خواتین ڈائجسٹ

نومبر 2014



نومبر 2014
جلد 42 شمارہ 7
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

خواتین ڈائجسٹ کا نومبر کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

اسلامی ہجری سال کا آغاز ہو چکا ہے۔ ہجری سال کے آغاز سے پہلے رومی اور ایرانی سن رائج تھے۔ خلیفہ دوم حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ سن کا تعین کیا جائے۔ حضرت عمرؓ سمجھتے تھے کہ ایرانی اور رومی سن اختیار کرنا مسلمانوں کے لیے مناسب نہیں ہے۔ ان کی علیحدہ شناخت ہونا چاہیے۔ انہوں نے اس سلسلے میں مشاورت کی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے تجویز دی کہ مسلمانوں کے نئے سال کا آغاز ہجرت مدینہ سے کیا جائے۔ یہ تجویز اتفاق رائے سے منظور ہوئی۔ اس کے بعد سے سن ہجری کا نفاذ ہوا جو آج تک رائج ہے۔

ہجری سال کی ابتدا محرم الحرام سے ہوتی ہے۔ یکم محرم الحرام کو حضرت عمرؓ شہید کیے گئے اور دس محرم الحرام کو شہادت کا وہ عظیم واقعہ پیش آیا جس نے قیامت تک کے لیے شجاعت کی تاریخ رقم کر دی۔

نواسہ رسولؐ امام حسینؓ باطل کے سامنے سرنگوں نہیں ہوئے۔ انہوں نے اپنے اعزا کے ساتھ شہادت پیش کر کے ثابت کر دیا کہ ہار جیت کا فیصلہ عددی کثرت یا طاقت پر نہیں، اس کی بنیاد حق اور صداقت پر ہوتی ہے۔ حق کے لیے جان دینے کی یہ تابندہ مثال قیامت تک دنیا کے لیے مشعل راہ بنی رہے گی۔

نیا ناول۔ آبِ حیات،

بہن عنیزہ سید کا ناول اختتام کو پہنچا۔ اس ماہ اس کی آخری قسط پیش کی جا رہی ہے۔ اس ماہ ہم بہن عمیرہ احمد کا ناول "آبِ حیات" شروع کر رہے ہیں۔ یہ عمیرہ احمد کے ناول "پیر کامل" کا تسلسل ہے۔ ان قارئین کے لیے جنہوں نے پیر کامل نہیں پڑھا، ہم پیر کامل کا خلاصہ شائع کر رہے ہیں تاکہ وہ "آبِ حیات" کے کرداروں کے پس منظر سے واقف ہو سکیں۔

عمیرہ احمد قارئین کی پسندیدہ مصنفہ ہیں۔ ان کی اب تک جو تحریریں شائع ہوئی ہیں، قارئین نے انہیں بے حد پسند کیا ہے۔ خصوصاً "پیر کامل" ان کا مقبول ترین ناول ہے۔ توقع رکھتے ہیں کہ اس ناول کا دوسرا حصہ بھی آپ کو پسند آئے گا۔

سانحۂ ارتحال،

ٹریفک کے ایک حادثے میں بہن فرحانہ ناز ملک اس دارِ فانی کو الوداع کہہ گئیں۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ؕ

ان کے ساتھ ان کی والدہ، چھوٹی بہن کرن اور بھائی غاور بھی تھے۔ وہ بھی موقع پر جاں بحق ہو گئے۔
فرحانہ ناز ملک کی جواں مرگ پر بے شمار دل رنجیدہ ہیں۔ ان کے اہل خانہ کے لیے یہ بہت بڑا سانحہ ہے۔ ہم ان کے دکھ میں برابر کے شریک ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحومین کی مغفرت فرمائے اور اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

اس شمارے میں،

- کوہ گراں تھے ہم۔ عنیزہ سید کے ناول کی آخری قسط،
- عمیرہ احمد کا ناول۔ آبِ حیات،
- تنزیلہ ریاض اور نمرہ احمد کے مکمل ناول،
- عنیقہ ایوب، ام ایمان قاضی اور میمونہ صدف کے ناولٹ،
- تمثیلہ زاہد، کنیز نور علی اور ایمل رضا کے افسانے،
- ماڈل اور اداکار فہد مرزا سے باتیں،
- ٹی وی فنکارہ شاہین خان سے ملاقات،
- فرحانہ ناز ملک کی یادیں،
- کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم،
- ہمارے نام، نفسیاتی الجھنیں اور عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے۔ اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

مردوں کا سونا پہننا

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کے ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی دیکھی تو آپ نے اسے اتار کر پھینک دیا اور فرمایا۔

"تم میں سے ایک شخص آگ کے انگارے کا ارادہ کرتا ہے اور اسے اپنے ہاتھ میں رکھ لیتا ہے!"

(آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس انگوٹھی کو انگارہ قرار دیا جو ہاتھ میں رکھا گیا)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانے کے بعد اس آدمی سے کہا گیا۔

"اپنی انگوٹھی پکڑ لو اور اس (کو بیچ کر اس) سے فائدہ اٹھالو۔"

اس نے جواب دیا۔ "نہیں، اللہ کی قسم! میں اس چیز کو کبھی نہیں لوں گا جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھینک دیا۔" (مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ اس سے معلوم ہوا کہ مردوں کے لیے جس طرح سونے کا زیور حرام ہے، اسی طرح ایک انگوٹھی پہننا بھی حرام اور کبیرہ گناہ ہے۔ لیکن بدقسمتی سے آج کل منگنی کی خود ساختہ رسم میں مردوں کو سونے کی انگوٹھی دینے کا عام رواج ہے اور مرد اسے بڑے فخر سے پہنتے ہیں۔ یہ رواج نہایت خطرناک ہے، اسے بالکل ختم کر دینا چاہیے۔ اول تو منگنی کے موقع پر لینے دینے اور بڑی بڑی دعوتوں کا اہتمام خوامخواہ کا بوجھ اور تکلف ہے جو شرعاً بھی قابل غور ہے، پھر حرام چیزوں کا لینا دینا تو اس پر مزید ظلم اور بنائے فاسد علی الفاسد ہے۔ اللہ تعالیٰ اس مسلمان قوم کو ہدایت نصیب فرمائے۔

2۔ اس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے جذبہ اطاعت رسول کا جو نمونہ ہے، وہ بھی بے مثال ہے۔

برائی سے روکو

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری

جان ہے! تم ضرور نیکی کا حکم کرو اور ضرور برائی سے روکو ورنہ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنی طرف سے کوئی عذاب بھیج دے پھر تم اس سے دعائیں کرو گے لیکن وہ قبول نہیں کی جائیں گی۔"

(اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث حسن ہے۔)

فائدہ : امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ترک کرنے سے ایک تو اللہ کے عذاب کا اندیشہ ہے اور دوسرا دعاؤں کی عدم قبولیت کا۔

افضل جہاد

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"سب سے زیادہ فضیلت والا جہاد ظالم بادشاہ کے سامنے کلمہ حق کہنا ہے۔" (اسے ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی فرماتے ہیں یہ حدیث حسن ہے۔)

فائدہ : جہاد کے مراتب ہیں نیکی کا حکم دینا بھی جہاد ہے اور افضل جہاد ظالم حکمرانوں کو اللہ کا پیغام سنانا ہے اور اسی طرح اگر کوئی سماج یا معاشرہ کسی برائی میں اس طرح ڈوب جائے کہ اس کے خلاف لب کشائی کی کسی کو ہمت نہ ہو تو اس برائی کے خلاف آواز بلند کرنا بھی افضل جہاد ہو سکتا ہے۔

سب سے بدتر

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم لوگوں کو کانوں کی طرح پاؤ گے۔ ان میں جو لوگ جاہلیت میں بہتر تھے اسلام میں بھی بہتر ہیں جب کہ وہ دین کی سمجھ حاصل کرلیں۔ اور اس حکمرانی کے معاملے میں تم ان لوگوں کو سب سے بہتر پاؤ گے جو اس کو سب سے زیادہ ناپسند کرتے ہوں گے۔ اور تم لوگوں میں سب سے بدتر دو رخے شخص کو پاؤ گے جو ان (لوگوں) کے پاس ایک رخ (چہرہ) لے کر جائے اور ان کے پاس دوسرا رخ۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل

1۔ : کانوں کی طرح کا مطلب ہے کہ ان کی بھی کوئی اصل ہوگی جس کی طرف وہ منسوب ہوں گے اور جو ان کے لیے ذریعہ افتخار ہوگی۔ اچھی اصل یعنی شرف و مجد رکھنے والے قبیلے جس طرح زمانہ جاہلیت میں ممتاز تھے اسلام چونکہ خود بھی شرافت و کرامت کا حامل مذہب ہے اس لیے قبول اسلام کے بعد بھی ممتاز قبیلوں کے لوگ شرف و فضل میں نمایاں ہی رہیں گے۔ ان کی قدر و منزلت میں کوئی کمی نہیں ہوگی بشرطیکہ وہ دین کی صحیح سمجھ حاصل کرلیں اور اس کی پابندی کو اپنا شعار بنالیں۔

2۔ جو لوگ عہدہ و منصب کی خواہش نہیں رکھتے بلکہ وہ اس کی ذمہ داریوں سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں اگر اختیار و اقتدار آجائے تو یہ عوام کے لیے بہتر ثابت ہوتے ہیں کیونکہ وہ اس کی ذمہ داریوں اور تقاضوں کو پوری دیانت داری سے ادا کرتے ہیں۔ وہ اپنے مفادات کو نہیں دیکھتے۔ ملک و قوم کے مفادات کو ترجیح دیتے ہیں اور اللہ کی حدوں کو توڑتے نہیں بلکہ ان کو قائم کرتے ہیں۔

3۔ دو رخے شخص سے مراد ایسا آدمی ہے جو ایک گروہ کے پاس جائے تو اسے باور کرائے کہ وہ اس کا خیر خواہ اور ساتھی ہے اور دوسرے کا مخالف۔ لیکن جب دوسرے گروہ کے پاس جائے تو وہاں بھی یہی تاثر دے۔ یہ بدترین آدمی ہے۔ اس کے مقابلے میں وہ شخص سب سے بہتر ہے کہ وہ ہر گروہ کے پاس جائے اور اپنی طاقت کے مطابق ہر ایک کی اصلاح کی کوشش کرے۔

جھوٹ کے حرام ہونے کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "جس چیز کا علم نہیں اس کے پیچھے مت پڑو۔" (الاسرا۔36)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "انسان جو لفظ بھی بولتا ہے تو اس کے پاس ایک نگران فرشتہ تیار رہتا ہے۔" (ق۔18)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"بلاشبہ سچائی نیکی کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور نیکی جنت کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور یقیناً" آدمی سچ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ اللہ کے ہاں صدیق (راست باز) لکھ دیا جاتا ہے اور بلاشبہ جھوٹ نافرمانی کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور نافرمانی جہنم کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور یقیناً" آدمی جھوٹ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ اللہ کے ہاں جھوٹا لکھ دیا جاتا ہے۔"

(بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ انسان جیسا رویہ اختیار کرتا ہے وہ اس کا وصف خاص بن جاتا ہے جس سے وہ مشہور ہوتا ہے۔ اس لیے انسان کو اچھی باتیں اور اچھا رویہ ہی اپنانا چاہیے تاکہ لوگوں کی زبانوں پر بھی اس کی تعریف کے چرچے ہوں اور اللہ کے ہاں بھی اس کا اچھا مقام ہو۔

2۔ سچائی نجات کا اور جھوٹ تباہی کا راستہ ہے۔

منافق

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"چار خصلتیں ہیں جس میں وہ ہوں گی وہ خالص منافق ہوگا اور جس کے اندر ان میں سے کوئی ایک خصلت ہوگی تو اس میں نفاق کی ایک خصلت ہوگی یہاں تک کہ وہ اسے چھوڑ دے (وہ خصلتیں یہ ہیں)

جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے

جب بات کرے تو جھوٹ بولے

جب عہد کرے تو بے وفائی کرے

اور جب جھگڑے تو بدزبانی کرے۔" (بخاری و مسلم)

جھوٹا خواب

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس شخص نے ایسا خواب بیان کیا جو اس نے نہیں دیکھا تو اسے (قیامت والے دن) مجبور کیا جائے گا کہ وہ جو کے دو دانوں کے درمیان گرہ لگائے۔ اور وہ یہ ہرگز نہیں کر سکے گا۔ اور جو شخص ایسے لوگوں کی بات سننے کے لیے ان کی طرف کان لگائے جو اس کے لیے اس کو ناپسند کرتے ہوں تو قیامت والے دن اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالا جائے گا۔ اور جو شخص (کسی جان دار کی) تصویر بنائے تو اسے عذاب دیا جائے گا اور اسے مجبور کیا جائے گا کہ وہ اس میں روح پھونکے جبکہ وہ اس میں روح نہیں پھونک سکے گا۔"

(بخاری)

فوائد و مسائل :

1۔ حلم برے خواب کو کہتے ہیں لیکن یہاں مراد مطلق خواب ہے چاہے اچھا ہو یا برا۔ اس میں اپنی طرف سے گھڑ کے جھوٹے خواب بیان کرنے کی شدید وعید ہے۔ یہ بیماری عام طور پر ایسے لوگوں میں ہوتی ہے جو شہرت اور ناموری کے بھوکے ہوتے یا اپنی پاکبازی کا پروپیگنڈہ کرنا چاہتے ہوں جیسے چند سال قبل ہمارے ملک میں ایک چرب زبان مقرر اور قائد بننے کے خبط میں مبتلا شخص نے بڑے بڑے عجیب و غریب خواب دیکھنے کے دعوے کیے تھے۔ وہ چونکہ سب بناوٹی تھے اس لیے بہت جلد بھانڈا پھوٹ گیا اور کسی نے بھی اس پر اعتبار نہیں کیا۔

2۔ اس میں ٹوہ میں رہنے یا ٹوہ لگانے کی بھی مذمت ہے۔

3۔ تصویر سازی پر سخت وعید ہے چاہے یہ تصویر ہاتھ کی بنی ہوئی ہو یا کیمرے کی کھینچی ہوئی اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تصویر بہرحال تصویر ہے حتیٰ کہ

ممنوعہ تصاویر کی بھی یہی سزا ہوگی، جس کو بہت سے لوگ تصویر ہی نہیں سمجھتے۔

جھوٹ بولنا

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"سب سے بڑا جھوٹ یہ ہے کہ آدمی اپنی آنکھوں کو وہ چیز دکھائے جو انہوں نے نہیں دیکھی۔" (بخاری)

اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ایسی چیز کے متعلق کہے کہ میں نے اسے دیکھا ہے جسے اس نے نہیں دیکھا۔

فائدہ : اس میں ابھی دروغ گوئی کی مذمت ہے' ایسا دعوا خواب کے بارے میں ہو یا حالت بیداری میں' دونوں صورتوں میں بڑا جھوٹ ہے۔

ٹوہ لگانا

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کے پاس ایک آدمی لایا گیا اور اس کے بارے میں کہا گیا کہ یہ فلاں آدمی ہے' اس کی داڑھی سے شراب کے قطرے گر رہے ہیں۔ انہوں نے فرمایا۔

"ہمیں ٹوہ لگا کر عیب تلاش کرنے سے منع کیا گیا ہے' البتہ اگر کوئی کمزوری ہمارے سامنے —— آئے گی تو ہم اس پر اس کی گرفت کریں گے۔

اسے ابو داؤد نے ایسی سند سے روایت کیا ہے، جو بخاری و مسلم کی شرط پر ہے۔)

فوائد و مسائل :

1۔ اس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس عمل کا ایک نمونہ ہے جس کی ہدایت اسلام نے دی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یقیناً "اسلام کے اوامر و نواہی کے پابند تھے۔

2۔ محض شبہ پر حد یا تعزیر عائد نہیں ہوگی' اس کے لیے واقعی ثبوت ضروری ہے۔

بلا ضرورت مسلمانوں سے بدگمانی کرنے کی ممانعت کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "اے ایمان والو! زیادہ بدگمانی سے بچو' اس لیے کہ بعض بدگمانی گناہ ہے۔"

سب سے بڑا جھوٹ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم بدگمانی سے بچو' اس لیے کہ بدگمانی سب سے بڑا جھوٹ ہے۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ اس میں بھی بدگمانی سے' خاص طور پر اہل خیر و صلاح کے بارے میں بدگمانی سے بچنے کی تاکید ہے' اس لیے کہ یہ جھوٹ کی بدترین قسم ہے۔ علاوہ ازیں شرعی احکام اور سزائیں یقین پر نافذ ہوتی ہیں' محض ظن و تخمین پر نہیں۔

2۔ عام حالات میں ہر مسلمان کی بابت اچھا خیال رکھنا ضروری ہے' الا یہ کہ کوئی واضح ثبوت اس کے برعکس موجود ہو۔

مسلمانوں کو حقیر جاننا حرام ہے

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"اے ایمان والو! کوئی قوم کسی قوم سے استہزا نہ کرے' ممکن ہے کہ وہ لوگ ان سے بہتر ہوں۔ اور نہ عورتیں دوسری عورتوں سے استہزا کریں' ممکن ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ اور اپنے (مومن بھائیوں) کو عیب مت لگاؤ اور نہ ایک دوسرے کو برے ناموں سے پکارو۔ ایمان لانے کے بعد برا نام (رکھنا) اللہ کی حکم عدولی ہے اور جو توبہ نہ کریں' پس وہی لوگ ظالم ہیں۔" (الحجرات۔11)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"ہر اس شخص کے لیے خرابی ہے جو طعنہ زنی

کرنے والا' عیب جو اور چغل خور ہو۔" (الھمزہ۔1)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"آدمی کے برا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے۔" (مسلم)

تکبر

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"وہ شخص جنت میں نہیں جائے گا جس کے دل میں رائی کے برابر بھی کبر ہوگا۔"

ایک آدمی نے عرض کیا۔

ایک آدمی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کا کپڑا اچھا ہو' اس کی جوتی اچھی ہو (کیا یہ بھی کبر ہے؟)

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"بے شک اللہ تعالیٰ خوب صورت ہے' خوب صورتی کو پسند فرماتا ہے۔ کبر حق کا انکار کرنا اور لوگوں کو حقیر جاننا ہے۔"

فوائد و مسائل :

1۔ یعنی حق بات کو ٹال دینا اور کہنے والے پر لوٹا دینا' مطلب یہی گریز کرنا ہے۔

2۔ اچھا لباس پہن لینا کبر نہیں ہے۔ جس کو عام طور پر لوگ کبر سمجھتے ہیں بلکہ کبر اصل میں وہ ہے جس کی نشان دہی حدیث میں کی گئی ہے۔

اللہ پر قسم

حضرت جندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ایک آدمی نے کہا اللہ کی قسم اللہ تعالیٰ فلاں شخص کو نہیں بخشے گا۔ تو اللہ عزوجل نے فرمایا کون ہے جو مجھ پر اس بات کی قسم کھاتا ہے کہ میں فلاں شخص کو نہیں بخشوں گا۔ بے شک میں نے اس کو بخش دیا اور تیرے عمل میں نے برباد کر دیے۔" (مسلم)

فائدہ :

بعض لوگوں کو اپنی عبادات اور زہد و تقویٰ پر گھمنڈ ہو جاتا ہے، جو انہیں دوسروں کی بابت بدگمانی میں مبتلا کر دیتا ہے اور وہ بڑے یقین سے اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ فلاں شخص کو تو اللہ نے کبھی معاف نہیں کرنا' حالانکہ یہ اللہ کی شان میں بے ادبی کا مظاہرہ اور اپنی بابت حد سے زیادہ خوش گمانی کا نتیجہ ہے۔ یہ رویہ اللہ کو پسند نہیں۔ اللہ تعالیٰ چاہے تو اس عابد و زاہد و متقی کے سارے عمل برباد کر کے اسے جہنم میں پھینک دے اور اس گناہ گار کو معاف کر کے جنت میں بھیج دے' جس کی بابت یہ قسم کھا کر کہتا تھا کہ اسے اللہ معاف نہیں کرے گا۔ اس لیے انسان کو اپنی عبادت پر گھمنڈ نہیں کرنا چاہیے اور دوسروں کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیے۔

مسلمان کی تکلیف پر خوشی کا اظہار کرنے کی ممانعت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا "مومن تو بھائی بھائی ہیں۔" (الحجرات 10)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"بے شک وہ لوگ، جو اہل ایمان کے اندر بے حیائی کے پھیلانے کو پسند کرتے ہیں' ان کے لیے دنیا و آخرت میں دردناک عذاب ہے۔" (النور۔19)

حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اپنے (مسلمان) بھائی کی تکلیف پر خوشی کا اظہار نہ کرو (کہیں ایسا نہ ہو) کہ اللہ تعالیٰ اس پر تو رحم فرما دے اور تمہیں آزمائش میں ڈال دے۔" (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے۔ یہ حدیث حسن ہے۔)





انشا آپی

ڈرتے ڈرتے آج کسی کو

ڈرتے ڈرتے آج کسی کو دل کا بھید بتایا ہے
اتنے دِنوں کے بعد لبوں پر نام کسی کا آیا ہے

اب یہ داغ بھی سورج بن کر ابھر ابھر چمکے گا
جس کو ہم نے دامن دِل میں اتنی عمر چھپایا ہے

کون کہے وہ کانِ ملاحت چارۂ دردِ محبت ہے
چارہ گری کی آڑ میں جس نے خود کو روگ لگایا ہے

ٹوٹ گیا جب دل کا شیشہ اب کیوں ریزے چنتی ہو
ریزوں سے بھی کبھی کسی نے شیشہ پھر سے بنایا ہے



معروف ماڈل اداکار

فہد مرزا سے باتیں

شاہین رشید

1 "اصلی نام؟"
"فہد نذیر مرزا۔"
2 "پیار کا نام؟"
"فہدی کہتے ہیں۔"
3 "تاریخ پیدائش / شہر؟"
"26 اپریل / کراچی۔"
4 "قد / ستارہ؟"
"5 فٹ ساڑھے 9 انچ / ٹورس۔"
5 "بہن بھائی / آپ کا نمبر؟"
"تین بہنیں ایک بڑی دو چھوٹی / میرا نمبر دوسرا ہے۔"
6 "لاڈلے ہیں؟"
"ابا کا لاڈلا نہیں ہوں اماں کا ہوں۔"
7 "تعلیمی قابلیت؟"
"ایم بی بی ایس جنرل سرجری میں ٹریننگ مکمل کر کے اب پلاسٹک سرجری میں ٹریننگ کر رہا ہوں۔ پلاسٹک سرجری میں فیلو شپ کر رہا ہوں۔"
8 "شادی / پسند؟"
"دو مہینے قبل 14 اگست 2014ء کو ہوئی اور پسند سے کی معروف فنکارہ ثروت گیلانی سے۔"
9 "شوبز میں لانے کا سہرا؟"
"ثروت گیلانی اور جلیل اختر (مرینہ کے شوہر)۔"
10 "وجہ شہرت؟"
"کمرشلز اور ڈرامے۔ آج کل "شناخت" بہت مشہور ہو رہا ہے اور Oreo بسکٹ کا کمرشل بہت چل رہا ہے۔"
11 "پہلی کمائی؟"
"کچھ عرصے کمائی کر رہا ہوں 15 ہزار پہلی کمائی تھی ایک کمرشل کی۔"
12 "اس فیلڈ میں کیا کمی دیکھتے ہیں؟"
"ڈسپلن کی۔"
13 "آپ کی صبح کب ہوتی ہے؟"
"صبح سات بجے اٹھ جاتا ہوں۔"
14 "اور رات؟"
"جو لوگ رات کو دھاڑی لگاتے ہیں اُن کی رات ہوتی ہی نہیں ہے کبھی کبھار تو ایک صبح سے دوسری صبح شروع ہو

جاتی ہے۔"

15 "صبح آنکھ کھلتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟"

"کہ دوبارہ سو جاؤں۔"

16 "گھر والوں کی کس بات سے چڑ ہونے لگتی ہے؟"

"گھر والے کھانا بہت کھلاتے ہیں اور بڑے شوق سے کھلاتے ہیں۔"

17 "تہوار شوق سے مناتے ہیں؟"

"جی جی... بہت شوق سے مناتا ہوں۔"

18 "اپنی پرسنالٹی میں کیا کمی محسوس کرتے ہیں؟"

"اب تو کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی' لیکن چھوٹا تھا تو سوچتا تھا کہ کاش بال ایسے ہوتے ہیں' قد لمبا ہوتا وغیرہ وغیرہ۔"

19 "شدید بھوک میں کیا کرتے ہیں؟"

"مجھے بہت شدت سے بھوک لگتی ہی نہیں ہے۔"

20 "حلقہ احباب وسیع ہے یا حلقہ یاراں؟"

"رشتے دار یعنی حلقہ احباب وسیع ہے۔ دوست کم ہیں۔"

21 "مطالعہ کا شوق ہے؟"

"مطالعہ کرنے کا بہت شوق ہے۔ اخبارات کو انٹرنیٹ پہ پڑھتا ہوں۔ جو آن لائن اچھی چیزیں ہوتی ہیں' وہ ضرور پڑھتا ہوں۔"

22 "کس دن کا شدت سے انتظار کرتے ہیں؟"

"مشکل سوال ہے... اپنی سالگرہ کا تو انتظار نہیں رہتا۔ کوئی خاص نہیں۔"

23 "خوشی میں آپ کا ردعمل؟"

"بہت خوش ہوتا ہوں اور اظہار کے لیے کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہوں۔"

24 "شدید تھکن میں بھی جانے کے لیے تیار رہتے ہیں؟"

"اپنے دوستوں کے ساتھ گھومنے پھرنے کے لیے۔"

25 "طبیعت میں ضد ہے؟"

"صحیح باتوں میں ضد ہے اور وہ میں کرتا ہوں... غلط باتوں پر بھی ضد نہیں کی۔"

26 "نیند کے دھنی ہیں؟"

"ہرگز نہیں' کیونکہ 70'80 سال کی عمر میں تو بستر ہوگا' نیند ہوگی اور ہم ہوں گے اگر زندگی نے سہولت دی تو۔"

27 "دماغ کا میٹر کب گھومتا ہے؟"

"جب کوئی آدمی ناجائز بات کر رہا ہو اور میرے سمجھانے پر بھی نہیں سمجھ رہا ہو تب۔"

28 "غصے میں ری ایکشن؟"

"چیزیں توڑنا شروع کر دیتا ہوں۔"

29 "خواتین میں کیا بات اچھی لگتی ہے؟"

قہقہہ "آپ کی کیسٹ ختم ہو جائے گی میری باتیں نہیں۔ اتنی اچھی لگتی ہیں خواتین۔"

30 "کوئی لڑکی مسلسل گھورے تو؟"

قہقہہ "اب بیگم آگئی ہے اس لیے گھورنے نہیں دیتا۔ پہلے تو میں بھی مسکرا دیتا تھا۔"

31 "پرائز بانڈ لیتے ہیں؟"

"بالکل نہیں۔"

32 "گھر میں کس کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟"

"اب تو خیر کسی کے غصے سے ڈر نہیں لگتا... پہلے البتہ ابا کے غصے سے ڈر لگتا تھا۔"

33 "کوئی چیز جو وقت سے پہلے مل گئی ہو؟"

"پیار وقت سے پہلے مل گیا۔ جب دس سال پہلے ثروت میری زندگی میں آئی تھی۔ اس کو پانے کے لیے دس سال انتظار کیا۔"

34 "جوائنٹ اکاؤنٹ ہونا چاہیے یا سنگل؟"

"سنگل... اپنا اپنا۔"

35 "کس ملک کی شہریت لینے کی خواہش ہے؟"

"ایسے ملک کی کہ جس کا ویزا لینے کے لیے خوار نہ ہونا پڑے۔"

36 "شاپنگ میں آپ کی پہلی خریداری؟"

"کپڑے اور جوتے۔"

37 "آپ کے دنیا میں آنے کا مقصد؟"

"یہ ہے کہ مجھے نارمل آدمی کی طرح شادی کر کے بچے پیدا کر کے ان کو کھلا پلا کر پڑھا لکھا کر کچھ ایسا کرنا ہے کہ مرنے کے بعد بھی میں لوگوں کو یاد رہوں۔"

38 "پیسہ خرچ کرتے وقت کیا سوچتے ہیں؟"

"کچھ بھی نہیں سوچتا کیوں کہ پیسہ ہوتا ہی خرچ کرنے کے لیے ہے۔"

39 "برا وقت جو آپ نے گزارا ہو؟"

"بہت وقت کرائسس میں گزارا ہے۔"

40 "بہترین تحفہ آپ کی نظر میں؟"

"کیش۔"

41 "کون سی بات موڈ پر اچھا اثر ڈالتی ہے؟"

"جب کوئی میری سرجری اور میری اداکاری کی تعریف کرتا ہے۔"

42 "پسندیدہ پروفیشن؟"

"ڈاکٹری اور ایکٹنگ۔"

43 "مخلص کون ہوتے ہیں اپنے یا پرائے؟"

"دونوں ہی ہوتے ہیں' منحصر ہے کہ آپ کیسے ہیں۔"

44 "نیند سے اٹھنے میں دیر لگاتے ہیں یا فوراً" اٹھ جاتے ہیں؟"

"نہیں جی۔ دیر نہیں لگاتا۔ آنکھ کھلتے ہی اٹھ جاتا ہوں۔"

45 "چھٹی کا دن؟"

"سمندر پہ جا کر اپنی کشتی چلاتا ہوں اور گھر والوں کے ساتھ انجوائے کرتا ہوں۔"

46 "بہترین زندگی کے لیے کیا ضروری ہے پیسہ یا محبت؟"

"پیسہ ہو اور محبت بھی ہو تو زندگی حسین ہو جاتی ہے۔"

47 "گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟"

"اپنے باتھ روم میں۔"

48 "ایک آرٹسٹ جس کے ساتھ کام کرنے کی خواہش ہے؟"

"نصیر الدین شاہ۔"

49 "کس کے ایس ایم ایس کے جواب فوراً" دیتے ہیں؟"

"اپنے باس کے۔"

50 "بوریت کس طرح دور کرتے ہیں؟"

"بور ہونے کا ٹائم ہی نہیں ملتا۔"

51 "کسی کو فون نمبر دے کر پچھتائے؟"

"جی جی... مریضوں کو۔"

52 "مہمان بننا یا مہمان کا آنا اچھا لگتا ہے؟"

"دونوں لحاظ سے اچھا لگتا ہے۔ آمد زیادہ اچھی لگتی ہے کہ گھر میں رونق ہو جاتی ہے۔"

53 "آپ پاور میں آجائیں تو؟"

"اچھا ہی کروں گا۔ کیونکہ ہماری تربیت میں کوئی لالچ نہیں ہے اس لیے پاور میں آکر احتساب تو ضرور کروں گا سیاست دانوں کا۔"

54 "کیا چیزیں جمع کرنے کا شوق ہے؟"

"جینز۔"

55 "نصیحت جو بری لگتی ہے؟"

"جب میری نانی اداکاری پہ نصیحت کرتی ہیں کہ اس طرح نہیں اس طرح اداکاری کیا کرو۔"

56 "انسان کی زندگی کا کب سے اچھا دور؟"

"کہ آپ جس سے پیار کرتے ہیں اس کے ساتھ وقت گزاریں اور پوری فیملی پیار محبت کے ساتھ رہ رہی ہو تو وہ ہی دور اچھا ہوتا ہے۔"

57 "وقت کی پابندی کرتے ہیں؟"

"کوشش کرتا ہوں۔"

58 "کن پہ خرچ کرنے کو دل چاہتا ہے؟"

"گھر والوں پہ' دوستوں پہ۔"

59 "اپنی کمائی سے اپنے لیے ایک قیمتی چیز جو خریدی؟"

"گھڑی۔"

60 "کھانے کا مزہ کہاں آتا ہے' اپنے بیڈ پہ' چٹائی پہ یا ڈائننگ ٹیبل پہ؟"

"ڈائننگ ٹیبل پہ کانٹے چھری کے ساتھ کھانے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔"

61 "دنیا سو جائے' آپ جاگ رہے ہوں تو کیا لینا چاہیں گے؟"

"مشکل سوال ہے۔ لینا تو بہت کچھ چاہوں گا۔"

62 "ایک کردار جو آپ کی شخصیت کا عکس ہے؟"

"ڈرامہ سیریل "شناخت کا کردار" روحان' جو میں نے خود کیا ہے۔"

63 "انٹرنیٹ اور فیس بک سے دلچسپی؟"

"بہت زیادہ ہے۔ کام کے سلسلے میں پڑھائی کے لیے دنیا سے ان ٹچ رہنے کے لیے۔"

64 "کانٹی نینٹل کھانے پسند ہیں یا دیسی؟"

"دونوں۔"

65 "ایک کھانا جو آپ بہت اچھا پکا لیتے ہیں؟"

"کچھ نہ کچھ پکا ہی لیتا ہوں۔"

66 "عورت نرم دل ہے یا مرد؟"

"عورت۔"

67 "کس شخصیت کو اغوا کرنا چاہیں گے اور تاوان.... کیا لیں گے؟"

"زرداری کو اغوا کروں گا اور پوچھوں گا کہ یہ سب کیسے کیا۔"

68 "کن کیڑوں مکوڑوں سے ڈر لگتا ہے؟"

"ان سے ڈر نہیں لگتا۔"

69 "کن باتوں سے ڈرتے ہیں؟"

"بیماری سے.... اللہ ہمیشہ صحت مند رکھے۔"

70 "کس کے بغیر زندگی ادھوری ہے؟"

"انٹرنیٹ کے بغیر اور اپنوں کے بغیر۔"

71 "کیا محبت اندھی ہوتی ہے؟"

"کبھی کبھار۔"

72 "دل کب ٹوٹتا ہے؟"

"جب کوئی آپ کے بھروسے کو توڑتا ہے۔"

73 "شادی میں پسندیدہ رسم؟"

"نکاح کی۔"

74 "ناشتہ اور کھانا کس کے ہاتھ کا پکا پسند ہے؟"

"اپنے خانساماں محمود کا۔"

75 "کس تاریخی شخصیت سے ملنے کی خواہش ہے؟"

"الیگزینڈر دی گریٹ۔"

76 "اپنا فون نمبر کتنی بار بدلا؟"

"کبھی نہیں بدلا اور بدلوں گا بھی نہیں کہ یہ ثروت نے لے کر دیا تھا۔ دس سال پہلے۔"

77 "فوبیا ہے آپ کو؟"

"بند جگہوں سے اور لفٹ سے، جب وہ بند ہوتی ہے تو میری جان نکل رہی ہوتی ہے۔"

78 "کن چیزوں کو لازمی لے کر نکلتے ہیں؟"

"اپنے گلاسز، والٹ اور موبائل۔"

79 "اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتے ہیں؟"

"سب سے پہلے۔"

80 "آپ کی اچھی اور بری عادت؟"

"بری عادت یہ کہ میں لوگوں پر زیادہ بھروسا نہیں کرتا اور اچھی عادت یہ کہ میرا دل بہت اچھا ہے، صاف ستھرا اور نرم۔"

81 "کیا کبھی منہ سے گالیاں نکلتی ہیں؟"

"جب میں سرجری کر رہا ہوتا ہوں کیونکہ میرے اسسٹنٹ میرے ساتھ کوآپریٹ صحیح طرح نہیں کر پا رہے ہوتے۔"

82 "غصے میں پہلا لفظ کیا نکلتا ہے؟"

"ماں بہن کی تعریف کرتا ہوں۔"

83 "غصے سے کھانا پینا چھوڑا؟"

"کئی بار۔"

84 "شہرت کب مسئلہ بنتی ہے؟"

"جب آپ پریشان ہوتے ہیں اور گھر سے باہر نکلے ہوئے ہوتے ہیں اور اس وقت لوگ آپ کو پہچان کر آپ کا راستہ روک رہے ہوں تب۔"

85 "کروٹیں بدلتے ہیں یا لیٹتے ہی سو جاتے ہیں؟"

"لیٹتے ہی نیند آ جاتی ہے۔ تھکاوٹ کی وجہ سے۔"

86 "اپنے سرہانے کیا کیا رکھتے ہیں؟"

"کتاب، ٹیبلٹ اور فون۔"

87 "خدا کی حسین تخلیق؟"

"انسان۔"

88 "زندگی کب بری لگتی ہے؟"

"جب مسلسل کام کیے جا رہے ہوں اور چھٹی کا ایک دن بھی نہ ملے۔"

89 "کھانے کی میز پہ کیا نہ ہو تو کھانے کا مزہ نہیں آتا؟"

"اگر آپ کی شہرت کو زوال آ جائے تو؟"

"کوئی مسئلہ نہیں۔ اللہ مالک ہے۔"

☆

پیرِ کامل

مصنف: عمیرہ احمد

بعض دفعہ تاریکی میں قدم دھرنے کے بعد ٹھوکر لگنے سے پہلے ہی انسان کو پچھتاوا ہونے لگتا ہے۔ وہ واپس روشنی کی طرف لوٹنا چاہتا ہے۔ اس وقت پیر کامل صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی انسان کو تاریکی سے روشنی تک لاسکتی ہے' اگر انسان سچے دل سے روشنی چاہے تو۔

"یقیناً" ہدایت ان ہی کو دی جاتی ہے جو ہدایت چاہتے ہیں۔"

ایک عظیم مقصد کے تحت لکھی جانے والی اس تحریر کے مرکزی کردار سالار اور امامہ ہیں۔ دونوں ہی کردار غیر معمولی ہیں۔ سالار بے پناہ ذہین ہے اور امامہ کی استقامت' اس کا یقین اور اس کا عشق غیر معمولی ہے۔

ڈاکٹر بننا امامہ کا جنون ہے۔ جویریہ نے اس سے پوچھا۔

"تمہاری زندگی کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے امامہ؟"

امامہ نے قدرے حیرانی سے اسے دیکھا اور سوچ میں پڑ گئی۔

"ملک کی سب سے بڑی ڈاکٹر بننا چاہتی ہوں۔ سب سے اچھی آئی اسپیشلسٹ۔ میں چاہتی ہوں جب پاکستان میں آئی سرجری کی تاریخ لکھی جائے تو اس میں میرا نام ٹاپ آف دا لسٹ ہو۔" اس نے مسکراتے ہوئے آسمان کو دیکھا۔

"اچھا اور اگر کبھی تم ڈاکٹر نہ بن سکیں تو۔۔۔؟" جویریہ نے کہا۔ "آخر یہ میرٹ اور قسمت کی بات ہے۔"

"ہو ہی نہیں سکتا۔۔۔ یہ میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے۔ میں اس پروفیشن کے لیے سب کچھ چھوڑ سکتی ہوں۔ یہ میرا خواب ہے اور خوابوں کو بھلا کیسے چھوڑا یا بھلایا جاسکتا ہے۔ امپاسبل۔۔۔"

امامہ نے قطعی انداز میں سر ہلاتے ہوئے ہتھیلی پر رکھے ہوئے دانوں میں سے ایک اور دانہ منہ میں ڈالا۔

"زندگی میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا۔۔۔ کبھی بھی' کچھ بھی ہو سکتا ہے' فرض کرو کہ تم ڈاکٹر نہیں بن پاتیں تو۔۔۔ پھر تم کیا کرو گی؟" امامہ اب سوچ میں پڑ گئی۔

"ہاں تو پھر زندہ رہ کر کیا کروں گی۔ سارے پلانز ہی میرے میڈیکل کے حوالے سے ہیں اور یہ چیز زندگی سے نکل گئی تو پھر باقی رہے گا کیا؟"

"اچھا' اگر تم ڈاکٹر نہ بن سکیں تو پھر مرو گی کیسے۔ خودکشی کرو گی یا طبعی موت؟" جویریہ نے بڑی دلچسپی سے پوچھا۔

"نہیں' مجھے پتا ہے کہ اگر میں ڈاکٹر نہ بنی تو پھر بہت جلد مر جاؤں گی۔ مجھے اتنا دکھ ہو گا کہ میں تو زندہ رہ ہی نہیں سکوں گی۔" وہ یقین سے بولی۔

"تم اب میری بات چھوڑو' اپنی بات کرو۔ تمہاری زندگی کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟" امامہ نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

اور جویریہ کی خواہش سن کر وہ سکتے کی کیفیت میں اسے دیکھتی رہ جاتی ہے۔ جویریہ کی خواہش کا تعلق امامہ کے عقیدے سے ہے۔ وہ کہتی ہے کہ تم مسلمان ہو جاؤ۔

امامہ کو یاد آتا ہے کہ وہ بچپن سے اسی طرح کی باتیں سنتی رہی ہے۔ تب اس پر منکشف ہوتا ہے کہ وہ خود کو مسلمان سمجھتی ہے جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ وہ مختلف کتابوں کا مطالعہ کرتی ہے تو اس کے ذہن میں سوالات ابھرتے ہیں۔ تب اس کے گھر والوں کے علم میں آتا ہے کہ وہ کس طرف جا رہی ہے۔

اس نے ان کتابوں کو کمرے میں بہت حفاظت سے چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ وسیم کے ہاتھ سب سے پہلے قرآن پاک کی تفسیر لگی تھی اور وہ جیسے دم بخود رہ گیا تھا۔

"یہ کیا ہے امامہ؟" اس نے مڑ کر تعجب سے پوچھا۔ امامہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور دھک سے رہ گئی۔

"یہ' یہ' یہ قرآن پاک کی تفسیر ہے۔" اس نے یک دم اپنی زبان میں ہونے والی لڑکھڑاہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"آخر تمہیں اس کتاب کی ضرورت کیوں پڑی؟" وسیم نے کتاب وہیں رکھ دی۔

"کیونکہ میں جاننا چاہتی ہوں کہ دوسرے عقائد کے لوگ آخر قرآن پاک کی کیا تفسیر کر رہے ہیں۔ ہمارے بارے میں قرآن کے حوالے سے ان کا نقطہ نظر کیا ہے۔" امامہ نے سنجیدگی سے کہا۔

وسیم اس کی بات پر بھڑک اٹھا۔ "تمہیں اس طرح کی کتابیں پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے لیے ہماری اپنی کتابیں کافی ہیں۔"



وسیم نے ہاشم مبین کو امامہ کے ساتھ ہونے والی بحث کے بارے میں بتا دیا تھا ہاشم مبین دم بخود رہ گئے تھے۔

"یہ سب تم سے امامہ نے کہا؟" ایک لمبی خاموشی کے بعد انہوں نے امامہ کو بلوا بھیجا۔

"تمہیں اپنی اولاد کہتے ہوئے مجھے شرم آرہی ہے۔ جہاں سے یہ کتابیں لے کر آئی ہو' کل تک وہیں دے آؤ' ورنہ میں انہیں اٹھا کر پھینک دوں گا باہر۔ ہو کیا تم' اپنی عمر دیکھو اور چلی ہو عقیدے جانچنے' اپنے نبی کی نبوت کو پرکھنے۔" ہاشم مبین کا پارہ بھی ہائی ہو گیا۔

"تم منہ میں سونے کا چمچ لے کر اسی نبی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہو' وہ نہ ہوتا تو سڑک پر دھکے کھا رہا ہوتا ہمارا سارا خاندان اور تم اس قدر احسان فراموش اور بے ضمیر ہو چکی ہو کہ جس تھالی میں کھاتی ہو' اسی میں چھید کر رہی ہو۔

بند کرو یہ لکھنا پڑھنا اور گھر بیٹھو تم!"

امامہ کی کلاس فیلو زینب کا بھائی جلال انصر نعت خواں ہے۔ نعت خوانی کے مقابلے میں جلال انصر حصہ لیتا ہے۔ امامہ اس کو سنتی ہے تو اس پر سحر سا طاری ہو جاتا ہے۔ زینب کہتی ہے کہ جلال کی آواز میں ساری تاثیر عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے ہے۔ امامہ اس کو اپنے دل کے قریب محسوس کرتی ہے۔

"اس آدمی میں کوئی چیز ایسی ہے جس کے سامنے میری ہر مزاحمت دم توڑ جاتی ہے۔ میں اس شخص کے حصول کی خواہش کیوں نہ کروں جو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے مجھ سے بھی زیادہ محبت رکھتا ہے۔ جس کے کردار سے میں واقف ہوں۔ کیا برا ہے اگر میں جلال انصر کے نام سے شناخت پاؤں۔ اس واحد آدمی کے نام سے جسے سنتے' جسے دیکھتے مجھے اس پر رشک آتا ہے۔"

اس کے کردار کی وجہ سے وہ خود اسے پرپوز کر دیتی ہے۔

"آپ نے اپنی شادی کے بارے میں کیا سوچا ہے؟ مجھ سے شادی کریں گے؟"

جلال دم بخود اسے دیکھنے لگا' اسے امامہ سے اس سوال کی توقع نہیں تھی۔

"آپ کو میری بات بری لگی ہے؟"

"نہیں ایسا نہیں ہے۔" اس نے بے اختیار کہا۔ "یہ سوال مجھے تم سے کرنا چاہیے تھا۔ تم مجھ سے شادی کرو گی؟"

"ہاں۔۔۔!" امامہ نے بڑی سہولت سے کہا۔

لیکن جب امامہ نے اسے بتایا کہ اس کے والدین اس شادی پر رضامند نہیں ہوں گے اور جلال سے وہ اپنے گھر والوں کی مرضی کے بغیر شادی کرے گی تو وہ پریشان ہو جاتا ہے۔ لیکن بالآخر اقرار کر لیتا ہے کہ وہ

گھر والوں کی مرضی کے بغیر بھی امامہ سے شادی کر لے گا۔

گھر والے امامہ کی طرف سے مشکوک ہو چکے ہیں۔ اس کے والد ہاشم یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ فوری طور پر اس کی شادی اسجد سے کر دی جائے۔ اسجد اس کا منگیتر ہے۔ خوش شکل اور خوش حال ہے۔ تعلیم یافتہ ہے لیکن امامہ مسلمان ہونے کے بعد اس سے شادی نہیں کر سکتی۔ امامہ کے احتجاج کے باوجود وہ اس کی شادی کی تاریخ طے کر دیتے ہیں۔

وہ سالار کو فون کر کے مدد مانگتی ہے اور کہتی ہے کہ جلال انصر سے رابطہ کر کے اسے بتائے کہ اس کے

والدین نے اس کی شادی طے کر دی ہے۔

سالار اس کا پڑوسی اور اس کے بھائی وسیم کا دوست ہے۔ ایک بار جب سالار نے خودکشی کی کوشش کی تھی اور اپنی کلائی کی رگیں کاٹ لی تھیں۔ گھر میں کوئی نہیں تھا۔ ملازم نے وسیم کو بلایا تھا اور وسیم امامہ کو بھی لے گیا تھا۔ امامہ نے خون روکنے کے لیے اس کی بینڈیج کی تھی۔ اگرچہ سالار نے اس وقت کافی بدتمیزی کی تھی اور امامہ نے اسے تھپڑ دے مارا تھا۔ امامہ کی رائے اس کے بارے میں بے حد خراب ـــــ تھی۔ اس کے باوجود اس نے مجبوراً" سالار سے مدد مانگی تھی۔

سالار نے اس سارے معاملے کو ایڈونچر کی طرح لیا۔ وہ جانتا تھا امامہ اسے پسند نہیں کرتی پھر بھی اس نے امامہ کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا اور امامہ کو اپنی ملازمہ کے ذریعے ایک موبائل بھجوا دیا۔

☼ ☼ ☼

"آپ کا بیٹا دنیا کی آبادی کے اس ۵.۰ فیصد حصے میں شامل ہے جو ۱۵۰ سے زیادہ کا آئی کیو لیول رکھتے ہیں۔ اس آئی کیو لیول کے ساتھ وہ جو کچھ کر رہا ہے وہ غیر معمولی سہی مگر غیر متوقع نہیں ہے۔" اس غیر ملکی اسکول میں سالار کو جاتے ہوئے ابھی صرف ایک ہفتہ ہوا تھا جب اسکول کے سائیکالوجسٹ نے انہیں سالار سکندر کے مختلف آئی کیو ٹیسٹ کے بارے میں بتایا تھا۔

سکندر عثمان کو آج بھی وہ دن اچھی طرح یاد تھا۔ سالار اس وقت صرف دو سال کا تھا اور غیر معمولی طور پر وہ اس عمر میں ایک عام بچے کی نسبت زیادہ صاف لہجے میں باتیں کرتا تھا اور باتوں کی نوعیت ایسی ہوتی تھی کہ وہ اور ان کی بیوی اکثر حیران ہوتے۔

ایک دن جب وہ اپنے بھائی سے فون پر بات کر رہے تھے تو سالار ان کے پاس کھڑا تھا۔ کچھ دیر بعد انہوں نے فون رکھ دیا۔ ریسیور رکھنے کے فوراً" بعد انہوں نے سالار کو فون کا ریسیور اٹھاتے ہوئے دیکھا۔

"ہیلو انکل! میں سالار ہوں۔" وہ کہہ رہا تھا۔ انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ اطمینان سے ریسیور کان سے لگائے کسی سے باتوں میں مصروف تھا۔

"میں ٹھیک ہوں' آپ کیسے ہیں؟" سکندر نے حیرت سے اسے دیکھا۔ پہلے ان کے ذہن میں یہی آیا کہ وہ جھوٹ موٹ فون پر باتیں کر رہا ہے۔

"پاپا میرے پاس بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے ہیں۔ نہیں' انہوں نے فون نہیں کیا' میں نے خود کیا ہے۔" وہ اس کے اگلے جملے پر چونکے۔

"سالار! کس سے باتیں کر رہے ہو؟" سکندر نے پوچھا۔

"انکل شاہنواز سے۔" سالار نے سکندر کو جواب دیا۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اس سے لے لیا۔ دوسری طرف ان کے بھائی ہی تھے۔

"یہ سالار نے نمبر ڈائل کیا ہے۔" انہوں نے معذرت کرتے ہوئے اپنے بھائی سے کہا۔

"سالار نے کیسے ڈائل کیا' وہ تو بہت چھوٹا ہے۔" ان کے بھائی نے دوسری طرف کچھ حیرانی سے پوچھا۔

"میرا خیال ہے اس نے آپ کا نمبر ری ڈائل کر دیا ہے۔ اتفاق سے ہاتھ لگ گیا ہوگا۔ ہاتھ مار رہا تھا سیٹ

پر۔" انہوں نے فون بند کر دیا اور ریسیور نیچے رکھ دیا۔ ریسیور کے نیچے رکھتے ہی اس نے ایک بار پھر ریسیور اٹھا لیا۔ اس بار سکندر عثمان اسے دیکھنے لگے' وہ بالکل کسی میچور آدمی کی طرح ایک بار پھر شاہنواز کا نمبر ڈائل کر رہا تھا اور بڑی روانی کے ساتھ۔ وہ ایک لمحہ کے لیے دم بخود رہ گئے تھے۔

"سالار! تمہیں شاہنواز کا نمبر معلوم ہے؟" انہوں نے حیرانی کے اس جھٹکے سے سنبھلتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔" بڑے اطمینان سے جواب دیا گیا۔

"تمہیں یہ نمبر کس نے سکھایا؟"

"میں نے خود سیکھا ہے۔"

"کیسے؟"

"ابھی آپ نے ملایا تھا۔" سالار نے ان کو دیکھتے

ہوئے کہا۔

"اچھا میں ایک نمبر ڈائل کرتا ہوں۔ میرے بعد تم یہی نمبر ڈائل کرنا۔" انہوں نے ریسیور اس کے ہاتھ سے لیا۔

"اچھا۔" سالار کو یہ سب ایک دلچسپ کھیل کی طرح لگا۔ سکندر عثمان نے ایک نمبر ملایا اور پھر فون بند کر دیا۔ سالار نے فوراً" ریسیور ان سے پکڑ کر ان ہی کی روانی کے ساتھ وہ نمبر ملایا۔ سکندر عثمان کا سر گھومنے لگا تھا۔ وہ واقعی وہی نمبر تھا جو انہوں نے ملایا تھا۔

دونوں میاں بیوی کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کا بچہ ذہنی اعتبار سے غیر معمولی صلاحیتیں رکھتا ہے۔

"اس بچے کو آپ کی خاص توجہ کی ضرورت ہے' عام بچوں کی نسبت ایسے بچے زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ اگر آپ اس کی اچھی تربیت کرنے میں کامیاب ہو گئے تو یہ بچہ آپ کے اور آپ کے خاندان کے لیے ایک سرمایہ ہوگا۔ نہ صرف خاندان کے لیے بلکہ آپ کے ملک کے لیے بھی۔" سکندر عثمان اور ان کی بیوی اس غیر ملکی سائیکالوجسٹ کی باتیں بڑے فخریہ انداز میں سنتے رہے۔

اپنے دوسرے بچوں کے مقابلے میں وہ سالار کو زیادہ اہمیت دینے لگے تھے۔ وہ ان کی سب سے چہیتی اولاد تھا اور انہیں اس کی کامیابیوں پر فخر تھا۔

سالار ہر لحاظ سے غیر معمولی ثابت ہوا۔ کلاس میں اسے پڑھائی پر توجہ دینے کی ضرورت نہ ہوتی۔ وہ فوٹو گرافک میموری کا مالک تھا۔ کسی چیز کو یاد رکھنے کے لیے صرف ایک نظر ڈال لینا کافی ہوتا۔

اس نے امتحان میں کبھی پیپر دینے کے بعد اس کو دوبارہ چیک نہیں کیا تھا۔ وہ آدھے گھنٹے میں حل کیا جانے والا پیپر صرف آٹھ منٹ میں حل کر لیتا تھا۔ گالف میں اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

وہ ویڈیو گیم میں حیران کن حد تک پوائنٹ اسکور کر لیتا تھا۔ سالار نے اسکول کے ہیڈ بوائے کے انتخاب میں حصہ لیا۔ اس کے مقابلے میں جو لڑکا تھا وہ اسکول کا سب سے اچھا مقرر تھا۔ آدھے گھنٹے تک وہ برٹش لب

ولہجے میں بہترین خطابت کے جوہر دکھاتا رہا۔ تو سب اس سے متاثر نظر آ رہے تھے سالار کی باری آئی تو اس نے بولنا شروع کیا۔

"گڈ مارننگ فرینڈز" وہ ایک لحظہ ٹھہرا "فیضان اکبر یقیناً "ہمارے اسکول کا اثاثہ ہیں۔ میں یا دوسرا کوئی بھی ان کے مقابلے میں کسی اسٹیج پر کھڑا نہیں ہو سکتا۔" اس نے رک کر فیضان کے چہرے کو دیکھا' جہاں ایک فخریہ مسکراہٹ ابھر رہی تھی مگر سالار کا اگلا جملہ۔

"اگر معاملہ صرف باتیں بنانے کا ہو تو۔" فیضان کی مسکراہٹ غائب ہو گئی تھی اور ہال میں ہلکی سی کھلکھلاہٹیں ابھری تھیں۔ سالار کی سنجیدگی برقرار تھی۔

"مگر ایک ہیڈ بوائے اور مقرر میں بہت فرق ہوتا ہے۔ مقرر کو باتیں کرنا ہوتی ہیں' ہیڈ بوائے کو کام کرنا ہوتا ہے۔" ہال تالیوں سے گونجنے لگا تھا۔

"میرے پاس فیضان اکبر جیسے خوب صورت لفظوں کی روانی نہیں ہے۔ میرے پاس صرف میرا نام ہے اور میرا متاثر کن ریکارڈ۔ مجھے صرف اتنا کہنا ہے۔ "مجھ پر اعتماد کریں اور مجھے ووٹ دیں۔" صرف ایک منٹ اور چالیس سیکنڈ میں اس نے فیضان کا تختہ کر دیا تھا۔

جب سوال جواب کا سلسلہ شروع ہوا تو سالار کے نپے تلے انداز نے فیضان کو بالکل چت کر دیا۔ لوگوں کو فیضان کی فصاحت و بلاغت چرب زبانی لگنے لگی۔

"سالار سکندر کو ہیڈ بوائے کیوں ہونا چاہیے؟" سوال۔

"کیونکہ آپ بہترین شخص کا انتخاب چاہتے ہیں۔" جواب آیا۔

"کیا یہ جملہ خود ستائشی نہیں ہے؟" اعتراض کیا گیا۔

"نہیں یہ جملہ خود شناسی ہے۔" جواب دیا گیا۔

"اگر آپ کو ہیڈ بوائے نہ بنایا تو آپ کو کیا فرق پڑے گا؟"

"فرق مجھے نہیں آپ کو پڑے گا۔"

"کیسے۔؟"

"اگر بہترین آدمی کو ملک کا لیڈر نہ بنایا جائے تو فرق قوم کو پڑتا ہے' اس بہترین آدمی کو نہیں۔"

"آپ اپنے آپ کو پھر بہترین آدمی کہہ رہے ہیں۔" ایک بار پھر اعتراض کیا گیا۔

"کیا اس ہال میں کوئی ایسا ہے جو خود کو برے آدمی کے زمرے میں رکھے؟"

"ہو سکتا ہے ہو؟"

"پھر میں اس سے ملنا چاہوں گا۔" ہال میں ہنسی کی آوازیں ابھریں۔

"ہیڈ بوائے بننے کے بعد سالار سکندر کیا تبدیلیاں لائے گا؟"

"تبدیلی بتائی نہیں جاتی دکھائی جاتی ہے اور یہ کام میں ہیڈ بوائے بننے سے پہلے نہیں کر سکتا۔"

مقابلہ ہونے سے پہلے ہی سالار نے یہ مقابلہ جیت لیا تھا۔

کامیابیاں' تعریفیں سالار کو اب کوئی خوشی نہیں دیتی تھیں۔ اسے تلاش تھی اس خوشی کی' اس سرور کی جو دائمی ہو' جو اسے سرشاری کی انتہا تک پہنچا دے۔ سرور کی اس انتہا کی تلاش میں اس نے ہر تجربہ کیا۔

وہ ریڈ لائٹ ایریا میں گیا۔ وہاں گانا' رقص کچھ بھی اسے متاثر نہ کر سکا۔ وہ زندگی میں جو تسکین' جو سرور' جو مدہوشی جو سرشاری چاہتا تھا۔ وہ اسے مل نہیں پا رہی تھی۔ کوئی بھی تجربہ اسے وہ دائمی سرور نہیں دے رہا تھا جس کی اسے جستجو اور تلاش تھی۔

زندگی کے سارے تجربے کرنے کے بعد اس نے موت کا تجربہ کرنے کی کوشش کی۔ پہلی دفعہ اس نے سڑک پر بائیک چلاتے ہوئے ون وے کی خلاف ورزی کی اور بائیک پر سے ہاتھ اٹھا لیے۔ وہ زخمی ہو گیا۔ گھر والے اسے حادثہ سمجھے۔

دوسری بار اس نے لاہور میں خود کو باندھ کر پانی میں ڈوبنے کی کوشش کی۔ ایک بار پھر اسے بچا لیا گیا۔

تیسری بار اس نے خواب آور گولیوں کی بڑی تعداد کو پیس کر کھا لیا۔ اس بار اس کے گھر والے جان گئے

کیونکہ اس نے خانساماں کے سامنے گولیاں پیس کر دودھ میں ڈالی تھیں۔ وہ اسے سائیکالوجسٹ کے پاس لے گئے تو اس نے ایک عجیب بات کی۔

اس نے کہا کہ "زندگی میں کوئی بھی چیز مجھے وہ سرشاری مدہوشی یا خوشی نہیں دیتی جو میں چاہتا ہوں۔ میں نے سوچا اگر میں سرور کی انتہا پر نہیں پہنچ سکتا تو شاید درد کی انتہا پر پہنچ سکوں۔"



جلال انصر سے امامہ بات کرتی ہے لیکن جلال انصر یہ کہہ کر انکار کر دیتا ہے کہ اس طرح اس کے گھر والے راضی نہیں ہیں۔ امامہ اس کے سامنے گڑگڑاتی ہے کہ وہ صرف نکاح کر لے بعد میں اپنے گھر والوں کی مرضی سے دوسری شادی کر سکتا ہے لیکن جلال کسی صورت نہیں مانتا۔ امامہ باپ سے بات کرتی ہے۔ اس کا باپ کہتا ہے کہ اس کی وجہ سے وہ فٹ پاتھ پر آ جائے گا۔ یہ سارا پیسہ اس کو تبلیغ کی وجہ سے ہی ملتا ہے۔

امامہ سالار سے کہتی ہے کہ وہ لاہور جا کر جلال انصر سے ملے اور اس سے کہے کہ امامہ اس گھر سے نکلنا چاہتی ہے وہ اس سے وقتی طور پر نکاح کر لے' تاکہ وہ اس گھر سے نکل سکے۔ وہ اس سے بات نہیں کر سکتی کیونکہ وہ اس کا فون نہیں اٹھا رہا۔

سالار اس سے مل کر امامہ کا پیغام پہنچاتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ آپ خود کیوں نہیں یہ نیک کام انجام دے لیتے۔ سالار کے یہ بتانے پر کہ امامہ اس (جلال انصر) سے محبت کرتی ہے۔ جلال انصر کہتا ہے' عارضی شادی میں یا نکاح میں محبت کا ہونا ضروری نہیں۔ بعد میں آپ بھی اسے طلاق دے دیں۔

جلال انصر اس سے یہ بھی کہہ دیتا ہے کہ وہ آئندہ اس کے پاس نہ آئے اور امامہ سے بھی کہہ دے کہ اس سے رابطہ نہ کرے' جلال انصر سے مایوس ہو کر امامہ سالار سے شادی کی درخواست کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ مجھے صرف کچھ دیر کے لیے تمہاری مدد چاہیے تاکہ نکاح کے بعد تم ہیلف کے ذریعے مجھے یہاں سے نکال لو۔ ہو سکتا ہے یہ جاننے کے بعد کہ میرا نکاح ہو چکا ہے' میرے والدین اسجد سے میری شادی نہ کریں اور میں تم سے طلاق لے کر جلال سے شادی کر سکوں۔"

سالار کو وہ احمقوں کی جنت کی ملکہ لگی۔ مگر اس کی مدد کرنے کے لیے سالار نے اپنے دوست حسن کی مدد لی۔ اسے کچھ رقم دی جس سے اس نے تین گواہوں کا انتظام کر لیا تھا۔ نکاح خواں کو اندازہ تھا کہ اس نکاح میں کوئی غیر معمولی کہانی تھی مگر اسے بھاری رقم کے ساتھ اتنی دھمکیاں بھی دی گئی تھیں کہ وہ خاموش ہو گیا۔

حسن سہ پہر کے وقت اس نکاح خواں اور تینوں گواہوں کو لے آیا تھا۔ سالار امامہ کو پہلے ہی اس بارے میں مطلع کر چکا تھا۔ مقررہ وقت پر فون پر نکاح خواں نے ان دونوں کا نکاح پڑھا دیا تھا۔ سالار نے ملازمہ کے ذریعے امامہ کو پیپرز بجھوا دیے تھے۔ امامہ نے پیپرز لیتے ہی برق رفتاری سے ان پر سائن کر کے ملازمہ کو دے دیے تھے۔

امامہ ایک بار پھر سالار سے کہتی ہے کہ وہ جلال انصر سے ملے۔

"جب وہ نہیں چاہتا تم سے شادی کرنا اور کانٹیکٹ کرنا۔ تو تم کیوں خوار ہو رہی ہو اس کے پیچھے۔"

"کیونکہ میری قسمت میں خواری ہے۔" اس نے دوسری طرف سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"اس کا کیا مطلب ہے؟" وہ الجھا۔

"کوئی مطلب نہیں ہے۔ نہ تم سمجھ سکتے ہو۔ تم بس اس سے جا کر کہو کہ میری مدد کرے۔ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہی مجھ سے شادی کر لے۔"

امامہ کو اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا باپ اسے طلاق دلوا کر اسجد سے شادی کر دے گا۔ تو وہ گھر سے فرار ہونے کا فیصلہ کرتی ہے اور دیوار پھلانگ کر سالار کے پاس پہنچ جاتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ وہ اسے لاہور

چھوڑ دے۔

سالار اسے اپنی گاڑی میں لاہور لے جاتا ہے اور اس سے جھوٹ بولتا ہے کہ جلال انصر شادی کرچکا ہے۔

راستے میں سالار امامہ سے کہتا ہے کہ وہ عجیب و غریب حرکتیں کررہی ہے۔ جواباً" امامہ اس سے کہتی ہے تمہاری حرکتیں اس سے زیادہ عجیب و غریب ہیں۔ اس کا اشارہ سالار کی خودکشی کی کوششوں کی طرف ہوتا ہے۔ سالار کہتا ہے کہ وہ تجربہ کررہا ہے وہ جاننا چاہتا ہے اس سے آگے کیا ہے۔

"معتوب اور مغضوب ہونے کے بعد باقی کیا بچتا ہے 'جسے جاننے کا تمہیں تجسس ہے۔" سالار کے مذاق اڑانے پر اس نے کہا۔

"ایک وقت آئے گا جب تمہیں ہر چیز کی سمجھ آجائے گی 'پھر تمہاری ہنسی ختم ہو جائے گی۔ تب تمہیں خوف آنے لگے گا موت سے بھی اور دوزخ سے بھی۔۔۔ اللہ تمہیں سب کچھ دکھا اور بتادے گا۔"

راستے میں ایک جگہ سالار گاڑی روکتا ہے تو امامہ اس سے کہتی ہے کہ وہ نماز پڑھنا چاہتی ہے۔ اسے وضو کرنا ہے۔

سالار نے اسے وضو کرایا۔ تب پہلی بار سالار نے اس کے ہاتھوں کو کہنیوں تک دیکھا۔ اس کی گردن میں سونے کی چین اور اس میں لٹکنے والے موتی کو بھی اس نے پہلی بار دریافت کیا تھا۔ سالار اسے لاہور کی حدود میں داخل ہو کر بس اسٹاپ پر چھوڑ دیتا ہے۔

امامہ کے گھر والوں کو سالار پر شبہ ہے لیکن سالار نے اتنی صفائی سے یہ کارنامہ انجام دیا تھا کہ پولیس میں رپورٹ اور پولیس کی تفتیش کے باوجود وہ کوئی ثبوت نہ فراہم کرسکے۔

اس کے بعد امامہ سالار کو فون کرکے طلاق مانگتی ہے۔ سالار اسے تنگ کرنے کے لیے طلاق دینے سے انکار کردیتا ہے۔

☼ ☼ ☼

اسلام آباد کی ایک تاریک رات سالار کی زندگی کا رخ بدل دیتی ہے۔ اس رات اسے پہلی بار خوف محسوس ہوتا ہے۔

موت سے 'قبر سے 'دوزخ سے۔

اسے امامہ ہاشم یاد آئی تھی۔ اس کا عشق یاد آیا تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تھا۔ اسے امامہ کی بے بسی' خوف اور تکلیف یاد آئی تھی جو اس کے طلاق نہ دینے پر اس نے محسوس کی ہوگی۔ اسے امامہ کے جملے یاد آئے تھے۔

"تم سمجھتے ہو 'میں تمہارے جیسے انسان کے ساتھ زندگی گزارنے پر تیار ہو جاؤں گی۔ ایک ایسے شخص کے ساتھ جو ختم نبوت پر یقین رکھتا ہے اور پھر بھی گناہ کرتا ہے 'جو ہر وہ کام کرتا ہے جس سے میرے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا۔"

سالار امریکا چلا جاتا ہے۔ وہاں اسلامک سینٹر میں اس کی ملاقات خالد عبدالرحمان سے ہوتی ہے جو اسے قرآن حفظ کرنے کو کہتا ہے۔ سالار بہت مختصر عرصہ میں قرآن حفظ کرلیتا ہے۔

اور ایم بی اے مکمل کرنے کے بعد وہ حج کا فریضہ بھی ادا کرتا ہے لیکن اسے تاریکی سے اب بھی خوف آتا ہے۔ وہ لائٹس آف کرکے نہیں سوسکتا۔ سلیپنگ پلز کے بغیر وہ سو نہیں سکتا۔

سالار یونیسف میں جاب کرلیتا ہے۔ اپنی بہن انیتا کی شادی میں شرکت کرنے کی غرض سے پاکستان آتا ہے تو فلائٹ کے دوران اس کی ملاقات ڈاکٹر فرقان سے ہوتی ہے۔ فرقان پاکستان میں فلاحی کام کرتا ہے۔ وہ سالار کو بھی پاکستان آنے کو کہتا ہے۔ سالار پاکستان آجاتا ہے اور ایک گاؤں میں فلاحی سرگرمیاں شروع کردیتا ہے۔ فرقان کے توسط سے ہی اس کی ملاقات ڈاکٹر سبط علی سے ہوتی ہے۔ وہ ایک عالم دین ہیں جو بڑے مدلل انداز میں سالار کے ذہن کی گتھیاں سلجھاتے ہیں سالار کے ذہن پر امامہ مسلط تھی۔ وہ اسے بھول نہیں پایا تھا۔

مختلف حالات سے گزرتی امامہ ڈاکٹر سبط علی کے پاس پہنچ گئی تھی۔ امامہ ہاسٹل میں رہ رہی تھی اور وہ عجیب زندگی تھی۔ بعض دفعہ اسے اسلام آباد میں اپنا گھر اور خاندان کے لوگ اتنی شدت سے یاد آتے کہ اس کا دل چاہتا وہ بھاگ کر ان کے پاس چلی جائے۔ بعض دفعہ وہ بغیر کسی وجہ کے رونے لگتی۔ بعض دفعہ اس کا دل چاہتا وہ جلال انصر سے رابطہ کرے۔ اسے وہ بے تحاشا یاد آتا۔ وہ بی ایس سی کررہی تھی۔

"میڈیکل کالج۔۔۔ ڈاکٹر" اس کے لیے بہت عرصے تک یہ دونوں الفاظ نشتر بنے رہے۔ کئی بار وہ اپنے ہاتھ کی لکیروں کو دیکھ کر حیران ہوتی رہتی۔ آخر وہاں کیا تھا' جو ہر چیز کو مٹھی کی ریت بنا رہا تھا۔ کئی بار اسے جویریہ سے کی جانے والی اپنی باتیں یاد آتیں۔

"میں اگر ڈاکٹر نہیں بن سکی تو میں تو زندہ ہی نہیں رہ سکوں گی۔ میں مرجاؤں گی۔"

وہ حیران ہوتی ہے وہ مری نہیں تھی۔ اسی طرح زندہ تھی۔

"پاکستان کی سب سے مشہور آئی اسپیشلسٹ؟"

سب کچھ ایک خواب ہی رہا تھا۔ وہ ہر چیز جو اس کے اتنے پاس تھی۔ اب اتنی دور تھی۔

اس کے پاس گھر نہیں تھا۔

اس کے پاس گھر والے نہیں تھے۔

اس کے پاس اسجد نہیں تھا۔

میڈیکل کی تعلیم نہیں تھی۔

جلال بھی نہیں تھا۔

وہ زندگی کی ان آسائشوں سے ایک ہی جھٹکے میں محروم ہوگئی تھی جن کی وہ بچپن سے عادی تھی اور اس کے باوجود وہ زندہ تھی۔ امامہ کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس قدر بہادر تھی یا بھی ہو سکتی تھی مگر وہ ہوگئی تھی۔

☼ ☼ ☼

ملتان میں اپنے قیام کے دوران بھی اس نے سالار سکندر کو کبھی اپنے ذہن سے فراموش نہیں کیا تھا۔ تعلیم کا سلسلہ باقاعدہ طور پر شروع کرنے کے بعد وہ ایک بار اس سے رابطہ کرنا چاہتی تھی اور اگر وہ پھر اسے طلاق دینے سے انکار کردیتا تو وہ اب بالآخر ڈاکٹر سبط علی کو اس تمام معاملے کے بارے میں بتا دینا چاہتی تھی۔

محفوظ رہنے کے لیے امامہ ڈاکٹر سبط کے کہنے پر اپنا نام آمنہ رکھ لیتی ہے اور تعلیمی اسناد میں بھی اپنا نام آمنہ درج کرواتی ہے۔

اس نے سالار کے گھر کا نمبر ڈائل کیا۔ کچھ دیر تک بیل ہوتی رہی 'پھر فون اٹھالیا گیا۔

"ہیلو۔۔۔!"

بولنے والا کوئی مرد تھا اور وہ سالار نہیں تھا۔ یہ وہ آواز سنتے ہی جان گئی تھی۔

"میں سالار سکندر سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"آپ امامہ ہاشم ہیں؟"

"جی۔۔۔" دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔

"آپ ان سے میری بات کروادیں۔"

"یہ ممکن نہیں ہے۔" دوسری طرف سے اس مرد نے کہا۔

"کیوں؟"

"سالار زندہ نہیں ہے۔"

"وہ مرگیا؟" امامہ یہ جان کر سکون کا سانس لیتی ہے۔

اب اسے ڈاکٹر سبط علی کو کچھ بھی بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ صحیح معنوں میں آزاد ہو چکی تھی۔

امامہ تعلیم مکمل کرکے جاب کرلیتی ہے۔ ایک بار پھر وہ جلال انصر کے سامنے ہوتی ہے۔ جلال انصر کی بیوی اسے چھوڑ چکی ہے۔ امامہ ایک بار پھر اپنی درخواست دہراتی ہے لیکن جلال انصر اس بار بھی صاف انکار کردیتا ہے۔ امامہ اپنی شادی کا اختیار ڈاکٹر سبط علی کو دے دیتی ہے۔ وہ اس کا رشتہ طے کردیتے ہیں لیکن تقدیر کو کچھ اور ہی منظور ہے۔ عین وقت پر وہ لڑکا جس سے وہ شادی طے کرتے ہیں' شادی کرنے سے انکار کردیتا ہے۔

ڈاکٹر سبط علی' سالار سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ آمنہ سے شادی کرے اور وہ جو اب تک امامہ کی تلاش میں تھا۔ خود کو کہنے سے روک نہیں پایا۔ آپ جیسا

چاہیں گے ' ویسا ہی ہو گا! آپ مجھ سے درخواست نہ کریں ، حکم دیں۔ نکاح کے وقت امامہ سالار سکندر کا نام سن کر چونکی ہے اور کہتی ہے۔

"میں نے نکاح کر لیا ہے مگر میں آج رخصتی نہیں چاہتی۔" اور جب ڈاکٹر سبط علی سے ملاقات ہوتی ہے تو وہ صاف کہہ دیتی ہے۔

"میں سالار سے طلاق لینا چاہتی ہوں۔"

وہ ڈاکٹر سبط علی کو سالار کے ماضی کے بارے میں بتاتی ہے اور یہ بھی کہ اس سے اس کا کیا تعلق رہا ہے۔

"میں نے اس کے ساتھ زندگی نہیں گزارنی۔ میں نے اس کے ساتھ نہیں رہنا۔" وہ اب بھی اپنی بات پر مصر تھی۔ "مجھے حق ہے کہ میں اس شخص کے ساتھ نہ رہوں۔"

"لیکن اللہ یہ کیوں کر رہا ہے کہ اس شخص کو بار بار آپ کے سامنے لا رہا ہے۔ دو دفعہ آپ کا نکاح ہوا اور دونوں دفعہ اسی آدمی سے۔" ڈاکٹر سبط علی نے کہا۔

"آمنہ! میں آپ کو مجبور نہیں کروں گا۔ آپ ایک بار سالار سے مل لیں۔ پھر بھی اگر آپ کا یہی مطالبہ ہوا تو میں آپ کی بات مان لوں گا۔" ڈاکٹر سبط علی بے حد سنجیدہ تھے۔

اسی وقت ملازم نے آکر سالار کے آنے کی اطلاع دی۔ ڈاکٹر سبط علی نے اپنی گھڑی پر ایک نظر دوڑائی اور ملازم سے کہا۔

"انہیں اندر لے آؤ۔" امامہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"آپ نے ابھی تک اسے دیکھا نہیں ہے۔ آپ اسے دیکھ لیں۔" انہوں نے دھیمے لہجے میں اس سے کہا۔

"یہاں نہیں ، میں اندر کمرے میں سے اس کو دیکھ لوں گی۔"

وہ پلٹ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ادھ کھلے دروازے سے لاؤنج سے آنے والی روشنی اتنی کافی نہیں تھی کہ کمرے کے اندر اچھی طرح سے دیکھا جا سکتا۔ وہ اپنے بیڈ پر آکر بیٹھ جاتی ہے۔

وہ جہاں بیٹھی تھی وہاں سے وہ لاؤنج کو بخوبی دیکھ سکتی تھی۔ نو سال کے بعد اس نے ادھ کھلے دروازے سے لاؤنج میں اس شخص کو نمودار ہوتے دیکھا ' جسے ایک طویل عرصہ پہلے مردہ سمجھ چکی تھی۔ جس سے زیادہ نفرت اور گھن اسے کبھی کسی سے محسوس نہیں ہوئی تھی ' جسے وہ بدترین لوگوں میں سے سمجھتی تھی اور جس کے نکاح میں وہ پچھلے کئی سالوں سے تھی۔

تقدیر کیا اس کے علاوہ کسی اور چیز کو کہتے ہیں؟

ڈاکٹر سبط علی اس سے گلے مل رہے تھے۔ اس نے معانقہ کرنے سے پہلے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پھول اور ایک پیکٹ سینٹر ٹیبل پر رکھا تھا۔ معانقے کے بعد وہ صوفے پر بیٹھ گیا اور تب پہلی بار امامہ نے اس کا چہرہ دیکھا۔

کھلا گریبان ' گلے میں لٹکتی زنجیریں ' ہاتھوں میں لٹکتے بینڈز ' ربربینڈ میں بندھے بالوں کی پونی ' وہاں ایسا کچھ نہیں تھا۔ وہ کریم کلر کے ایک سادہ شلوار سوٹ پہ واسکٹ پہنے ہوئے تھا۔

"ہاں ظاہری طور پر بہت بدل گیا ہے۔" اسے دیکھتے ہوئے اس نے سوچا۔ اسے دیکھ کر کوئی بھی یقین نہیں کر سکتا کہ یہ بھی۔۔۔

اس کی سوچ کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اور وہ ڈاکٹر سبط علی کے استفسار پر انہیں امامہ کے ساتھ ہونے والے اپنے نکاح کے بارے میں بتا رہا تھا۔ وہ اپنے پچھتاوے کا اظہار کر رہا تھا۔ کس طرح اس نے جلال کی شادی کے بارے میں اس سے جھوٹ بولا۔ کس طرح اس نے طلاق کے بارے میں اس سے جھوٹ بولا۔

"میں اس کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ اتنی تکلیف کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔ وہ میرے ذہن سے نکلتی ہی نہیں۔" وہ دھیمے لہجے میں ڈاکٹر سبط علی کو بتا رہا تھا۔

"بہت عرصے تو میں ابنارمل رہا۔ اس نے مجھ سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے مدد مانگی تھی۔ یہ کہہ کر کہ میں ایک مسلمان ہوں۔ ختم نبوت پر یقین رکھنے والا مسلمان۔ میں دھوکا نہیں دوں گا اسے اور میری پستی کی انتہا دیکھیں کہ میں نے اسے دھوکا دیا۔

یہ جاننے کے باوجود کہ وہ میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قدر محبت کرتی ہے کہ سب کچھ چھوڑ کر گھر سے نکل آئی اور میں اس کا مذاق اڑاتا رہا۔ اسے پاگل سمجھتا اور کہتا رہا۔ جس رات میں اسے لاہور چھوڑنے آیا تھا۔ اس نے مجھ سے راستے میں کہا تھا کہ ایک دن مجھے ہر چیز کی سمجھ آجائے گی۔ تب مجھے اپنی اوقات کا پتا چل جائے گا۔"

وہ عجیب سے انداز میں ہنسا تھا۔ "اس نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ مجھے واقعی ہر چیز کی سمجھ آگئی۔ اتنے سالوں میں ' میں نے اللہ سے اتنی دعا اور توبہ کی ہے کہ..."

وہ بات کرتے کرتے رک گیا۔ امامہ نے اسے سینٹر ٹیبل کے شیشے کے کنارے پر اپنی انگلی پھیرتے دیکھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ آنسو ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"بعض دفعہ مجھے لگتا تھا کہ شاید میری دعا اور توبہ قبول ہو گئی۔" وہ رکا۔

"مگر اس دن ۔۔۔ میں آمنہ کے ساتھ نکاح کے کاغذات پر دستخط کر رہا تھا تو مجھے اپنی اوقات کا پتا چل گیا۔ میری دعا اور توبہ کچھ بھی قبول نہیں ہوئی۔ ایسا ہوتا تو مجھے امامہ ملتی ' آمنہ نہیں۔ میری خواہش دیکھیں میں نے اللہ سے کیا مانگا۔ ایک ایسی لڑکی جسے کسی اور سے محبت ہے ' وہ جو مجھے اسفل السافلین سمجھتی ہے ' جسے میں نو سال سے ڈھونڈ رہا ہوں مگر اس کا کچھ پتا نہیں ہے۔

ولیوں جیسی اور ولیوں جیسی عبادت کرتا تو شاید اللہ میرے لیے یہ معجزے کر دیتا ' میرے جیسے آدمی کے لیے ۔۔۔ میری اوقات تو یہ ہے کہ لوگ خانہ کعبہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر بخشش مانگتے ہیں۔ میں وہاں کھڑا ہو کر بھی اسے ہی مانگتا رہا۔ شاید اللہ کو یہی برا لگا۔"

امامہ کے جسم سے ایک کرنٹ گزرا تھا۔ ایک جھماکے کی طرح وہ خواب اسے یاد آیا تھا۔

"میرے اللہ!" اس نے اپنے دونوں ہاتھ ہونٹوں پر رکھ لیے۔ وہ بے یقینی سے سالار کو دیکھ رہی تھی۔ وہ خواب میں اس شخص کا چہرہ نہیں دیکھ سکی تھی۔ "کیا وہ یہ شخص تھا ' یہ جو میرے سامنے بیٹھا ہے۔ یہ آدمی۔۔۔؟"

اس نے تب خواب میں اس آدمی کو جلال سمجھا تھا۔ مگر اسے یاد آیا تھا۔ جلال دراز قد نہیں تھا ' وہ آدمی دراز قد تھا۔ سالار سکندر دراز قد ہے۔ اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ جلال کی رنگت گندمی تھی۔ اس آدمی کی رنگت صاف تھی۔ سالار سکندر کی رنگت صاف ہے۔ اس نے خواب میں اس آدمی کے کندھے پر ایک تیسری چیز بھی دیکھی تھی۔ وہ تیسری چیز؟

اس نے کانپتے ہاتھوں سے اپنے چہرے کو مکمل طور پر ڈھانپ لیا۔

وہ معجزوں کے نہ ہونے کی باتیں کر رہا تھا اور۔۔۔ اندر ڈاکٹر سبط علی خاموش تھے۔ وہ کیوں خاموش تھے۔ یہ صرف وہ اور امامہ جانتے تھے۔ سالار سکندر نہیں۔

امامہ نے اپنی آنکھیں رگڑیں اور چہرے سے ہاتھ ہٹا دیے۔ اس نے ایک بار پھر بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ اس شخص کو دیکھا۔

نہ وہ ولی تھا ' نہ درویش ۔۔۔ صرف سچے دل سے توبہ کرنے والا ایک شخص تھا۔ اسے دیکھتے ہوئے اسے پہلی بار احساس ہوا کہ جلال اور اس کے درمیان کیا چیز آکر کھڑی ہو گئی تھی۔ جس نے اتنے سالوں میں جلال کے لیے اس کی ایک بھی دعا قبول نہیں ہونے دی۔ کون سی چیز آخری وقت میں فہد کی جگہ اس کو لے آئی تھی۔

اس شخص میں کوئی نہ کوئی بات تو ایسی ہو گی کہ اس کی دعائیں قبول ہوئیں ' میری نہیں۔ ہر بار مجھے پلٹا کر اسی کی طرف بھیجا گیا۔

اس نے نم آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھتے ہوئے سوچا۔ اس نے ڈاکٹر سبط علی کو اسے صالح آدمی کہتے سنا۔ وہ اسے صالح قرار نہ بھی دیتے تب بھی وہ اسے صالح ماننے پر مجبور تھی۔

اس کے پاس جو گواہی تھی وہ دنیا کی ہر گواہی سے بڑھ کر تھی۔ اسے کیا "چنا" دیا گیا تھا ' اسے کیا "چنا" دیا گیا تھا۔ وہ جانتی تھی۔۔۔ صرف وہی جان سکتی تھی۔

☆

پیر کامل سے آبِ حیات تک ...

"آبِ حیات" پیر کامل کا دوسرا حصہ ہے ... وہ حصہ جسے میں 2004ء میں اپنی گوناگوں مصروفیات کے باعث لکھ نہیں پائی تھی اور جسے میں نے کچھ سال بعد لکھنے کا فیصلہ اس لیے بھی کیا تھا کیونکہ میں چاہتی تھی پیر کامل کی کامیابی کی گرد اور بازگشت دونوں تھم جائیں اور میں تب اس کہانی کا اگلا حصہ کسی نفسیاتی دباؤ کے بغیر لکھوں۔

سالار سکندر اور امامہ ہاشم کی زندگی کا پہلا حصہ آپ نے دس سال پہلے پڑھ لیا۔ ان کی زندگی کا دوسرا حصہ آپ اس ناول میں پڑھ سکیں گے۔ پیر کامل اور آبِ حیات ایک ہی تحریر کی دو کڑیاں ہیں اور یہ وہ تحریر ہے' جسے میں نے داد و تحسین کے لیے نہ 2003ء میں لکھا تھا نہ ہی آج اس کی تمنا ہے۔ خواہش صرف اتنی تھی کہ کاغذ پر بے مقصد الفاظ کا ڈھیر لگاتے لگاتے کچھ ایسے لفظ بھی لکھوں جس سے کوئی گمراہی کے راستے پر جاتے جاتے رک جائے ... نہ بھی رکے تو سوچ میں ضرور پڑے۔ خواہش کوشش آج بھی بس اتنی ہی ہے۔

پیر کامل کا دوسرا حصہ لکھنا کیوں ضروری تھا؟

اسے لکھنے کے مقاصد کیا ہیں؟

ان دو سوالوں کا جواب آپ کو "آبِ حیات" ہی دے سکتا ہے۔ اس ناول کو میں نے 2010ء میں مکمل کر لیا تھا لیکن اس کے بعد یہ کئی بار نظرثانی کے مراحل سے گزرا۔ ابھی آپ کے ہاتھوں تک پہنچتے ہوئے یہ ایک بار پھر میرے قلم کی قطع و برید کا شکار ہوگا۔ کوشش ہے' جو بات آپ تک پہنچے وہ غیر مبہم' سادہ اور آسان ہو۔

اس ناول کا تعارفی حصہ "تاش" آپ اس ماہ پڑھ سکیں گے۔ آبِ حیات کی کہانی تاش کے ان 13 شفلڈ (Shuffled) پتوں میں بٹی ہے یا چھپی ہے؟

کون سا پتا عروج ہے؟ کون سا زوال؟

کس پتے کو پہلے آنا چاہیے؟ کس کو بعد میں ... اور کون سا پتا ترپ کا پتا ہے ...؟ جس کے مل جانے پر ہر بازی کا فیصلہ ہو جاتا ہے ...

ان سب سوالوں کا جواب بھی آپ کو "آبِ حیات" پڑھ کر ہی مل پائے گا۔

لفظ "آبِ حیات" جن چھ حروف سے مل کر بنا ہے۔ ان میں سے ہر حرف انسانی زندگی کی ایک بنیادی اسٹیج کو بیان کرتا ہے۔

آ : آدم و حوا

ب : بیت العنکبوت

ح : حاصل و محصول

ی : یا مجیب السائلین

ا : ابداً ابدا

ت : تبارک الذی

یہ چھ لفظ پوری انسانی زندگی کا خلاصہ کرتے ہیں۔

سالار اور امامہ آبِ حیات میں وہی سفر طے کرتے ہیں جو ہم سب کی زندگی کا سفر ہے۔

آدم و حوا کا ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو کر زندگی بھر کا ساتھی بن جانا ...

دنیا میں اس جنت جیسا گھر بنانے کی خواہش اور سعی میں جت جانا جہاں سے وہ دونوں نکالے گئے تھے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان کا گھر بیت العنکبوت (مکڑی کا جالا) جیسی ناپائیداری رکھتا ہے۔ جو بننے میں عرصہ لیتا ہے' ٹوٹنے میں لمحے ...

اور پھر حاصل و محصول کا چکر۔ کیا کھویا کیا پایا؟ کیا پانے کے لیے کیا کیا کھویا؟ کامیابی' خواب' خواہشات' تمناؤں کا ایک گرداب۔ جو زندگی کو گھن چکر بنا دیتا ہے۔

اور پھر اس کے بعد اگلا مرحلہ جہاں آزمائشیں ہوتی ہیں ... اتنی اور ایسی ایسی آزمائشیں کہ بس اللہ یاد آتا ہے' اور وہی کام آتا ہے کیونکہ وہ مجیب السائلین ہے۔

اور پھر وہ مرحلہ جب انسان اپنی اگلی نسل کے ذریعے اپنے عروج کا دوام چاہتا ہے اور اسے احساس ہوتا ہے کہ اس زندگی کو زوال ہے۔ صرف ابدی زندگی ہے جو لافانی ہے ...

اور پھر وہ جو زندگی کے ان سارے مرحلوں میں سے نکل آتے ہیں۔ مومن بن کے انسانی پستیوں سے نکل کے ان کے لیے تبارک الذی ... اللہ کی ذات جو تمام خوبیوں کی مالک ہے۔ بزرگ و برتر ہے اور اپنے بندوں کو سب کچھ عطا کرنے پر قادر ہے ... جس کی محبت "آبِ حیات" ہے۔ جو انسان کو ابدی جنتوں میں لے جاتا ہے ... دنیا ختم ہوتی ہے' زندگی نہیں۔

چند الفاظ آپ سب کے لیے۔

آپ سے ملنے والی عزت اور محبت وہ بیج ہے جس سے میری ہر تحریر پھوٹتی ہے ... آپ سب کا بہت شکریہ۔ میں آپ کی داد و ستائش کا بدلہ نہ پہلے دے سکی ... نہ اب دے سکتی ہوں۔

اور آخر میں ادارے کا اور خاص طور پر امتل کا شکریہ' جن کی کوششوں سے اس ناول کی اشاعت خواتین ڈائجسٹ میں سات سال کے بعد ممکن ہو رہی ہے۔

عمیرہ احمد



آبِ حیات

عمیرہ احمد





تاش

2

اس نے دور سے سالار کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں سوفٹ ڈرنک کا ایک گلاس تھا۔
"تم یہاں کیوں آکر بیٹھ گئیں؟" امامہ کے قریب آتے ہوئے اس نے دور سے کہا۔
"ایسے ہی۔ شال لینے آئی تھی۔ پھر یہیں بیٹھ گئی۔" وہ مسکرائی۔ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے سالار نے



سوفٹ ڈرنک کا گلاس اپنی ٹانگوں کے درمیان نچلی سیڑھی پر رکھ دیا۔ امامہ لکڑی کے ستون سے ٹیک لگائے ایک گھٹنے پر کھانے کی پلیٹ ٹکائے کھاتے ہوئے دور لان میں ایک کینوپی کے نیچے اسٹیج پر بیٹھے گلوکار کو دیکھ رہی تھی جو نئی غزل شروع کرنے سے پہلے سازندوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ سالار نے کانٹا اٹھا کر اس کی پلیٹ سے کباب کا ایک ٹکڑا اپنے منہ میں ڈالا۔ وہ بھی اب گلوکار کی طرف متوجہ تھا جو اپنی نئی غزل شروع کر چکا تھا۔

"انجوائے کر رہی ہو؟" سالار نے اس سے پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے مسکرا کر کہا وہ غزل سن رہی تھی۔

کسی کی آنکھ پرنم ہے، محبت ہوگئی ہوگی
زباں پہ قصۂ غم ہے، محبت ہوگئی ہوگی

وہ بھی غزل سننے لگا تھا۔

کبھی ہنسنا کبھی رونا، کبھی ہنس ہنس کر رو دینا
عجب دل کا یہ عالم ہے، محبت ہوگئی ہوگی

"اچھا لگ رہا ہے۔" امامہ نے ستائشی انداز میں کہا۔ سالار نے کچھ کہنے کے بجائے سر ہلا دیا۔

اولاد کی پرسنل اور پرائیویٹ لائف تک ان کے پاس ہر چیز کی تفصیلات تھیں۔

لیکن سارا مسئلہ یہ تھا کہ ڈیڑھ ماہ کی اس محنت اور پوری دنیا سے اکٹھے کیے ہوئے اس ڈیٹا میں سے وہ ایسی کوئی چیز نہیں نکال سکے تھے جس سے اس کی کردار کشی کر سکتے۔

وہ ٹیم جو پندرہ سال سے اسی طرح کے مقاصد پر کام کرتی رہی تھی ' یہ پہلی بار تھا کہ وہ اتنی سر توڑ محنت کے باوجود اس شخص اور اس کے گھرانے کے کسی شخص کے حوالے سے کسی قسم کا بری حرکت یا ناشائستہ عمل کی نشان دہی نہیں کر پائی تھی۔ دو سو پوائنٹس کی وہ چیک لسٹ جو انہیں دی گئی تھی ' وہ دو سو کراسز سے بھری ہوئی تھی اور یہ ان سب کی زندگی میں پہلی بار ہو رہا تھا۔ انہوں نے ایسا صاف ریکارڈ کسی کا نہیں دیکھا تھا۔

کسی حد تک ستائش کے جذبات رکھنے کے باوجود وہ ایک آخری کوشش کر رہے تھے۔ ایک آخری کوشش۔۔۔ کرے کے ایک بورڈ سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے بورڈ تک جاتے جاتے وہ آدمی اس کے شجرہ نسب کی اس تصویر پر رکا تھا۔ اس تصویر کے آگے کچھ اور تصویریں تھیں اور ان کے ساتھ کچھ بلٹ پوائنٹس۔۔۔ ایکدم جیسے بجلی کا سا جھٹکا لگا تھا۔ اس نے اس لڑکی کی تصویر کے نیچے اس کی تاریخ پیدائش دیکھی پھر مڑ کر ایک کمپیوٹر کے سامنے بیٹھے ہوئے آدمی کو وہ سال بتاتے ہوئے کہا۔

"دیکھو! یہ اس سال کہاں تھا؟"

کمپیوٹر پر بیٹھے ہوئے آدمی نے چند منٹوں کے بعد اسکرین دیکھتے ہوئے کہا۔

"پاکستان میں۔" اس شخص کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آئی تھی۔

"کب سے کب تک؟" اس آدمی نے اگلا سوال کیا۔ کمپیوٹر کے سامنے بیٹھے ہوئے آدمی نے تاریخیں بتائیں۔

"آخر کار ہمیں کچھ مل ہی گیا۔" اس آدمی نے بے اختیار ایک سیٹی بجاتے ہوئے کہا تھا۔ انہیں جہاز ڈبونے کے لیے تارپیڈو مل گیا تھا۔

یہ پندرہ منٹ پہلے کی روداد تھی۔ پندرہ منٹ بعد اب وہ جانتا تھا کہ اسے اس آتش فشاں کا منہ کھولنے کے لیے کیا کرنا تھا۔

J

♠

وہ یہاں کسی جذباتی ملاقات کے لیے نہیں آئی تھی۔۔۔ سوال و جواب کے کسی لمبے چوڑے سیشن کے لیے بھی نہیں۔۔۔ لعنت و ملامت کے کسی منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بھی نہیں۔۔۔ وہ یہاں کسی کا ضمیر جھنجوڑنے آئی تھی ' نہ ہی کسی سے نفرت کا اظہار کرنے کے لیے۔۔۔ نہ ہی وہ کسی کو یہ بتانے آئی تھی کہ وہ اذیت کے ماؤنٹ ایورسٹ پر کھڑی ہے۔۔۔ نہ ہی وہ اپنے باپ کو گریبان سے پکڑنا چاہتی تھی۔۔۔ نہ اسے یہ بتانا چاہتی تھی کہ اس نے اس کی زندگی تباہ کر دی تھی۔۔۔ اس کے صحت مند ذہن اور جسم کو ہمیشہ کے لیے مفلوج کر دیا تھا۔

وہ یہ سب کچھ کہتی۔۔۔ یہ سب کچھ کرتی ' اگر اسے یقین ہوتا کہ یہ سب کرنے کے بعد اسے سکون مل جائے گا۔ اس کا باپ احساس جرم یا پچھتاوے جیسی کوئی چیز پالنے لگے گا۔

پچھلے کئی ہفتے سے وہ آبلہ پا تھی۔ وہ راتوں کو سکون آور گولیاں لیے بغیر سو نہیں پا رہی تھی اور اس سے بڑھ کر تکلیف دہ چیز یہ تھی کہ وہ سکون آور ادویات لینا نہیں چاہتی تھی۔۔۔ وہ سونا نہیں چاہتی تھی۔۔۔ وہ سوچنا چاہتی تھی اس بھیانک خواب کے بارے میں ' جس میں وہ چند ہفتے پہلے داخل ہوئی تھی اور جس سے اب وہ ساری زندگی نہیں نکل سکتی تھی۔

وہ یہاں آنے سے پہلے پچھلی پوری رات روتی رہی تھی۔ یہ بے بسی کی وجہ سے نہیں تھا۔ یہ اذیت کی وجہ سے بھی نہیں تھا۔ یہ اس غصے کی وجہ سے تھا جو وہ اپنے باپ کے لیے اپنے دل میں اتنے دنوں سے محسوس کر رہی تھی۔ ایک آتش فشاں تھا یا جیسے کوئی الاؤ ' جو اس کو اندر سے سلگا رہا تھا ' اندر سے جلا رہا تھا۔

کسی سے پوچھے ' کسی کو بتائے بغیر یوں اٹھ کر وہاں آجانے کا فیصلہ جذباتی تھا ' احمقانہ تھا اور غلط تھا۔۔۔ اس نے زندگی میں پہلی بار ایک جذباتی ' احمقانہ اور غلط فیصلہ بے حد سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ ایک اختتام چاہتی تھی وہ اپنی زندگی کے اس باب کے لیے ' جس کے بغیر وہ آگے نہیں بڑھ سکتی تھی اور جس کی موجودگی کا انکشاف اس کے لیے دل دہلا دینے والا تھا۔

اس کا ایک ماضی تھا۔ وہ جانتی تھی لیکن اسے کبھی یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس کے ماضی کا "ماضی" بھی ہو سکتا تھا۔ ایک وقعہ کا ذکر تھا جب وہ "خوش" تھی اپنی زندگی میں۔۔۔ جب وہ خود کو باسعادت سمجھتی تھی۔ اور "مقرب" سے "ملعون" ہونے کا فاصلہ اس نے چند سیکنڈز میں طے کیا تھا۔ چند سیکنڈز شاید زیادہ وقت تھا۔۔۔ شاید اس سے بھی بہت کم وقت تھا جس میں وہ احساس کمتری ' احساس محرومی ' احساس ندامت اور ذلت و بدنامی کے ایک ڈھیر میں تبدیل ہوئی تھی۔

اور یہاں وہ اس ڈھیر کو دوبارہ وہی شکل دینے آئی تھی۔۔۔ اس بوجھ کو اس شخص کے سامنے اتار پھینکنے آئی تھی ' جس نے وہ بوجھ اس پر لادا تھا۔۔۔ زندگی

کسی کو اس وقت یہ پتا نہیں تھا کہ وہ وہاں تھی۔۔۔ کسی کو پتا ہوتا تو وہ وہاں آ ہی نہیں سکتی تھی۔۔۔ اس کا سیل فون پچھلے کئی گھنٹوں سے آف تھا۔ وہ چند گھنٹوں کے لیے خود کو اس دنیا سے دور لے آئی تھی ' جس کا وہ حصہ تھی۔ اس دنیا کا حصہ ' یا پھر اس دنیا کا حصہ جس میں وہ اس وقت موجود تھی۔۔۔؟ یا پھر اس کی کوئی بنیاد نہیں تھی۔۔۔؟ وہ کہیں کی نہیں تھی۔۔۔ اور جہاں کی تھی ' جس سے تعلق رکھتی تھی ' اس کو اپنا نہیں سکتی تھی۔

انتظار لمبا ہو گیا تھا۔۔۔ انتظار ہمیشہ لمبا ہوتا ہے۔۔۔ کسی بھی چیز کا انتظار ہمیشہ لمبا ہوتا ہے۔۔۔ چاہے آنے والی شے پاؤں کی زنجیر بننے والی ہو یا گلے کا ہار۔۔۔ سر کا تاج بن کر سجنا ہو اس نے یا پاؤں کی جوتی۔۔۔ انتظار ہمیشہ لمبا ہی لگتا ہے۔

وہ ایک سوال کا جواب چاہتی تھی اپنے باپ سے۔۔۔ صرف ایک چھوٹے سے سوال کا۔۔۔ اس نے اس کی فیملی کو کیوں مار ڈالا؟

6

♠

گرینڈ حیات ہوٹل کا بال روم اس وقت Scripps National Spelling Bee کے 92 ویں مقابلے کے فائنل میں پہنچنے والے فریقین سمیت دیگر شرکا ان کے والدین ' بہن بھائیوں اور اس مقابلے کو دیکھنے کے لیے موجود لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہونے کے باوجود ایسا خاموش تھا کہ سوئی گرنے کی آواز بھی سنی جا سکے۔

وہ دو افراد جو فائنل میں پہنچے تھے ' ان کے درمیان چودھواں راؤنڈ کھیلا جا رہا تھا۔ تیرہ سالہ نینسی اپنے لفظ کے ہجے کرنے کے لیے اپنی جگہ پر آچکی تھی۔ پچھلے بانوے سالوں سے اس بال روم میں دنیا کے بیسٹ اسپیلر کی تاج پوشی ہو رہی تھی۔ امریکا کی مختلف ریاستوں کے علاوہ دنیا کے بہت سارے ممالک میں اسپیلنگ بی کے مقامی مقابلے جیت کر آنے والے پندرہ سال سے کم عمر کے بچے اس آخری راؤنڈ کو جیتنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے۔ ایسی ہی ایک بازی کے شرکا آج بھی اسٹیج پر موجود تھے۔

"Sassafras" نینسی نے رکی ہوئی سانس کے ساتھ پروناؤنسر کا لفظ سنا۔ اس نے پروناؤنسر کو لفظ دہرانے کے لیے کہا، پھر اس نے اس لفظ کو خود دہرایا۔ وہ چیمپئن شپ ورڈز میں سے ایک تھا لیکن فوری طور پر اسے وہ یاد نہیں آسکا۔ بہرحال اس کی ساؤنڈ سے وہ اسے بہت مشکل نہیں لگا تھا اور اگر سننے میں اتنا مشکل نہیں تھا تو اس کا مطلب تھا وہ ترکی لفظ ہو سکتا تھا۔

نو سالہ دوسرا فائنلسٹ اپنی کرسی پر بیٹھے، گلے میں لٹکے اپنے نمبر کارڈ کے پیچھے انگلی سے اس لفظ کی ہجے کرنے میں لگا ہوا تھا۔ وہ اس کا لفظ نہیں تھا لیکن وہاں بیٹھا ہر بچہ ہی لاشعوری طور پر اس وقت یہی کرنے میں مصروف تھا، جو مقابلے سے آؤٹ ہو چکا تھا۔

نینسی کا ریگولر ٹائم ختم ہو چکا تھا۔

"S-A-S-S" اس نے رک رک کر لفظ کی ہجے کرنا شروع کی۔ وہ پہلے چار حرف بتانے کے بعد ایک لمحہ کے لیے رکی۔ زیر لب اس نے باقی کے پانچ حرف دہرائے پھر دوبارہ بولنا شروع کیا۔

"A-F-R" وہ ایک بار پھر رکی۔ دوسرے فائنلسٹ نے بیٹھے بیٹھے زیر لب آخری دو حرف کو دہرایا۔

"U-S" مائیک کے سامنے کھڑی نینسی نے بھی بالکل اسی وقت یہی دو حرف بولے اور پھر بے یقینی سے اس گھنٹی کو بجتے سنا، جو اسپیلنگ کے غلط ہونے پر بجتی تھی۔ شاک صرف اس کے چہرے پر نہیں تھا۔ اس دوسرے فائنلسٹ کے چہرے پر بھی تھا۔ پروناؤنسر اب Sassafras کے درست اسپیلنگ دہرا رہا تھا۔ نینسی نے بے اختیار اپنی آنکھیں بند کیں۔

"آخری لیٹر سے پہلے A ہی ہونا چاہیے تھا... میں نے U کیا سوچ کر لگا دیا؟" اس نے خود کو کوسا۔ تقریباً "فق" رنگت کے ساتھ نینسی گراہم نے مقابلے کے شرکا کے لیے رکھی ہوئی کرسیوں کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ ہال تالیوں سے گونج رہا تھا۔ یہ ممکنہ رنر زاپ کو کھڑے ہو کر دی جانے والی داد و تحسین تھی۔ نو سالہ دوسرا فائنل میں پہنچنے والا بھی اس کے لیے کھڑا تالیاں بجا رہا تھا۔ نینسی کے قریب پہنچنے پر اس نے آگے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔ نینسی نے ایک مدہم مسکراہٹ کے ساتھ اسے جواب دیا اور اپنی سیٹ سنبھال لی۔ ہال میں موجود لوگ دوبارہ اپنی نشستیں سنبھال چکے تھے اور وہ دوسرا فائنلسٹ مائیک کے سامنے اپنی جگہ پر آچکا تھا۔ نینسی اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے ایک موہوم سی امید تھی کہ۔ اگر وہ بھی اپنے لفظ کے غلط ہجے کرتا تو وہ ایک بار پھر اپنے فائنل راؤنڈ میں واپس آجاتی۔

"That was a catch 22" اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ وہ اندازہ نہیں لگا سکی، وہ اس کے لیے کہہ رہا تھا یا وہ اس لفظ کو واقعی اپنے لیے بھی Catch 22 ہی سمجھ رہا تھا... وہ چاہتی تھی ایسا ہوتا... ہر کوئی چاہتا۔

سینٹر اسٹیج پر اب وہ نو سالہ فائنلسٹ تھا۔ اپنی اسی شرارتی مسکراہٹ اور گہری سیاہ چمکتی آنکھوں کے ساتھ۔ اس نے اسٹیج سے نیچے بیٹھے چیف پروناؤنسر کو دیکھتے ہوئے سر ہلایا۔ جو ناتھن جواباً "مسکرایا تھا اور صرف جو ناتھن ہی نہیں، وہاں سب کے لبوں پر ایسی ہی مسکراہٹ تھی۔ وہ نو سالہ فائنلسٹ اس چیمپئن شپ کو دیکھنے والے حاضرین کا موسٹ فیورٹ تھا۔

اس کے چہرے پر بلا کی معصومیت تھی۔ چمکتی ہوئی تقریباً "گول آنکھیں جو کسی کارٹون کریکٹر کی طرح پُر جوش اور جان دار تھیں اور اس کے تقریباً "گلابی ہونٹ جن پر وہ وقتاً "فوقتاً" زبان پھیر رہا تھا اور جن پر آنے والا ذرا سا خم بہت سے لوگوں کو بلاوجہ مسکرانے پر مجبور کر رہا تھا... وہ "معصوم فتنہ" تھا۔ یہ صرف اس کے والدین جانتے تھے، جو دوسرے بچوں کے والدین کے ساتھ اسٹیج کی بائیں طرف پہلی رو میں اپنی بیٹی کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں

بیٹھے دوسرے فائنلسٹس کے والدین کے برعکس وہ بے حد پرسکون تھے۔ ان کے چہرے پر اب بھی کوئی ٹینشن نہیں تھی جب ان کا بیٹا چیمپئن شپ ورڈ کے لیے آکر کھڑا تھا۔ ٹینشن اگر کسی کے چہرے پر تھی تو وہ ان کی سات سالہ بیٹی کے چہرے پر تھی، جو دو دن پر مشتمل اس پورے مقابلے کے دوران ہلکان رہی تھی اور وہ اب بھی آنکھوں پر گلاسز لگائے پورے انہماک کے ساتھ اپنے نو سالہ بھائی کو دیکھ رہی تھی جو پروناؤنسر کے لفظ کے لیے تیار تھا۔

"Cappelletti" جو ناتھن نے لفظ ادا کیا۔ اس فائنلسٹ کے چہرے پر بے اختیار ایسی مسکراہٹ آئی تھی، جیسے وہ بمشکل اپنی ہنسی کو کنٹرول کر رہا ہو۔ اس کی آنکھیں پہلے کلاک وائز اور پھر اینٹی کلاک وائز گھومنا شروع ہوئی تھیں۔ ہال میں کچھ کھلکھلاہٹیں ابھری تھیں۔ اس نے اس چیمپئن شپ میں اپنا ہر لفظ سننے کے بعد اسی طرح ری ایکٹ کیا تھا۔ بھینچی ہوئی مسکراہٹ اور گھومتی ہوئی آنکھیں... کمال کی خود اعتمادی تھی۔ کئی دیکھنے والوں نے اسے داد دی۔ اس کے حصے میں آنے والے الفاظ دوسروں کی نسبت زیادہ مشکل ہوتے تھے۔ یہ اس کے لیے مشکل وقت ہوتا تھا۔ لیکن بے حد روانی سے بغیر اٹکے بغیر گھبرائے اسی پُر اعتماد مسکراہٹ کے ساتھ وہ ہر پہاڑ سر کرتا رہا تھا اور اب وہ آخری چوٹی کے سامنے کھڑا تھا۔

"DefinitionPlease" اس نے اپنا ریگولر ٹائم استعمال کرنا شروع کیا۔

"Languageoforigin" (اس زبان کا ماخذ) اس نے پروناؤنسر کے جواب کے بعد اگلا سوال کیا۔

"اٹالین" اس نے پروناؤنسر کے جواب کو دہراتے ہوئے کچھ سوچنے والے انداز میں ہونٹوں کو دائیں بائیں حرکت دی۔ اس کی بہن بے چینی اور تناؤ کی کیفیت میں اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے والدین اب بھی پرسکون تھے۔ اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ لفظ اس کے لیے آسان تھا۔ وہ ایسے ہی تاثرات کے ساتھ پچھلے تمام الفاظ ہجے کرتا رہا تھا۔

"پلیز اس لفظ کو کسی جملے میں استعمال کریں۔" وہ اب پروناؤنسر سے کہہ رہا تھا۔ پروناؤنسر کا بتایا ہوا جملہ سننے کے بعد گلے میں لٹکے ہوئے نمبر کارڈ کی پشت پر انگلی سے اس لفظ کو لکھنے لگا۔

"اب آپ کا ٹائم ختم ہونے والا ہے۔" اسے آخری تیس سیکنڈز کے شروع ہونے پر اطلاع دی گئی جس میں اس نے اپنے لفظ کے ہجے کرنا تھا۔ اس کی آنکھیں گھومنا بند ہو گئیں۔

"Cappelletti" اس نے ایک بار پھر لفظ دہرایا۔

"C-A-P-P-E-L-L" وہ ہجے کرتے ہوئے ایک لحظہ کے لیے رکا۔ پھر ایک سانس لیتے ہوئے اس نے دوبارہ ہجے کرنا شروع کیا۔

"E-T-T-I"

ہال تالیوں سے گونج اٹھا تھا اور بہت دیر تک گونجتا رہا۔

اسپیلنگ بی کا نیا چیمپئن صرف ایک لفظ کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔

تالیوں کی گونج تھمنے کے بعد جو ناتھن نے اسے آگاہ کیا تھا کہ اسے اب ایک اضافی لفظ کے حرف بتانے ہیں۔ اس نے سر ہلایا۔ اس لفظ کی ہجے نہ کر سکنے کی صورت میں نینسی ایک بار پھر مقابلے میں واپس آجاتی۔

"Weissnichtwo" اس کے لیے لفظ پروناؤنس کیا گیا۔ ایک لمحہ کے لیے اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہوئی تھی۔ پھر اس کا منہ کھلا اور اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

"اوہ مائی گاڈ!" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔ وہ سکتہ میں تھا اور پوری چیمپئن شپ میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس کی آنکھیں اور وہ خود اس طرح جامد ہوا تھا۔

نینسی بے اختیار اپنی کرسی پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ تو کوئی ایسا لفظ آگیا تھا جو اسے دوبارہ چیمپئن شپ میں

واپس لا سکتا تھا۔

اس کے والدین کو پہلی بار اس کے تاثرات نے کچھ بے چین کیا تھا۔ ان کا بیٹا اب اپنے نمبر کارڈ سے اپنا چہرہ حاضرین سے چھپا رہا تھا۔ حاضرین اس کی انگلیوں اور ہاتھوں کی کپکپاہٹ بڑی آسانی سے اسکرین پر دیکھ سکتے تھے، اور ان میں سے بہت سوں نے اس بچے کے لیے واقعی بہت ہمدردی محسوس کی۔ وہاں بہت کم تھے جو اسے جیتتے ہوئے دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔

ہال میں بیٹھا ہوا صرف ایک شخص مطمئن اور پُرسکون تھا۔ پُرسکون... یا پُرجوش...؟ کہنا مشکل تھا اور وہ اس بچے کی سات سالہ بہن تھی، جو اپنے ماں باپ کے درمیان بیٹھی ہوئی تھی اور جس نے اپنے بھائی کے تاثرات پر پہلی بار بڑے اطمینان کے ساتھ کرسی کی پشت کے ساتھ مسکراتے ہوئے ٹیک لگائی تھی۔ گود میں رکھے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں کو بہت آہستہ آہستہ اس نے تالی کے انداز میں بجانا بھی شروع کر دیا تھا۔ اس کے ماں باپ نے بیک وقت اس کے تالی بجاتے ہاتھوں اور اس کے مسکراتے چہرے کو الجھے ہوئے انداز میں دیکھا، پھر اسٹیج پر اپنے لرزتے کانپتے کنفیوز بیٹے کو جو نمبر کارڈ کے پیچھے اپنا چہرہ چھپائے انگلی سے کچھ لکھنے اور بڑبڑانے میں مصروف تھا۔

A

♠

اس کتاب کا پہلا باب اگلے نو ابواب سے مختلف تھا۔ اسے پڑھنے والا کوئی بھی شخص یہ فرق محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا کہ پہلا باب اور اگلے نو ابواب ایک شخص کے لکھے ہوئے نہیں لگ رہے تھے۔ وہ ایک شخص نے لکھے۔ بھی نہیں تھے۔

وہ جانتی تھی، وہ اس کی زندگی کی پہلی بددیانتی تھی، لیکن یہ نہیں جانتی تھی کہ وہی آخری بھی ہوگی۔ اس کتاب کا پہلا باب اس کے علاوہ اب کوئی اور نہیں پڑھ سکتا تھا۔ اس نے پہلا باب بدل دیا تھا۔

نم آنکھوں کے ساتھ اس نے پرنٹ کمانڈ دی۔ پرنٹر برق رفتاری سے وہ پچاس صفحے نکالنے لگا، جو اس کتاب کا ترمیم شدہ پہلا باب تھے۔

اس نے ٹیبل پر پڑی ڈسک اٹھائی اور بے حد تھکے ہوئے انداز میں اس پر ایک نظر ڈالی۔ پھر اس نے اسے دو ٹکڑوں میں توڑ ڈالا۔ پھر چند اور ٹکڑے... اپنی ہتھیلی پر پڑے ان ٹکڑوں کو ایک نظر دیکھنے کے بعد اس نے انہیں ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔

ڈسک کا کور اٹھا کر اس نے زیرِ لب اس پر لکھے چند لفظوں کو پڑھا... پھر چند لمحے پہلے لیپ ٹاپ سے نکالی ہوئی ڈسک اس نے اس کور میں ڈال دی۔

پرنٹر تب تک اپنا کام مکمل کر چکا تھا۔ اس نے ٹرے میں سے ان صفحات کو نکال لیا۔ بڑی احتیاط کے ساتھ انہیں ایک فائل کور میں رکھ کر اس نے انہیں ان دوسری فائل کورز کے ساتھ رکھ دیا، جن میں اس کتاب کے باقی نو ابواب تھے۔

ایک گہرا سانس لیتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ کھڑے ہو کر اس نے ایک آخری نظر اس لیپ ٹاپ کی مدھم پڑتی اسکرین پر ڈالی۔

اسکرین تاریک ہونے سے پہلے اس پر ایک تحریر ابھری تھی Will Be Waiting!

اس کی آنکھوں میں ٹھہری نمی ایک دم چھلک پڑی تھی۔ وہ مسکرا دی۔ اسکرین اب تاریک ہو گئی۔ اس نے پلٹ کر ایک نظر کمرے کو دیکھا۔ پھر بیڈ کی طرف چلی آئی۔ ایک عجیب سی تھکن اس کے وجود پر چھانے لگی تھی، اس کے وجود پر... یا ہر چیز پر... بیڈ پر بیٹھ کر چند لمحے اس نے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پڑی چیزوں پر نظر دوڑائی۔

وہ پتا نہیں کب وہاں اپنی رسٹ واچ چھوڑ گیا تھا۔ شاید رات کو جب وہ وہاں تھا، وہ وضو کرنے گیا تھا۔ پھر شاید اسے یاد نہیں رہا تھا۔ وہ رسٹ واچ اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔ سیکنڈ کی سوئی تیزی سے اپنا سفر طے کر رہی تھی۔ زندگی میں سیکنڈز کی سوئی کبھی نہیں رکتی۔ صرف منٹ اور گھنٹے ہیں، جو رکتے ہوئے نظر آتے ہیں... سفر ختم ہوتا ہے... سفر شروع ہو جاتا ہے۔

بہت دیر اس گھڑی پر انگلیاں پھیرتی وہ جیسے اس کے لمس کو کھوجتی رہی۔ وہ لمس وہاں نہیں تھا۔ وہ اس گھر کی واحد گھڑی تھی، جس کا ٹائم بالکل ٹھیک ہوتا تھا۔ صرف منٹ نہیں... سیکنڈز تک... کاملیت اس گھڑی میں نہیں تھی۔ اس شخص کے وجود میں تھی، جس کے ہاتھ پر وہ ہوتی تھی۔

اس نے آنکھوں کی نمی صاف کرتے ہوئے اس گھڑی کو دوبارہ سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ کمبل اپنے اوپر کھینچتے ہوئے وہ بستر پر لیٹ گئی۔ اس نے لائٹ بند نہیں کی۔ اس نے دروازہ بھی مقفل نہیں کیا تھا۔ وہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔ بعض دفعہ انتظار بہت "لمبا" ہوتا ہے... بعض دفعہ انتظار بہت "مختصر" ہوتا ہے۔

اس کی آنکھوں میں نیند اترنے لگی... وہ "اسے" "نیند" سمجھ رہی تھی... ہمیشہ کی طرح آیت الکرسی کا ورد کرتے ہوئے وہ اسے چاروں طرف پھونک رہی تھی، جب اسے یاد آیا۔ وہ اس وقت وہاں ہوتا تو اس سے آیت الکرسی اپنے اوپر پھونکنے کی فرمائش کرتا۔

بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پڑے ایک فوٹو فریم کو اٹھا کر اس نے بڑی نرمی کے ساتھ اس پر پھونک ماری، پھر فریم کے شیشے پر جیسے کسی نظر نہ آنے والی گرد کو اپنی انگلیوں سے صاف کیا۔ چند لمحے تک وہ فریم میں اس ایک چہرے کو دیکھتی رہی، پھر اس نے اس کو دوبارہ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ سب کچھ جیسے ایک بار پھر سے یاد آنے لگا تھا... اس کا وجود جیسے ایک بار پھر سے ریت بننے لگا تھا۔ آنکھوں میں ایک بار پھر سے نمی آنے لگی تھی۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ "آج" اسے بہت دیر ہو گئی تھی۔

7

♠

"ایکسکیوزمی۔" وہ کہتے ہوئے اٹھ کر بار کی طرف چلی گئی تھی۔ اس کی نظروں نے جیکی کا تعاقب کیا۔ وہ بار کاؤنٹر پر بارٹینڈر سے بات کر رہی تھی۔ اس کے سیاہ بیک لیس ڈریس سے اس کی سفید خوب صورت پشت کمر کے خم تک نظر آ رہی تھی۔ اس نے نظر ہٹاتے ہوئے اپنے سامنے پڑے اورنج جوس کا ایک گھونٹ بھرا۔ بہت عرصے کے بعد اس نے کسی عورت کے جسم پر غور کیا تھا اور بہت عرصے کے بعد وہ کسی عورت کے ساتھ اکیلے کسی بار میں بیٹھا تھا۔ وہ ایک ہوٹل کا بار روم تھا لیکن وہ کسی ایسی جگہ پر بھی بہت عرصے کے بعد آیا تھا۔

وہ ہاتھ میں پکڑے گلاس سے دوسرا گھونٹ لے رہا تھا، جب جیکی دو شیمپئن گلاسز کے ساتھ واپس آ گئی تھی۔

"میں نہیں پیتا۔" اس نے ایک گلاس اپنے سامنے رکھے پر چونک کر اسے یاد دلایا تھا۔

"یہ شیمپئن ہے۔" جیکی نے جواباً ایک کندھے کو ہلاتے ہوئے بے حد گہری مسکراہٹ کے ساتھ اس سے کہا۔ اس کا اپنا گلاس اس کے ہاتھ میں تھا۔

"شیمپئن شراب نہیں ہوتی کیا؟" اس نے جواباً جیسے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔ وہ ٹیبل پر پڑی سگریٹ کی ڈبیا سے اب ایک سگریٹ نکال کر لائٹر کی مدد سے سلگا رہا تھا۔ جیکی نے آگے جھکتے ہوئے بڑی سہولت سے اس کے ہونٹوں میں دبا سگریٹ نکال لیا۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔ اس کی یہ حرکت بے حد غیر متوقع تھی۔ وہ اب

اسی سگریٹ کو اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں دبائے بائیں ہاتھ میں شیمپئن گلاس پکڑے مسکراتے ہوئے سگریٹ کے کش لے رہی تھی۔ اس نے نظریں چراتے ہوئے سگریٹ کی ڈبیا سے ایک اور سگریٹ نکال لیا۔

"آؤ ڈانس کریں۔"

وہ جیکی کی آفر پر ایک بار پھر چونکا۔ وہ ڈانس فلور پر رقص کرتے چند جوڑوں کو دیکھ رہی تھی۔ بار روم میں اس وقت زیادہ لوگ نہیں تھے اور ان میں سے بھی صرف چند ایک ہی ڈانس فلور پر موجود تھے جنہیں واقعی ڈانس کرنا تھا۔ وہ اسی ہوٹل کے نائٹ کلب میں موجود تھے۔

"میں ڈانس نہیں کرتا۔" اس نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے لائٹر رکھا۔

"آتا نہیں ہے؟" جیکی ہنسی تھی۔

"پسند نہیں ہے۔" وہ مسکرایا تھا۔ وہ شیمپئن کا گھونٹ بھرتے ہوئے عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ اس نے راکھ جھاڑنے کے بہانے نظریں چرائیں۔ جیکی کی مسکراہٹ مزید گہری ہوگئی تھی۔

"شراب بھی نہیں پی تم نے؟"

اس نے ہاتھ میں پکڑا گلاس میز پر رکھتے ہوئے کچھ آگے جھکتے ہوئے پوچھا۔

اس شخص کی نظریں ایک لمحہ کے لیے گلاس سے اٹھی تھیں، پھر اس نے جیکی کو دیکھا۔

"بہت عرصہ پہلے۔" اس نے جیسے اعتراف کیا۔

"شیمپئن؟" جیکی نے مصنوعی حیرت کے ساتھ کہا۔

"یہ بھی۔" بے تاثر چہرے کے ساتھ اس نے ڈانس فلور کو دیکھتے ہوئے کہا۔ گلاس دوبارہ اٹھاتے ہوئے اور سامنے بیٹھے ہوئے مرد کے چہرے پر نظریں جمائے جیکی نے اپنی زندگی میں آنے والے پرکشش ترین مردوں کی فہرست میں اس کو رکھا تھا۔ وہ بلاشبہ ٹاپ پر تھا۔ یہ اس کے جسمانی خدوخال نہیں تھے جس کی بنا پر وہ اسے یہ درجہ دے رہی تھی۔ اس کی زندگی میں شکل و صورت کے اعتبار سے اس سے زیادہ خوب صورت مرد آئے تھے۔ سامنے بیٹھے ہوئے شخص میں کچھ اور تھا، جو اسے بے حد ممتاز کر رہا تھا۔ اس کی بے حد مردانہ آواز، اس کا رکھ رکھاؤ، شفاف ذہین اور بے ریا گہری آنکھیں، اس کی مسکراہٹ یا پھر اس کی تمکنت اور رعونت۔۔۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی طرف کھنچ رہی تھی اور بری طرح کھنچ رہی تھی۔۔۔ اور اس میں اس کا قصور نہیں تھا۔ وہ دعوے سے کہہ سکتی تھی کہ وہ مرد کسی بھی عورت کو متوجہ کر سکتا تھا۔ اس نے اس کے کریکٹر پروفائل میں پڑھا تھا کہ وہ Womanizer نہیں تھا۔۔۔ اسے حیرت تھی وہ کیوں نہیں تھا۔۔۔ اسے ہونا چاہیے تھا۔ اس پر نظریں جمائے اس نے سوچا اور بالکل اسی لمحے اس شخص نے ڈانس فلور سے نظر ہٹا کر اسے دیکھا۔ جیکی کی مسکراہٹ بے اختیار گہری ہوئی تھی۔ وہ بھی بے مقصد مسکرا دیا تھا۔ وہ بہت عرصے کے بعد کسی عورت کی کمپنی کو انجوائے کر رہا تھا۔

وہ خوب صورت تھی، اسمارٹ تھی اور وہ مضطرب تھا۔ نہ ہوتا تو یہاں اس وقت دو گھنٹے ایک اجنبی عورت کے ساتھ کبھی نہ بیٹھا ہوتا۔

"تمہاری شیمپئن؟" جیکی نے اسے ایک بار پھر یاد دلایا۔

"تم لے سکتی ہو۔" اس نے جواباً گلاس اس کی طرف بڑھا دیا۔

"اگر پہلے پیتے تھے تو اب اس میں کیا برائی نظر آگئی تمہیں؟" جیکی اس بار سنجیدہ ہوئی تھی۔

"مرنے کے لیے پیتا تھا جب مزا آنا ختم ہوگیا تو چھوڑ دی۔" وہ اس کی بات پر بے اختیار ہنسی۔ وہ اسے دیکھتا رہا۔

جیکی دونوں ہاتھ ٹیبل پر رکھتے ہوئے آگے جھکی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے اس نے کہا۔

"تمہیں پتا ہے، مجھے تم میں ساحرانہ کشش محسوس ہو رہی ہے۔" وہ مسکرایا تھا۔ یوں جیسے اس کے جملے سے محظوظ ہوا ہو۔

"میرے لیے خوشی کی بات ہے۔" اس نے جواباً کہا تھا۔ جیکی نے بڑے غیر محسوس انداز میں میز پر رکھے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تھا۔ وہ ہاتھ ہٹانا چاہتا تھا لیکن چاہتے ہوئے بھی نہیں ہٹا سکا۔ وہ اس کے ہاتھ کی پشت پر بظاہر غیر محسوس انداز میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ اس نے بائیں ہاتھ میں پکڑا سگریٹ ایش ٹرے میں بجھا دیا۔ وہ دونوں اب ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ایک دوسرے کو خاموشی سے دیکھ رہے تھے، پھر جیکی نے کہا۔

"Do You Believe in one- night Stands"

(کیا تم ایک رات کے تعلق پر یقین رکھتے ہو؟)

جواب فوری آیا تھا۔

"بالکل۔"

4

♠

اینٹوں سے بنے چولہے پر رکھی، گھسی ہوئی پرانی مٹی کی ہنڈیا میں ساگ اپنے پانی میں گل رہا تھا۔ اس بوڑھی عورت نے نہر کے کنارے سے چنی ہوئی خشک جھاڑیوں کی ٹہنیوں کو توڑ توڑ کر چولہے میں پھینکنا شروع کر دیا۔ وہ آگ کو اسی طرح بھڑکائے رکھنے کی ایک کوشش تھی۔ وہ مٹی سے لیپے ہوئے گرم فرش پر چولہے کے قریب آکر بیٹھ گئی۔ پاؤں سے چپل اتار کر اس نے اپنے سرد ہلکے ہلکے سوجے ہوئے پیروں کو دھوپ سے گرم فرش سے جیسے کچھ حدت پہنچانے کی کوشش کی تھی۔

اماں اس عمر میں بھی پنجوں کے بل بیٹھی لکڑیوں کو توڑ مروڑ کر چولہے میں جھونک رہی تھی۔ آگ میں لکڑیوں کے تڑخنے اور چٹکنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ ساگ کی ہانڈی سے اٹھتی بھاپ اور اس میں اٹھتے ابال دیکھتی رہی۔

"مرد کیا کرتا ہے تیرا؟" وہ اماں کے اس اچانک سوال پر چونکی، پھر بڑبڑائی۔

"کیا کرتا ہے؟" اس نے جیسے یاد کرنے کی کوشش کی تھی، پھر کہا۔ "کام کرتا ہے۔"

"کیا کام کرتا ہے؟" اماں نے پھر پوچھا۔

"باہر کام کرتا ہے۔" وہ ساگ کو دیکھتے ہوئے بڑبڑائی۔

"پردیس میں ہے؟" بوڑھی عورت نے جواباً پوچھا۔ وہ بھی اب اسی کی طرح زمین پر بیٹھ گئی تھی اور اس نے اپنے گھٹنوں کے گرد اس کی طرح بازو لپیٹ لیے تھے۔

"ہاں۔۔۔ پردیس میں ہے۔" وہ اسی طرح ساگ کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"تو۔۔۔ تو یہاں کس کے پاس ہے۔ سسرال والوں کے پاس؟"

"نہیں۔"

"پھر؟"

"میں کسی کے پاس نہیں ہوں۔" ساگ پر نظریں جمائے اس نے بے ربط جواب دیا۔

"مرد نے گھر سے نکال دیا ہے کیا؟" اس نے چونک کر اس عورت کا چہرہ دیکھا۔

"نہیں۔"

"پھر تو لڑ کر آئی ہے کیا؟"

"نہیں۔" اس نے پھر بے ساختہ سر ہلایا۔

"تو پھر یہاں کس لیے آئی ہے؟"
"سکون کے لیے۔" اس نے بے اختیار کہا۔
"سکون کہیں نہیں ہے۔" وہ اس عورت کا چہرہ دیکھنے لگی۔
"جو چیز دنیا میں ہے ہی نہیں' اسے دنیا میں کیا ڈھونڈنا؟" اس نے حیرت سے اس عورت کو دیکھا۔ وہ گہری بات تھی اور اس عورت کے منہ سے سن کر اور بھی گہری لگی تھی اسے' جو اس جھگی میں بیٹھی آگ میں لکڑیاں جھونک رہی تھی۔
"پھر بندہ رہے کیوں دنیا میں' اگر بے سکون رہنا ہے؟"
وہ اس سے یہ سوال نہیں پوچھنا چاہتی تھی' جو اس نے پوچھا تھا۔
"تو پھر کہاں رہے؟" لکڑیاں جھونکتی اس عورت نے ایک لمحہ کے لیے رک کر اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ کچھ لاجواب ہوتے ہوئے دوبارہ ساگ کو دیکھنے لگی۔
"مرد کہتا نہیں واپس آنے کو؟"
"پہلے کہتا تھا۔ اب نہیں کہتا۔"
اس نے خود بھی لکڑیوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے آگ میں پھینکنے شروع کر دیے تھے۔
"بے چارہ اکیلا ہے وہاں؟" وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹکی۔
"ہاں۔" اس نے اس بار مدھم آواز میں کہا۔ وہ بوڑھی عورت اب پلاسٹک کے ایک شاپر میں پڑا ہوا آٹا ایک تھالی میں ڈال رہی تھی۔
"تو اکیلا چھوڑ کر آ گئی اسے؟" دھوپ میں پڑے ایک گھڑے سے ایک گلاس میں پانی نکالتے ہوئے اماں نے جیسے افسوس کیا تھا۔ وہ بے مقصد آگ میں لکڑیاں پھینکتی رہی۔
"تجھ سے پیار نہیں کرتا تھا؟" وہ ایک لمحے کے لیے ساکت ہوئی۔
"کرتا تھا۔" اس کی آواز بے حد مدھم تھی۔
"خیال نہیں رکھتا تھا؟" ساگ سے اٹھتی بھاپ کی نمی اس کی آنکھوں میں اترنے لگی تھی۔ اسے بڑے عرصے کے بعد پتا نہیں کیا' کیا یاد آیا تھا۔
"رکھتا تھا۔" آواز اور بھی مدھم ہو گئی تھی۔
اماں اب اس کے پاس بیٹھی اس تھالی میں دو روٹیوں کا آٹا گوندھ رہی تھی۔ "روٹی کپڑا نہیں دیتا تھا؟"
اس نے چادر سے اپنی آنکھیں رگڑیں۔ "دیتا تھا۔" وہ اپنی آواز خود بھی بمشکل سن پائی تھی۔
"تو نے پھر بھی چھوڑ دیا اسے؟ تو نے بھی اللہ سے بندے والا معاملہ کیا اس کے ساتھ۔۔۔ سب کچھ لے کر بھی دور ہو گئی اس سے۔"
اماں نے آٹا گوندھتے ہوئے جیسے ہنس کر کہا تھا۔ وہ بول نہیں سکی تھی۔ بولنے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں۔۔۔ پلکیں جھپکائے بغیر وہ صرف اماں کا چہرہ دیکھتی رہی۔
"تجھے یہ ڈر بھی نہیں لگا کہ کوئی دوسری عورت لے آئے گا وہ؟"
"نہیں۔" اس بار آٹا گوندھتے اماں نے اس کا چہرہ دیکھا تھا۔
"تجھے پیار نہیں ہے اس سے؟" کیا سوال آیا تھا۔ وہ نظریں چرا گئی۔
اس کی چپ نے اماں کو جیسے ایک اور سوال دیا۔
"کبھی پیار کیا ہے؟" آنکھوں میں سیلاب آیا تھا۔ کیا کچھ یاد آ گیا تھا۔

"کیا تھا۔" اس نے آنسوؤں کو بہنے دیا تھا۔
"پھر کیا ہوا؟" اماں نے اس کے آنسوؤں کو نظر انداز کر دیا تھا۔
"نہیں ملا۔" سر جھکائے اس نے آگ میں کچھ اور لکڑیاں ڈالیں۔
"ملا نہیں یا اس نے چھوڑ دیا؟" اس کے منہ میں جیسے ہری مرچ آ گئی تھی۔
"اس نے چھوڑ دیا۔" پتا نہیں ساگ زیادہ دھواں چھوڑ رہا تھا یا اس کی آنکھیں۔۔۔ پر آنچ اور آنسو دونوں جگ تھے۔
"پیار نہیں کرتا ہو گا۔" اماں نے بے ساختہ کہا۔
"پیار کرتا تھا' لیکن انتظار نہیں کر سکتا تھا۔" اس نے پتا نہیں کیوں اس کی طرف سے صفائی دی تھی۔
"جو پیار کرتا ہے وہ انتظار کرتا ہے۔" جواب کھٹاک سے آیا تھا اور اس کی ساری وضاحتوں' دلیلوں کے پرخچے اڑا گیا تھا۔ وہ روتے ہوئے ہنسی تھی یا پھر شاید ہنستے ہوئے روئی تھی۔ کیا سمجھا دیا تھا اس عورت نے' جو دل و دماغ کبھی سمجھا نہیں سکے تھے اسے۔
"اس آدمی کی وجہ سے گھر چھوڑ آئی اپنا؟" اماں نے پھر پوچھا۔
"نہیں۔۔۔ بس وہاں بے سکونی تھی مجھے' اس لیے آ گئی۔" اس نے بھیگے ہوئے چہرے کے ساتھ کہا۔
"کیا بے سکونی تھی؟" وہ برستی آنکھوں کے ساتھ بتاتی گئی۔ اماں چپ چاپ آٹا گوندھتی رہی۔ اس کے خاموش ہونے پر بھی اس نے کچھ نہیں کہا تھا۔ خاموشی کا وہ وقفہ طویل ہو گیا تھا۔۔۔ بے حد طویل۔۔۔ اماں آٹا گوندھنے کے بعد ساگ میں ڈوئی چلانے لگی تھی۔۔۔ وہ ٹانگوں کے گرد بازو لپیٹے ساگ کو گھلتے دیکھتی رہی۔
"وہاں نہر کے کنارے کیوں کھڑی تھی؟" اماں نے یک دم ساگ گھوٹتے ہوئے اس سے پوچھا۔ اس نے سر اٹھا کر اماں کا چہرہ دیکھا۔

5

بیرونی گیٹ ہمیشہ کی طرح گھر میں کام کرنے والی ملازمہ نے کھولا تھا۔ ڈرائیو وے پر گاڑی کھڑی کرتے ہوئے اس نے ابھی ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ ہر روز کی طرح لان میں کھیلتے اس کے دونوں بچے بھاگتے ہوئے اس کے پاس آ گئے تھے۔ چار سالہ جبریل پہلے پہنچا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے اس نے اپنے بیٹے کا چہرہ چوما تھا۔ وہ پسینے سے شرابور تھا۔ اس نے اسے اپنے ساتھ لگایا۔
"السلام علیکم!" جبریل نے روزانہ کی رسومات پوری کیں۔ گاڑی میں پڑے ٹشو باکس سے ٹشو نکال کر اس نے جبریل کا چہرہ صاف کیا جو اس نے بڑی فرماں برداری سے کروایا تھا۔ دو سالہ عنایہ تب تک ہانپتی کانپتی' شور مچاتی' گرتی پڑتی اس کے پاس آ گئی تھی۔ دور سے پہلے اس کے بازوؤں کو دیکھ کر وہ کچھ اور کھلکھلائی تھی۔۔۔ اس نے ہمیشہ کی طرح اسے دور سے گود میں لیا تھا۔ بہت زور سے اسے بھینچنے کے بعد اس نے باری باری بیٹی کے دونوں گال چومے۔ جبریل تب تک ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ بند کر چکا تھا۔ اس نے عنایہ کو اب نیچے اتار دیا۔ وہ دونوں باپ سے ملنے کے بعد دوبارہ لان میں بھاگ گئے تھے۔ جہاں وہ ملازمہ کی دو بیٹیوں کے ساتھ فٹ بال کھیلنے میں مصروف تھے۔ وہ چند لمحے ڈرائیو وے پر کھڑا اپنے بچوں کو دیکھتا رہا۔ پھر گاڑی کے پچھلے حصے سے اپنا بریف کیس اور جیکٹ نکالتے ہوئے وہ گھر کے اندرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کی بیوی تب تک اس کے استقبال کے لیے دروازے تک آ چکی تھی۔ دونوں کی نظریں ملی تھیں۔ وہ حیرانی سے اس کے پاس آتے ہوئے مسکرائی۔
"تم جلدی آ گئے آج؟" اس نے ہمیشہ کی طرح اسے گلے لگاتے ہوئے اس کے بالوں کو ہولے سے سہلاتے

ہوئے کہا۔

"ہاں آج زیادہ کام نہیں تھا۔"

"تو ڈھونڈ لیتے۔" وہ جواباً" اس کے ہاتھ سے جیکٹ لیتے ہوئے ہنسی۔ وہ جواب دینے کے بجائے مسکرا دیا۔

اپنے بیڈ روم میں اس نے جب تک اپنا بریف کیس رکھا اور جوتے اتارے وہ اس کے لیے پانی لے آئی تھی۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟" وہ اس کے ہاتھ میں پکڑی ٹرے سے گلاس اٹھا رہا تھا جب اس نے اچانک پوچھا تھا۔ اس نے چونک کر اس کی شکل دیکھی۔

"ہاں... بالکل... کیوں؟"

"نہیں... مجھے تھکے ہوئے لگے ہو اس لیے پوچھ رہی ہوں۔" اس نے جواب دینے کے بجائے گلاس منہ سے لگا لیا۔ وہ ٹرے لے کر چلی گئی۔

کپڑے تبدیل کرکے وہ لاؤنج میں آگیا تھا۔ لان میں اس کے دونوں بچے ابھی بھی فٹ بال کے پیچھے بھاگتے پھر رہے تھے۔ وہ لاؤنج کی کھڑکی کے سامنے جاکر کھڑا ہو گیا۔ کانگو کا موسم اسے کبھی پسند نہیں رہا تھا اور اس کی وجہ وہ بارش تھی جو کسی وقت بھی شروع ہو سکتی تھی اور جو شاید ابھی کچھ دیر میں پھر سے شروع ہونے والی تھی۔ کنگ ساشا میں پچھلے کئی دنوں سے ہر روز اسی وقت بارش ہوتی تھی۔ سہ پہر کے آخری چند گھنٹے... ایک ڈیڑھ گھنٹہ کی بارش اور اس کے بعد مطلع صاف۔

"چائے..." وہ اپنی بیوی کی آواز پر باہر لان میں دیکھتے بے اختیار پلٹا۔ وہ ایک ٹرے میں چائے کے دو مگ اور ایک پلیٹ میں چند کوکیز لیے کھڑی تھی۔

"تھینکس..." وہ ایک مگ اور ایک بسکٹ اٹھاتے ہوئے مسکرایا۔

"باہر چلتے ہیں بچوں کے پاس۔" وہ باہر جاتے ہوئے بولی۔

"میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔ کسی کال کا انتظار کر رہا ہوں۔" وہ سر ہلاتے ہوئے باہر چلی گئی۔ چند منٹوں کے بعد اس نے اپنی بیوی کو لان میں نمودار ہوتے دیکھا۔ لان کے ایک کونے میں پڑی کرسی پر بیٹھتے ہوئے وہ کھڑکی میں اسے دیکھ کر مسکرائی تھی۔ وہ بھی جواباً" مسکرا دیا تھا۔ چائے کا مگ اور بسکٹ کی پلیٹ اب لان میں اس کے سامنے پڑی ٹیبل پر رکھے تھے۔ اس نے باری باری جبریل اور عنایہ کو اس کے پاس آکر بسکٹ لیتے دیکھا۔ جبریل نے دو بسکٹ لے کر نونو اور لویا کو دیے تھے۔ چاروں بچے ایک بار پھر فٹ بال سے کھیلنے لگے تھے۔ اس کی بیوی اب مکمل طور پر بچوں کی طرف متوجہ تھی۔ چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے دائیں کندھے پر پڑی شال سے اپنے جسم کا وہ حصہ چھپائے جہاں ایک نئی زندگی پرورش پا رہی تھی۔ ان کے ہاں تیسرا بچہ ہونے جا رہا تھا۔ وہ فٹ بال کے پیچھے بھاگتے بچوں کو دیکھتے ہوئے وقتاً فوقتاً ہنس رہی تھی اور پھر انہیں ہدایات دینے لگتی۔

لاؤنج کی کھڑکی کے سامنے کھڑے باہر دیکھتے ہوئے وہ جیسے ایک فلم دیکھ رہا تھا۔ ایک مکمل فلم... اس کے ہاتھ میں پکڑی چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ ایک گہرا سانس لے کر اس نے مگ وہیں رکھ دیا۔ اس کی بیوی کا اندازہ ٹھیک تھا۔ وہ "ٹھیک" نہیں تھا۔

وہ کھڑکی کے شیشے سے باہر لان میں نظر آنے والی ایک خوش و خرم فیملی دیکھ رہا تھا۔ آئیڈیل پرفیکٹ لائف کا ایک منظر... اس کے بچوں کے بچپن کے قیمتی لمحے... اپنے اندر ایک اور ننھا وجود لیے اس کی بیوی کا مطمئن و مسرور چہرہ۔ چند پیپرز کو پھاڑ کر پھینک دینے سے یہ زندگی ایسے ہی خوب صورت رہ سکتی تھی۔ وہ ایک لمحے کے لیے بری طرح کمزور پڑا۔ اولاد اور بیوی واقعی انسان کی آزمائش ہوتے ہیں۔ ان کے لیے جنہیں "مال" آزمانے سے

قاصر رہتا ہے۔ انہیں دیکھتے ہوئے وہ بھی اسی آزمائش کا شکار ہو رہا تھا۔ ایک مرد ایک شوہر اور ایک باپ کے طور پر لان میں موجود اس کی فیملی اس کی ذمہ داری تھی۔ وہ ان سے "خون" اور "محبت" کے رشتوں سے بندھا ہوا تھا۔

ایک لمحہ کے لیے اس کی نظر بھٹک کر جبریل اور عنایہ کے ساتھ کھیلنے والی چار اور چھ سال کی ان دو سیاہ فام لاغر بچیوں پر گئی تھی۔ اس کے خوب صورت گورے بچوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے وہ اور بھی زیادہ بدصورت لگ رہی تھیں۔ ہیڈی کی وہ دونوں بیٹیاں اگر اس وقت مناسب لباس اور جوتوں میں ملبوس تھیں تو اس کی وجہ ہیڈی کا ان کے گھر کام کرنا تھا۔ ورنہ وہ گومبے کے غریبوں کے ہزاروں بچوں کی طرح اپنا بچپن کسی بھی سہولت کے بغیر چائلڈ لیبر کے طور پر گزار رہی ہوتیں اور وہاں سے چلے جانے کے بعد ان کا مستقبل پھر کسی غیر یقینی صورت حال کا شکار ہو جاتا۔ بالکل اسی طرح جس طرح اس مغربی استعماریت کے وہاں آجانے سے پورا افریقہ بے یقینی اور عدم استحکام کا شکار ہو رہا تھا۔ وہ اسی مغربی استعماریت کے ایک نمائندے کے طور پر وہاں موجود تھا۔

اس نے اپنی تیس سالہ ملازمہ کو ڈرائیو وے پر کھڑے اپنی بچیوں کی کسی کک پر تالیاں بجاتے دیکھا۔ بالکل ویسے ہی جیسے لان کے ایک کونے میں کرسی پر بیٹھی اس کی بیوی اپنے دونوں بچوں کو کھیلتے دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ ہیڈی نے خود کبھی "بچپن" نہیں دیکھا تھا۔ وہ پیدا ہونے کے فوراً" بعد بالغ ہو گئی تھی۔ افریقہ کے نوے فیصد بچوں کی طرح جنہیں بچپن یا بقائے زندگی میں سے کوئی ایک چیز ہی مل سکتی تھی۔ بچپن بہرحال ان آپشنز میں سے تھا جو پریمیم کی لسٹ میں آتے تھے اور ایسا ہی ایک آپشن اپنے بچوں کو دینے کے لیے ہیڈی سنگل پیرنٹ کے طور پر جان توڑ محنت کر رہی تھی۔ وہ ان کے ساتھ انسانیت کے رشتے میں منسلک تھا۔

ایک لمبے عرصے کے بعد وہ پہلی بار وہاں کھڑا اپنی اولاد اور اس عورت کی اولاد کا موازنہ کر رہا تھا۔ اپنی بیوی کی زندگی اور اس عورت کی زندگی کا مقابلہ کر رہا تھا۔ حالانکہ وہ آج وہاں اس کام کے لیے نہیں کھڑا تھا۔

اس کا فون بجنے لگا تھا۔ ایک گہرا سانس لے کر اس نے کالر آئی ڈی دیکھی۔ اس کا جسم ایک لمحے کے لیے تنا تھا۔ کال ریسیو کرتے ہوئے اسے اندازہ تھا اس وقت دوسری طرف وہ کس سے بات کرنے والا تھا۔

اسے اپنی فیملی کی زندگی اور استعفیٰ میں سے ایک چیز کا انتخاب کرنا پڑا۔

8

♠

پریذیڈنٹ نے کافی کا خالی کپ واپس میز پر رکھ دیا۔ پچھلے پانچ گھنٹے میں یہ کافی کا آٹھواں کپ تھا جو اس نے پیا تھا۔ اس نے زندگی میں کبھی اتنی کافی نہیں پی تھی مگر زندگی میں کبھی اسے اس طرح کا فیصلہ بھی نہیں کرنا پڑا تھا۔

وہ between devil and the blue sea (آگے گڑھا پیچھے کھائی) والی صورت حال سے دوچار تھا اور اپنے عہد صدارت کے ایک بہت غلط وقت پر ایسی صورت حال سے دوچار ہوا تھا۔ کانگریس کے الیکشنز سر پر تھے اور یہ فیصلہ ان الیکشنز کے نتائج پر بری طرح اثر انداز ہوتا۔ "بری طرح" کا لفظ شاید ناکافی تھا۔ اس کی پارٹی دراصل الیکشن ہار جاتی لیکن اس فیصلہ کو نہ کرنے کے اثرات زیادہ مضر تھے۔ وہ اسے جتنا ٹال سکتا تھا۔ ٹال چکا تھا۔ جتنا کھینچ چکا تھا۔ اب بہرحال اس کے پاس ضائع کرنے کے لیے مزید وقت نہیں تھا۔ کچھ لابیز کی قوت برداشت جواب دے رہی تھی۔ کچھ پاور پلیئرز دبے لفظوں میں اپنی ناراضی اور شدید ردعمل سے اسے خبردار کر رہے تھے۔ فارن آفس اسے مسلسل متعلقہ ممالک سے امریکن سفارت کاروں کی تقریباً" روزانہ کی بنیاد پر آنے والی کو ریز اور کنسرنز کے بارے میں آگاہ کر رہا تھا اور خود وہ دو ہفتے کے دوران مستقل ہاٹ لائن پر رہا

تھا۔ امریکا کی بین الاقوامی پسپائی ایک الیکشن ہارنے سے زیادہ سنگین تھی مگر اس کے پاس آپشنز نہ ہونے کے برابر تھے۔ اپنی کیبنٹ کے چھ اہم ترین ممبرز کے ساتھ پانچ گھنٹے کی طویل گفت و شنید کے بعد وہ جیسے تھک کر پندرہ منٹ کا ایک وقفہ لینے پر مجبور ہو گیا تھا اور اس وقت وہ اس وقفے کے آخری کچھ منٹ گزار رہا تھا۔

ٹیبل سے کچھ پیپرز اٹھا کر وہ دوبارہ دیکھنے لگا تھا۔ وہ کیبنٹ آفس میں ہونے والی پانچ گھنٹے طویل میٹنگ کے بلٹ پوائنٹس تھے۔ اس کی کیبنٹ کے وہ چھ ممبرز دو برابر گروپس میں بٹے ہوئے دو مختلف لائنز کے ساتھ تھے۔ وہ ٹائی اس کے کاسٹنگ ووٹ سے ٹوٹنے والی تھی اور یہی چیز اسے اتنا بے بس کر رہی تھی۔ اس فیصلے کی ذمہ داری ہر حال میں اسی کے سر پر آرہی تھی۔ یہ اس کے عہد صدارت میں ہوتا اور اس کے کاسٹنگ ووٹ سے ہوتا۔ اگر ہوتا تو۔ اور اس ذمہ داری کو وہ لاکھ کوشش کے باوجود وہ کہیں اور منتقل نہیں کر پا رہا تھا۔

اس نے ہاتھ میں پکڑے کاغذات کو ایک نظر پھر دیکھنا شروع کیا۔ وہ بلٹ پوائنٹس اس وقت اس کے لیے بلٹس کا کام کر رہے تھے۔

بریک کے آخری دو منٹ باقی تھے جب وہ ایک فیصلے پر پہنچ گیا تھا۔ بعض دفعہ تاریخ بنانے والے کے ہاتھوں کو جکڑ کر خود کو بنواتی ہے۔

اور تاریخ 17 جنوری 2030ء کو بھی یہی کر رہی تھی۔

10

♠

وہ یخنی میں ڈوبے ہوئے روٹی کے ٹکڑے چمچے کے ساتھ اپنے باپ کو کھلا رہا تھا۔ اس کا باپ ایک لقمے کو چبانے اور نگلنے میں تقریباً "دو منٹ لے رہا تھا۔ وہ ہر بار صرف اتنی ہی یخنی پیالے میں ڈالتا جس میں ایک ٹکڑا ڈوب جاتا' پھر چمچے سے اس ٹکڑے کو باپ کے منہ میں ڈالنے کے بعد وہ بے حد تحمل سے پیالے میں نیا ٹکڑا اور گرم یخنی ڈالتا۔ لقمے کے چبائے جانے تک روٹی کا نیا ٹکڑا یخنی میں پھولنے لگتا تھا۔ وہ ایک ہی وقت میں یخنی اس پیالے میں ڈالتا تو یخنی اب تک ٹھنڈی ہو چکی ہوتی۔ یخنی کا ایک پیالہ پینے میں اس کا باپ تقریباً "ایک گھنٹہ لگاتا تھا۔ ٹھنڈی یخنی میں ڈوبے ہوئے روٹی کے ٹکڑے بھی وہ اسی رغبت سے کھاتا جیسے وہ ان گرم لقموں کو کھا رہا تھا۔ اس کی ذائقے کی حس آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھی۔ گرم اور ٹھنڈی خوراک میں تخصیص کرنا وہ کب کا چھوڑ چکا تھا۔ یہ صرف اس کی دیکھ بھال کرنے والے اس کی فیملی کے افراد تھے' جو اس تخصیص کو اس کے لیے اب بھی برقرار رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اب بھی خوراک کو اس کے لیے ممکنہ حد تک ذائقہ دار بنا کر دے رہے تھے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ اس ذائقے سے لطف اندوز ہو سکتا تھا نہ اس ذائقے کو یاد رکھ سکتا تھا۔

باپ کو کھانا کھلانے کے ساتھ ساتھ اس نے اور اس کی بیوی نے بھی وہاں بیٹھے کھانا کھایا تھا۔ وہ جب بھی یہاں آتا تھا' تینوں وقت کا کھانا باپ کے کمرے میں اسے کھانا کھلاتے ہوئے ہی کھاتا تھا اور اس کی عدم موجودگی میں یہ کام اس کی بیوی اور بچے کرتے تھے۔ ان کے گھر کا ڈائننگ روم ایک عرصہ سے نہ ہونے کے برابر استعمال ہو رہا تھا۔ اس کے باپ کا بیڈ روم اس کی فیملی کے افراد کی بہت ساری سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ یہ اس شخص کو تنہائی سے بچانے کی ایک کوشش بھی تھی' جو پچھلے کئی سال سے بستر پر پڑا تھا اور الزائمر کی آخری اسٹیج میں داخل ہو چکا تھا۔

ٹرالی میں پڑا نیپکن اٹھا کر اس نے اپنے باپ کے ہونٹوں کے کونے سے نکلنے والی یخنی کے وہ قطرے صاف کیے جو چند لمحے پہلے نمودار ہوئے تھے۔ اس کے باپ نے خالی آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھا جن سے وہ ہمیشہ دیکھتا تھا۔ وہ اسے کھانا کھلاتے ہوئے جواب کی توقع کیے بغیر اس سے بات کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ اس کے باپ کی خاموشی کے وقفے اب گھنٹوں پر مشتمل ہونے لگے۔ گھنٹوں کے بعد کوئی لفظ کوئی جملہ اس کے منہ سے نکلتا تھا

جس کا تعلق اس کی زندگی کے کسی سال کی کسی یاد سے ہوتا تھا اور وہ سب اس جملے کو حال کے ساتھ جوڑنے کی کوشش میں لگ جاتے تھے۔

اس کا باپ یک ٹک کھانا کھاتے اسے دیکھتا تھا۔ اب بھی دیکھ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا اس کا باپ جیسے ایک اجنبی کا چہرہ پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کو کھانا کھلانے کی کوئی احتیاط' کوئی محبت' کوئی لگن اس کی یادداشت پر کہیں محفوظ نہیں ہو رہی تھی۔ وہ ایک اجنبی کے ہاتھ سے کھانا کھا رہا تھا اور اس کی ختم ہوتے دماغی خلیے سارا وقت اس اجنبی کے چہرے کو کوئی نام دینے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔

وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کے باپ کو اس کے ہاتھ سے کھایا ہوا دوپہر کا کھانا تک یاد نہیں ہو گا۔ وہ جتنی بار اس کے کمرے میں آتا ہو گا۔ وہ اپنے باپ کے لیے ایک نیا شخص' ایک نیا چہرہ ہو گا اور صرف وہی نہیں اس کی فیملی کے تمام افراد بھی۔ اس کا باپ شاید حیران ہوتا ہو گا کہ اس کے کمرے میں بار بار نئے لوگ کیوں آتے ہیں۔ اس کا باپ اپنے گھر میں "اجنبیوں" کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ لوگ جو اسے کھانا کھلاتے ہیں۔ باتھ روم لے کر جاتے تھے۔ نہلاتے تھے۔ کپڑے بدلتے تھے۔ باتیں کرتے تھے۔ لیکن وہ یہ سب کیوں کرتے تھے؟ اور پھر "کیوں؟" کا یہ سوال بھی اس کے ذہن کی اسکرین سے مٹ گیا یا شاید تحلیل ہو گیا۔

اس نے یخنی کا آخری چمچہ اپنے باپ کے منہ میں ڈالا۔ پھر پیالہ ٹرالی میں رکھ دیا۔ اب وہ اپنے باپ کو اسی طرح چمچے کے ساتھ پانی پلا رہا تھا۔ اس کا باپ لمبا گھونٹ نہیں بھر سکتا تھا۔

اس کی بیوی کچھ دیر پہلے کمرے سے اٹھ کر گئی تھی۔ اس کا سامان کچھ دیر پہلے ایئرپورٹ جا چکا تھا۔ اب باہر ایک گاڑی اس کے انتظار میں کھڑی تھی۔ جو اسے تھوڑی دیر میں ایئرپورٹ تک لے جاتی۔ اس کا اسٹاف بے صبری سے اس کمرے سے اس کی برآمدگی کا منتظر تھا۔

اس نے گلاس واپس رکھتے ہوئے بیڈ پر بیٹھ کر اپنے باپ کی گردن کے گرد پھیلایا ہوا نیپکن ہٹایا۔ پھر کچھ دیر تک وہ اپنے باپ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بیٹھا رہا۔ آہستہ آہستہ اس نے اپنے باپ کو اپنی روانگی کے بارے میں بتایا تھا اور اس تشکر و احسان مندی کے بارے میں جو وہ اپنے باپ کے لیے محسوس کرتا تھا اور خاص طور پر آج محسوس کر رہا تھا۔ اس کا باپ خالی نظروں سے اسے دیکھ اور سن رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ کچھ نہیں سمجھ رہا' لیکن یہ ایک رسم تھی جو وہ ہمیشہ ادا کرتا تھا۔ اس نے اپنی بات ختم کرنے کے بعد باپ کے ہاتھ چومے' پھر انہیں لٹا کر کمبل اوڑھا دیا اور کچھ دیر بے مقصد بیڈ کے پاس کھڑا اسے دیکھتا رہا تھا۔ اس کے بعد پتا نہیں وہ کب دوبارہ اپنے باپ کے پاس آنے کے قابل ہوتا۔

وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ آخری کھانا تھا' جو اس نے باپ کے ساتھ کھایا تھا۔

Q

♠

اس کا ہاتھ پکڑے وہ اسے اب کسی راستے پر لے جانے لگا۔

ایک قدم۔ دوسرا قدم۔ تیسرا۔ پھر وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ وہ ایک جھیل تھی۔ چھوٹی سی جھیل جس کے کنارے پر وہ تھے۔ ہلکی نیلی رنگت کے شفاف پانی کی ایک جھیل۔ جس کے پانی میں وہ رنگ برنگی مچھلیاں تیرتے دیکھ سکتی تھی۔

اور اس کی تہہ میں بے شمار رنگوں کے موتی۔ پتھر۔ سیپیاں۔

جھیل کے پانی پر آبی پرندے تیر رہے تھے۔ خوب صورت راج ہنس۔ جھیل کے چاروں اطراف پھول تھے' اور بہت سے پھول جھیل کے پانی تک چلے گئے تھے۔ کچھ پانی کی سطح پر تیر رہے تھے۔

مگر اس کے قدموں کو ان میں سے کسی چیز نے نہیں روکا تھا۔ اس کے قدموں کو روکنے والی شے جھیل کے کنارے پر موجود لکڑی کی وہ خوب صورت چھوٹی سی کشتی تھی جو پانی میں ہلکورے لے رہی تھی۔ اس نے بے اختیار کھلکھلا کر اسے دیکھا۔

"یہ میری ہے؟" وہ مسکرا دیا۔

وہ اپنا ہاتھ چھڑا کر بچوں کی طرح بھاگتی کشتی کی طرف گئی۔ وہ اس کے پیچھے لپکا۔

اس کے پاس پہنچنے پر کشتی پانی سے کچھ باہر آگئی۔ وہ بڑی آسانی سے اس میں سوار ہو گئی۔ اسے لگا وہ کشتی صندل کی لکڑی سے بنی تھی۔ خوشبودار صندل سے۔

وہ اس کے ساتھ آکر بیٹھ گیا۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا کشتی کو پانی میں لے گیا۔ دونوں بے اختیار ہنسے۔ کشتی اب جھیل کے دوسرے کنارے کی طرف سفر کر رہی تھی۔ اس نے جھک کر پانی میں تیرتا کنول کا ایک پھول پکڑ لیا۔ پھر اسی احتیاط کے ساتھ اسے چھوڑ دیا۔

اس نے دوسری طرف جھک کر اپنے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں جھیل کا پانی ایک چھوٹی سی رنگین مچھلی سمیت لیا اور اس کے سامنے کر دیا۔ اس کے ہاتھوں کے پیالے میں حرکت کرتی مچھلی کو دیکھ کر وہ ہنسی۔ پھر اس نے اس مچھلی کو ہاتھ سے پکڑا اور پانی میں اچھال دیا۔ وہ دونوں جھک کر اسے دیکھتے رہے۔

پانی پر تیرتا ایک ہنس کشتی کے پاس آگیا۔ پھر دوسرا۔۔۔ پھر تیسرا۔۔۔ وہ کشتی کے گرداب جیسے ایک دائرہ سا بنا کر تیر رہے تھے۔ یوں جیسے ان کا استقبال کر رہے تھے۔ وہ پاس سے تیر کر گزرتے ہر ہنس کو اپنے ہاتھ سے چھوتی کھلکھلا رہی تھی۔ پھر یک دم اس نے جھیل کے پانی پر کنول کے پھولوں کی قطاروں کو حرکت کرتے دیکھا۔ وہ جھیل کے پانی پر تیرتے اب رقص کر رہے تھے۔ ادھر سے ادھر جاتے۔ خوب صورت شکلیں بناتے۔۔۔ پاس آتے۔۔۔ دور جاتے۔۔۔ پھر پاس آتے۔۔۔ یوں جیسے وہ یک دم ہنسوں کی طرح زندہ ہو گئے تھے۔ جھیل کے نیلے پانی پر وہ سفید کنول اپنے سبز خوب صورت پتوں کے ساتھ ہونے والی مسلسل حرکت سے پانی میں ارتعاش پیدا کر رہے تھے۔۔۔ وہ بے خود ہو رہی تھی یا بے اختیار۔۔۔ وہ بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی۔۔۔ سمجھنا اب ضروری بھی نہیں تھا۔

جھیل کے نیلے پانی پر رقص کرتے لاتعداد خوب صورت پھولوں کے بیچ اس نے پانی میں یک دم کسی عکس کو نمودار ہوتے دیکھا۔ کشتی میں بیٹھے بیٹھے وہ چونک کر مڑی اور پھر وہ بے ساختہ کھڑی ہو گئی۔ کشتی دوسرے کنارے کے پاس آگئی تھی اور وہاں۔۔۔ وہاں۔۔۔ کچھ تھا۔

K

♠

ٹیلی اسکوپ سے اس نے ایک بار پھر اس بینکوئٹ ہال کی کھڑکی سے اندر نظر ڈالی۔ ہال میں سیکورٹی کے لوگ اپنی اپنی جگہوں پر مستعد تھے۔ کیٹرنگ اسٹاف بھی اپنی اپنی جگہ پر تھا۔ اس بینکوئٹ ہال کا داخلی دروازہ اس قد آدم کھڑکی کے بالکل سامنے تھا جس کھڑکی کے بالمقابل ساٹھ فٹ چوڑی، دو رویہ مین روڈ کے پار ایک عمارت کی تیسری منزل کے ایک اپارٹمنٹ میں وہ موجود تھا۔ اس اپارٹمنٹ کے بیڈ روم کی کھڑکی کے سامنے ایک کرسی رکھے وہ ایک جدید اسنائپر رائفل کی ٹیلی اسکوپ سائٹ سے کھڑکی کے پردے میں موجود ایک چھوٹے سے سوراخ سے اس بینکوئٹ ہال میں جھانک رہا تھا۔ بینکوئٹ ہال کا داخلی دروازہ کھلا ہوا تھا اور کوریڈور میں استقبالی قطار اپنی پوزیشن لے چکی تھی۔ اس کی گھڑی پر 9:02 بجے تھے۔ مہمان نو بج کر پندرہ منٹ پر اس کوریڈور میں داخل ہونے والا تھا اور تقریباً" ایک گھنٹہ اور پندرہ منٹ وہاں گزارنے کے بعد وہ وہاں سے جانے والا تھا۔ مہمان کے اس ہوٹل میں پہنچنے سے اس کی روانگی کے بعد تک اس علاقے میں تقریباً" ڈیڑھ گھنٹہ کے لیے ہر طرح کا مواصلاتی رابطہ جام ہونے والا تھا۔ یہ سیکورٹی کے ہائی الرٹ کی وجہ سے تھا۔ ڈیڑھ گھنٹہ کے لیے وہاں سیل فون اور متعلقہ کوئی

ڈیوائسز کام نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن وہ ایک پروفیشنل ہٹ مین تھا۔ اس سے پہلے بھی اسی طرح کے ہائی الرٹس میں کامیابی سے کام کرتا رہا تھا۔ اس کو ہائر کرنے کی وجہ بھی اس کی کامیابی کا تناسب تھا جو تقریباً" نوے فیصد تھا۔ وہ صرف دو لوگوں کو مارنے میں ناکام رہا تھا اور اس کی وجہ اس کے نزدیک اس کی بری قسمت تھی۔ پہلی بار اس کی رائفل لاسٹ سیکنڈز میں اس اسٹینڈ سے ہل گئی تھی جس پر وہ رکھی تھی اور دوسری بار۔۔۔ خیر دوسری بار کا قصہ طویل تھا۔

وہ پچھلے دو مہینے سے اس اپارٹمنٹ میں رہ رہا تھا۔ اس دن سے تقریباً" ایک مہینہ پہلے سے جب یہ ہوٹل اس بینکوئٹ کے لیے مختص کیا گیا تھا۔ جنہوں نے اسے اس اہم کام پر مامور کیا تھا۔ اس تقریب کے لیے اس ہوٹل اور ہوٹل کے اس بینکوئٹ ہال کا انتخاب کرنے والے بھی وہی تھے۔

اس مہمان کو ختم کرنے کا فیصلہ چار ماہ پہلے ہوا تھا۔ وقت، جگہ اور قاتل کا انتخاب بے حد ماہرانہ طریقے سے بڑے غور و خوض کے بعد کیا گیا تھا۔ اس مہمان کے سال کی مکمل مصروفیات کے شیڈول میں سے مقام، ملک اور ممکنہ قاتلوں کے نام شارٹ لسٹ کیے گئے تھے۔ پھر ہر جگہ اور تاریخ پر ہونے والے اس حادثے کے اثرات پر سیر حاصل بحث کی گئی تھی۔ فوری اثرات اور اس سے نمٹنے کی حکمت عملی پر بات کی گئی تھی۔ ممکنہ رد عمل کے نقصانات سے بچنے کے لیے منصوبے تیار کیے گئے تھے۔ ایک قاتلانہ حملے کے ناکام ہو جانے کی صورت میں ہونے والے ممکنہ رد عمل اور نقصانات پر غور کیا گیا تھا اور ہر میٹنگ کے بعد "کام" کی جگہیں اور تاریخیں بدلتی رہی تھیں، لیکن قاتل ایک ہی رہا تھا۔ کیونکہ وہ موزوں ترین تھا۔

اس شہر میں اس تاریخ پر اس تقریب کے لیے سیکورٹی کی وجوہات کے باعث تین مختلف ہوٹلز کا نام لسٹ میں رکھا گیا تھا، لیکن اسے ہائر کرنے والے جانتے تھے کہ تقریب کہاں ہوگی۔

اس کو دو ماہ پہلے ہی اس اپارٹمنٹ میں رہائش پذیر ستائیس سالہ لڑکی سے دوستی کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ اس لڑکی کے چار سالہ پرانے بوائے فرینڈ سے بریک اپ کے لیے ایک پروفیشنل کال گرل کا استعمال کیا گیا تھا جو اس کے کار ڈیلر بوائے فرینڈ سے ایک کار خریدنے کے بہانے ملی تھی اور اسے ایک ڈرنک کی آفر کرکے ایک موٹل لے گئی تھی۔

اس کال گرل کے ساتھ گزارے ہوئے وقت کی ریکارڈنگ دوسرے دن اس لڑکی کو میل میں موصول ہو گئی تھی۔ اس کا بوائے فرینڈ نشے میں تھا اسے پھنسایا گیا تھا۔ اور یہ سب ایک غلطی تھی، لیکن اس کے بوائے فرینڈ کی کوئی تاویل، اس کے غصے اور رنج کو کم نہیں کر سکی تھی۔ اس کی گرل فرینڈ کے لیے یہ بات اس لیے بھی زیادہ تکلیف دہ تھی۔ زیادہ ناقابل برداشت تھی، کیونکہ وہ تین ہفتے بعد شادی کرنے والے تھے۔ اس نے اپنے بوائے فرینڈ کا سامان گھر کے دروازے سے باہر نہیں پھینکا تھا۔ اسے اپارٹمنٹ کی کھڑکی سے باہر پھینکا تھا۔ سڑک پر بکھرے سامان کو اکٹھا کرتے ہوئے خود کو اور اس کال گرل کو کوستے ہوئے بھی اس کا بوائے فرینڈ یہ سوچ رہا تھا کہ چند ہفتوں میں اس کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا اور وہ دونوں دوبارہ اکٹھے ہو جائیں گے۔ جنہوں نے ان کا تعلق ختم کروایا تھا۔ انہیں اس بات کا اندیشہ بھی تھا۔ چنانچہ معاملات کو پوائنٹ آف نو ریٹرن تک پہنچانے کے لیے اس لڑکے کے کمپیوٹر کو ہیک کیا گیا تھا۔ اس کی اور اس کی گرل فرینڈ کی بے حد قابل اعتراض تصویروں کو اس کی ای میل آئی ڈی کے ساتھ بہت ساری ویب سائٹس پر اپ لوڈ کر دیا گیا تھا۔

یہ جیسے تابوت میں آخری کیل تھی۔ اس لڑکی نے اپنے بوائے فرینڈ کی ای میل آئی ڈی سے بھیجا ہوا پیغام پڑھا تھا۔ جس میں لکھا تھا کہ اس نے اپنے بریک اپ کے بعد اس کی ساری پکچرز کو قابل اعتراض ویب سائٹس پر اپ لوڈ کر دیا ہے۔ اس کی گرل فرینڈ نے پہلے وہ لنکس وزٹ کیے تھے۔ پھر اپنے بوائے فرینڈ کی اس کال گرل کے ساتھ ویڈیو کو اپ لوڈ کیا تھا اور اس کے بعد اپنے سابقہ بوائے فرینڈ کو اس کے شو روم میں جا کر اس کے کسٹمرز کے

سامنے اس وقت پیا تھا' جب وہ انہیں ایک جدید ماڈل کی گاڑی "تقریباً" بیچنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

" Happy families drive this car " اس نے تقریباً چھپن بار یہ جملہ اس جوڑے کے سامنے دہرایا تھا جو ٹیسٹ ڈرائیو کے لیے وہاں موجود تھے اور اس کے ساتھ اس نے ایک سو چھپن بار یہ جھوٹ بھی بولا تھا کہ کس طرح خود بھی اس کار کو ذاتی استعمال میں رکھنے کی وجہ سے اس کا اور اس کی گرل فرینڈ کا ریلیشن شپ مضبوط ہوا تھا۔ اس کے بوائے فرینڈ کو مار کھانے پر اتنا شاک نہیں لگا تھا۔ چار سالہ کورٹ شپ میں وہ اپنی گرل فرینڈ کے ہاتھوں اس شہر کی "تقریباً" ہر مشہور پبلک پلیس پر پٹ چکا تھا اور یہ تو بہرحال اس کا اپنا شو روم تھا۔ جتنا اسے اپنی گرل فرینڈ کے الزام سن کر شاک لگا تھا۔

اس کے چیخنے چلانے اور صفائیاں دینے کے باوجود اس کی گرل فرینڈ کو یقین تھا کہ اس نے شراب کے نشے میں یہ حرکت کی ہوگی۔ ورنہ اس کی ذاتی لیپ ٹاپ میں موجود تصویریں اس کے ای میل ایڈریس کے ساتھ کون اپ لوڈ کر سکتا تھا۔

اس بریک اپ کے ایک ہفتے کے بعد وہ نائٹ کلب میں اس سے ملا تھا۔ چند دن ان کی ملاقاتیں اسی بے مقصد انداز میں ہوتی رہی تھیں۔ وہ میڈیکل ٹیکنیشن تھی اور اس نے اپنا تعارف پینٹر کے طور پر کروایا تھا۔ وہ ہر بار اس لڑکی کی ڈرنکس کی قیمت خود ادا کرتا رہا تھا۔ چند دن کی ملاقاتوں کے بعد اس نے اسے گھر پہ مدعو کیا تھا اور اس کے بعد وہاں اس کا آنا جانا زیادہ ہونے لگا تھا۔ وہ اس بلڈنگ کے افراد کو ایک ریگولر وزیٹر کا تاثر دینا چاہتا تھا اور دو ماہ کے اس عرصے میں وہ اس اپارٹمنٹ کی دوسری چابی بنوا چکا تھا اور ایک ہفتہ پہلے وہ اس لڑکی کی عدم موجودگی میں اس کے اپارٹمنٹ پر وہ اسنائپر رائفل اور کچھ دوسری چیزیں بھی منتقل کر چکا تھا۔ وہ جانتا تھا اس تقریب سے ایک ہفتہ پہلے اس علاقے کی تمام عمارتوں پر سیکورٹی چیک ہوگا۔ وہ تب ایسا کوئی بیگ اسکریننگ کے بغیر عمارت میں منتقل نہیں کر سکے گا اور اس وقت بھی اس علاقے کی تمام بلڈنگز بے حد ٹائٹ سیکورٹی میں تھیں۔ وہ ایک ریگولر وزیٹر نہ ہوتا تو اس وقت اس بلڈنگ میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔

اس بلڈنگ سے پچاس میل دور اس کی گرل فرینڈ کو اسپتال میں کسی ایمرجنسی کی وجہ سے روک لیا گیا تھا۔ ورنہ اس وقت وہ اپنے اپارٹمنٹ پر ہوتی۔ پارکنگ میں کھڑی اس کی کار کے چاروں ٹائر پنکچر تھے اور اگر وہ ان دونوں چیزوں سے کسی نہ کسی طرح بچ کر پھر بھی گھر روانہ ہو جاتی تو راستے میں اس کو چیک کرنے کے لیے کچھ اور بھی انتظامات کیے گئے تھے۔

نو بج کر تیرہ منٹ ہو رہے تھے۔ وہ اپنی رائفل کے ساتھ مہمان کے استقبال کے لیے بالکل تیار تھا۔ جس کھڑکی کے سامنے وہ تھا' ہوٹل کے اس بینکوئٹ ہال کی وہ کھڑکی بلٹ پروف شیشے کی بنی تھی۔ ڈبل گلیزڈ بلٹ پروف شیشہ... یہی وجہ تھی کہ ان ونڈوز کے سامنے کوئی سیکورٹی اہلکار تعینات نہیں تھے۔ تعینات ہوتے تو اسے نشانہ باندھنے میں یقیناً "دقت ہوتی" لیکن اس وقت اسے پہلی بار یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اسے اس سے پہلے کسی کو مارنے کے لیے اتنی جامع سہولیات نہیں ملی تھیں۔ مہمان کو کوریڈور میں چلتے ہوئے آنا تھا۔ ایلویٹر سے نکل کر کوریڈور میں چلتے ہوئے بینکوئٹ ہال کے داخلی دروازے تک اس مہمان کو شوٹ کرنے کے لیے اس کے پاس پورے دو منٹ کا وقت تھا۔ ایک بار وہ بینکوئٹ ہال میں اپنی ٹیبل کی طرف چلا جاتا تو اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا' لیکن دو منٹ کا وقت اس جیسے پروفیشنل کے لیے دو گھنٹے کے برابر تھا۔

اس بینکوئٹ ہال کی تمام کھڑکیاں بلٹ پروف تھیں۔ صرف اس کھڑکی کے سوا جس کے سامنے وہ تھا۔ تین ہفتے پہلے بظاہر ایک اتفاقی حادثے میں اس کھڑکی کا شیشہ توڑا گیا تھا۔ اسے تبدیل کروانے میں ایک ہفتہ لگا تھا اور تبدیل کیا جانے والا شیشہ ناقص تھا۔ یہ صرف وہی لوگ جانتے تھے جنہوں نے یہ سارا منصوبہ بنایا تھا۔ اسٹیج تیار تھا اور اس پر وہ فنکار آنے والا تھا جس کے لیے یہ ڈراما کھیلا جا رہا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

تمثیلہ زاہد

محبت جیت ہوتی ہے

حنا کمرے کی تفصیلی صفائی کرنے میں جتی ہوئی تھی۔ پنکھا اسٹول پر چڑھ کر اچھی طرح جھاڑنے کے بعد وہ عرفان کی الماری صاف کرنے میں مشغول



ہوگئی۔ ڈریسنگ ٹیبل اور الماری سے نکلا کاٹھ کباڑ اس نے صاف کر ڈالا تھا۔ صفائی کا یہ بخار مہینے میں ایک بار اسے ضرور چڑھا کرتا تھا۔ پھر وہ ہر چیز کو درست کرنے کی دھن میں سوار وقت سے بے خبر ہو جاتی۔ آج بھی عرفان کے ہمراہ بچوں کو اسکول بھیجنے کے بعد وہ کمرے میں حسب معمول نظر آنے والی بے ترتیبی سمیٹنے لگی۔ پھر خیال آیا کیوں نہ آج کمرے کی تفصیلی صفائی کر لی جائے۔

"حنا... حنا! بارہ بج رہے ہیں' بچوں کو اسکول لینے نہیں جانا۔ نیچے سنک میں برتن بھی پڑے رکھے ہیں۔ محترمہ آج آپ کی ڈیوٹی ہے... بھول گئیں کیا؟" اس کی جٹھانی نے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔

"ہائے اللہ! میں واقعی بھول گئی۔ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ اوپر سے میرے کمرے کی گھڑی کے سیل بھی کل سے خراب ہیں۔ عرفان کو کہہ رکھا ہے لانے کے لیے... اف خدایا! بہت دیر ہوگئی ہے۔ بچوں کی چھٹی ایک بجے ہوتی ہے۔ ابھی وقت ہے۔ میں فٹافٹ کچن سمیٹ کر آتی ہوں۔" حنا اپنی اکڑی کمر پر ہاتھ رکھ کر تیز تیز بولتی اپنے کمرے سے نکلی تو عالیہ بھابھی نے پیچھے سے آواز دی۔

"کیا ہوا کے گھوڑے پر سوار بھاگی چلی جا رہی ہو۔ یہاں آؤ بیٹھو آرام سے۔ میں نیچے اپنا کام سمیٹ کر تمہاری ڈیوٹی کے برتن بھی دھو آئی ہوں۔ معلوم تھا مجھے صبح سے اپنا کمرا صاف کرنے میں لگی ہوئی ہو۔" وہ محبت سے بولیں۔

حنا اپنی پھولی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے تشکر بھرے لہجے میں بولی۔ "شکریہ بھابھی!"

"کل رات ثوبیہ میکے سے آگئی ہے۔" جٹھانی نے اطلاع دی۔

"اچھا... تو مجھے کیوں بتا رہی ہیں۔" اس نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔

"تم یہ کرو کہ اب اپنا غصہ تھوک دو۔"

"یہ نہیں ہو سکتا عالیہ بھابھی!" وہ اٹل لہجے میں بولی۔

"کیا حرج ہے' ایک بار بات تو کر کے دیکھو۔ تمہارے پہل کر لینے سے تم چھوٹی نہیں ہو جاؤ گی۔ تم دونوں کے درمیان کھڑی انا اور نفرت کی دیوار گر جائے گی۔ ایک گھر میں رہ کر اس طرح کب تک رہو گی۔ تم نے دیکھا نہیں تمہارے اور ثوبیہ کے تعلقات جب سے خراب ہوئے ہیں۔ گھر کے ماحول میں تناؤ سا آگیا ہے۔ کل مجھ سے ساسو ماں بھی گھر کے بگڑتے ماحول پر افسوس کر رہی تھیں۔ وہ بھی کافی پریشان ہیں۔" عالیہ بھابھی نرمی سے اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"بھابھی! میرے اور اس کے درمیان صلح ہو بھی جاتی ہے تو بات پہلے جیسی نہیں رہے گی۔ ایک بار دل میں بال آجائے تو گزرتے وقت کی تیز ہوائیں بھی اسے سرکا نہیں سکتیں۔" وہ دکھ بھرے لہجے میں دیورانی کے تیکھے رویے یاد کرتے ہوئے بولی۔

بات کچھ یوں تھی کہ حنا کا اپنی دیورانی ثوبیہ سے چھوٹی سی بات پر اختلاف ہو گیا۔ عالیہ بھابھی گھر کی بڑی بہو تھیں۔ ان کی شادی کو پندرہ برس ہو چکے تھے۔ حنا اور ثوبیہ کی شادی ایک سال کے فرق سے ہوئی۔ ثوبیہ کی شادی کو چند ماہ ہی گزرے تھے۔ حنا کو بھی زیادہ وقت سسرال میں نہیں گزرا تھا۔ حنا اور ثوبیہ آپس میں بے تکلف تھیں۔ لیکن حنا اس کی ہر بات پر نکتہ چینی کرنے والی عادت سے سخت بے زار رہتی۔ ثوبیہ اکثر ہی کسی نہ کسی بات پر حنا کو ٹوک دیا کرتی۔ اپنی بات کو درست ثابت کرنے خاطر ثوبیہ لمبی لمبی بحث کرنے پر بھی باز نہ آتی۔ وہ یہ مباحثہ اتنی کامیابی سے کرتی کہ سامنے والا زچ ہو کر خاموش ہو جاتا۔

اس دن ساس کے لیے سوپ بناتی حنا کا ثوبیہ نے آدھے گھنٹے سے دماغ چاٹ رکھا تھا۔ وہ سوپ میں ڈالے گئے اجزا پر اپنی تنقیدی رائے کا اظہار کر رہی تھی۔

حنا لب بھینچے اس کی تقریر سنتی رہی' پھر پھٹ پڑی اور اسے ڈانٹ کر اپنے کام سے کام رکھنے کو کہا۔ جواب میں ثوبیہ بھی دو چار باتیں سنا کر پیر پٹختی ہوئی

کمرے میں بند ہو گئی۔ اپنے میاں جی کی لاڈلی ثوبیہ نے سارا دن کمرے سے قدم باہر نہ نکالا۔

اپنی ہتک کا احساس دل میں لیے دونوں ہی کے درمیان خاموشی آج تک قائم تھی۔ حنا' ثوبیہ کی موجودگی میں نیچے نہ آتی۔ کچن نیچے ایک ہی تھا اور سب ہی کے زیر استعمال تھا۔ گھر کے تمام کام ساس نے تینوں بہوؤں میں بانٹ رکھے تھے۔ کام کے دوران کبھی دونوں کا آمنا سامنا ہو بھی جاتا تو دونوں ہی ایک دوسرے سے رخ پھیر لیتیں اور اپنے حصے کا کام نمٹا کر یہ جا وہ جا۔ دونوں میں سے کوئی بھی جھکنے کو تیار نہ تھا۔

عالیہ بھابھی گھر کی بڑی بہو ہونے کی حیثیت سے گھر کو محبت سے سمیٹ کر رکھنے کی خاطر دونوں کے درمیان صلح صفائی کرنے کی کوششوں میں لگی رہتیں۔ لیکن کوئی بھی ٹس سے مس نہ ہوا۔



"عالیہ بھابھی! کل جمعہ ہے' آپ اپنے میکے جائیں گی ہے نا۔" حنا بولی۔

"نہیں... کل مشکل ہے۔ پرسوں ہفتہ کو جاؤں گی۔"

"کیوں آپ کہہ رہی تھیں نا' بہت دن ہو گئے۔ جمعہ کو جائیں گی اور ہفتہ کو آئیں گی۔" اسے جیسے کچھ یاد آیا تو فوراً بولی۔

"کل میری بھابھی گھر پر ہوں گی' ان کی موجودگی میں جانا مناسب نہیں۔ وہ جب پرسوں اپنے میکے جائیں گی' پھر میں جاؤں گی۔" وہ نظریں چراتے ہوئے بولیں۔

حنا نے عالیہ کی طرف حیرت سے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ خجالت سے پھر بولیں۔

"بھابھی اور میرے بچوں میں زیادہ بنتی نہیں۔ جب بھی اکٹھے ہوتے ہیں' آپس میں لڑائی جھگڑے ہی رہتے ہیں۔ بھابھی بھی ذرا' ذرا سی بات پر منہ بنا لیتی ہیں۔ بچوں کی لڑائی لمحے بھر میں ختم ہو جاتی ہے' لیکن بڑوں کے پھولے منہ پھولے ہی رہتے ہیں۔ پچھلے ماہ جب میں امی کی طرف گئی تھی تو عدنان نے بھابھی کی بیٹی کا فیڈر پھینک دیا۔ اس کی اس شرارت پر سب کے سامنے میں نے اسے ڈانٹا' لیکن بھابھی کا منہ پھولا ہی رہا اور میرے بیٹے کو کافی کھری کھری بھی سنا دیں۔ تب سے ہمارے درمیان بات چیت بند ہے۔ اب بتاؤ بھلا' بچے تو بچے ہیں' لیکن جب بڑے بھی بچوں جیسی حرکتیں کرنے لگیں تو کیا کیا جائے؟ میرے گھر جاتے ہی بھابھی اپنے بچوں کو لے کر کمرے میں بند ہو جاتی ہیں۔ امی بلڈ پریشر کی مریضہ ہیں۔ وہ بھی پریشان رہنے لگی ہیں۔"

"چھوڑیں نا بھابھی! کیا حرج ہے آپ خود ہی پہل کر کے انہیں منا لیجیے۔ آخر آپ کی بڑی بھابھی ہیں۔ پہل کر لینے سے آپ چھوٹی تھوڑی ہو جائیں گی۔ ورنہ گھر یوں ہی تناؤ کا شکار رہے گا... محبت سے بات کر کے تو دیکھیں' محبت دلوں کو جیت لیتی ہے... محبت میں بہت طاقت ہوتی ہے۔"

حنا بے پروا انداز میں کہتی چلی گئی۔ روانی سے بولے گئے جملوں کا خود اسے بھی اندازہ نہ ہو سکا کہ وہ کیا کچھ کہہ گئی ہے۔ اچانک ہی کہتے کہتے رک سی گئی۔ عالیہ بھابھی اور حنا کی نظریں ایک دوسرے سے چار ہوئیں۔ دونوں کے درمیان خاموشی تھی۔ ان خاموش لمحوں میں دونوں کے دل کے دیے ایک نکتے پر آکر روشن ہوئے تھے۔

محبت... محبت دلوں کو جیت لیتی ہے۔

عالیہ بھابھی میکانکی انداز میں پلٹی تھیں اور اپنے پاس پڑا موبائل اٹھا کر بٹن پریس کرنے لگیں۔

اور حنا کا رخ ثوبیہ کے کمرے کی جانب تھا۔

محبت ابر کی صورت
دلوں کی سرزمیں پہ گھر کے آتی اور برستی ہے
چمن کا ذرہ ذرہ جھومتا ہے' مسکراتا ہے
ازل کی بے نموئی میں سبزہ سر اٹھاتا ہے
محبت ان کو بھی شاداب اور آباد کرتی ہے
جو دل ہیں قبر کی صورت
محبت ابر کی صورت!

☆

عتیقہ ایوب

میرے قاتلوں کو گماں نہ ہو

"اوہ، بہت کم لوگ ہوتے ہیں ایسے جنہیں اللہ موقع دیتا ہے اتنے کام کرنے کا۔ ماشاء اللہ! بہت خوش قسمت ہیں آپ۔" مصنوعی مسکراہٹ سجائے وہ سامنے بیٹھی خاتون سے مخاطب تھی۔

لائیو ریکارڈنگ ہو رہی تھی۔ ایسے میں خراب ایکسپریشن دے کر وہ اس شو کی ہوسٹ کی سیٹ سے ہٹنا نہیں چاہتی تھی۔ جب ہی ناصرہ ہمدانی کی تعریفوں کے جھوٹے پل باندھ رہی تھی۔

"اچھا یہ بتائیں کہ فیملی میں کون کون سراہتا ہے آپ کے کام کو۔ بچے تو بہت پراؤڈ محسوس کرتے ہوں گے ناں؟"

ان کے میک اپ سے لپے تپے چہرے اور جیولری سے مزین کان، ہاتھ اور گلے کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ بچے تو بہت خوش ہوتے ہیں اور میاں بھی بہت سپورٹ کرتے ہیں۔ بس کبھی غرور نہیں کیا۔" دائیں ہاتھ سے بالوں کو سنوارتی مسز ناصرہ ہمدانی نے بڑے تفاخر سے جواب دیا۔

"کبھی غرور نہیں کیا" والے فقرے پر نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

"دیکھیں بھئی! یہ ہمارا ملک ہے۔ اگر ہم اس ملک کی بھلائی کے لیے کام نہیں کریں گے تو کون کرے گا؟ جب میں نے این جی او بنائی تو اس ملک کی عورتوں کو ایک پلیٹ فارم دیا اپنی آواز بلند کرنے کا۔ ہم حقوق نسواں کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے۔"

ناولٹ

وہی فارمل گھسے پٹے جملے۔ تو روز کا تماشا تھا۔ تقریباً روزانہ ہی کوئی نہ کوئی مہمان آتا، عوام کے سامنے جھوٹ کا پلندہ رکھتا اور آرام سے گھر چلا جاتا۔ شو کے ساتھ ان کی بھی ریٹنگ بڑھتی رہتی۔ کان میں لگے ہیڈ فون میں پروڈیوسر صاحب بریک لینے کا کہہ رہے تھے۔

ناصرہ ہمدانی حب الوطنی و دردمندی پر تھوڑی سی تقریر جھاڑنے کے بعد اب اپنی تعریفوں کے پل باندھنے میں مصروف تھیں۔ بمشکل انہیں چپ کروا کے اس نے بریک لی۔ بریک کے دوران وہ یہی سوچ رہی تھی کہ مسز ہمدانی کی باتوں کو کل کہاں کہاں ڈسکس کیا جائے گا۔ کسی اپر کلاس گھرانے میں، دفاتر



میں انگلش میڈیم اسکول میں انہیں رول ماڈل بنا کر پیش کیا جائے گا۔ ان کی 'آزادیٔ نسواں' کے نام پر بے ہودہ خدمات کو خراج تحسین پیش کیا جائے گا۔ بڑے فخر سے کہا جائے گا کہ اس این جی او نے بیرون ملک سے ایوارڈ جیتا ہے۔ ملک کا نام روشن کیا ہے۔۔۔ ان این جی اوز کو جہاں سے فنڈز ملتے تھے وہیں سے ایوارڈ بھی مل جاتے تھے مقاصد پورے کرنے کے انعام میں۔۔۔ اور یہ مقاصد بھی فنڈز اور ایوارڈ کی طرح باہر والوں کے ہی ہوتے تھے۔

☼ ☼ ☼

"آپ ہادی ملک ہیں، ہے ناں؟" پرجوش نسوانی آواز پر وہ تیزی سے مڑا۔ پیچھے پانچ لڑکیوں کا گروپ کھڑا تھا۔ پانچوں کی پانچوں مسرت اور حیرت کے ملے جلے تاثرات لیے دیکھ رہی تھیں۔

"کوئی شک؟" وہ مسکرایا۔ وہی دل موہ لینے والی مسکراہٹ۔

"نہیں کوئی شک نہیں۔ بس مارے خوشی کے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ ہم آپ کو ٹی وی کے بجائے اپنے سامنے دیکھ رہے ہیں اپنی آنکھوں سے۔" سیاہ اسکارف والی لڑکی کی تو حالت ہی غیر ہو گئی تھی خوشی کے مارے۔

"آپ کو پتا ہے ہم آپ کے کتنے بڑے فین ہیں۔ یقین کریں ہم میں سے کوئی بھی نیوز چینل نہیں دیکھتا مگر جب سے آپ شو کر رہے ہیں ہم ضرور دیکھتے ہیں۔۔۔ بہت اچھا شو کرتے ہیں آپ۔" اب کے نیلی شرٹ والی نے کہا۔

"شکریہ۔ آپ نے میرے کام کو پسند کیا، خوشی ہوئی۔" فارمل سے جملے بول کر اس نے جانا چاہا مگر وہ سب آٹو گراف لینے پر بضد ہو گئیں۔ پین نکال کر تیزی سے الفاظ گھسیٹنے لگا وہی مخصوص الفاظ۔

"Love your motherland
as you love your mother"
hadi malik

(اپنی مادر وطن سے ایسے ہی محبت کریں، جیسی اپنی ماں سے کرتے ہیں۔ ہادی ملک)

"پلیز ایک کپ کافی پی لیں ہمارے ساتھ، پلیز سر!" سیاہ اسکارف والی لڑکی کچھ زیادہ ہی فین تھی اس کی اپنی نرم دلی کے باعث اسے انکار کرنا بہت مشکل لگا، وہ جلدی میں تھا۔

"نہیں پلیز۔ یہ ممکن نہیں ہے۔ مجھے جلدی ہے۔" بڑے عاجزانہ لہجے میں معذرت کی تھی۔

ان سب نے دل پر پتھر رکھ کر اجازت دے دی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ تیمور حیدر سے ملنے آیا تھا اور راستے میں پہلے ہی ٹریفک جام میں پھنس گیا تھا اوپر سے یہ لڑکیاں۔۔۔

سات ماہ پہلے وہ اس فیلڈ میں آیا اور سات دنوں میں ہٹ ہو گیا تھا۔ رات کو دو گھنٹے کے لائیو شو "دی ٹروتھ" میں وہ جس طرح سیاستدانوں، بیوروکریٹس اور نام نہاد دعوے داروں کے 'چھکے چھڑاتا'، بے مثال تھا۔ اوپر سے اس کے پاس ہر چیز کا ثبوت ہوتا تھا۔ ہر خبر پورے تصدیق اور ثبوت کے ساتھ دیتا۔۔۔ ہر جگہ اس کے چرچے تھے۔۔۔ سیاستدانوں کو اگر وہ ناپسند تھا تو عوام کو اتنا ہی پسند۔۔۔ لڑکیوں میں اس کی آنکھیں اور مسکراہٹ مشہور تھیں تو لڑکوں میں ڈریسنگ۔ علمی حلقوں میں اس کی باتیں ڈسکس ہوتی تھیں تو سیاسی حلقوں میں الزام عائد کیے جاتے کہ اس کے رابطے انٹیلی جنس والوں سے ہیں، ایجنسیاں اسے اتنی معلومات اور ثبوت فراہم کرتی ہیں۔

پلازہ کے سیکنڈ فلور پر اسے تیمور نظر آ گیا تھا۔ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔

"میرا خیال ہے گھڑی باندھنے کا تمہیں کوئی خاص فائدہ نہیں۔" تیمور نے ناراض لہجے میں کہا۔ وہ ہنستے ہوئے اس کے گلے لگ گیا۔

"سوری یار بس کچھ فینز مل گئے تھے۔" اس نے معذرت کی۔

"اچھا خیر لیے لو تمہارے مطلوبہ ڈاکومنٹس۔" تیمور

نے فائل اسے تھمائی اور تیز تیز قدم اٹھاتا وہاں سے چلا گیا۔ ہادی کے چہرے پر دبا دبا سا جوش ابھر آیا۔ اس نے تیمور کو نہیں روکا تھا۔ وہ جانتا تھا وہ ڈیوٹی پر ہے۔

☼ ☼ ☼

"کیا تم سرداور کی اسائنمنٹس مکمل کر چکی ہو؟" سارہ نے ہوائیاں اڑاتے چہرے کے ساتھ پوچھا۔ یقیناً" وہ خود نہیں کر کے لائی تھی۔

"ہاں کر چکی ہوں۔" اس نے مخصوص دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ نظریں دروازے پر تھیں منتظر سی۔ جواب سن کر سارہ پرسکون ہو گئی۔ یعنی نو محنت، اسی کی دیکھ کے بنا لوں گی آرام سے۔ وہ مڑ کر اپنی سیٹ پر چلی گئی اور دو سہیلیوں کے ساتھ گپ شپ کرنے لگی البتہ فراریہ وہیں بیٹھی رہی۔ کلاس میں کسی کے ساتھ اس کی دوستی نہیں تھی۔ ہاں، دل اور آنکھیں منتظر رہتی تھیں خاموشی سے۔۔۔ ایک سارہ تھی جو خود ہی آ کر اس سے بول لیتی تھی ورنہ تو وہ خاموش ہی رہتی یا پھر سنتی رہتی۔ سب کو نہیں صرف مراد ملک کو۔۔۔ اور یہ بات تو وہ خود سے بھی چھپا لیتی کہاں مراد ملک جیسا ذہین اور بے حد سوشل اسٹوڈنٹ اور کہاں وہ۔۔۔ ایک ٹی وی ہوسٹ کی بہن۔ وہ جانتی تھی کہ اگر وہ سب سے فرینک ہو گی تو لوگ اس کی فیملی کے متعلق پوچھیں گے اور جب انہیں پتا چلے گا کہ وہ ایکٹریس اور ہوسٹ سعدیہ حسن کی بہن ہے تو پھر۔۔۔

تو پھر اس سے فلرٹ کرنے کی کوشش ہر کوئی کرے گا مگر عزت کوئی نہیں کرے گا۔ سر سے پھسلتی چادر اس نے دوبارہ سر پر جمائی۔ سرداور اندر داخل ہو رہے تھے۔ مطلب آج وہ نہیں آیا۔۔۔ مراد ملک کب اسے اتنا اچھا لگا تھا اسے یاد نہیں رہا تھا لیکن یہ پسندیدگی بس اسی تک محدود تھی۔ مراد کو تو شاید پتا بھی نہیں تھا۔ پتا بھی ہوتا تو کیا ہوتا۔ وہ یونیورسٹی کا سب سے مشہور اسٹوڈنٹ تھا، ایک اچھا پلیئر، ایک اچھا مقرر، گروپ لیڈر اور ہادی ملک کا بھائی۔۔۔ اوپر سے اس کے انداز

ہزاروں مرتی تھیں تو وہ کس کھاتے میں تھی۔۔۔

وہ بے توجہی سے لیکچر نوٹ کر رہی تھی۔ آج کا آنا ضائع گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"یہ ساتھ والوں کی لڑکی میرے ہاتھوں ہی قتل ہو گی۔ لکھ لو۔" وردہ نے دہائی دی۔

"تمہارے نوکر نہیں ہیں ہم۔ خود لکھ لو۔" مراد نے ریموٹ اس کے ہاتھ سے چھینا۔ جواباً" وہ چیخ اٹھی تھی۔

"واپس کریں میرا ریموٹ، میں نے ڈراما دیکھنا ہے۔" احتجاجی صدا بلند کی مگر وہ مراد ہی کیا جو سن لے۔

"آئینہ دیکھ لو جا کے۔ اتنا ہی شوق ہے ڈرامے دیکھنے کا تو۔" وہ نیوز چینل لگا چکا تھا۔

"میں ہادی بھائی کو بتاتی ہوں۔" دھمکی دی گئی۔

"بتا دو۔۔۔ ہادی بھائی کی چمچی!" اس نے اور چڑایا۔

"ابا! دیکھیں بھائی کو۔" اب کے اس نے باآواز بلند ابا کو بلایا۔ ابا فوراً" اندر آئے مگر پھر وہیں جم گئے خبریں دیکھنے کے لیے۔۔۔

اف۔۔۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر باہر آ گئی۔

کوئی چوتھی مرتبہ اس نے پاس ورڈ ڈالا مگر کمپیوٹر کنیکٹ ہی نہیں کر رہا تھا۔ وہ لب بھینچ کے بیٹھا رہا۔۔۔ ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ تیمور نے غلط انفارمیشن دی تھیں مگر پھر۔۔۔ کیوں ویب سائٹ کنیکٹ نہیں ہو رہی تھی۔ ایک لمحے کو خیال آیا، تیمور سے ہی پوچھ لے مگر پھر رک گیا۔ آج کل وہ اہم مشن پہ تھا۔ اس سے رابطہ مشکل ہی تھا۔ تیمور ایم آئی (ملٹری انٹیلی جنس) کے سیکرٹ ونگ میں تھا۔ بطور ایجنٹ اس کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ ہادی کا بہترین دوست تھا مگر خفیہ۔۔۔ بظاہر وہ امپورٹ ایکسپورٹ کے بزنس سے جانا جاتا تھا۔

آخری کوشش کرتے ہوئے اس نے دوبارہ پاس ورڈ داخل کیا۔۔۔ اوہ۔۔۔ کمپیوٹر کنیکٹ کر رہا تھا۔ وہ پرجوش سا آگے جھک گیا۔ تقریباً" پانچ منٹ بعد اس کی

بھیجی گئی ریکویسٹ قبول کرلی گئی تھی۔

"Who is there "

اسکرین پر جگمگایا۔۔۔

اس نے اپنا نام، چینل کا نام اور جرنلسٹ لکھ کر بھیج دیا۔۔۔

اوکے لکھا آیا تھا۔ وہ خوش ہوگیا۔

"آپ کو جلد جواب دے دیا جائے گا۔" اگلا جواب آیا۔۔۔ پُرجوش ہو کر اس نے ڈائریکٹر کو فون کیا۔

"تقریباً" سیونٹی پرسنٹ کامیابی سمجھ لیں رضا صاحب!" لہجے میں دبا دبا جوش تھا۔۔۔ دوسری طرف رضا حیات محاورتاً "نہیں حقیقتاً" اچھل پڑے۔

"کیا واقعی؟" بڑی حیرت سے پوچھا گیا۔

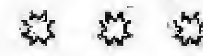
"ہاں واقعی۔۔۔ بس کل تک پتا لگ جائے گا۔" وہ پُریقین لہجے میں بولا۔

"اگر ایسا ہو جائے تو تم جانتے نہیں کہ ہمارے چینل کی ریٹنگ کتنی بڑھ جائے گی مگر۔۔۔ ایک بار پھر سوچ لو ہادی۔۔۔ بہت بڑا رسک ہے۔" وہ فکر مند ہوئے۔

"رسک ہی تو لائف ہے۔" اس نے معنی خیز لہجے میں کہا اور دعائیہ کلمات کہہ کر فون بند کردیا۔

ان دنوں کراچی میں ایک تنظیم نے قتل و غارت کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ ٹارگٹ کلنگ اور بھتہ خوری اپنے عروج پر تھی۔ جگہ جگہ ہونے والے دھماکوں نے پورے شہر کے لوگوں کو ہراساں کر رکھا تھا۔ ان حملوں کے بارے میں انٹیلی جنس رپورٹس پہلے سے ہی بتا دیتی تھیں مگر پھر بھی مجرم نہ پکڑے جاتے۔۔۔ البتہ حملہ ہونے کے بعد انٹیلی جنس والوں کو تنظیم کی طرف سے ایک نئے حملے کا پیغام مل جاتا اور ساتھ ہی پرانے حملے کی ذمہ داری بھی قبول کرلی جاتی۔ تنظیم کی جانب سے یہ سارے بیانات ایک خفیہ ویب سائٹ سے بھیجے جاتے تھے کبھی کبھار کوئی ویڈیو بھی بھیج دی جاتی۔ البتہ وہ ٹریس نہ ہو پاتے۔

کیپٹن تیمور سے وہ اسی ویب سائٹ اور اس کی پروسیسنگ کا طریقہ پوچھ کر آیا تھا اور ساتھ میں تفصیلات لے آیا تھا۔ ریکویسٹ میں اس نے اس تنظیم سے ایک انٹرویو کی درخواست کی تھی کسی اہم ممبر کی۔ طریقہ کار کے مطابق وہ اپنی مخصوص گاڑی بھیج کر صحافی کو لے جاتے اور بے ہوش کر دیتے۔ انٹرویو لے کر دوبارہ بے ہوش کر کے واپس چھوڑ جاتے۔ ایسے میں صحافی سے رازداری کا وعدہ لیا جاتا کہ وہ انٹرویو سے پہلے کسی کو یہ نہیں بتائے گا۔۔۔ اگر بتائے گا تو نقصان اٹھائے گا۔ کیونکہ ان لوگوں کے ہاتھ بہت لمبے تھے، اگر صحافی ایک آدھ اڈے کے بارے میں بتا دیتا اور پولیس اسے تباہ کر بھی دیتی تو ان کو کوئی فرق نہ پڑتا۔۔۔ ان تمام خطرات کے باوجود ہادی ان کا انٹرویو کرنا چاہتا تھا۔



بھکاری کے روپ میں یہاں بیٹھے اسے سات گھنٹے ہوگئے تھے۔۔۔ مشکوک آدمی تو کیا مشکوک چڑیا بھی نظر نہ آئی۔۔۔ ناظم آباد کا یہ آباد روڈ تھا جہاں کچھ دنوں میں حملے کی اطلاعات تھیں۔۔۔ جگہ جگہ مشکوک نقل و حرکت چیک کرنے کے لیے ایجنٹ تعینات کر دیے گئے تھے۔ اس کی قسمت وہ بھکاری بن گیا تھا۔ سفید مصنوعی داڑھی، سفید بال، سبز میلا چولا، گلے میں مالائیں، ہاتھ میں پکڑا برتن، ہاتھوں پر اور گلے پر چلی ہوئی اسکن کا خول اور اچھی بھلی قدرتی ٹانگ پر مصنوعی ٹانگ کا حصار۔۔۔ ایک قابل رحم حالت۔۔۔ اسے کراہیت سی آئی یکدم خود سے مگر یہ اس کی جاب کا حصہ تھا۔۔۔ "لے بھئی کیپٹن تیمور! اسی کی کمی تھی بس۔" سفید یونیفارم میں ملبوس لڑکیوں کا گروہ اس طرف آتا دکھائی دیا۔ گرلز کالج کی چھٹی ہو چکی تھی۔ ان میں سے کچھ لڑکیاں یونہی آگے گزر گئیں مگر ایک رکی اور جھک کر اس کے برتن میں سکے ڈالنے لگی۔ سکے ڈال کر وہ اٹھنے لگی تھی کہ رک گئی۔۔۔ وہ وجد میں سر ہلاتے ہوئے بھی اس کا رکنا محسوس کرچکا تھا۔ خطرے کے سائرن کہیں اِدھر اُدھر بجنے لگے۔

"باباجی۔۔۔ اس عمر میں بھی آپ کی ہنسلی کی ہڈی تو بہت نمایاں ہے۔" لڑکی نے بغور اس کی گردن کو دیکھتے ہوئے کہا۔ تیمور کو کرنٹ لگا تھا۔۔۔ کون تھی اتنی فرصت سے یہ دیکھنے والی۔۔۔ اس نے فوراً" سر روکا۔ نظریں لڑکی کی سیاہ گھورتی آنکھوں سے ٹکرائیں تو ایک طویل سانس اس کے حلق سے نکل گیا۔۔۔ البتہ سامنے کھڑی لڑکی کو اب جھٹکا لگا تھا۔۔۔ اتنے کمزور، لاچار، قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے باباجی کی اتنی روشن، تازہ دم چمکتی آنکھیں۔۔۔ ادھر وہ مسکراہٹ دبا رہا تھا۔

وہ پہچان چکا تھا اسے۔۔۔ سامنے کوئی اور نہیں ہادی کی چھوٹی بہن وردہ کھڑی تھی۔ وہ اسے نہیں جانتی تھی، جانتا تو وہ بھی نہیں تھا مگر ہادی کی فیملی البم وہ دیکھ چکا تھا، اور ہادی نے بطور خاص اسے اپنی اکلوتی لاڈلی بہن کے بارے میں بتایا تھا۔

"کیا ہوا باباجی؟" وہ یوں دیکھنے پر گھبرا گئی۔۔۔

"کچھ نہیں بیٹا۔۔۔ جاؤ گھر جاؤ اپنے۔" اس نے نحیف و نزار لہجے میں دل پر پتھر رکھ کر اسے بیٹا کہا۔۔۔ نظریں اب بھی اس کے بھولے چہرے پر تھیں۔ وہ بھی اس بوڑھے میاں کی اتنی بولتی آنکھوں سے گھبرا گئی تھی، اسی لیے فوراً" اٹھی اور چلی گئی۔۔۔ پیچھے وہ مسکرا رہا تھا۔ چلو کچھ تو اچھا ہوا ہی تھا آج۔۔۔ البتہ وہ پریشان سی جا رہی تھی۔ عادت کے مطابق اس کی پہلی نظر گئی ہی اس ہڈی پر تھی۔



"سعدیہ! جاگ رہی ہو اب تک، صبح شوٹ پر نہیں جانا کیا؟" اس نے بیڈ پر ساکت بیٹھے اس کے وجود کو ہلایا۔

"یہ سردیاں اتنی خاموش کیوں ہوتی ہیں فرواریہ۔۔۔ کچھ بولتی کیوں نہیں ہیں۔۔۔ چپ کیوں رہتی ہیں؟" خالی خالی آنکھوں سے وہ فرواریہ کو دیکھ رہی تھی۔

"کیا ہو گیا ہے۔ کیوں ایسی باتیں کر رہی ہو۔" اسے خوف سا آیا تھا اس کی حالت دیکھ کر۔

"جاؤ سو جاؤ تم جا کر۔" سعدیہ نے اس کا کندھے پر رکھا ہاتھ جھٹکا اور لیٹ گئی۔ وہ بھی مایوس سی بستر پر آگئی اور آنکھیں موند لیں۔ آنکھیں بند کرتے ہی چھم سے مراد ملک کا سراپا سامنے آگیا۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔۔۔ "یا اللہ مجھ پر رحم کر۔ مزید دکھ اٹھانے کی ہمت نہیں ہے مجھ میں۔" اس نے آنسو بہاتی آنکھوں سے فریاد کی۔۔۔ دو سال پہلے ابا کی وفات ہوئی تو طارق بھائی نے گھر سنبھال لیا تھا مگر مہر آپا کی خودسری اتنی بڑھ گئی کہ وہ گھر سے بھاگ گئیں۔

طارق بھائی نے انہیں ڈھونڈ نکالا، مگر گھر لا کر جان سے مار ڈالا۔ بہن قتل ہوئی۔ بھائی پھانسی چڑھ گیا۔ ٹی وی پر ایک دن کے لیے ہیڈ لائن بھی چل گئی "غیرت کے نام پر قتل۔" اماں کو یہ صدمے ہی اللہ کے پاس لے گئے۔ پیچھے رہ گئیں وہ دونوں۔۔۔ بہن کے اس عمل سے جو رسوائی و ذلت اٹھانی پڑی۔ وہ الگ اس کے بعد لوگوں کے طنزیہ سوالات، ہوس بھری نظریں، کردار کشی۔

سعدیہ کو گریجویشن کرنے کے بعد بھی جاب نہ ملی تو ایک دوست کے توسط سے ماڈلنگ کی آفر اس نے فوراً" قبول کرلی۔ پھر ایکٹنگ اور پھر ہوسٹنگ۔۔۔ یہ تینوں کام اس نے ساتھ ہی شروع کردیے۔ پیسہ بھی آگیا، شہرت بھی، نام نہاد عزت بھی، مگر وہ خود اپنی نظروں میں گر گئی تھی۔ پکا ارادہ تھا کہ فرواریہ کے ایم ایس سی سائیکالوجی کے بعد وہ باہر شفٹ ہو جائیں گی۔ وہاں انہیں کوئی نہ جانتا ہو گا نہ پہچانتا ہو گا۔۔۔ پھر وہ اپنا گھر بنا کر سکون سے جی لیں گی۔۔۔

ماضی کی تلخ بھول بھلیوں میں کھوئے کھوئے ہی نیند کی دیوی اس پر مہربان ہوئی تھی۔ وہ سو گئی تھی نجانے کب۔



آج پریزنٹیشن کا دن تھا۔ سر جس اسٹوڈنٹ کو بھی اٹھا کر پریزنٹیشن کا کہہ دیتے، اسے ضرور دینی پڑتی۔ اس وقت کلاس کا سب سے سنجیدہ لڑکا وقار احمد وائٹ بورڈ کے پاس کھڑا بول رہا تھا۔ پروفیسر ابراہیم نے اسے موضوع دیا تھا۔ "بھوک۔"

اگلا نمبر فزاریہ کا آگیا۔

روسٹرم پر جاتے ہی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ اس کو بھی 'بھوک' کا ہی موضوع دیا گیا تھا۔ وہ کچھ لمحے چپ کھڑی رہی۔ کیا تھی بھوک؟ کوئی جانتا تھا یہاں؟ وہ جانتی تھی 'بس صرف وہ' مگر بول نہیں سکتی تھی۔ ہمت کر کے اس نے مارکر اٹھایا اور وائٹ بورڈ پر کچھ بنانے لگی۔ سب حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔ اور جب وہ بنا چکی تو ایک لمحے کے لیے کلاس میں سکوت چھا گیا تھا۔ وہ کانپتے کانپتے پلٹی... پھر۔ اس کی دنیا کا سب سے بڑا معجزہ ہوا۔

مراد ملک کھڑا ہوا' تالیاں بجائیں اور پیچھے ساری کلاس کھڑی ہوگئی۔ حتیٰ کہ کرسی پر بیٹھے سر ابراہیم بھی۔ مگر وہ کہاں دیکھ رہی تھی ان کو... نظروں میں بس ایک منظر بس گیا تھا۔ کھڑا ہوا مراد ملک اور اس کی بجتی تالیاں' جبکہ ساری کلاس بورڈ پر اس کی بنائی ہوئی تصویر دیکھ رہی تھی۔

تصویر میں ایک کتا ہڈیاں اور گلے سڑے فروٹ کھا رہا تھا۔ ان خراب چیزوں کا ڈھیر تھا۔ قدرے فاصلے پر ایک روتی بلکتی بچی اور بدحال ماں بیٹھی تھیں۔ ماں کا ایک ہاتھ کتے کے آگے پڑے فروٹ اٹھانے کی کوشش میں تھا۔ نیچے الفاظ تھے۔

"یہ ہے بھوک۔" کمرا اب بھی تالیوں سے گونج رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اسکرین پر سب نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ تین دن پہلے تیس کروڑ کی رقم اور فائلز الحبیب گروپ آف کمپنیز سے اڑالی گئی تھیں۔ آج اس کی سی سی ٹی وی ویڈیو ہادی کو مل گئی تھی جس میں چوری کرنے والا لڑکا نہیں ایک لڑکی تھی۔ اسکرین پر منظر چل رہا تھا۔

سرخ فراک پہنے لڑکی چپ چاپ اس حصے کی جانب بڑھ رہی تھی' جہاں فائر الارم تھا۔ بہت احتیاط سے اس نے جیب سے لائٹر نکالا اور ادھر ادھر دیکھا۔ سب اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ لوگ سکون سے آجا رہے تھے۔ کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ لائٹر اس نے فائر الارم کے قریب کیا۔ آگ کو ڈیٹیکٹ کرتے ہی فائر الارم پوری قوت سے بج اٹھا۔ ساتھ ہی پوری بلڈنگ میں ہلچل مچ گئی۔

لوگ باہر بھاگ رہے تھے۔ افراتفری میں کوئی کسی کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ بڑی تیزی سے وہ لڑکی مڑی' کسی آفس آئی' بریف کیس اٹھایا' اپنے گلے میں لٹکتے ہار کو کھولا اور پینڈنٹ نکالا۔ وہ پینڈنٹ نہیں فلیش تھی۔ اس نے تیزی سے اسے کمپیوٹر سے کنیکٹ کیا' فائلز کاپی کیں اور نکل گئی۔

ویڈیو دیکھنے کے بعد ہادی نے ہونٹ بھینچ لیے۔ بڑی پھرتیلی لڑکی تھی۔ ایک تنظیم نے اس کی بھی ذمہ داری قبول کرلی تھی۔

"سوچ لو ہادی! ایک بار پھر' کہیں وہ لوگ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچادیں۔ تم دیکھ چکے ہو ناں۔ کس قدر شاطر ہیں وہ۔"

رضا حیات اب بھی فکر مند تھے مگر وہ فیصلہ کر چکا تھا۔ کل وہ جا رہا تھا شیروں کی کچھار میں۔ آج صبح ہی اسے مقررہ جگہ بتایا گیا تھا۔

آگے کیا ہوگا' وہ نہیں جانتا تھا۔

☼ ☼ ☼

یوں لگ رہا تھا جیسے آنکھوں کو کسی نے گوند سے بند کر دیا ہو۔ بمشکل بھاری ہوتے سر کے ساتھ اس نے آنکھیں کھولیں اور ادھر ادھر دیکھا۔ یہ ایک خالی کمرا تھا' بالکل خالی۔ وہ نیچے فرش پر لیٹا ہوا تھا۔ شعور کی چمک واپس آتے ہی وہ اٹھ بیٹھا۔ پتا نہیں کون سی جگہ تھی یہ... لب بھینچے اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے ہاتھ جیب میں ڈالا اور ساتھ ہی ایک طویل سانس لیا۔ جیب میں نہ اس کا والٹ تھا نہ موبائل نہ ہی شناختی کارڈ۔

تب ہی قدموں کی چاپ پہ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ کچھ لمحوں بعد ایک لمبا تڑنگا مضبوط جسامت کا آدمی اندر داخل ہوا۔ دو کرسیاں رکھیں اور مڑ گیا۔

"رکو" ہادی نے بے اختیار پکارا۔ وہ رک گیا۔

"کون مجھے انٹرویو دے گا؟" ہادی نے پوچھا۔ مقابل کے چہرے پر سرد تاثرات تھے۔

"ڈیزی۔" اسی سرد لہجے میں جواب آیا۔

"مگر مجھے تو کہا گیا تھا کہ کوئی اہم عہدے دار انٹرویو دے گا۔ یہ ڈیزی کون ہے؟" ہادی نے ہونٹ چباتے ہوئے پوچھا۔

"تمہیں جو کہا گیا تھا' صحیح کہا گیا تھا۔ ڈیزی ایک اہم عہدیدار ہے۔" ایک بار پھر جواب آیا۔

"کیا عہدہ ہے اس کا تنظیم میں؟" ڈیزی کے انٹرویو سے پہلے وہ اس کا ہی انٹرویو لینے لگا۔ آدمی کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھر آئے تھے۔

"وہ تین گروپس کی چیف ہے۔" کھڑے لہجے میں اس نے کہا اور پھر مڑنے لگا۔

"سنو! بس آخری سوال۔ کتنے گروپ ہیں تمہاری تنظیم کے؟" ہادی نے پوچھا۔

"بہت ہیں۔ ہر گروپ کا الگ چیف ہوتا ہے۔ البتہ ڈیزی کے انڈر تین گروپ ہیں... تم کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ وہ آنے والی ہے۔"

اس نے کہا اور مڑ گیا۔ ہادی اٹھ کر کرسی پر بیٹھ گیا پھر بغور کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ یہ بالکل بند چوکور کمرا تھا جس میں ایک دروازہ تھا۔ دروازے پر نظر پڑتے ہی وہ ٹھٹکا۔ عین دروازے کے اوپر بنی سلور سی دھاری۔ مطلب کیمرا نصب تھا۔ وہ کوئی بھی غلط قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہی آدمی واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ٹیپ ریکارڈر تھا۔

"مجھے میرا موبائل لا دو۔ اس میں ریکارڈر موجود ہے۔ میں اس میں ہی انٹرویو ریکارڈ کروں گا۔" ہادی نے ٹیپ ریکارڈر دیکھ کر کہا۔ مگر آدمی نے کوئی جواب نہ دیا اور ریکارڈر رکھ کر مڑ گیا۔ پھر پانچ منٹ بعد وہ آگئی۔

ہادی نے سر اٹھا کر کمرے میں داخل ہوتے وجود کو دیکھا پھر ایک لمحے کے لیے ساکت ہوگیا۔ بلیو جینز کے ساتھ گھٹنوں تک آتی بلیک شرٹ' چمکتی شفاف رنگت پر کانچ جیسی آنکھیں... وہ سو فیصد وہی تھی جس کی سی سی ٹی وی ویڈیو وہ کل دیکھ کے آیا تھا۔ جس نے الحبیب گروپ آف کمپنیز کو کنگال کیا تھا۔ اس کے یوں دیکھنے پر اس کے بے تاثر چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرا۔ وہ آکر کرسی پر بیٹھ گئی عین اس کے سامنے۔

"پوچھو۔" بڑے شاہی انداز میں کہا گیا۔

"الحبیب کمپنیز کو تم نے لوٹا تھا ناں؟" وہ سارے سوال چھوڑ کر اس بات پر اتر آیا۔ لڑکی کا چہرہ اب بھی پُرسکون تھا مگر آنکھوں میں تھوڑی الجھن سی آگئی۔

"ہاں۔ آگے کہو۔" اس نے اعتراف کرلیا۔

"تمہارا نام؟"

"تم پوچھ چکے ہو میرے آنے سے پہلے۔"

"اپنا اصلی نام بتاؤ؟"

"یہی میرا اصلی نام ہے۔"

"ڈیزی مسلمانوں کا نام نہیں ہوتا۔"

"تم سے کس نے کہا میں مسلمان ہوں؟" بے تاثر لہجے میں جواب آیا۔ ہادی چپ چاپ اسے دیکھے گیا۔ مانگ کے تھوڑا نیچے بنا ہوا محراب... وہ نمازیوں کا مخصوص نشان تھا اور وہ کہہ رہی تھی کہ وہ مسلمان نہیں ہے۔ وہ اس کی نظریں اپنے ماتھے پر محسوس کر چکی تھی۔

"بعض اوقات نظر آنے والی حقیقت صرف نظر کا دھوکا ہوتی ہے۔" اس کی نظروں کے جواب میں کہا گیا۔

"اوکے... مجھے علم نہیں کہ میں کس جگہ پر ہوں؟ مگر کیا یہ تمہارا ہیڈ کوارٹر ہے؟" اس نے بات آگے بڑھائی۔

"نہیں۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"پھر کہاں ہے؟"

"آگے پوچھو۔"

"کیا ڈیمانڈز ہیں تم لوگوں کی؟"

"ہمارے مقاصد تمہاری اپروچ سے اوپر کے ہیں۔ تمہیں سمجھ نہیں آئے گی۔" بڑے سکون سے جواب آیا۔ وہ تپ گیا۔

"معصوم لوگوں کو قتل کرنا' انہیں ٹارگٹ بنانا'

"گھر۔۔۔؟" وہ حیران ہوا۔

"ہاں گھر۔۔۔ تفصیل سنو ذرا۔ پرسوں سینٹرل جیل گیا میں۔ پچھلے پانچ سال کے ریکارڈ سے 2010ء کے ریکارڈ میں اس کا نام ملا۔ اپنے باس کو قتل کرنے کے جرم میں وہ گرفتار ہوئی تھی اور اس نے اعتراف جرم بھی کر لیا تھا۔ مزید لیڈی انسپکٹر نے بتایا کہ وہ فیکٹری میں اکاؤنٹنٹ تھی۔ اس کے باس نے۔۔۔ غلط ارادے سے ایک دن اسے لیٹ نائٹ کام کے لیے روک لیا اور پھر اس پر زور زبردستی کی کوشش کی۔ اس نے اپنے دفاع میں پیپر ویٹ باس کے سر پر مارا' بلیڈنگ زیادہ ہو گئی تو وہ اسے ہسپتال لے آئی اور آفس کے ایک اور عہدیدار کو بھی بلا لیا۔ مختصر یہ کہ اس آدمی کی ڈیتھ ہو گئی اور زینب کو اریسٹ کر لیا گیا۔ اس نے سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔۔۔" وہ رکا۔ ہادی بہت غور سے سن رہا تھا۔

"پھر؟ پھر کیا ہوا؟" اس کے رکتے ہی وہ بے چینی سے گویا ہوا۔ تیمور معنی خیز انداز میں مسکرا دیا۔

"پھر کیا۔۔۔ تمہاری خاطر دھکے کھاتا فیکٹری گیا۔ وہاں دس سالہ پرانے ملازم کو پیسہ دیا اور پوچھا تو اس نے مزید بتایا کہ وہ ایک بچی اور صاف گو لڑکی تھی۔ اس کا باپ مستری تھا اور باپ کی وفات کے بعد اس نے جاب شروع کی تھی۔ وہ اپنے دونوں بھائیوں کو پڑھانا چاہتی تھی مگر بیچ میں یہ سب ہو گیا اور۔۔۔" اس نے سانس لی۔

"اور اس کا ایک عدد منگیتر بھی تھا رافع۔۔۔ وہ اکثر اس سے ملنے فیکٹری آتا تھا۔ سنا ہے بہت چاہتا تھا اسے اور سنا ہے کہ وہ بھی انوالو تھی۔۔۔ وہ اس کی پھپھو کا بیٹا بھی تھا۔ حیثیت میں ان سے بڑھ کر تھا' مطلب زینب کے مقابلے میں امیر۔ جب یہ واقعہ ہوا تو اس کے گھر والوں نے بجائے اس کا ساتھ دینے کے اس سے تعلق توڑ لیا۔۔۔ بقول ان کے وہ عزت دار لوگ ہیں۔ ان کی بیٹیاں تھانے کچہری میں نہیں جا سکتیں۔ اس کے منگیتر نے بھی یہی کیا۔۔۔ اس کا منگیتر حالانکہ پولیس میں تھا مگر اس نے بھی اس کا ساتھ نہیں دیا۔

اسے عمر قید کی سزا ہوئی اور وہ بھائی جن کے لیے وہ دن رات محنت کرتی تھی۔ انہوں نے اس سے اخبار میں لاتعلقی کا اشتہار دے کر اسے اس کی ریاضتوں کا صلہ دے دیا۔۔۔ اس تنظیم کی ایک عورت جیل میں گرفتار تھی۔ اس نے زینب سے دوستی کر لی' جب تنظیم والوں نے اس عورت کو چھڑایا تو اس نے باہر جاتے ہی زینب کی رہائی کے انتظامات کرائے اور اسے وہاں سے بھگا لیا' پھر وہ ان کے لیے کام کرنے لگی اور اپنا نام ڈیزی رکھ لیا۔۔۔ مزید انٹیلی جنس انکوائری کے مطابق وہ اس تنظیم کی ایک بہت اہم کارکن ہے۔ اپنی شکست کا انتقام وہ پورے ملک سے لے رہی ہے۔ بڑے کم عرصے میں اس نے وہاں جگہ بنائی ہے اور ایک گڈ نیوز بھی ہے تمہارے لیے۔۔۔" تیمور مسلسل بولتے ہوئے رکا۔۔۔ وہ جیسے جیسے سن رہا تھا ویسے ویسے دکھ کے گہرے تاثرات اس کے چہرے پر ثبت ہوتے جا رہے تھے۔

"کون سی گڈ نیوز؟" اس نے بے توجہی سے پوچھا۔

"تم اس سے کانٹیکٹ کر سکتے ہو۔" وہ حقیقتاً اچھل پڑا۔

"کیا واقعی؟" بے یقینی اور حیرت سے بولا۔ تیمور مسکرا دیا۔

"ہاں۔۔۔ ان کی ویب سائٹس پر بھیجی جانے والی ساری میلز وہ پڑھتی ہے۔۔۔ بہت مشکل سے پتا چلایا ہے میں نے کہ اپنی تنظیم کی ویب سائٹس کو وہ کنٹرول کرتی ہے۔ اعلیٰ انٹیلی جنس رپورٹس کے مطابق ڈیزی سائبر کرائم کی ایکسپرٹ ہے اور نہ صرف دوسری ویب سائٹس ہیک کر لیتی ہے بلکہ کچھ ہی لمحوں میں اپنی ویب سائٹس کو کیموفلاج بھی کر دیتی ہے۔" تیمور نے مزید تفصیل بتائی۔۔۔ وہ تشکرانہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"بس بس تھینک یو مت کہنا اب۔۔۔ میرے یار کے دل کا معاملہ ہو اور میں کچھ نہ کروں۔۔۔ یہ تو ہو نہیں سکتا۔" وہ اس کا ارادہ بھانپ گیا تھا۔

"نہیں تیمور۔۔۔ تم بہت عظیم ہو۔ اپنی اتنی

مصروفیت میں تم نے میرے لیے وقت نکالا۔ رسمی شکریے کے لیے الفاظ نہیں ہیں میرے پاس۔۔۔ کچھ مانگ لو مجھ سے۔۔۔ کچھ بھی۔" شدت جذبات سے اس کی آواز بوجھل ہو گئی۔ تیمور مسلسل مسکرا رہا تھا۔ آنکھوں کی چمک اس آفر پر بڑھ گئی تھی۔

"مانگوں گا' بہت جلد۔۔۔ تیار رہنا۔" اس نے کہا۔ ہادی نے سر ہلا دیا وہ کچھ بھی دینے کے لیے تیار تھا۔

"میرا نام۔۔۔ میرا نام زینب فاطمہ ہے۔" کہیں قریب ہی آواز گونجی تھی۔ اس نے لب بھینچ لیے۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن وہ یونیورسٹی تو آ گئی تھی مگر چور نظروں سے مراد کو دیکھ رہی تھی' جو اشعر کے پاس کھڑا تھا۔ کچھ لمحوں بعد اس نے فزاریہ کی طرف دیکھا تو وہ تیزی سے نظروں کا رخ بدل گئی۔۔۔ وہ اس کی طرف بڑھا' اس نے گھبرا کر فائل پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔

"ہیلو مس فزاریہ! کیسی طبیعت ہے اب آپ کی؟" مسکراتا ہوا نرم لہجہ۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے نظریں سبز گھاس پر گاڑ دی تھیں۔

"اوہ ویل۔۔۔ آپ کی سسٹر کیسی ہیں؟" اگلا سوال پوچھا۔

"وہ بھی ٹھیک ہیں۔" مختصر جواب آیا۔

"میں کل آؤں گا آپ کی طرف۔" فزاریہ نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ وہ سنجیدہ تھا البتہ آنکھیں۔۔۔ اسے لگا وہ مسکرا رہی تھیں۔

"آپ کی سسٹر نے دعوت دی تھی۔" وہ یوں بولا۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ آپ کو تو توفیق نہیں ہوئی بلانے کی۔ وہ لڑبڑا گئی۔

"جی جی۔۔۔ ضرور ویلکم۔" اس نے گھبرا کر جواب دیا۔ وہ اب کھل کے مسکرا رہا تھا۔

"اوکے' کل ملاقات ہو گی پھر' بائے۔" مسکراتے لہجے میں کہہ کر وہ چلا گیا اور وہ وہیں کھڑی تھی گم صم۔۔۔ اس نے خود آ کے اس سے بات کی۔ وہ اس کے گھر آ رہا تھا خود۔۔۔ خوش ہونے کے بجائے وہ بے چین ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

پہلی ای میل چیک کرنے کے بعد جب دوسری کھولی تو جھٹکا لگا۔۔۔ میل اسی جرنلسٹ کی طرف سے تھی۔۔۔

"محبت اور اعتبار ہارنے کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ اپنی مٹی کو ہی روند دیا جائے۔۔۔ انتقام لینا تھا تو رافع سے لیتیں' اپنی بے بسی کا نشانہ اپنے ہی جیسے بے بس لوگوں کو کیوں بنا دیا۔"

وہ سن ہو گئی۔۔۔ مطلب وہ سب جان گیا تھا۔ چار میلز اور تھیں' سب کی سب ہادی ملک کی طرف سے۔

دوسری میل میں ایک چوبیس سالہ فوجی کی تصویر تھی۔ ساتھ میں کسی اخبار کی خبر تھی۔ "کراچی میں دہشت گردوں کے خلاف آپریشن میں کیپٹن محمد روحان شہید۔" نیچے لکھا تھا۔

"جانتی ہو اس شہید کی منگیتر کا نام بھی زینب فاطمہ تھا مگر اس میں منگیتر کی محبت سے زیادہ مٹی کی محبت تھی' جب ہی وہ شہید ہو گیا۔"

تیسری میل کھولی۔

"میں ہادی ملک ایک پاکستانی۔۔۔ تمہیں کہتا ہوں' دعوت دیتا ہوں لوٹ آؤ۔۔۔ میں تمہیں گارنٹی دیتا ہوں کہ تمہیں بچا لوں گا۔ جو لڑکی اپنی عزت کی خاطر جان لے سکتی ہے' اس کو چاہیے وہ اپنے پرچم کی عزت کے لیے سرینڈر کر دے۔ پاکستانی بیٹی کا دوپٹا اور پرچم' دونوں کی عزت ایک جیسی ہوتی ہے۔"

چوتھی میل کھولی۔

"پلٹ آؤ زینب فاطمہ! تم منافق نہیں ہو۔ سچی لڑکی ہو۔ عزت دار۔ ہمارا ساتھ دو' ان مجرموں کو پکڑواؤ' میں قسم دیتا ہوں تمہیں بچا لوں گا۔ پلٹ آؤ پلیز!"

آخری میل میں التجا تھی۔۔۔ وہ ساکت بیٹھی تھی بالکل۔۔۔ مسلمان لڑکی کی عزت اور پرچم۔۔۔؟

فیصلہ ہو چکا تھا پلٹنے کا۔ مگر وہ منافق نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

"کون ہے؟" نسوانی آواز پر وہ اپنی مسکراہٹ نہ روک سکا۔

"میں ہادی کا دوست ہوں' تیمور حیدر۔" باآواز بلند اس نے جواب دیا۔ وردہ نے دروازہ کھول دیا۔ ہادی بھائی کی ہدایت تھی کہ تیمور نام کے بندے کو فوراً" اندر لے آئے۔ وہ سر جھکائے اندر داخل ہوا اور پہلی نظر سرخ اور اسکن رنگ میں ملبوس اس لڑکی پر پڑی تھی۔ نظروں کے ارتکاز پر ورده نے بھی اس کی طرف دیکھا پھر وہیں ٹھہر گئی' نظر بھی اور وہ خود بھی... اسے کچھ محسوس ہوا تھا۔

"ہادی سے مل لوں؟" اس نے مسکراہٹ دبا کر اجازت چاہی۔

"جی... جی آیئے۔" وہ گڑبڑا کر اندر لے آئی... ڈرائنگ روم میں اسے بٹھایا اور ہادی بھائی کو بلانے مڑی مگر پھر رک گئی... بغور تیمور حیدر کو دیکھا۔

"آپ... آپ... آپ کے ابا فقیر ہیں؟" ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ اس نے پہلے حیرت سے اسے دیکھا پھر ایک بھرپور قہقہہ اس کے حلق سے نکلا تھا... ورده نے گھبرا کر لب بھینچے اور بھاگی ہادی کو بلانے... پیچھے وہ اب تک ہنس رہا تھا... تھوڑی دیر بعد ہادی آگیا اور اسے ڈیزی کو بھیجی جانے والی سیلز کا بتانے لگا۔

"تم نے کہا تھا میں تم سے کچھ مانگوں تو تم دو گے۔" تیمور نے وعدہ یاد دلایا۔

"ہاں ہاں کہا تھا۔" ہادی کو یاد تھا۔

"پرسوں امی ابا آرہے ہیں مانگنے' تمہاری بہن کا ہاتھ۔" بڑے مسکین لہجے میں اطلاع دی تھی... کچھ لمحے ہادی ناسمجھی سے اسے دیکھتا رہا اور جب سمجھا تو؟

"کیا... کیا واقعی... او یہ میری خوش قسمتی ہے اور تم بدمعاش اب بتایا کیوں نہیں۔" وہ اس پر چڑھ دوڑا۔ جواباً" تیمور ہنستا رہا۔ تب ہی ورده چائے اور دیگر لوازمات لے کر آگئی۔ دونوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر ورده کو' پھر دونوں ہنس پڑے... وہ کنفیوژ سی ہو کر باہر بھاگی۔ شاید ہادی بھائی کا دوست فقیر ابا والی بات بتا چکا تھا جبکہ تیمور ہادی کو پورا ناظم آباد والا قصہ سنا رہا تھا اور وہ ہنس ہنس کے دوہرا ہو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"بہت خوب صورت گھر ہے آپ کا' بہت اچھی ڈیکوریشن ہے۔" سعدیہ نے مسکراتے ہوئے تعریف وصول کی۔

"میرا خیال ہے مجھے چلنا چاہیے اب۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔" اس نے گھڑی دیکھی اور اجازت چاہی۔ پچھلے پون گھنٹے سے وہ آیا تھا اور اس سارے عرصے میں وہ اور سعدیہ باتیں کرتے رہے تھے جبکہ وہ گونگے کا گڑ کھا کر بیٹھی رہی۔

ہر نئی بات پہ دل دھڑک اٹھتا کہ کہیں وہ یہ نہ پوچھ لے کہ آپ کے گھر کوئی مرد نہیں ہے کیا؟ آپ کے امی ابا کہاں ہیں؟ صد شکر اس نے کچھ نہیں پوچھا اور چپ چاپ چلا گیا... گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے یاد آیا' وہ اندر بھول آیا تھا۔ یاد آتے ہی وہ تیزی سے اندر آیا مگر ڈرائنگ روم سے آتی آواز نے دروازے میں ہی اس کے قدم جکڑ لیے تھے۔

"پاگل ہو گئی ہو تم' اسے لڑکیوں کی کمی نہیں ہے جو وہ ٹی وی ایکٹریس کی بہن سے اور... اور تمہارے ٹی وی میں ہونے سے اسے کوئی پرابلم نہ بھی ہوا تو بھی' وہ فیملی کے متعلق ضرور جاننا چاہے گا۔ کیا بتاؤ گی تم اسے' بولو کیا بتاؤ گی؟" فرواریہ چیخ رہی تھی۔

"کیا کہو گی کہ ہماری آپا مہر گھر سے بھاگ گئیں' ہمارا معصوم بھائی ان کے پیچھے پھانسی چڑھ گیا۔ اماں تڑپ تڑپ کر مر گئیں اور ہم دونوں' نوالے نوالے کو ترسنے لگے تھے' اور پھر یہ بھی بتا دینا کہ تمہیں کہیں سے بھی اپنی ڈگری کی قیمت نہ ملی تو مجبوراً" عزت کی قیمت وصول کر کے گھر چلانے لگیں...." وہ پھوٹ پھوٹ کے رو رہی تھی' سعدیہ بھی ہچکیاں لے رہی تھی۔

"آئندہ مت بلانا اسے یہاں۔" وہ کہہ رہی تھی۔ وہ وہیں سے پلٹ گیا بوجھل قدموں کے ساتھ چشمہ وہیں رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

فون کی بجتی بیل نے گھر کا سناٹا توڑا تھا۔ شام سے وہ دونوں ایک دوسرے سے نظریں چرا رہی تھیں۔ سعدیہ نے ہاتھ بڑھا کر لاؤڈر کا بٹن آن کر دیا۔ ریسیور اٹھانے کا موڈ نہیں تھا۔ لاؤڈر کا بٹن آن ہوتے ہی ایک بوڑھی مگر فریش مردانہ آواز کمرے میں گونجی۔ وہ دونوں اچھل پڑیں۔

"السلام علیکم بیٹا!" آواز پر دونوں نے نظروں کا تبادلہ کیا۔

"وعلیکم السلام' جی کون؟" سعدیہ نے پوچھا۔

"ہم مراد کے ابا ہیں۔ سعدیہ بیٹی سے بات کرنی ہے۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔ حیرت سے سعدیہ کی آنکھیں پھٹ سی گئیں اور فرواریہ تو اپنی جگہ سے ہی کھڑی ہو گئی تھی۔

"جی میں... سعدیہ ہی بول رہی ہوں۔" اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ فرواریہ بھی اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی تھی۔

"بیٹا! کیسی ہو۔ ہم بہت شوق سے تمہارا شو دیکھتے ہیں۔ ماشاء اللہ بہت اچھا شو ہے۔" وہ تعریف کر رہے تھے۔

"جی... جی شکریہ۔" لمبے سے جی کے بعد اس نے شکریہ کہا۔ اب اور کیا کہتی۔

"اصل میں ہم تمہاری طرف آنا چاہتے ہیں اپنے بیٹے مراد کے لیے' امید ہے تم مایوس نہیں کرو گی... ہم فرواریہ کو اپنی بیٹی بنانا چاہتے ہیں۔" ذرا ٹھہر کر انہوں نے دھماکا کیا۔ اب کے فرواریہ کے ساتھ ساتھ وہ بھی گرتے گرتے بچی۔

"میرا بیٹا ایک اچھا لڑکا ہے... مزید چھان بین کروانی ہو تو کروا لینا بیٹا! پھر ہمیں اپنے فیصلے سے آگاہ کر دینا' اگر فیصلہ ہاں میں ہوا تو یہ ہماری خوش قسمتی ہو گی۔"

انہیں اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ اتنی عزت' اتنا اختیار ان دونوں کو بھی مل سکتا تھا زندگی میں۔ یہ تو سوچا ہی نہیں تھا۔

"آپ آجائیں' ہماری طرف سے ہاں ہے۔ ہمیں کوئی چھان بین نہیں کرانی۔ ہمیں آپ کی زبان پر یقین ہے۔" سعدیہ کو اپنے ہی لفظ اجنبی لگ رہے تھے۔

"اگر آپ کو ہماری فیملی کے متعلق جاننا ہے تو...." وہ کہتے کہتے رک گئی۔

"ہمیں جو جاننا ہے جان چکے اور ہماری دوسری بیٹی کو کہنا کہ زیادہ مت سوچا کرے.... باقی باتیں تمہارے گھر پر ہوں گی ان شاء اللہ۔" انہوں نے کہا۔ شدت جذبات سے ان دونوں کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے؟ کیسے ہو گیا سب؟ معجزے اس دنیا میں ہوتے ہیں۔ آج یقین آگیا تھا... اگلے دن وہ نروس سی یونیورسٹی گئی تھی۔ مراد اسے دیکھتے ہی پوری دلکشی سے مسکرایا۔ اس نے گھبرا کر نظریں جھکا دیں۔

"کیا ہوا؟" وہ پاس آگیا۔

"کک' کچھ نہیں۔"

"وہ سب' وہ آپ کے ابا' وہ... وہ میری فیملی تو۔" الفاظ بے ربط ہو رہے تھے۔

"وہ سب حقیقت تھا۔ میرے ابا تمہارے خواب میں نہیں' سچ مچ تمہیں فون کر رہے تھے اور باقی رہی فیملی تو.... مجھے نہ طارق بھائی سے کوئی پرابلم ہے اور نہ سعدیہ سے۔ طارق کو پھانسی ہوئی تو اس میں تم دونوں کا کوئی قصور نہیں اور مہر آپا اگر گھر سے بھاگیں تو اس میں بھی تمہاری غلطی نہیں۔"

وہ نئی صبح کا پیغام دے رہا تھا۔ فرواریہ سر جھکائے کھڑی تھی.... زندگی میں صرف غم نہیں ہوتے۔ کبھی نہ کبھی' کہیں نہ کہیں' کوئی نہ کوئی خوشی آپ کی منتظر رہتی ہے... بس اپنے غموں کے اندھیرے میں آپ دیکھ نہیں پاتے۔

☼ ☼ ☼

بڑا ہال کمرا، دیواروں پر لگی جا بجا اسکرینیں، جگہ جگہ نصب کیمرے اور فرش پر اسٹینڈنگ موونگ کیمرے' ان کے ساتھ کھڑے کیمرا مین' ہر اسکرین پر مختلف چینلز آ رہے تھے۔ یہ ایک نیوز اسٹوڈیو کا منظر تھا۔ ابھی شو شروع ہونے میں آدھا گھنٹہ تھا۔ وہ وہیں پروڈیوسر کے ساتھ کھڑا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ پچھلے کچھ دنوں سے ان کا چینل سب سے بڑا نیوز بریکر بن گیا تھا اور پروڈیوسر سارا کریڈٹ ہادی کو دیتے تھے۔ شو شروع ہونے میں پانچ منٹ تھے' جب اس کا فون بجنے لگا۔ اس نے تیزی سے آف کرنا چاہا مگر پھر تیمور کالنگ۔ دیکھ کر اس نے اٹینڈ کر لیا۔

"تم نے کہا تھا کہ زینب فاطمہ نے تمہیں کوئی جوابی میل نہیں بھیجی اور نہ ہی کسی اور طرح جواب دیا ہے؟" تیمور کی پریشان سی آواز آئی۔ وہ الرٹ ہو گیا۔

"ہاں میں نے کہا تھا اور یہ صحیح ہے۔" اس نے تصدیق کی۔

"اور تم نے میل میں یہ لکھا تھا کہ تم اسے بچالو گے" تیمور کی ایک بار پھر آواز آئی۔ اُدھر شو کا ٹائم ہو رہا تھا۔

"ہاں' ایسا ہی ہے۔ کیا ہوا ہے؟" وہ نا سمجھی سے بولا۔ نظریں ہاتھ پر جمی گھڑی پر تھیں۔

"زینب فاطمہ نے گرفتاری دے دی ہے۔ اپنے انڈر تینوں گروپس کی تفصیلات تو اس نے فراہم کی ہی ہیں مگر ساتھ ساتھ خود بھی اعتراف جرم بلکہ اعتراف جرائم کرتے ہوئے اس نے کہا ہے کہ سب سے پہلے سزا اسے ہی دی جائے۔ کیا تم نے اسے کہا تھا کہ تم اسے بچاؤ گے۔ اگر ایسا کہا تھا تو اس نے اپنی گرفتاری کیوں دی؟"

تیمور بول رہا تھا اور وہ... وہ وہاں نہیں تھا' کہیں اور پہنچ چکا تھا' بہت دور' بہت دور۔



ایک بار پھر وہی منظر تھا۔ وہی خالی کمرا' وہی دو کرسیاں۔ مگر حالات وہ نہیں تھے۔ یہ کراچی سنٹرل جیل کا ملاقاتیوں کا کمرا تھا۔ ایک بار پھر وہ اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ ایک بار پھر اس کے چہرے پر وہی سکون تھا اور ایک بار پھر وہ دل میں ہزاروں سوال لیے اس کے سامنے بیٹھا الفاظ ڈھونڈ رہا تھا۔

تین دن پہلے اس نے گرفتاری دی تھی اور اپنے پاس موجود ساری معلومات بھی۔ مگر وہ بضد تھی کہ اسے کسی خفیہ مقام پر رکھنے کے بجائے سنٹرل جیل میں رکھا جائے۔ اتنی اہم گرفتاریوں کے بعد یہ بات یقینی تھی کہ اس تنظیم کی طرف سے شدید ردعمل سامنے آئے گا اور پھر جہاں وہ پورے شہر میں قتل و غارت کا بازار گرم کریں گے۔ وہیں وہ ڈیزی کو بھی مارنے کی کوشش کریں گے اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ تنظیم والے انٹیلی جنس کے پیچھے پڑیں۔

"کیوں کیا تم نے ایسا؟ میں نے قسم دی تھی تمہیں کہ میں مدد کروں گا تمہاری۔ تمہیں یقین کرنا چاہیے تھا میرا۔"

وہ بمشکل بولا۔ آج اس کے سر پر سیاہ چادر تھی اور ماتھے پر بنا محراب نمایاں تھا۔ کچھ دیر وہ خاموش زمین کو گھورتی رہی پھر سر اٹھایا۔

"تم نے کہا کہ تم سچی لڑکی ہو۔ تم نے مجھے میل کر کے یہ بھی کہا کہ تم منافق نہیں ہو' تم پلٹ آؤ۔ تم وہ پہلے آدمی تھے میری زندگی میں جس نے میرے لیے کوشش کی۔ شکریہ مگر... میں نے آج تک کسی کا احسان نہیں لیا۔ اس لیے تمہاری بات مان کر میں پلٹ آئی اور تمہارے احسان کا بدلہ چکا دیا۔"

وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہی تھی۔ کانچ جیسی آنکھوں میں ایک بار پھر نمی تیر رہی تھی۔ ہادی نے کچھ بولنا چاہا مگر اس نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔ وہ بولنا چاہتا تھا' اتنی مشکلوں سے تو تیمور نے اس ملاقات کا بندوبست کیا تھا' مگر وہ بولنے نہیں دے رہی تھی۔

"تم نے کہا کہ تم مجھے بچالو گے' مگر میں منافق نہیں ہوں کہ اپنے ساتھیوں کو سزا دلوا دیتی اور خود بچ جاتی۔" آنکھوں میں تیرتی نمی مزید بڑھ رہی تھی' اس نمی کا اثر اس کی آواز میں بھی آ رہا تھا۔

"اپنی عزت بچانے کے لیے میں نے ایک جان لے لی' تم نے کہا کہ پاکستانی لڑکی کا دوپٹہ اور پرچم دونوں کی عزت ایک جیسی ہے۔ تم نے یہ بھی کہا کہ جیسے میں نے اپنی عصمت کے لیے قدم اٹھایا ویسے ہی اپنے پرچم کے لیے ایکشن لوں۔ اپنی عزت کے لیے جان لی تھی' پرچم کے لیے جان دوں گی تو ہی بات بنے گی نا۔" آنسو اس کے گالوں پر آ گئے تھے مگر وہ روک نہیں رہی تھی۔

"میرا باپ ایک مستری تھا۔ لوگوں کے گھر بناتا تھا۔ اکثر کڑی دھوپ ہوتی اور ابا اس شدید گرمی میں بھی گارے مٹی سے اٹا وجود لیے بڑی بڑی دیواریں تعمیر کرتا' بنیادیں مضبوط کرتا تھا' میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ ایک گھر بنانے والے کی بیٹی ہو کر میں ہزاروں گھر اجاڑوں گی۔ جس مٹی سے ابا کے ہاتھ اٹے رہتے' اسی مٹی پر میں خون کے دریا بہاؤں گی۔ میرے خون کے رشتوں نے جب اعتبار توڑا تو میں نے خود جانے کتنے رشتے توڑ دیے' کسی کا سہاگ' کسی کا بھائی' کسی کا بیٹا اپنے انتقام کی بھینٹ چڑھایا اور سب سے بڑھ کر... سب سے بڑھ کر اس مٹی کے بیٹوں کا خون اپنے سر لیا...." وہ اب ہچکیاں لے کر رو رہی تھی۔ کانچ جیسی آنکھوں کی سرخی بڑھ رہی تھی۔ یوں جیسے شیشے پر کوئی خون کی سرخ بوندیں ڈال رہا ہو۔

"اب تو مجھے کوئی نہیں بچا سکتا۔ تم یہاں مجھے بچا بھی لیتے تو اللہ کے ہاں مجھے کوئی نہ بچا پاتا۔ بہت قرض ہیں مجھ پر' جان دوں گی تو ہی کچھ کفارہ ادا کر پاؤں گی۔" وہ خود اذیتی کی انتہا پر تھی۔

"میں نے ڈیزی سے زینب فاطمہ کا واپسی کا سفر تمہارے کہنے پر شروع کرنا چاہا مگر میں نہیں کر سکی فاصلہ بہت تھا ہادی' مسافت بہت تھی۔" وہ رو رہی تھی۔ پہلی بار اس کے ہونٹوں سے اس کا نام نکلا تھا۔

"تم جاؤ یہاں سے۔ اس فوجی کی طرح تمہارے دل میں بھی فاطمہ نہیں مٹی ہونی چاہیے۔ جاؤ۔"

وہ بولی۔ وہ کچھ کہے بنا اٹھا اور باہر نکل آیا۔ گاڑی چلاتے ہوئے اسے اپنے گالوں پر نمی محسوس ہوئی۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر چھوا... وہ رو رہا تھا' دل کے بائیں جانب شدت کا درد اٹھا تھا۔ گھر پہنچتے پہنچتے اس نے دس بار اپنے گالوں پر نمی محسوس کی تھی۔



ایک کک فٹ بال کو لگی اور وہ سیدھا اڑتا ہوا بنچ پر بیٹھی عورت کے پاس آ گرا۔ کک لگانے والی پانچ سالہ بچی اس خاتون کے پاس آئی اور بڑے شائستہ انداز میں فٹ بال مانگا۔ بلیو جینز کے ساتھ گھٹنوں تک آتی قمیص' پونی ٹیل باندھے بڑی بڑی آنکھوں والی بچی پر ہر دیکھنے والے کو پیار آتا تھا۔ اس خاتون کو بھی آ گیا۔

"تمہارا نام کیا ہے بیٹا!" انہوں نے فٹ بال اسے پکڑا دیا۔

"میرا نام زینب فاطمہ ہے۔" بچی نے مسکرا کر جواب دیا۔ تب ہی اسے پیچھے سے آواز آئی۔

"زینب! واپس آؤ۔" اس کی مما بلا رہی تھیں۔ وہ دوڑتی ہوئی واپس آ گئی۔

"پاپا نہیں آئے آئس کریم لے کر؟" اس نے معصومیت سے ماں کو دیکھا۔

"میں آ گیا۔" ہادی نے پیچھے سے اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ہادی بھی ہنس رہا تھا اور ہادی کے پہلو میں کھڑی اس کی بیوی' زینب کی ماں سعدیہ حسن بھی ہنس رہی تھی۔ مراد اور درِ دانہ کی شادیوں سے فارغ ہو کر اس نے ساری زندگی اکیلے گزارنے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر پھر ابا کے کہنے پر ان کی پسندیدہ ہوسٹ سے شادی کر لی اور اسے اعتراف تھا کہ یہ ایک اچھا فیصلہ تھا۔ سعدیہ ایک اچھی بیوی اور اچھی ماں تھی مگر آج بھی... آج بھی کبھی کبھی اس کے دل میں کسک سی اٹھتی۔ کانچ والی آنکھیں اپنا حصار اس کے گرد باندھ لیتیں' پھر ہر طرف ایک ہی آواز گونجتی۔

"میرا نام... میرا نام زینب فاطمہ ہے۔"

کنیز نور علی

اندر کی آواز

"اگر تم کچھ کر نہیں سکتیں تو تمہارا یہ کرب جھوٹا ہے۔ اور ہر وقت چھائی رہنے والی یہ سستی' ناکارہ پن بے چارگی' خوف "ریاکاری سچ ہے۔"

یہ آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔ مگر یہ اس کے اندر سے ابھری تھی۔

"میرا کرب کیوں کر جھوٹا ہو سکتا ہے۔ یوں جیسے ہر وقت کوئی میرے دل کو کھرچ رہا ہو۔ اس میں چھید کر رہا ہوں۔ میری کھال کے نیچے ہر وقت آگ جلتی رہتی ہے۔ میرا پنڈا ہر وقت تپا رہتا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کچھ بن نہیں پڑتا۔ میرا کرب کیسے جھوٹا ہو سکتا ہے۔"

اپنے حال پر اس کی بے بسی رلانے والی تھی۔

"اگر تمہارا حال ایسا ہی ہے تو تم بدل جاؤ۔ کسی کی ویسی نہ رہو جیسی اس حال سے پہلے تھیں۔"

"میں تو بدلتی ہوں لیکن بدلا ہی نہیں جاتا۔ کئی بار میں سمجھتی ہوں کہ میں بدل گئی ہوں لیکن کچھ عرصے بعد خود کو پھر اسی حالت میں پاتی ہوں۔ کوئی راستہ ملتا ہی نہیں جس پہ میں چلوں اور بدل جاؤں۔"

"راستہ اگر ڈھونڈنے سے نہ ملے تو خود بنانا پڑتا ہے۔ اپنی منزل کی جانب جانچ پڑتال کر کے خود چلنا پڑتا ہے۔"

"اتنا مشکل کام مجھ سے نہیں ہوتا۔" اس کی ساری بے چینی اور تڑپ پر یہ ایک بے بس کسلمندی اور سستی غالب آگئی وہ عاجز آکر بولی تھی۔

"تو پھر مان جاؤ کہ یہ کرب جھوٹا ہے۔" اف وہ آواز۔

"میری جان نکلتی رہتی ہے ہر وقت' ہر لمحہ یہ جھوٹ کیسے ہو سکتا ہے۔" اس کی تڑپ۔

"لیکن تم زندگی کے لیے ہاتھ پاؤں بھی تو نہیں مارتیں۔"

"اتنی ہمت کاش میرے اندر ہوتی۔" وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں حسرت سے کہہ کر رو پڑی۔

"اگر تم ریاکاری اور سستی چھوڑ دو تو سامنے ہمت ہی ہمت ہے۔" آواز دوستانہ ہو گئی تھی۔

"مجھ سے اپنے اندر کی تپش برداشت نہیں ہوتی۔ دل کو جلانے والی روح کو کرلانے والی۔ سانس بھی ڈھنگ سے لی نہیں جاتی۔"

"اور اسی تپش کا علاج تم غفلت سے بے کار لغو کاموں سے کرتی ہو۔ مرض کو بگاڑ رہی ہو۔ دراصل تو یہ مرض ہے ہی نہیں۔ اس میں ڈوب جاؤ۔ اس کا سامنا کرو۔ اس میں شفا ہے۔ تمہاری ہر مشکل کا حل نکل آئے گا۔"

وہ ہمدرد آواز مرہم کی طرح اس کے ہر زخم پر لیپ بن کر پھیل گئی تھی۔ ایک دم سے جلتے ہوئے زخموں کو تسکین ملی تھی۔ ایک عرصے کی جھنجلاہٹ اور بے دلی کو ایک عزم ملا تھا۔ نئے سرے سے کوشش کرنے کا شعور۔

☆ ☆ ☆

سارہ خلیل ایک ایسا نام تھا جو اب کسی تعارف' کسی حوالے کا محتاج نہیں رہا تھا۔ اتنے اس کی عمر کے سال نہیں تھے۔ جتنی کتب وہ تحریر کر چکی تھی۔ مشہور ہونا ایک اور قصہ ہوتا ہے لیکن اچھا لکھنا ایک الگ خوبی ایک الگ وصف اور سارہ خلیل کے پاس یہی وصف تھا' اور بہت خوب تھا۔ وہ معروف تھی سو مصروف بھی رہتی تھی۔ اور آج اس مصروفیت میں سے تھوڑا وقت ایک انٹرویو کے لیے بھی نکالا تھا۔ ایک معروف میگزین کے انٹرویو کے لیے صحافی اس کے گھر پہنچ چکا تھا۔

صحافی ندیم علی جانتا تھا کہ مس سارہ عام طور پر انٹرویو دیتی نہیں ہیں۔ سو اس خاص طور پر دیے جانے والے انٹرویو کو وہ بے حد خاص بنانا چاہتا تھا۔ روایتی خاطر تواضع کے بعد وہ سوالات کا آغاز کرنے لگا۔

سال نو کے شمارے میں سارہ خلیل کا انٹرویو قارئین کے لیے ایک خاص تحفہ تھا۔ جس میں بے شمار سوالات تھے' جو اس کے قاری اس سے پوچھنا چاہتے تھے۔ اس کی زندگی کے مختلف گوشوں کو جاننا چاہتے تھے۔ بہت سارے قاری یہ جاننے کو بے تاب تھے کہ آخر سارہ خلیل میں ایسی کیا خاص بات ہے کہ وہ اس قدر عمدہ طرز تحریر رکھتی ہے۔ اس کی زندگی کیسے ماحول میں گزری ہے۔ کس قسم کی تربیت ہوئی۔ والدین خاندان دوست احباب کس قسم کے ہیں۔ اس کا مزاج' لباس' خیالات سب کچھ جان لینے کے شوقین قارئین کی تعداد کم نہیں تھی۔ اور پھر یہ خصوصی انٹرویو بہت سارے لوگوں کو حیرت میں ڈال گیا۔ جب انہوں نے سارہ خلیل کے خیالات بھی جانے اور واقعات بھی۔ اپنی زندگی کے بارے میں وہ بتا رہی تھی۔

"ایک بے حد عام سی لڑکی جو ملگجے حلیے میں رہتی ہے لیکن صفائی پسند کہلانے کی شوقین ہوتی ہے۔ اپنی بے حد عام سی شکل و صورت کو حسینہ عالم گردانتی ہے۔ حسد کرتی ہے۔ سست ہوتی ہے۔ کام چور ہوتی ہے اور سب سے بڑھ کر بدتمیز گستاخ ہوتی ہے۔ میں بھی ایسی ہی تھی۔ کچھ مختلف نہ تھا میرے لڑکپن میں۔"

اس نے اپنی فنی صلاحیتوں کے راز سے یوں پردہ اٹھایا تھا۔

"جب میں نے لکھنے کا آغاز کیا تو میں ایک بے حد اچھے سبجیکٹ میں ایک بہت بڑی ——— ڈگری رکھتی تھی۔ مگر کوئی خاص تجربہ نہیں تھا۔"

والدین اور خاندان کے تعارف میں سارہ خلیل نے کہا۔



"والدین اور خاندان کی محبت اور اعتماد شروع سے حاصل تھا۔ لیکن اسے سمجھنے میں ہمیں بہت وقت لگتا ہے۔ اسی وجہ سے زندگی کا ایک اہم حصہ ضائع ہوجاتا ہے۔ لیکن درحقیقت وقت ضائع نہیں ہوتا بلکہ کام آتا ہے۔ اگر ہم محبت اور اعتماد کو سمجھ جائیں تو زندگی سہل ہوجاتی ہے۔ ہم لوگوں کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہم جذباتی لوگ ہیں۔ بلا کے خوش فہم اور حد درجے کے بدگمان۔ بس انہی تفاوات کے باعث زندگی مشکل ہوجاتی ہے۔

ہم عام سے لوگ تھے۔ مڈل کلاس۔ زیادہ ان پڑھ' کچھ پڑھے لکھے افراد کا ہمارا خاندان۔ نہ زیادہ دولت تھی نہ غربت تھی۔"

اور آخر میں صحافی نے ساری کڑیوں کو ملاتے ہوئے پوچھا۔

"مس سارہ! آپ نے اپنی زندگی کو جس قدر عام بنا کر ہمیں دکھایا ہے' یہ یقیناً" ہمارے قارئین کے لیے حیرت کا باعث ہوگا۔ لیکن اس قدر عام طرز زندگی میں ایسی کون سی خاص بات تھی' جو آپ کی زندگی کے دھارے کو یکسر بدل گئی۔"

"بہت ساری عام باتیں مل کر خاص بن جایا کرتی ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ خصوصیت ہمارے باہر نہیں اندر ہونی چاہیے۔ اپنے اندر کی آواز' اپنے من کی تپش کا اگر ہم سامنا کریں تو ہم خاص ہوجاتے ہیں' وگرنہ سب عام ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص کے اندر ایک آواز ہر وقت ابھرتی ہے۔ ایک تپش ہمیں زندگی کے کسی نہ کسی حصے میں ضرور محسوس ہوتی ہے اور ہم اسے نظر انداز کرتے جھٹلاتے رہتے ہیں۔ اگر ہم اس سے غافل ہوجائیں تو سمجھ لیں کہ آگے کی زندگی عامیانہ ہی ہوگی اور اگر اس تپش کے اندر اتر جائیں اس کا سامنا کریں تو بیرونی زندگی کے تمام ٹکراؤ بے معنی ہوجاتے ہیں۔ ہم ایک خاص زندگی گزارتے ہیں۔ جس میں عمومیت ہوتی ہے' رعونت نہیں۔ عاجزی ہوتی ہے' بے بسی نہیں۔ سب سے اہم بات اسی اندر کی آواز کو سننا سمجھنا اور اس کے ساتھ رہنا ہے۔ میں بھی ایک عرصہ اس سے نبرد آزما رہی اور عامیانہ زندگی گزارتی لیکن جب میں نے اس آواز کو سننا سمجھنا اور پھر اس پر عمل کرنا شروع کیا تو یقین جانیے! میں اپنے آپ میں خاص ہوگئی۔ میرے رذائل میرے خصائل بن گئے۔ ایسا ہوتا ہے۔ ایسا ہوسکتا ہے۔ ایک غلیظ گستاخ' بدزبان' بے ادب' جاہل' شکی' حاسد' بے اعتماد' بے شرم' خوف زدہ لڑکی ایک باادب' سلجھی۔ سمجھ دار' باشعور انسان کے پیکر میں ڈھل گئی۔ بس اندر کی آواز کے باعث۔"

سارہ خلیل کے قارئین جو پورے ملک میں پھیلے ہوئے تھے۔ سب نے انٹرویو پڑھا تھا۔ وہ جو اپنے اندر کی آواز کو پچھاڑ کر بہت آگے بڑھ آئے تھے اتنا کہ اب وہ آواز سنائی نہ دیتی تھی وہ سب خود کو بہت خاص سمجھتے تھے اور عامیانہ زندگی گزار رہے تھے۔ اور وہ بھی جو اس آواز سے نبرد آزما تھے۔ جن کا دل ایک درد محسوس کرتا تھا۔ جن کا جسم ہر وقت تپش محسوس کرتا تھا۔

عامیانہ قارئین نے انٹرویو سب کچھ جلدی جلدی جان لینے کی خواہش میں بہت جلدی جلدی پڑھا تھا اور پڑھ کر کچھ نخوت کچھ غرور کچھ استہزا سے سوچا تھا۔

"اچھا تو یہ ہے سارہ خلیل۔ عام سی ہی ہے۔"

اور قارئین کے دوسرے طبقے کے جلتے ہوئے زخموں پر سارہ خلیل کے آخری الفاظ مرہم کے لیپ بن کر پھیل گئے تھے۔ ان کی ایک عرصے کی جھنجلاہٹ اور بے دلی کو ایک عزم ملا تھا۔ نئے سرے سے کوشش کرنے کا شعور۔ وہی جو ایک عرصہ پہلے سارہ خلیل کو اپنے اندر کی آواز سے ملا تھا اور اس نے اپنے من کی تپش کو جھیلا تھا اور اپنے کرب کو سہا تھا۔ ایک تبدیل شدہ بہت خاص انسان بن کر ابھری تھی۔

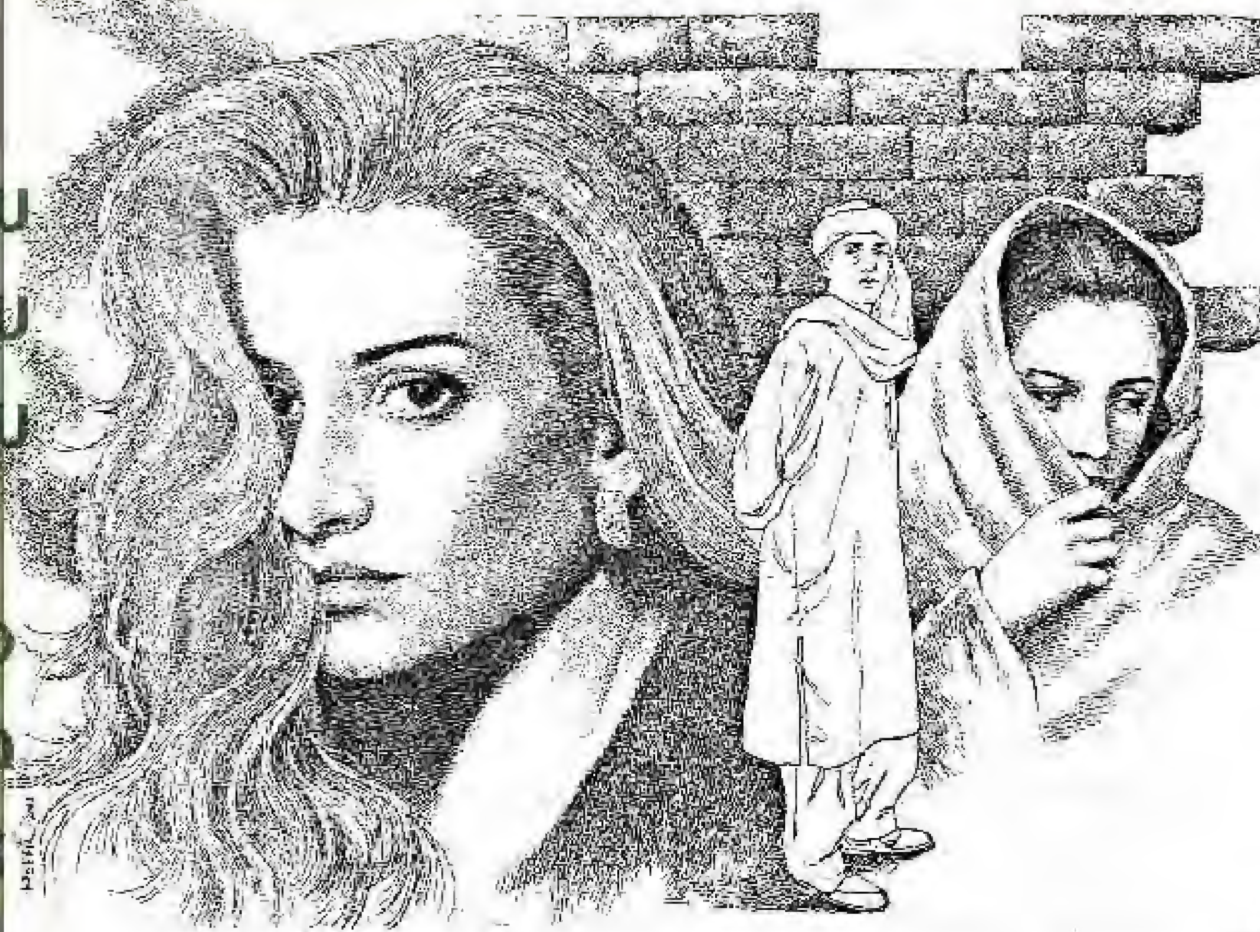


زندگی تم ہو

ام ایمان قاضی

ناولٹ





"تایا ابا۔ میں اندر آجاؤں؟" اس نے ڈرتے ڈرتے دروازے سے جھانک کر ان سے اجازت طلب کی۔ کتاب سے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر جلال احمد نے اسے دیکھا اور اثبات میں سرہلا دیا۔

"تایا! آج پے ملی تھی تو یہ۔" اس نے لفافہ ان کی طرف بڑھایا جسے انہوں نے ماتھے کے بل ختم کیے بنا تھام لیا اور لفافے میں سے ساری رقم نکال کر گننا شروع کی۔ اختتام پر ان کی تیوریوں کے بل مزید گہرے ہوگئے تھے۔

"تیس ہزار سات سو تیرہ روپے ہے تمہاری تنخواہ۔ سات سو تیرہ تو ہوگیا تمہارا جیب خرچ۔ یہ ہیں انتیس ہزار۔ ایک ہزار روپے کہاں ہیں؟" گونج دار لہجے میں کی گئی بازپرس نے مہر کو نظریں جھکانے پر مجبور کردیا۔

"وہ تایا ابا۔ سردیاں آگئی ہیں تو میرے پاس سردیوں کے کپڑے نہیں تھے' گرمیوں کے ہی اب تک استعمال کررہی ہوں۔ میں نے سوچا ایک گرم سوٹ لے لوں یعنی تو اور جرسی اور شال بھی تھی مگر وہ اگلے ماہ لے لوں گی۔" اس نے تھوک نگل کر ڈرتے ڈرتے کہا۔

"پچھلی بار جو دو گرم سوٹ میں لے کے آیا تھا۔ وہ بھی تو ہیں تمہارے پاس اور جرسی جو اس نامجار نے تمہاری برتھ ڈے پر گفٹ کی تھی۔ وہ بھی تو اچھی خاصی مہنگی تھی۔ کتنی دفعہ کہا ہے کہ فضول خرچی سے پرہیز کیا کرو' مگر تم لوگ سنتے کہاں ہو۔ تمہیں کیا پتا اس گھر کا خرچا میں کیسے چلاتا ہوں۔ دانتوں سے پکڑ پکڑ کے خرچ کرتا ہوں۔ تب جاکر کہیں مہینے کا خرچا پورا ہوتا ہے اور تم لوگوں کی شاہ خرچیاں ختم ہونے میں نہیں آتیں۔" وہ غصے سے بولے تو مہر نے آہستہ سے جی کہا اور سست روی سے چلتی ان کے کمرے سے نکل کر اپنے' رعنا آپا اور سارہ کے کمرے کی طرف آگئی۔

رعنا آپا کالج سے آکر فورا" کچن میں چلی گئی تھیں جبکہ سارہ آفس سے آکر تھوڑی دیر آرام کرتی۔ پھر وہ اور سارہ شام کا سارا کام سنبھالتیں تایا ابا کی طرف سے

کسی بھی کل وقتی یا جز وقتی ملازمہ کا رکھنا صرف پیسے کا زیاں تھا اور بس۔۔۔ اس کے اماں ابا ایک حادثے میں چل بسے تھے' اس نے ہوش سنبھالنے پر اپنی تائی کی پر شفقت گود دیکھی اور رعنا آپا کا محبت بھرا پیار۔ اس کا تایا زاد اویس البتہ ایک اکھڑ اور بد تمیز بچہ تھا جو اسے اور سارہ کو خوب تنگ کرتا۔ وہ سارہ اور مہر سے تین سال بڑا تھا اور اپنی اس بڑائی کا فائدہ بھی خوب اٹھاتا۔ تایا جلال احمد مہا کنجوس تھے۔ بینک میں ایک اچھے عہدے فائز ہونے کے باوجود انہوں نے گھر والوں کو ایک ایک چیز کے لیے ترسا کر رکھ دیا تھا۔ بس دولت جمع کرنے کا جنون تھا اور اسی جنون میں وہ اپنی بیوی اور بچوں کی بنیادی ضروریات کو بھی پس پشت ڈال دیتے' حالانکہ وہ بچوں کے لیے پرائیویٹ اور اچھے اسکولز کا خرچا برداشت کر سکتے تھے' لیکن انہوں نے سرکاری اسکولوں کو ترجیح دی۔ اپنے بھائی جو کہ سرکاری ادارے میں گریڈ بیس کے ملازم تھے ان کی وفات کے بعد ان کے ادارے سے ملنے والے واجبات' گھر اور ایک دو پلاٹس بیچ کر تمام رقم اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرا دی۔ نفیسہ بیگم ان کی اس روش پر خوب کڑھتیں۔ گھر کا سودا سلف جلال احمد خود لاتے اور ان کو احتیاط سے خرچ کرنے کی تلقین کرتے۔ سر شام گھر کی تمام بتیاں بند کروی جاتیں کہ زیادہ بل نہ آجائے۔ بچوں کے یونیفارم جب تک پھٹ نہ جائیں وہ خرید کر نہیں دیتے تھے۔ رعنا آپا پڑھائی میں بہت اچھی تھیں۔ سو انہوں نے محلے کے چند بچوں کو ٹیوشن دینی شروع کر دی۔ ابا نے ان کے اس قدم کو بہت سراہا اور ٹیوشن کے ان پیسوں کے حقدار بن گئے۔ رعنا آپا نے اپنی مدد آپ کے تحت ٹیوشن کا جو قدم اٹھایا تھا' سارہ اور مہر بھی اس پر چل نکلی تھیں۔ اویس کو کمپیوٹر میں دلچسپی اس حد تک تھی کہ اس کی چھوٹی موٹی خرابیاں وہ خود ہی ٹھیک کر لیتا۔ پھر وہ دوسرے لوگوں کے کمپیوٹر ٹھیک کر کے اپنا خرچ نکالنے لگا مگر ابا کو وہ ایک روپیہ بھی نہ دیتا تھا' سو ابا اس سے ناراض رہنے لگے تھے۔ ان ہی دنوں ابا کو پتا نہیں کیا خدشے ستائے کہ اویس اور مہر کا نکاح کر دیا اور بھتیجی کی جائیداد اپنے ہاتھوں میں محفوظ کر کے مطمئن ہو گئے۔ رعنا کے رشتے آنا شروع ہوئے تو جلال احمد نے کہا۔

"میں اپنی بیٹیوں کی شادی ابھی نہیں کروں گا۔ ارے ابھی میں نے جو ان پر لگایا ہے وہ سود سمیت وصول کر لوں۔ پھر سوچوں گا۔" نفیسہ بیگم نے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔

"خدا کو مانیں جلال صاحب! بچوں کی تربیت ان کی پرورش اور ان کے گھر بسانا ہمارا فرض ہے۔ کوئی قرض تو نہیں ہے جسے آپ سود کے ساتھ وصول کریں گے۔ رعنا کی شادی کی عمر ہے۔ مناسب عمر میں بیٹیوں کی شادی ہو جائے تو ماں باپ کے لیے بھلا اس سے بڑھ کر خوشی کا مقام اور کیا ہو گا۔" وہ تو ہراساں ہی ہو گئیں ان کی بات سن کر۔

"تم چپ رہو۔ اپنے بچوں کی زندگی کے فیصلے میں خود کروں گا۔" انہوں نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

رعنا کے ایم ایس سی تک آتے آتے کئی اچھے اور مناسب رشتے جلال احمد کی ضد کی بھینٹ چڑھ گئے۔ اویس کو ایک سرکاری محکمے میں گریڈ سترہ کی جاب مل گئی تھی۔ جب تائی نفیسہ نے جلال احمد سے تقاضا کیا کہ مہر کا اویس کے ساتھ نکاح تو ہو چکا ہے اور اب وہ بی ایس سی بھی کر چکی ہے' سو ان کی رخصتی کی تقریب کر دی جائے۔

"مہر میری بیٹی ہے اور جو اصول میرے رعنا اور سارہ کے لیے ہیں' وہی مہر کے لیے بھی ہیں۔ مہر تعلیم حاصل کر کے نوکری کرے گی اور اپنے لیے جہیز اور زیور کی رقم جمع کرے گی۔ اسی طرح اویس جب تک میرے مطلوبہ ہدف کے مطابق مہر کے لیے دس لاکھ مہر اور پندرہ تولے سونے کا انتظام نہ کر لے میں رخصتی کا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

انہوں نے کمال اطمینان سے کہا۔ نفیسہ بیگم اس عجیب و غریب اور نرالی منطق پر حق دق رہ گئیں۔ اور اویس بھی یہ بات سن کر بھڑک اٹھا۔

"شریعت کی رو سے مہر میری بیوی ہے اور مجھے اس سے نہ تو زیور کی خواہش ہے نہ جہیز کی۔ مجھے رخصتی کرانے کے لیے صرف میری ماں کی دعا ہی کافی ہے۔ والدین کا احسان دنیا کی کوئی اولاد بھی نہیں اتار سکتی اتارنا چاہے بھی تو۔ پر تین سال ہو گئے رعنا آپا کو لیکچرار بنے ہوئے۔ اپنی تنخواہ کی پائی پائی اور ٹیوشن سینٹر سے حاصل ہونے والی رقم سے وہ آپ کو آپ کا قرض سود سمیت لوٹا چکی ہیں' اس لیے اب اگر آپ نے ان کی شادی نہ کی تو میں کوئی مناسب رشتہ دیکھ کر اماں کی رضا سے ان کی شادی کرا دوں گا۔ آپ شامل ہوئے تو ہماری خوش قسمتی ہو گی۔ نہ ہوئے تو ہمیں صرف افسوس ہو گا۔ بس اس کے بعد میں نے مہر کو رخصت کرا کے سارہ کا سوچنا ہے۔ آپ جو کر سکتے ہیں کر لیں۔"

غصے میں وہ کہتا چلا گیا۔ اماں کبھی غصے میں لال پیلے ہوتے اویس کو دیکھتیں' کبھی کمال اطمینان سے ٹانگ پر ٹانگ رکھے جلال احمد کو' جو خاموش سپاٹ تاثرات لیے اویس کو دیکھ رہے تھے۔

"آپ نے اپنی بات ختم کر لی یا کچھ اور بھی کہنا ہے؟" انہوں نے اپنے مخصوص لہجے میں پوچھا تو اویس احمد ان کو بس ایک نظر غصے سے دیکھ کر رہ گیا۔

"جس دن تم نے یہ جو اپنا پلان مجھے سنایا ہے اس پر عمل کرنے کی کوشش کی' اس دن میں نفیسہ بیگم یعنی تمہاری ماں کو طلاق دے دوں گا اور تم سب کو اپنی جائیداد سے عاق کر دوں گا۔ اس گھر سے نکل کر پھر جو دل چاہے کرنا۔" جلال احمد کے لبوں سے نکلنے والے الفاظ نے بلڈ پریشر کی مریضہ نفیسہ بیگم کو سیکنڈوں میں لہرا کر نیچے گرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اویس احمد نے خون کے گھونٹ پی کر جلال احمد کو دیکھا اور ماں کی طرف بڑھا۔ جلال احمد نوکیلے الفاظ کے تیر برسا کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے۔ دروازے سے لگی وہ تینوں ہراساں لڑکیاں ان کے نکلتے ہی تیزی سے اندر آئیں۔ شام تک نفیسہ بیگم کی حالت سنبھلی تو سب نے سکون کا سانس لیا۔ اویس نے رعنا آپا کو کھانا بنانے سے منع کیا اور خود بازار سے کھانا لے آیا۔ ٹیبل پر کھانا لگا کر مہر تایا ابا کو بھی بلا لائی۔ نفیسہ بیگم سوئی ہوئی تھیں۔ جلال احمد کسی بات کی پروا کیے بغیر اطمینان سے ٹیبل پر آئے اور دو تین مختلف قسم کی ڈشز دیکھ کر بھڑک گئے۔

"کتنی محنت کے بعد چار پیسے ہاتھ میں آتے ہیں اور یہاں مرغ مسلم کے مزے لیے جا رہے ہیں۔ پتا بھی ہے کہ مہنگائی آسمان کو چھو رہی ہے۔" باقی سب تو خاموش رہے' لیکن اویس کہے بغیر نہ رہ سکا۔

"آپ بے فکر رہیے۔ آپ کی دولت عنقریب کو ہوا نہیں لگی۔ یہ سب کچھ میں لایا ہوں۔" وہ سپاٹ لہجے میں ان کو اطلاع فراہم کرتے ہوئے بولا۔

"ہونہہ تو یہ کون سی فخر کی بات ہے۔ ابھی سے بچت کی عادت ڈالو۔ نہیں تو تمہاری آنے والی نسلیں بھیک مانگنے پر مجبور ہو جائیں گی۔" انہوں نے نوالہ توڑتے ہوئے کہا۔

"آپ کی وجہ سے ہم ابھی بھی بھیک منگوں کی صف میں ہی کھڑے ہوئے ہیں۔۔۔ رہی بات آنے والی نسلوں کی تو آپ کے جو نادر اصول اور تقاضے ہیں تو آنے والی نسلیں عالم ارواح میں ہی ترستی رہیں گی۔ انہوں نے دنیا کا منہ نہیں دیکھنا۔ یہ بات لکھ لیجیے آپ۔"

وہ سکون سے بولا اور ایک نظر سر جھکائے چاول ٹونگتی مہر پر ڈالی۔ اسے اماں کے ساتھ گھر کی تینوں خواتین سے سخت گلے تھے۔ اسے یقین تھا کہ اگر وہ سب مل کر ابا کی غلط روش' غلط شرائط اور غلط اصولوں کا بائیکاٹ کریں تو ہو سکتا ہے اکیلے پڑ جانے کے خوف سے ابا کمزور پڑ جائیں۔

"فضول باتیں مت کرو اویس! اور خاموشی سے کھانا کھاؤ۔" ابا پھر نہ بگڑ جائیں۔ اس ڈر سے رعنا نے اویس کو چپ کرا دیا۔

بی ایس سی کے بعد سارہ نے ایک این جی او جوائن کر لی تھی اور مہر نے اپنی تعلیم مکمل کرتے ہی یونیورسٹی کی ایک دوست کے توسط ایک فرم میں جاب شروع کر لی۔ وہ تینوں اپنی تنخواہ لا کر جلال احمد کے ہاتھوں میں رکھ دیتیں۔ ہاں اویس نے یہ کیا کہ مخصوص راشن کے

علاوہ وہ روزمرہ ' فروٹس ' انڈے اور باقی ضرورت کی چیزیں بے دھڑک اور بہت زیادہ لے آتا تھا۔ ان کے کپڑے وغیرہ بنا دیتا۔ یہی بات جلال احمد کو سخت ناپسند تھی پر اسے پروا نہ تھی۔ اپنے آفس سے قرضہ لے کر اس نے قسطوں پر پلاٹ بھی خرید لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس روز رعنا آپا ابھی کالج سے نہیں لوٹی تھیں سارہ نفیسہ بیگم کے پاس تھی 'جب مہر اسے پکن میں کام کرتی نظر آئی۔ اس نے موقع غنیمت جانا اور اندر داخل ہو کر کھنکھار کر اسے متوجہ کیا۔

"تمہیں کچھ چاہیے کیا؟" ذرا سا مڑ کر دیکھا۔ پھر رخ موڑ گئی۔ شاید بہت مصروف تھی۔

"ہاں بولو کیا چاہیے؟" جواب نہ پا کر پھر پوچھا۔

"تم چاہیے ہو مجھے۔" اس کے الفاظ پر مہر ہل گئی۔ کچھ عرصے سے اس کے باغیانہ انداز اور بے باک نظریں سخت ہراساں کرنے لگی تھیں اسے۔

"میرا پورا حق ہے تم پر۔ پھر بھی دیکھو! تمہاری رضا سے مانگتا ہوں اور... تمہاری رضا۔" وہ گہری سانس لے کر بولا۔

"تمہاری رضا اس شخص کی مرضی سے جڑی ہے جس کے نزدیک رشتے کوئی معنی نہیں رکھتے۔ صرف دولت 'پیسہ اور روپیہ اہمیت رکھتا ہے۔ صرف ایک بار... صرف ایک بار اسٹینڈ لے کر دیکھو۔ ایک بار میرا ساتھ دو۔ میرے ساتھ چلو یہاں سے۔ اس شخص کو اس کے غرور کی سزا نہ مل گئی تو پھر کہنا۔" وہ آگے بڑھ آیا اور اسے کندھوں سے پکڑ کر اپنی طرف موڑ لیا مگر یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ مہر کا سرخ و سفید چہرہ اس وقت آنسوؤں سے تر تھا۔

"میں بہت چھوٹی تھی اویس! جب میرے ماں باپ گزر گئے۔ یہ تایا ہی تھے 'جو مجھے یہاں لائے۔ عزت محبت اور شفقت دی۔ پڑھایا 'لکھایا اور اس مقام پر پہنچایا۔ آج میں کیسے ان کے احسانوں کو بھول کر تمہارے ساتھ چل پڑوں۔" وہ آنسو پونچھ کر بولی۔

"اچھا تو اپنے تایا حضور کی شرائط پوری کرنے میں یونہی عمر گزار دو گی۔ ان کا قرض سود سمیت تم صدیوں تک نہیں لوٹا سکتیں۔ پتا ہے تمہیں!" وہ غصے میں گویا ہوا۔

"وہ ہم میں سے کسی کی شادی کرنے پر سنجیدہ نہیں ہیں۔ وہ تم لوگوں کی تنخواہوں سے ہاتھ نہیں دھونا چاہتے۔ رعنا آپا کو ہی دیکھ لو۔ پھر بھی تم ان سے امید لگا بیٹھی ہو۔" اس نے اب کے باقاعدہ اس کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑ دیا۔

"تمہاری سب باتیں درست ہیں پھر بھی میں تایا کے خلاف کبھی بھی نہیں جا سکتی۔ نہ ہی انہیں دکھ دینے کا سوچ سکتی ہوں۔" اب کے مہر نے اپنے آنسو پونچھ کر دو ٹوک کہا اور اپنا بازو اس سے چھڑا کر دوبارہ اس کی طرف سے رخ موڑ گئی۔

"یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟" اپنا کام خاموشی سے کرتی مہر کے کانوں میں اویس کی سرد آواز آئی۔ وہ خاموش رہی۔ وہ جھٹکے سے مڑا اور پکن سے باہر نکل گیا۔ مہر نے شکستگی سے مڑ کر پکن کی خالی چوکھٹ کو دیکھا اور پکن ٹیبل کے پاس آ کر کرسی پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

☼ ☼ ☼

"انکار کی کوئی معقول وجہ بھی تو ہو مس رعنا! آپا سے پتا چلا کہ آپ کہیں اور انٹرسٹڈ ہیں نہ انگیجڈ۔ آپ کے انکار کی وجہ جاننے کے لیے آج میں خود آپ کے سامنے موجود ہوں۔" خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی رعنا کو دیکھتے ہوئے شہزاد احمد نے پوچھا۔

رعنا کو ایک دو بار انہوں نے گھر تک ڈراپ کیا تھا جب کالج میں کسی ہڑتال کے باعث ہنگامے ہو گئے تھے اور ٹریفک جام ہو جانے کے سبب انہوں نے اپنی بہن کے ساتھ پہلی دفعہ اپنے آپ میں مگن کھوئی کھوئی سی نازک اندام رعنا کو دیکھا تھا اور یہ جان کر حیران رہ گئے کہ بظاہر کالج گرل نظر آنے والی یہ وہی آپا کی کولیگ رعنا ہیں جن کا ذکر ہر وقت ان کی زبان پر ہوتا ہے۔

اس کے بعد ان کی بھانجی پنکی کی سالگرہ پر انہوں نے گہرے رنگ کی ساڑھی میں ملبوس پروقار سی رعنا کو دیکھا تو پوری طرح دل ہار گئے اور رات کو ہی اپنی آپا سے کہہ ڈالا کہ وہ شادی کے لیے تیار ہیں۔

آپا نے رعنا کے انکار کا ذکر کیا تو ان سے رہا نہیں گیا وہ خود ہی چلے آئے۔ رعنا بمشکل راضی ہوئی تھیں۔ اب ان کے سامنے وہ سوچ رہی تھیں کہ اس پروقار اور وجیہہ شخص کے سوالوں کا کیا جواب دیں۔ کچھ بھی ہو ابا کی رسوائی انہیں کسی طور گوارا نہیں تھی اور یہ بھی وہ جانتی تھیں کہ ابا کا اب تو کیا مستقبل قریب یا بعید میں بھی ان میں سے کسی کی شادی کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ شہزاد احمد مستقل ان کے صبیح چہرے پر نظر جمائے اتار چڑھاؤ بغور دیکھ رہے تھے۔

"مس رعنا! کوئی پرابلم ہے تو آپ مجھ سے شیئر کر سکتی ہیں۔ لیکن پلیز اس طرح انکار کر کے میرا دل مت توڑیے پلیز۔" انہوں نے لجاجت سے کہا۔

"اصل میں شہزاد صاحب! میرے والد آج کے اس ترقی یافتہ دور میں بھی پرانی روایات کے حامی ہیں جن میں ایک اہم ریت اپنی برادری میں ہی بچوں کی شادیاں کرنے کی ہے اور اپنے اس موقف سے وہ ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں ہیں۔ آپ بہت اچھے اور شریف ہیں لیکن ان سب باتوں کے باوجود مجھے یقین ہے کہ ابا میرا رشتہ کبھی بھی آپ کے ساتھ نہیں کریں گے سو کسی بھی ناخوشگوار بات سے بچنے کے لیے... اپنے والد کو بہت بہتر طریقے سے جانتی ہوں۔ وہ ہرگز نہیں مانیں گے۔" بہت سوچنے کے بعد آخر رعنا کو ایک معقول وجہ مل ہی گئی تھی جس کو بنیاد بنا کر انہوں نے انکار کر دیا۔ انکار کا اس قدر بودا جواز سن کر شہزاد احمد ششدر رہ گئے۔

"آپ کے والد صاحب اب ریٹائرڈ لائف گزار رہے ہیں۔ اتنے پڑھے لکھے ہیں اور اعلا عہدے پر فائز رہنے کے باوجود ایک فرسودہ اور جاہلانہ بات کو بنیاد بنا کر بچوں کے رشتے نہ کرنا میری سمجھ میں تو نہیں آ رہا۔ بالفرض آپ کی برادری میں رشتے مناسب نہیں ملتے تو

کیا آپ کے والد صاحب آپ کی شادی کبھی بھی نہیں کریں گے؟" وہ ناخوشگوار سی حیرت سے بولے۔

"میں نے آپ کو بتا دیا ہے شہزاد صاحب! جو بھی وجہ تھی اب آپ مجھے اجازت دیجیے۔" ضبط سے رعنا کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ انہیں لگا کہ وہ ان کے سامنے سے نہ اٹھیں تو یہ مہربان چہرہ انہیں کمزور نہ کر ڈالے سو کھڑے ہو کر اجازت طلب کی۔ شہزاد احمد بھی ساتھ ہی کھڑے ہو گئے۔

"میں پھر بھی درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے اپنے والد سے ایک بار مل کر ان کو قائل کر لینے دیں ہو سکتا ہے قسمت میرا ساتھ دے جائے۔" وہ مسکرا دیے تو رعنا کے پاؤں جیسے زمین نے جکڑ لیے۔

"اوکے میں اپنی والدہ کو بتا کر مسز خالد کو بتا دوں گی لیکن آپ اپنا ارادہ بدل لیں تو زیادہ بہتر ہے کیوں کہ میرے والد اگر قائل ہونے والے ہوتے تو بہت عرصہ پہلے ہو گئے ہوتے۔" رعنا نے ایک بار پھر ان کو باز رکھنا چاہا تھا لیکن شہزاد احمد ہاتھ آئی بازی اس دفعہ کھیلنا ضرور چاہتے تھے۔

وہ دن رعنا نے بمشکل کالج میں گزارا۔ گھر آ کر بھی طبیعت پر اداسی سی چھائی رہی۔ دل کسی کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ سارہ اور مہر' رعنا آپا کی یہ ٹوٹی ٹوٹی حالت اور رویا اور ستا ہوا چہرہ نظر انداز نہ کر سکیں اور ان کے بے حد اصرار پر انہوں نے بے ربط لفظوں میں سارا قصہ سنا ڈالا۔ مہر تو یہ سب سن کر ہی ان کے ساتھ ہی رونے لگی جبکہ سارہ کو ٹھیک ٹھاک غصہ آ گیا۔

"آپ دونوں جیسے بزدل لوگ جو اپنی زندگی کی ڈور دوسروں کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں ہمیشہ روتے ہی رہتے ہیں' آپ لوگوں نے اپنی قوت فیصلہ کو تھپک کر گہری نیند سلا دیا ہے۔ اب بھی وقت ہے آپا! آپ بھائی کو اپنا سرپرست بنائیں اور جائیں۔ اماں اور ہم سب کی دعائیں اور محبتیں آپ کے ساتھ ہیں۔ ابا پر بھروسا کریں گی تو ایسے ہی روتی رہ جائیں گی۔ میں تو اس پاگل کو بھی سمجھاتی ہوں کہ بھائی کی محبت اور پر اعتماد رفاقت اس کے ساتھ ہے۔ یہ ایک بار حوصلہ تو کرے ورنہ ابا نے تو قیامت تک ان دونوں کو ایک نہیں ہونے دینا۔ لکھ لیں آپ دونوں میری یہ بات۔" وہ غصے میں بولتی چلی گئی۔ بہت دنوں بعد اپنے کمرے سے نکل کر ان کے دروازے کی چوکھٹ پر کھڑی نفیسہ بیگم ساکت کھڑی رہ گئیں۔

"رعنا میری بچی!" ان کی کمزور آواز پر وہ تینوں مڑ کر ان کو دیکھنے لگیں۔ مہر اور رعنا نے اپنے اپنے آنسو صاف کیے' لیکن سارہ کے تاثرات ویسے ہی ناگوار رہے۔ وہ اٹھ کر اماں کے پاس دروازے میں آئی اور ان کا ہاتھ پکڑ انہیں اندر لے آئی۔

"بیٹا تم! اپنی کولیگ سے کہہ دو کہ وہ اور ان کا بھائی ایک بار آئیں یہاں۔ میں ایک بار پھر لڑوں گی تیرے باپ سے' ہو سکتا ہے وہ پتھر نرم پڑ جائے۔ نہ بھی ہوئے تو اس بار فیصلہ میں خود کروں گی۔ ماں ہوں آخر تمہاری۔" ان کا لہجہ کمزور مگر انداز حتمی تھا۔ رعنا آپا نے آگے بڑھ کر ان کی گود میں سر رکھ دیا۔

"مہر! بچے جاؤ کھانا لگاؤ اور سب کو بلا لو۔ اویس بھی آنے والا ہے۔ جاؤ سارہ تم بھی بہن کی مدد کرو۔" وہ رعنا سے تنہائی میں کچھ پوچھنا چاہتی تھیں۔ سارہ بھی سر ہلاتی مہر کے ساتھ ہی اٹھ گئی۔



"ہیلو۔ ہیلو کہاں گم ہو جناب۔" ثاقب نے پنسل سے ٹیبل بجا کر کھوئی کھوئی سارہ کو اپنی طرف متوجہ کیا' جس کی نظریں کمپیوٹر کی خالی اسکرین پر اور ذہن کی پرواز کسی اور سمت تھی۔ وہ چونک کر سیدھی ہوئی۔

"ہوں۔ آؤ۔ تم کب آئے۔" کمپیوٹر شٹ ڈاؤن کرتے ہوئے وہ ٹیبل پر بکھری اشیا سمیٹنے لگی۔

"کیا بات ہے۔ گھر میں پھر کوئی نئی بات ہوئی ہے کیا؟" اس کے چہرے پر اسے وہ پریشانی بھی نظر آ ہی گئی جو سارہ نے مسکراہٹ میں چھپائی ہوئی تھی۔

"گھر میں کوئی بات نہ ہو تب حیرت کی بات ہونی چاہیے تمہارے لیے۔" وہ فائلز سمیٹ کر دراز میں رکھتے ہوئے بولی۔

"پھر بھی پتا تو چلے ورنہ مجھے پتا ہے کہ تم بڑی بڑی باتوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتی ہو۔" کھوج اس کی فطرت کا حصہ تو نہیں تھی' پر اس کا پریشان چہرہ اسے بے چین کر رہا تھا۔

"پتا نہیں کیوں ثاقب! ہماری زندگی عام لوگوں کی طرح کیوں نہیں ہے۔ رعنا آپا۔" پھر آہستہ آہستہ وہ اسے ساری تفصیل بتاتی چلی گئی۔ تین سال پہلے جب سارہ کی اس این جی او میں جاب ہوئی تھی تو ثاقب اور وہ ایک ہی سیکشن میں کام کرتے تھے۔ نٹ کھٹ اور حاضر جواب سارہ اور ثاقب میں کچھ خصوصیات ایسی تھیں' جو ایک جیسی تھیں اور ان دونوں کو تیزی سے ایک دوسرے کے قریب لے آئی تھیں۔ ثاقب ایک متوسط گھرانے کا فرد تھا' جس پر ابھی دو بہنوں اور بھائی کی ذمہ داری موجود تھی۔ اپنے اپنے گھر کے حالات کے بارے میں کبھی کچھ نہیں چھپایا تھا ہاں البتہ ثاقب کو سارہ کے نظریات نے بہت حیران کیا تھا۔

"جب تمہاری والدہ اور تمہارے بھائی تم لوگوں کے ساتھ ہیں' تم لوگ اسٹینڈ لو اور رعنا آپا کو رخصت کرو۔"

"یہی تو مسئلہ ہے ثاقب۔ ساری دنیا کے بزدل ہمارے ہی گھر جمع ہو گئے ہیں۔ رعنا آپا اس وقت تک تیار نہیں ہیں شادی کے لیے جب ابا کی رضا نہ ہو۔ وہ اس چیز کو برا خیال کرتی ہیں کہ ابا کی دعاؤں کے بغیر اس گھر سے رخصت ہوں۔ اور کچھ ایسے ہی خیالات ہماری کزن محترمہ مہر صاحبہ کے ہیں حالانکہ میں جانتی ہوں مہر اویس بھائی سے بہت محبت کرتی ہے۔ لیکن ابا کی مرضی کے بنا رخصتی پر تیار ہی نہیں ہے۔ بھائی کہہ کہہ کر تھک گئے ہیں۔" وہ بہت مایوسی سے بول رہی تھی۔

"فرض کرو سارہ! یہی حالات تمہارے ساتھ ہوں تو کیا تم میرے لیے اسٹینڈ لو گی اپنے ابا کے سامنے۔" سارہ کو نظروں کی گرفت میں لے کر اس نے کہا تو بے حد پر اعتماد سارہ بھی نظریں جھکا گئی۔

"پتا نہیں ثاقب! یہ سب تو قبل از وقت باتیں ہیں۔ ابھی تو ہم صرف رعنا آپا کے لیے پریشان ہیں دعا کرو ابا کا دل نرم پڑ جائے۔" وہ اس کی بات کا جواب گول کر گئی۔

"میری کوئی دعا تمہارے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ آؤ تمہیں گھر چھوڑ دوں۔" اس کے اٹھتے ہی اس نے کہا اور خود بھی اٹھ کھڑا ہوا۔



وہ کمپیوٹر اسکرین پر دیکھ دیکھ کر اہم ڈیٹا فائل پر منتقل کر رہی تھی' جب چپراسی نے آ کر کسی مہمان کی آمد کی اطلاع دی۔ مہر چونک گئی۔

"میرے مہمان؟" اس نے حیرت سے چپراسی کو انہیں لے آنے کو کہا اور چند لمحوں بعد اویس کو دیکھ کر مزید حیرت زدہ رہ گئی۔ وہ آج تک اس کے آفس نہیں آیا تھا۔

"تمہارے سیکشن انچارج سے ہاف لیو لے چکا ہوں۔ اب جلدی سے سب کچھ سمیٹو اور چلو میرے ساتھ۔" اویس نے اسے آرڈر دیا۔

"کک۔ کیوں خیریت۔ کہاں جانا ہے؟" اس نے متوحش ہو کر پوچھا۔ اس دن کچن میں ہونے والی گفتگو کے بعد اویس کی طرف سے مکمل ناراضی کا اظہار تھا۔ اس سے بات چیت مکمل بند تھی۔ اپنے ذاتی کاموں کے لیے بھی وہ سارہ یا آپا کو آواز دینے لگا تھا۔ مہر اس کی اس بے رخی پر دل مسوس کر رہ جاتی پر کچھ کرنے سے قاصر تھی۔

"جتنا کہا گیا ہے اتنا کرو۔" مجبوراً مہر کو سب کچھ سمیٹنا پڑا اور اس کے ساتھ چلی آئی۔ گاڑی کو بے حد تیز ڈرائیو کرتے ہوئے وہ اسے ساتھ لے کر کسی فوٹو شاپ پر آیا۔ اس کی کچھ تصاویر بنوائیں پھر جب اس نے پاسپورٹ آفس کے سامنے اپنی گاڑی روکی تو مہر بری طرح بوکھلا گئی۔

"اویس! تم کیا کر رہے ہو؟ ہم یہاں کیوں آئے ہیں۔ تایا کو پتا چلا تو بہت خفا ہوں گے۔" وہ روہانسی

ہو کر بولی۔

"تایا کی فرماں بردار بھتیجی! کبھی یہ بھی یاد رکھ لیا کرو کہ تایا نے ہی تمہارا نکاح مجھ سے کردیا ہے۔ افسوس ہر بار مجھے اس رشتے کا احساس دلانا پڑتا ہے۔ میں جو کچھ بھی کررہا ہوں، کسی حق کے تحت کررہا ہوں اب مہربانی کرکے اپنا آئی کارڈ مجھے دو اور یہاں گاڑی میں رہو۔ میں کچھ ضروری کارروائی کرکے تمہیں بلاؤں گا۔ تمہارے سائن لینے ہوں گے۔"

"تایا کو بتایا تم نے...؟" حواس باختہ مہر کے سر پر تایا کا بھوت سوار تھا۔

"مجھے آئی ڈی کارڈ دو..." اس کی بات سن کر وہ غصہ ضبط کرکے بولا تو مہر نے بیگ میں سے کانپتے ہاتھوں سے اسے آئی ڈی کارڈ نکال کردے دیا۔

"تم نے مجھے سمجھنے کی کوشش نہیں کی اویس... میرے دل سے پوچھو جو تمہاری رفاقت اور ہمراہی کی خواہش رکھتا ہے اور تمہارا نام اپنے نام سے جڑے دیکھ کر جو انجانی خوشی میں محسوس کرتی ہوں وہ صرف میں ہی جانتی ہوں، لیکن تایا کے احسانات اتنے بھاری ہیں کہ تمہاری محبت اس کے بوجھ کے نیچے دب جاتی ہے اور میں سانس بھی نہیں لے پاتی۔ پر اللہ پر میرا یقین بہت پختہ ہے جو کبھی نہ کبھی تو میرے دل کی دعا سن کر تایا کو تمہارے حق میں راضی کرے گا۔" دور جاتے اویس کی پشت پر نظریں جمائے وہ بہت کچھ سوچتی چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

گھر واپس آنے پر اسے اس بارے میں زیادہ سوچنے کا موقع نہ مل سکا۔ شہزاد احمد ڈرائنگ روم میں تایا کے ساتھ جبکہ ان کی بہن نفیسہ بیگم کے ساتھ موجود تھیں۔ مہر تو سب کچھ بھول بھال کر کچن میں آگئی جہاں سارہ مصروف تھی جبکہ رعنا آپا شاید اپنے کمرے میں تھیں۔ اویس کو بھی جب شہزاد احمد کی آمد کا پتا چلا تو وہ بھی ڈرائنگ روم میں چلا گیا اور جاتے ہی اسے خوش گوار حیرت کا سامنا کرنا پڑا جب ابا کی ہی زبانی اسے پتا چلا کہ انہوں نے شہزاد احمد کو رعنا کے رشتے کے لیے اوکے کردیا ہے۔ اویس پر تو شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری ہوگئی جبکہ مہر خوشی کے مارے رعنا آپا سے لپٹ کر بے ساختہ رودی۔

"میں کہتی تھی نا آپا کہ اللہ تعالیٰ بہت مہربان ہے۔ وہ سچی دعا کبھی بھی واپس نہیں لوٹاتا۔" اس نے روتے ہوئے کہا۔

"بھائی! مجھے چٹکی کاٹیں ذرا۔ میں خواب میں تو نہیں ہوں۔" سارہ نے چوکھٹ میں کھڑے مسکراتے اویس کو کہا۔

"ویسے آج مجھے یقین آگیا کہ معجزے ہم جیسے گنہگاروں کے ساتھ بھی ہوسکتے ہیں۔ ابا کا مان جانا اس صدی کا معجزہ ہی ہوا نا۔" سارہ کے تیز تیز چلتے ہاتھوں کے ساتھ زبان بھی اسی رفتار سے چل رہی تھی جس سے اس کی خوشی کی انتہا کا اندازہ ہورہا تھا۔

"کیا خیال ہے بھائی! ابا کے موڈ کا کچھ پتا نہیں کب بدل جائے۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر آپ بھی مہر کی رخصتی کا منوالیں۔" سارہ نے شرارت سے سلاد کے لیے سبزیاں کاٹتی مہر کو دیکھ کر کہا جس نے گھور کر اسے دیکھا، پر سارہ پر کہاں اثر ہوتا تھا۔

"ابا مانیں یا نہ مانیں تمہاری مہر صاحبہ کی رخصتی تو ہر صورت ہونی ہے۔ بس کچھ کام رہ گئے ہیں وہ پورے ہوجائیں۔ بے فکر ہوجاؤ اور جلدی سے کھانا لگا دو۔ میں ڈرائنگ روم میں ہوں۔" ہلکے پھلکے انداز میں کہتا وہ واپس مڑ گیا تو دونوں خواہ مخواہ ہی ہنس دیں۔ دل کی خوشی یونہی لبوں پر مسکراہٹ لے آیا کرتی ہے اور آج اس گھر کے افراد بہت عرصہ بعد دل سے خوش تھے۔

ابا شادی کے لیے مان گئے ان کا یہی احسان بہت تھا۔ انہوں نے شادی کے سلسلے میں کسی بھی قسم کی مالی مدد کرنے سے انکار کردیا تھا۔ اویس تو اس بات پر بھی بہت برافروختہ تھا اور ابا سے جاکر باقاعدہ ان سب کی خصوصاً" رعنا آپا کی ہر ماہ وصول کی جانے والی تنخواہ اور اکیڈمی کی ٹیوشن سے حاصل ہونے والی رقم کے بارے میں بازپرس کرنا چاہتا تھا، لیکن اماں نے اسے روک دیا۔

"تمہیں ان کے مزاج کا پتا تو ہے اویس! انہوں نے میری بچی کی عمر کے کئی سنہری سال ضائع کردیے اب غصہ میں آکر پھر سے اپنی بات سے مکر گئے تو؟ اللہ بہتری کرے گا۔" انہوں نے بیٹے کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے اماں! آپ کی بات بالکل ٹھیک ہے ابا کی اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد جو پیسہ ملا ہے یا جو کچھ جمع ہے ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں ہے، لیکن آپ کے پیسوں پر قبضہ کرلینا کہاں کی شرافت ہے۔" وہ غصے سے سر جھٹک کر بولا۔

"وہ ہماری کوئی مدد نہیں کریں گے۔ میرا زیور جو میں نے تمہارے باپ سے چھپاکے رکھا تھا۔ تم وہ لے لو۔" وہ تھکے تھکے سے لہجے میں بولیں تو اویس احمد بھی ماں کی بات سن کر دھیما پڑ گیا۔

"ٹھیک ہے اماں... میں ایک دو دوستوں سے بھی بات کرتا ہوں اور آفس میں بھی لون کے لیے اپلائی کرتا ہوں۔ اللہ مالک ہے۔" وہ ان کے پاس آبیٹھا اور ان کے گرد اپنے بازو حمائل کرکے تسلی دینے والے انداز میں کہا ذہن میں کئی الجھنیں چکرا رہی تھیں۔ اگلے کئی دن اسی بھاگ دوڑ میں گزر گئے اور ٹھیک پندرہ دن بعد جب وہ لیپ ٹاپ پر اپنے کسی کام میں مصروف تھا۔ اس کے کمرے کے دروازے کو آہستہ سے کھٹکھٹا کر وہ چلی آئی۔

"کیا بات ہے مہر! اس ٹائم۔ خیریت تو ہے نا۔" وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ اس کے کمرے میں کبھی آئی ہی نہ تھی۔ وہ کوئی کام کہتا بھی تو سارہ کے ہاتھ ہی کرکے بھجوا دیتی۔

"یہ کچھ رقم ہے رکھ لو۔ رعنا آپی کی شادی کے سلسلے میں کام آئے گی۔" پشت سے ہاتھ سامنے لاکر اس نے لفافہ ٹیبل پر رکھ دیا۔ اویس نے ایک نظر لفافے پر اور دوسری مہر پر ڈالی جو جانے کے لیے پر تول رہی تھی۔

"تنخواہ تو ساری تمہارے تایا لے لیتے ہیں۔ یہ رقم کہاں سے آئی۔" اس نے اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑا اور بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"تقریباً" آٹھ نو ماہ پہلے ہم سب کولیگز نے فیصلہ کیا تھا کہ جس دن پے ملے اسی دن سب لوگ ایک مخصوص رقم کیشیئر کے پاس ہی رہنے دیا کریں اور ہر ماہ جس کی اشد ضرورت ہو وہ، وہ رقم لے لیا کرے۔ ایک قسم کی بی سی ٹائپ اقدام تھا یہ... یوں اس وقت محسوس بھی نہیں ہوتی تھی ایک معمولی سی کٹوتی، اور رقم بھی جمع ہوجاتی۔ مجھے پتا ہے کہ تمہیں رعنا آپا کی شادی کے لیے ضرورت ہے سو..."

"مجھے تمہارا اس طرح سوچنا، کرنا اچھا لگا، لیکن تم یہ رقم واپس اٹھالو تمہارے اپنے کام آجائے گی اور مہربانی کرکے اس رقم کی خبر اپنے تایا جی کو ہرگز مت ہونے دینا۔ میں رقم کا بندوبست کرچکا ہوں۔ تم بس دعا کرو کہ آپا کی شادی کا مرحلہ بخیر و عافیت گزر جائے۔" اویس نے لفافہ اٹھا کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"تم یہ نہیں رکھو گے تو میں سمجھوں گی کہ تم مجھے اس گھر کا حصہ نہیں سمجھتے۔" وہ روٹھے لہجے میں بولی تو اویس اس کے اس انداز پر بے ساختہ مسکرا دیا۔

"سمجھنے کی بات چھوڑیں۔ وہ کھاتا کھولا تو بہت دور تک جائے گا۔ تم نہ صرف اس گھر بلکہ میری زندگی کا بھی اہم حصہ ہو۔ اس لیے ایسی فضول بات اور ایسا شکوہ نہیں بنتا تمہاری طرف ہاں تمہیں اپنے آپ کو یہ حقیقت باور کرانے کی ضرورت ہے۔ صرف آپا ہی کیا تم سب میری ذمہ داری ہو اور اپنی ذمہ داری نبھانا میں خوب جانتا ہوں۔" سنجیدگی سے اسے سمجھاتے ہوئے اویس نے کہا پر مہر پھر بھی اپنی بات پر ڈٹی رہی۔

"میں تم سے بہت زیادہ ناراض ہوجاؤں گی۔ اگر تم نے یہ نہیں لی تو۔" اویس نے لفافہ دوبارہ سامنے ٹیبل پر رکھ دیا۔

"یہ لو۔ میں سب کچھ برداشت کرسکتا ہوں، لیکن تمہاری ناراضی ہرگز نہیں، اب خوش؟" اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو مہر شکریہ کہہ کر تیزی سے اس کے کمرے سے باہر نکل آئی۔

ڈیڑھ ماہ کا عرصہ تیزی سے شادی کی تیاریوں میں

گزرا تھا۔ ابا کو اس بات سے کوئی سروکار نہیں تھا کہ شادی کے اخراجات اور سارے انتظامات کیسے ہوئے۔ ایک ہاں کہہ کر انہوں نے اپنا فرض پورا کردیا تھا۔ اویس نے یہ سب کیسے کیا کہاں سے کیا انہوں نے ایک بار بھی پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ رعنا آپا رخصت ہو کر شہزاد احمد کے سنگ چلی گئیں تو نفیسہ بیگم سمیت سب نے سکون کی سانس لی۔ شہزاد احمد بہت اچھے تھے۔ رعنا آپا بہت خوش تھیں۔ شادی کے بعد وہ جب جب بھی آئیں سچی خوشی کا عکس ان کے چہرے پر روشنی بن کر جھلملا رہا ہوتا ہاں ایک الجھن ضرور تھی کہ مسز خالد جو شادی سے پہلے تک ان کی بہت اچھی کولیگ اور دوست تھیں اور شادی کروانے میں بھی پیش پیش تھیں ان کا رویہ شادی کے بعد سے رعنا کو کچھ اکھڑا اکھڑا سا لگا تھا۔ بہت ڈھونڈنے اور سوچنے پر بھی کوئی خاص وجہ بظاہر نظر نہ آسکی۔ شہزاد احمد سے بھی سرسری طور پر ذکر کیا تو انہوں نے بھی انہیں یہ کہہ کر مطمئن کردیا کہ ان کے گھر کی کوئی پریشانی ہوگی۔ ابھی وہ دونوں ان ہی کے اوپر والے پورشن میں مقیم تھے۔

✺ ✺ ✺

مہر نے آفس سے آنے کے بعد نفیسہ بیگم کے کمرے میں جھانکا اور انہیں نماز پڑھتے پا کر کچن میں آگئی۔ فریج میں سالن موجود تھا وہ نکال کر گرم کیا' روٹیاں پکائیں اور سلاد بنا کر واپس نفیسہ بیگم سے آکر کھانے کا پوچھا تو پتا چلا وہ اور تایا کھانا کھا چکے ہیں۔

"رعنا آئی تھی تھوڑی دیر کے لیے۔ وہ بنا کے گئی تھی کھانا۔ اویس آئے تو اسے گرم روٹی ڈال دینا خود بھی کھا لینا۔ سارہ اپنی کسی کولیگ کے ہاں گئی ہے۔" انہوں نے جائے نماز لپیٹتے ہوئے تفصیل بتائی۔

"رعنا آپا آئی تھیں' رکی نہیں؟" وہ حیرت سے بولی۔

"ہاں بس کھڑے کھڑے طبیعت کا پتا کرنے چلی آئی پھر شہزاد میاں کے ساتھ شاپنگ پر جانا تھا اسے۔ کہنے لگی دونوں تھکی ہوئی آئیں گی۔ سو سالن بنا کے تمہارے تایا کو اور مجھے روٹیاں ڈال دیں پھر چائے پینے تک شہزاد میاں بھی اسے لینے چلے آئے تو چلی گئی۔"

مہر سر ہلاتی واپس کچن میں آگئی۔ کھانا کھا کر ابھی چائے بنانے کے لیے کیتلی رکھی ہی تھی کہ اویس بھی آگیا۔

"کھانا کہاں لگاؤں' تمہارے کمرے میں یا یہیں؟" اس کے تھکے تھکے انداز کو دیکھ کر وہ بولی۔

"یہیں لگا دو' بہت تھک گیا ہوں آج تو۔ پھر اسٹرونگ سی چائے بنا دینا' میں فریش ہو کر آتا ہوں۔" کہہ کر وہ اپنے کمرے کی جانب چلا گیا تو مہر نے اس کے آنے تک ٹیبل پر کھانا لگا دیا۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہی وہ اس کے سامنے چائے کا کپ رکھ کر اپنا کپ اٹھا کر باہر نکلنے کو تھی جب اویس کی آواز پر اسے رکنا پڑا۔

"رکو مہر! مجھے تم سے بات کرنی ہے۔" وہ دروازے سے واپس پلٹ آئی اور اس کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اویس اس لمحے اسے بہت سنجیدہ لگا تھا۔

"ابا سے میں بہت بار تمہاری رخصتی کی بابت بات کرچکا ہوں مگر نتیجہ کچھ بھی نہیں نکلا۔ چھ ماہ پہلے میں نے اپنے آفس میں سعودی عرب برانچ میں اپنے ٹرانسفر کے لیے درخواست دی تھی۔ وہاں سے مجھے [illegible] مل چکا ہے اور تمہارا اور میرا پاسپورٹ بھی بن کر آچکا ہے۔ ابا سے آخری بار بات کروں گا۔ وہ نہ مانے تب بھی تمہیں میں نے ساتھ لے کر جانا ہے۔ اماں کی رضا بھی یہی ہے' تم سے صرف اتنی درخواست ہے کہ ہر صورت میں تمہیں میرے ساتھ جانے کے لیے تیار رہنا ہے۔" یہ سب کچھ بتاتے ہوئے اس کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہ آیا تھا جبکہ مہر نے حیرت سے اسے دیکھا جیسے اسے یقین نہ آرہا ہو کہ وہ اتنا بڑا قدم بھی اٹھا سکتا ہے۔

"لیکن اویس! اگر تایا نہ مانے تو۔ اور تم اس طرح کیسے سب کچھ چھوڑ کر جاسکتے ہو۔ تائی اماں؟" اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیسے اپنا مطمع نظر اس پر واضح کرے۔

"اماں کی ایما پر ہی میں یہ قدم اٹھانے پر مجبور ہوا

ہوں ان کے خیال میں یہ آخری قدم ہی شاید ان کو راضی کر جائے۔" اس کو مشکل میں ڈال کر وہ وہاں سے اٹھ گیا تھا۔ مہر جانتی تھی کہ تایا نے ماننا نہیں ہے اور تایا کی مرضی اس کے لیے بہت اہم تھی۔ دماغ کی ناڑیں تایا کے احسانات کی زد میں تھیں جبکہ دل ہمک ہمک کر اویس کی ہمراہی چاہتا تھا۔ اسی کشمکش میں اسے وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلا۔

✺ ✺ ✺

آج چھٹی کا دن تھا۔ رعنا نے آج اپنے میکے جانے کا پروگرام بنایا ہوا تھا سو جلدی سے گھر کے مختلف کام سمیٹنے میں مصروف تھیں۔ جب مسز خالد چلی آئیں اب شہزاد کی طرح وہ بھی انہیں آپا کہنے لگی تھیں۔

"ارے آئیں آپا... آپ۔" رعنا خوشگوار حیرت میں گھر کر بولیں۔

"آپا ایک بات پوچھوں۔ اگر برا نہ مانیں تو۔" کولڈ ڈرنکس سے ان کی تواضع کرنے کے بعد رعنا نے کسی قدر جھجکتے ہوئے ان سے پوچھا۔

"ہاں پوچھو۔" انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"کالج میں جس طرح آپ نے ہر قدم پر میری رہنمائی کی وہ میں کبھی بھلا نہیں پاؤں گی۔ شہزاد کی نسبت سے میں بہت عزت دیتی ہوں آپ کو اور محبت کرتی ہوں آپ سے۔ میں پوچھنا چاہ رہی ہوں کہ اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہو تو آپ مجھے ڈانٹ سکتی ہیں۔ میری بڑی ہیں آپ۔ میں کبھی برا نہیں مانوں گی۔" رعنا نے شہزاد کی طرف غیر موجودگی کا فائدہ اٹھایا اور اپنے مخصوص نرم انداز میں پوچھا۔

"کیا تم واقعی نہیں جانتیں رعنا۔" مسز خالد کی پیشانی پر ہلکے سے بل آگئے۔

"کیا آپا۔ آپ کھل کر بات کریں' یقین کریں میں کچھ نہیں جانتی کہ آپ کو میری کون سی بات بری لگی ہے۔"

"تمہاری نہیں تمہارے والد کی۔" انہوں نے سرد لہجے میں کہا تو رعنا کا رنگ زرد پڑ گیا۔

"تک... کیا کیا ہے ابا نے۔" ان کی آواز لڑکھڑائی اور رنگ پل میں زرد پڑ گیا۔

"میں نے تمہیں بتایا تھا نا رعنا کہ میرے بھائی نے بہت مشکل وقت گزارا ہے۔ وہ ایک سیلف میڈ انسان ہے۔ اس نے زندگی کے کئی سنہری برس محنت مشقت کی بھٹی میں گزار کر جو پونجی جمع کی اپنا سب کچھ لے کر یہاں چلا آیا تاکہ اپنا بزنس اسٹارٹ کرسکے اور میرے میاں کی غیر موجودگی میں مجھے بھی سہارا مل جائے۔" وہ الجھن بھری نگاہوں سے آپا کو دیکھ رہی تھیں۔

"تمہارے والد نے پہلے تو شہزاد کو صاف انکار کردیا تمہارا رشتہ دینے سے مگر اس کے اصرار پر اس سے دس لاکھ روپے مانگ لیے وہ بھی اس شرط پر کہ کسی کو علم نہ ہو۔ میرے بھائی کی تو قسمت ہی بری ٹھہری۔ پہلی بار جو لڑکی اسے پسند آئی۔ اس نے دولت کی کمی کو بنیاد بنا کر اس کا ہیرے جیسا دل توڑ ڈالا اور اتنے برس بعد جس لڑکی پر میرے بھائی کا دل آیا۔ اس کے باپ نے دولت کو بنیاد بنا کر میرے بھائی کی کمر ہی توڑ ڈالی۔ روپے پیسے کی کمی تو پھر بھی پوری ہوجائے گی' لیکن جو کمی زندگی میں آجائے اسے تو کوئی پورا نہیں کرسکتا۔ شہزاد نے ہمارے مرحوم والدین کی نشانی اماں ابا کا گھر فروخت کیا اور تمہارے ابا کی خواہش پوری کردی۔ شہزاد نے مجھے تم سے یا کسی سے ذکر کرنے سے سختی سے منع کیا تھا' لیکن کیا کروں کہ تمہیں دیکھتی ہوں تو تمہاری سیرت' اچھائیاں اور عادات سب پس پشت چلی جاتی ہیں۔ سامنے آجاتی ہے تو تمہارے والد کی زیادتی۔" مسز خالد رعنا کے لٹھے کی طرح سفید ہوتے رنگ سے بے خبر بولے چلی گئیں۔

"یہ کیا کیا ابا آپ نے... لوگ تو بیٹیوں کے اونچے سر کے لیے اپنا آپ بھی قربان کر ڈالتے ہیں اور آپ نے بیٹی کو کچھ دینے کے بجائے الٹا اسے اپنے میاں اور سسرال کے سامنے عمر بھر کا مقروض کردیا۔ اب ساری عمر کیسے سر اٹھا پاؤں گی میں اس بھلے آدمی کے سامنے جس نے کبھی بھی زیادتی کا احساس دلائے بغیر مجھے

محبتوں کی دولت سے مالا مال کر دیا۔"

مسز خالد جا چکی تھیں۔ ان کا کہا گیا ایک ایک لفظ رعنا کی روح کو سلگا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں شہزاد احمد آگئے۔ انہیں تیار نہ دیکھ کر حیران ہوئے اور جلدی سے تیاری کا حکم دیا۔ رعنا تو شرمندگی کے مارے ان سے آنکھیں چار ہی نہ کر سکیں اور ڈھیلے ڈھالے انداز میں تیار ہو کر ان کے ساتھ نفیسہ بیگم کے ہاں آگئیں۔ شومئی قسمت ابا سب سے پہلے ملے تھے۔ انہوں نے رعنا کو گلے لگا کر ماتھا چوما۔ شہزاد احمد کو گلے سے لگا کر گرم جوشی سے خوش آمدید کہا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو رعنا ابا کی اس مہربانی پر خوشی سے بے حال ہو جاتیں پر اس پل انہیں وہ چہرہ باپ کا پُرشفقت چہرہ نہیں بلکہ لالچ کے غلاف میں لپٹا ایک خود غرض آدمی کا چہرہ دکھائی دیا جس کے نزدیک دولت، روپیہ پیسہ سب سے اہم تھا۔ رشتے، جذبے اور محبتیں اس دولت کے آگے ہیچ تھیں۔

شہزاد احمد کھانے کے بعد چلے گئے کہ شام تک وہ انہیں واپس لے جائیں گے۔ ان کے جاتے ہی رعنا کے ضبط نے ساتھ چھوڑ دیا۔ وہ ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ مہر اور سارہ کے تو ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے۔ اویس ابھی تھوڑی دیر پہلے گھر سے نکلا تھا جبکہ ابا اپنے کمرے میں تھے۔ نفیسہ بیگم نماز کے لیے اٹھ کر گئی تھیں، کمرے میں اب وہ تینوں اکیلی تھیں۔ ان کے رونے کی وجہ جان کر وہ دونوں ہی ساکت رہ گئیں۔ دروازے میں کھڑا اویس بھی سن ہو کر رہ گیا۔ ہر بار ہی ابا کی طرف سے ان کی اولاد کو کوئی نہ کوئی ایسی زک ملتی کہ اگلی چوٹ ملنے تک وہ پرانا زخم ہی چاٹتے رہ جاتے تھے۔

"لوگ تو اپنی بیٹیوں کو اپنے گھر خوش دیکھنے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کرتے اور ابا نے میرے لیے میرے سسرال میں شرمندگی اور ندامت کی ایسی دلدل تیار کر دی کہ میں مرتے دم تک اس سے نکل نہیں پاؤں گی۔" وہ سسک رہی تھیں۔ اویس آہستہ سے چلتا ہوا اندر آگیا۔

"بس کریں آپا آپ کا بھائی ابھی زندہ ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں رقم کے بندوبست کے لیے تاکہ آپ شہزاد بھائی کو لوٹا سکیں۔ مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوگا آپ کی نظریں اور سر ہمیشہ سسرال والوں کے سامنے جھکا رہے۔" وہ سنجیدگی سے بولا ایسے کہ الفاظ میں رنجیدگی نمایاں تھی۔

"نہیں اویس! اللہ ہمیشہ تمہیں سلامت رکھے، میں تو بس اپنا دکھ بانٹنے تم لوگوں کے پاس چلی آئی تھی۔ شہزاد نے مجھ سے اس بات کو پوشیدہ رکھا کہ میرے جذبات مجروح نہ ہوں۔ انہوں نے مجھے کبھی اس بات کا احساس نہیں ہونے دیا۔ اب میرا بھی تو فرض بنتا ہے کہ ان کے جذبات کا خیال رکھوں۔ آپا نے مجھے سختی سے منع کیا ہے کہ شہزاد سے ذکر نہ کروں، پہلے میں ان کی عزت کرتی تھی اب میری روح بھی ان کے احسانوں کے نیچے دبی رہے گی۔" وہ گہری آہ بھر کر بولیں۔

"پتا نہیں کیا مل جائے گا ابا کو اتنی دولت جمع کر کے حالانکہ ایک ہمارے ابا کو چھوڑ کر دنیا کے ہر انسان کے لیے اس کی اولاد ہی اس کی دولت ہوتی ہے۔" سارہ کو حسب معمول ابا پر بے حد غصہ تھا۔

"آپا۔ آپ شکر ادا کریں کہ شہزاد بھائی ایک اچھے انسان ہیں انہوں نے آپ کو یہ بات نہ جتا کر اور آپ سے چھپا کر اپنی اچھی فطرت کا ثبوت دیا ہے وہ آپ کو کبھی بھی اس بات کا طعنہ نہیں دیں گے۔" مہر نے بھی آپا کا ہاتھ پکڑ کر انہیں احساس شرمندگی سے نکالنا چاہا۔

"کوشش کرنا کہ اماں کو اس بات کا پتا نہ ہی چلے تو بہتر ہے، انہیں بہت دکھ ہوگا۔" کہہ کر وہ وہاں سے اٹھ آیا اور سیدھا ابا کے کمرے میں چلا آیا جہاں ابا اپنی الماری کھولے نجانے کس کام میں مصروف تھے کہ اسے دیکھ کر جلدی سے ٹھک کر کے الماری بند کر دی اور اپنی طرف بغور دیکھتے بیٹے کے انداز سے خائف ہو کر گڑبڑا گئے۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟" وہ اپنی آرام کرسی پر جا بیٹھے۔

"میں صرف یہ پوچھنے آیا ہوں کہ کیا کریں گے اتنی دولت، جائیداد کا جو نہ آپ کا ظاہر بدل سکی نہ اندر، نہ آپ کے اپنوں کے کام آسکی نہ انہیں خوشیاں دے سکی۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ مجھ سے بات کرتے ہوئے کیوں بھول جاتے ہو کہ میں تمہارا باپ ہوں تم میرے نہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم دن بہ دن بہت گستاخ اور بے ادب ہوتے جا رہے ہو۔" وہ غصے سے بولے۔ اویس مزید دو قدم آگے بڑھ آیا اور ابا کے بالکل سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔

"کاش ابا! یہ بات مجھے بھول جاتی کہ آپ میرے باپ ہیں تو سارا زمانہ دیکھتا کہ میں کیا کرتا۔ اس رشتے کا احساس ہی ہے جو میرے ہاتھ باندھ دیتا ہے۔ دولت کی اس جنگ میں ابا کم از کم اپنی بیاہی بیٹی کے ارمانوں کا ہی خیال رکھ لیتے۔ دولت کی ہوس میں آپ نے سب کچھ بھلا دیا ہے۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو؟" ابا نے اویس کی بات کاٹی تو وہ بھی ان ہی کا بیٹا تھا غصے میں زور سے چلایا۔

"میں پوچھتا ہوں شہزاد بھائی سے آپ نے رقم کیوں لی۔ کیا بیٹی بیچ رہے تھے آپ؟" غصے سے اس کی آواز بیٹھ گئی۔ ابا کو اب اس کے غصے کی وجہ سمجھ میں آئی تھی۔

"ارے جاؤ بھئی! میں سمجھا پتا نہیں کیا آفت آگئی۔ باپ ہوں میں اس کا۔ ساری عمر اس کی تعلیم و تربیت پر خرچ کیا ہے میں نے، اتنا تو حق بنتا تھا نا میرا اور شہزاد احمد کا کیا ہے لاکھوں میں کھیلتا ہے امریکا پلٹ ہے۔ تھوڑی سی دولت خرچ کر دی بیوی پر تو کیا حرج ہو گیا بھلا۔" ابا کا اطمینان دیدنی تھا۔ اویس کی برداشت کی حد بس یہیں تک تھی اس کے اندر جو غصہ ابل رہا تھا وہ اندر ہی رہ گیا۔ نم آنکھوں کے ساتھ باہر نکلتے نکلتے ایک دم ٹھٹھک کر دروازے میں رکا۔

"مہر کی رخصتی میرے ساتھ کر رہے ہیں یا نہیں۔" اس نے ہونٹ بھینچ کر اک بار پھر ابا کے بالمقابل آکر سوال کیا۔

"تیس لاکھ میری بچی کی سیکورٹی کے مجھے دو اور لے جاؤ اپنی بیوی کو۔ تم جیسا اکھڑ مزاج بندہ کب بدل جائے کچھ بھروسا نہیں۔" ابا نے کہا تو وہ طنزیہ سی ہنسی ہنس دیا جیسے جواب سن کر محظوظ ہوا ہو۔



تھوڑی دیر پہلے ہی شہزاد بھائی رعنا آپا کو لے کر گئے تھے۔ سارہ اور مہر نے کھانا کھلا کر ہی ان کو بھیجا تھا۔ صبح کی نسبت رعنا آپا اب کچھ پُرسکون تھیں۔ سارہ نے نفیسہ بیگم کو کھانا کھلا دیا۔ تایا نے کھانا اپنے کمرے میں منگوا لیا تھا جبکہ اویس آج سرے سے کھانے کی ٹیبل پر نظر ہی نہ آیا تھا۔ سارہ کو لیٹے دیکھ مہر ایک بار پھر کچن میں آگئی۔ آٹا گوندھ کر فریج میں رکھا۔ سنک میں پڑے برتن دھوئے اور ابھی کچن کا تنقیدی جائزہ لے ہی رہی تھی کہ تایا کی آواز سنائی دی۔

"مہر ایک کپ چائے بنا کر میرے کمرے میں لے آؤ بیٹا!"

اس نے چائے بنائی اور لے کر ان کے کمرے میں آگئی۔ وہ چائے کا کپ رکھ کر پلٹنے لگی جب انہوں نے اسے آواز دی۔

"مہر یہاں بیٹھو اور میری بات سنو۔" وہ ان کے سامنے بیڈ پر بیٹھ گئی۔ خود وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ ٹانگوں پر کمبل پڑا ہوا تھا۔

"تم بہت چھوٹی تھیں، جب میں تمہیں اس گھر میں لے کر آیا تھا۔ خدا گواہ ہے کہ تمہیں اپنی اولاد کی طرح ہی سمجھا۔ تمہارا اویس سے نکاح بھی میری محبت ہی ہے۔ میں چاہتا تھا میرے بھائی کی نشانی ساری عمر میرے پاس رہے میری آنکھوں کے سامنے۔" وہ آہستہ آہستہ چائے کے گھونٹ بھرتے ہوئے بولتے گئے۔ مہر الجھن بھرے انداز میں انہیں دیکھنے لگی۔

"اویس میری اپنی اولاد ہے، لیکن اس کی بدگمانیاں اپنے باپ سے اس حد تک بڑھ گئی ہیں کہ وہ اب میرے ساتھ ضد پر آگیا ہے۔ اس کی جنگ میرے

ساتھ ہے پر اب اس میں وہ تمہیں بھی گھسیٹنا چاہتا ہے' وہ جانتا ہے کہ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ میری اسی محبت کو وہ میری کمزوری بنانا چاہتا ہے۔ تمہیں مجھ سے دور لے جانا چاہتا ہے۔ یہ سب باتیں ایک طرف ہے۔ میں نے آج صرف تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ تمہاری رائے جان سکوں کہ تم کیا چاہتی ہو۔ میرے پیش نظر تمہاری بھلائی ہے اور اسی حوالے سے تمہارا تحفظ سوچ کر میں نے کچھ شرائط اس کے سامنے رکھی ہیں تاکہ بعد میں تم سکھی رہو۔ اس کے بعد تمہاری رخصتی کرنے کو تیار ہوں بشرطیکہ وہ تمہیں یہاں ہم سب کے ساتھ رکھے۔ بڑھاپے میں ہمیں تنہا نہ کرے۔ میرے لیے تمہاری رائے سب سے زیادہ مقدم ہے۔ تم جو چاہو گی ویسا ہی ہوگا' پر بیٹا! اتنا مجھ بوڑھے پر رحم کرنا کہ عمر کے اس حصے میں جب ماں باپ کو اولاد کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے' مجھے چھوڑ کر مت جانا۔" ان کا لہجہ بھرا گیا اور آنکھیں نم ہو گئیں۔ مہر کے آنسو بھی بہنے لگے۔

"نہیں تایا۔ آپ یہ کبھی مت سوچیے گا کہ میں کہیں جاؤں گی۔ آپ میرے والد کی جگہ پر ہیں اور میری زندگی کے ہر فیصلے کا اختیار آپ کو ہے۔ آپ جو کہیں گے میں ویسا ہی کروں گی۔" اس نے روتے ہوئے کہا تو تایا نے ایک طویل سانس لی۔

"جیتی رہو۔ جاؤ اب آرام کرو۔" اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر طویل سانس لی۔ ابھی رات ہی تو انہوں نے اویس کو نفیسہ بیگم سے بات کرتے سنا تھا کہ وہ اسی ہفتے کسی دن مہر کو لے کر یہاں سے چلا جائے گا بھلے زبردستی کیوں نہ لے جانا پڑے۔ کیوں کہ ابا کبھی بھی میری اور مہر کی شادی نہیں کریں گے بس ٹکٹس آجائیں تو میں جلد ہی کوئی فیصلہ کرنا چاہتا ہوں۔ اگرچہ آپ کو اس حال میں چھوڑ کر جانے کو دل نہیں مانتا پر اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔" وہ ماں کے ساتھ گفتگو کر رہا تھا جب جلال احمد ان کی باتیں سن کر وہیں سے پلٹ آئے تھے۔

مہر جو صبح رعنا آپا کی باتوں کے زیر اثر تایا سے ذرا بدگمان ہو بیٹھی تھی۔ اب تایا کی بے بسی' ان کی محبت اور آنسوؤں نے اسے موم کی طرح پگھلا ڈالا تھا۔ ابھی وہ بستر پر آکر بیٹھی ہی تھی کہ دروازے پر دستک دے کر اویس اندر چلا آیا۔

"تم اپنی ضروری پیکنگ کرلو کل شام چار بجے کی فلائٹ سے تم اور میں سعودی عرب جا رہے ہیں۔ ٹکٹس آچکی ہیں۔ ایک دن ہے تمہارے پاس۔ کوئی شاپنگ کرنی ہو تو سارہ کے ساتھ جا کر کرلینا۔" اس نے آتے ہی کھڑے کھڑے مہر کو ہدایات دیں۔ وہ دنگ ہو گئی۔

"کیا ہو گیا ہے اویس۔ ایسے کیسے۔ تم تایا سے بات تو کرو۔ وہ تمہاری ہر بات ماننے کو تیار ہیں۔ بس وہ چاہتے ہیں تم انہیں چھوڑ کر مت جاؤ۔" مہر حواس باختہ ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ سارہ لیپ ٹاپ چھوڑ کر چپ چاپ ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

"میں نے تمہیں سب کچھ صاف بتا دیا تھا کہ تمہارے تایا سے میری ایک نہیں ہزار بار بات ہو چکی ہے اور ان کی جو شرائط ہیں جو میں تو کیا کوئی بھی قیامت تک پوری نہیں کر سکتا۔ ایک سال بعد جب ہم یہاں آئیں گے تو حالات بہت حد تک سدھر چکے ہوں گے۔" اس نے خود پر بہت ضبط کرتے ایک بار پھر اسے سمجھانا چاہا۔

"کچھ بھی ہو اویس! میں تایا کی اجازت کے بغیر کوئی بھی انتہائی قدم نہیں اٹھاؤں گی' جو ان کا سر جھکانے کا باعث بنے۔" اس نے دو ٹوک انداز میں کہا اور انگلی کے ناخن کو دانتوں سے چبانے لگی جیسے اپنے اندر کے اضطراب کو کم کرنا چاہ رہی ہو۔

"تمہارے تایا کا سر اٹھا رہے' بھلے تم خود برباد ہو جاؤ۔ اپنے دل کی آواز سنو مہر! اور دماغ کی کھڑکیاں کھول کر اچھی طرح سے حالات و واقعات کا جائزہ لو تو صحیح صورت حال کو سمجھ پاؤ گی بے وقوف لڑکی!" سارہ نے تیز لہجے میں کہا اور ملامتی نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

"بس کرو سارہ، جو لوگ اپنی زندگی کی راہیں خود

کرتے ہیں وہ سرے لاکھ کوشش کریں اسے کھڑا نہیں کر سکتے۔" وہ سارہ سے مخاطب ہوا اور پھر اس کی طرف مڑا اور اس کے بالکل سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر خاموش نظریں جھکائے مہر کو تاسف بھری نظروں سے دیکھا اور مخاطب ہوا۔

"تم نے بہت بار میرے جذبوں کا مذاق اڑایا ہے مہر! لیکن میرے جذبے اتنے سستے ہرگز نہیں ہیں کہ ہر بار اپنے پاؤں کی ٹھوکر سے تم انہیں اپنی زندگی سے دور ہٹاؤ۔ میں یہاں سے بہت دور جا رہا ہوں اپنے دل کا ہر رشتہ تم سے ختم کر کے۔ اب تم مجھے سو بار بھی بلاؤ گی تو بھی میں پلٹ کر نہیں آؤں گا کہ دل کی بستی ایک بار اجڑ جائے تو پھر اس میں محبتوں کے پھول لگنا ناممکن ہو جاتا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے جیب سے ٹکٹ نکالا اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کے سامنے پھینکا اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ سارہ نے بھائی کو حق بجانب سمجھا اور ابھی مہر کو لعنت ملامت کرنے ہی والی تھی کہ اسے ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھ کر تاسف سے سر ہلاتی اس کے پاس آگئی۔

"دل کو مار کر اگر ایک فیصلہ کر ہی لیا ہے تو اس پر ثابت قدم بھی رہو' اب یہ رونا کیوں؟" اس نے اس کے جھٹکے لیتے جسم کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"مہر! تم نے بہت برا کیا اپنے ساتھ بھی اور بھائی کے ساتھ بھی۔ زندگی میں مخلص ساتھی بہت کم ملتے ہیں اور بہت کم خوش نصیبوں کو ملتے ہیں اور جو ان کی ناقدری کریں ان سے بڑا بدنصیب کوئی نہیں ہوتا۔"

سارہ کی کہی ہوئی ایک ایک بات ٹھیک تھی' پر اس نے احسانات کو محبت اور رشتوں پر ترجیح دی تھی۔ پوری رات اس نے جاگتے گزاری تھی اور صبح سب کا سامنا کرنا پڑے گا یہی سوچ اسے مقررہ وقت سے پہلے گھر سے باہر نکلنے پر مجبور کر گئی۔ آفس میں کسی کام کو دل نہ لگا۔ وہ دشمن جاں یہ سرزمین چھوڑ کر چلا جائے گا۔ یہ خیال ہی روح کو کھینچ لینے والا تھا۔ ساڑھے تین بجے مرے مرے قدموں سے وہ باہر نکل آئی۔ چار بجے [illegible] وہ گھر پہنچی۔ ایک ہولناک سناٹے نے اس کا استقبال کیا۔ تھکے تھکے قدموں سے وہ اپنے کمرے میں آگئی۔ سارہ اس سے پہلے آچکی تھی۔

"کھانا لاؤں تمہارے لیے؟" اس نے عام سے لہجے میں اس سے پوچھا اس کا تھکا وجود اور آنکھیں اس کے دل میں افسوس کی لہر جگا گئیں۔

"بھوک نہیں ہے' میں سوؤں گی کچھ دیر۔" اس نے کہا اور بیگ اور چادر بستر پر پھینکی اور لیٹ کر کمبل میں منہ چھپا لیا۔ سارہ کا دل بہت دکھی ہو رہا تھا۔ اویس یہاں سے بارہ بجے نکلا تھا۔ شہزاد بھائی اور رعنا آپا ائیرپورٹ تک ساتھ گئے تھے۔ ابا البتہ صبح کے گھر سے نکلے ابھی تک نہ لوٹے تھے۔ نفیسہ بیگم نے اگرچہ یہ راستہ خود ہی اویس کو دکھایا تھا' پر اب اسے اکیلے جاتے دیکھ بہت دکھی تھیں۔ اسی وجہ سے ان کا بی پی بہت شوٹ کر گیا تھا۔ سارہ نے انہیں دوا کھلا کر لٹا دیا تھا۔ اویس نے کہنے کو تو دل کا ہر رشتہ اس سے توڑ ڈالا تھا' پر اس کی متلاشی نظریں بار بار یہاں وہاں ہر ایک کو تلاشتی رہی تھیں۔ آخر میں وہ بے حد مایوس ہو کر اور مہر سے ہزاروں شکوے رکھتا چلا گیا تھا۔ مہر کے آفس لوٹ آنے کے کچھ دیر بعد ابا بھی لوٹ آئے تھے اور سارہ کو کھانا لگانے کو کہا تھا۔ سارہ نے دبے دبے لہجے میں انہیں اویس کے جانے کا بتایا تھا' وہ خاموش بیٹھے کھانا کھاتے رہے تھے۔ سارہ دل جلا کر پلٹ آئی۔ اگلے ایک دو دنوں میں مہر کے دل کی تو پتا نہیں کیا حالت تھی۔ بظاہر پرسکون تھی۔ ابا نے اسے بلا کر شاباش دی تھی اور اپنا مان رکھ لینے پر اس کے سر پر دست شفقت بھی رکھا تھا۔

"ماں باپ کا مان اور غرور سلامت رکھنے والی بچیاں کبھی بھی ناخوش نہیں رہتیں۔ اللہ نے ان کے لیے ان کے حصے کی خوشیاں الگ سے رکھی ہوتی ہیں' جو وہ وقت آنے پر ضرور دیتا ہے۔" ان کے اس طرح کہنے پر مہر کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ تاہم اس نے کچھ کہنے سے گریز کیا تھا۔

"ارے دیکھنا میں اس ناخلف کو اس کے کیے کی کیا سزا دیتا ہوں۔ وہ اگر اس طرح اکڑ دکھا کر چلا گیا ہے تو

میری بیٹی کے لیے بھی رشتوں کی کمی نہیں ہے۔" ان کی بات سن کر مہر کا دل دھک سے رہ گیا۔

"ن۔۔۔ نن نہیں تایا۔۔۔ مجھ سے یہ سب نہیں ہو گا۔ آپ کا ہر حکم سر آنکھوں پر، لیکن مجھ سے اویس کا نام جدا مت کیجیے گا۔" اس نے اس طرح بے قرار ہو کر کہا تھا تایا کی اگلی بات ان کے منہ میں رہ گئی تھی۔ اس کا دل ایسے پانی بن کر آنکھوں سے بہہ نکلا کہ اس سے زیادہ دیر وہاں رکا نہیں گیا وہ وہاں سے بھاگ کر اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔

اویس نے وہاں جا کر سب سے پہلے نفیسہ بیگم اور پھر سارہ سے بات کی، پھر فون بند کر دیا تھا۔ مہر دل ہی دل میں رو دی تھی۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ اس سے دوری تو اس نے تایا کی محبت اور احسان کے عوض خرید لی تھی پر اس کے نام سے جڑا یہ رشتہ جس سے اس کے دل کے سارے تار بندھے تھے، کسی بھی قیمت پر نہیں توڑے گی۔



کچھ دن سے سارہ کی سرگرمیاں کچھ مشکوک سی تھیں۔ فون پر بات کرتے کرتے وہ اسے دیکھ کر یا تو فون بند کر دیتی یا اس کے کہیں ادھر ادھر ہو جانے کا انتظار کرتی۔ حالانکہ وہ تینوں ہمیشہ ساتھ رہتی آئی تھیں اور کسی بھی قسم کی رازداری ان میں سے کسی نے نہ برتی تھی چھپانے والا کچھ تھا ہی نہیں۔ اب سارہ کی اس قسم کی باتیں اسے تکلیف دینے لگی تھیں اور اس کی الجھن تب اور زیادہ بڑھی۔ جب وہ رات کو کھانے کے بعد حسب معمول نفیسہ بیگم کے کمرے میں گئی۔ سارہ پہلے سے ہی وہاں موجود تھی اسے دیکھ کر تیز تیز بولتی سارہ اور پیشانی پر شکنیں لیے تائی دونوں خاموش ہو گئیں۔ اس چیز نے مہر کو سخت خفت میں مبتلا کیا اور کسی حد تک ناگواری میں بھی۔ نفیسہ بیگم سمیت گھر کے ہر فرد نے اسے نہ صرف اپنے گھر بلکہ دلوں میں جگہ دی تھی۔ اسے کبھی یہ محسوس نہیں ہونے دیا تھا کہ یہ اس کا اپنا گھر نہیں ہے، لیکن آج کل وہ اتنی زود رنج ہو رہی تھی کہ معمولی سے معمولی بات بھی بری طرح سے محسوس کرنے لگی تھی۔ وہ جانے کو تھی جب نفیسہ بیگم نے اسے پکار لیا۔

"آؤ نا مہر! کہاں جا رہی ہو۔"

"کہیں نہیں، بس آپ کے پاس آئی تھی، لیکن آپ لوگ باتوں میں مصروف تھیں تو میں۔۔۔" وہ آہستہ سے بولتی ان کے پاس بیٹھ گئی۔

"تو بیٹا! اس گھر کے مسائل تم سے چھپے ہوئے ہیں۔" وہ اسے افسردہ سی لگیں تو مہر نے بھی فوراً "خود ترسی کی کیفیت سے خود کو نکالا۔

اسی وقت سارہ کے سیل فون پر کال آئی۔ رعنا کا فون تھا اور وہ امی سے بات کرنا چاہ رہی تھیں۔ دوسری طرف کی بات سن کر نفیسہ بیگم کے چہرے کے تاثرات بھی بدل گئے۔

"مبارک ہو بیٹا! شادی کے بعد ماں بننے کی خوش نصیبی پانا ہر بیاہتا عورت کی خواہش ہوتی ہے۔ خدا خیر سے وہ وقت لائے۔"

ان کی بات سن کر ان دونوں کے چہروں پر بھی خوشی کے تاثرات جھلملانے لگے۔ اس گھر کے گھٹن زدہ ماحول میں یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں ان جگنوؤں کی طرح لگتیں جو کبھی کبھار بھٹک کر کسی انجانے دیس میں جا نکلتے ہوں۔ نفیسہ بیگم اب اسی حوالے سے کچھ احتیاطی تدابیر رعنا آپا کو بتا رہی تھیں۔ سارہ نے چند دن اس سے روا رکھی بے رخی کو سمیٹا اور اس کو دیکھ کر مسکرا دی۔ مہر نے بھی جواباً" مسکرانے میں کسی بخل سے کام نہیں کیا کہ یہ لوگ اس کے اپنے تھے اور اپنوں کی خوشی میں خوش ہونا ہی اچھے اور مخلص لوگوں کا شیوہ ہوتا ہے۔ اگلے روز رعنا آپا آئیں تو بہت خوش تھیں اور بہت خوب صورت بھی لگ رہی تھیں۔ مہر اور سارہ نے ان کے خوشی سے چمکتے چہرے کو دیکھ کر ان کی خوشی دائمی ہونے کی بیک وقت دعا مانگی تھی۔



چھٹی والے دن اس کی آنکھ حسب معمول نماز کے وقت کھلی۔ وہ باقاعدگی سے پانچوں نمازیں ادا کرتی تھی۔ البتہ سارہ فجر کی نماز میں ڈنڈی مار جایا کرتی تھی۔ حسب معمول آنکھ کھلنے پر اس کی نگاہ غیر ارادی طور پر سارہ کے بستر پر پڑی تو وہ اسے خالی لگا یہی خیال آیا کہ وہ واش روم یا کچن چائے بنانے کے لیے گئی ہوگی۔ واش روم جانے کے بعد اس نے وضو کر کے نماز پڑھی اور جائے نماز تہہ کرنے لگی تو اب بھی سارہ کو نہ پا کر چونک گئی۔ پھر خیال کیا کہ نفیسہ بیگم کے کمرے میں ہوگی۔ آج کل کافی راز و نیاز چل رہے تھے ان دونوں کے۔ اس نے سر جھٹک کر نفیسہ بیگم کے لیے ناشتا بنانا شروع کیا اور جب ان کو ناشتا دینے کے لیے گئی تو وہاں ان کو اکیلے دیکھ کر اس کی حیرت پریشانی میں بدل گئی پر نفیسہ بیگم پر کوئی بات ظاہر کیے بنا اس نے انہیں ناشتا کرایا اور دوائیاں دے کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ کسی بھی بدترین خدشے کو دل سے جھٹکتے وہ تیزی سے تایا کے کمرے کی طرف آئی۔

"آؤ بھئی مہر بچے! آج ناشتا نہیں ملے گا کیا۔" تایا کے کمرے میں بھی نہیں تو پھر کہاں۔

"جی تایا! ابھی لاتی ہوں ناشتا۔" ان کو جواب دیتی وہ عجلت میں واپس کمرے کی جانب آئی اور سارہ کے بیڈ کی سائیڈ درازوں کا جائزہ لینے پر بدترین شک حقیقت کا روپ دھارے نظر آیا۔ سارہ کے تکیے کے نیچے اسے ایک بڑا سا کاغذ تہہ کیا ہوا ملا اس کی سطروں پر نظریں دوڑانے لگی۔ پڑھتے ہی مہر پر جیسے کوئی لرزہ طاری ہو گیا۔ ناشتا وغیرہ سب بھول کر وہ نفیسہ بیگم کے کمرے کی جانب آئی۔ اسے حواس باختہ دیکھ کر چونک گئیں۔

"تائی اماں۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ دیکھیں۔۔۔ سارہ نے کیا کیا۔۔۔ وہ یہ گھر چھوڑ کر چلی گئی ہے۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ لکھ کر رکھ گئی ہے۔" پھولی ہوئی سانس اور نم آواز میں کہہ کر اس نے وہ پرچہ تائی اماں کی طرف بڑھایا۔ نفیسہ بیگم نے وہ پرچہ اس کے ہاتھ سے لے کر ایک نظر ان سطروں پر ڈالی اور جب بولیں تو ان کے لہجے میں پریشانی کے بجائے ایک سکوت تھا۔

"تم نے اپنے تایا کو بتایا؟" ان کا ردعمل مہر کو عجیب بہت عجیب سا لگا۔ اسے تو خدشہ تھا کہ یہ سنتے ہی تائی کی طبیعت زیادہ خراب نہ ہو جائے۔ لیکن اس کے سارے اندازے غلط ثابت ہوئے بلکہ ایک لمحے کے لیے تو اس کو خیال آیا کہ سارہ کہیں تائی کو بتا کر ہی نہ گئی ہو، لیکن دوسرے لمحے اس نے اپنے خیال پر لعنت بھیجی۔

"نہیں، میں تو سیدھا آپ کے پاس ہی چلی آئی ہوں۔" اس نے ہکلا کر کہا۔

"مجھے اس کے جانے کا اور اس طرح جانے کا بہت دکھ ہے مہر! لیکن پھر سوچتی ہوں کہ جن بچیوں کے والدین یہ بھول جائیں کہ گھر میں جوان بچیاں ہیں اور ان کی فرائض کی ادائیگی ان پر فرض ہے تو کئی ایک بچیاں اپنی راہ خود ہی ڈھونڈ لیا کرتی ہیں جیسے سارہ نے کیا۔ ہر لڑکی رعنا کی طرح نہیں سوچتی نہ تمہاری طرح۔" وہ تھکے تھکے انداز میں بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر بولیں اور آنکھیں موند لیں، پھر کہنے لگیں۔

"پریشان نہ ہو۔ اویس ان دونوں کا رشتہ طے کر گیا تھا۔"

ناشتے میں تاخیر کے سبب وہ نفیسہ بیگم کے کمرے میں چلے آئے تھے۔ عرصہ ہو گیا تھا دونوں میاں بیوی کے کمروں کو الگ ہوئے۔ اندر کا منظر دیکھ کر چونک گئے۔ بیڈ سے ٹیک لگائے ان کی نصف بہتر اس حال میں تھیں کہ آنسوؤں کی قطار گالوں پر تھی۔ درمیان میں ایک پرچہ کھلا پڑا تھا۔ ان کے بالمقابل پریشان اور نم آنکھیں لیے بیٹھی مہر۔

"کیا ہوا؟ ایسے کیوں بیٹھی ہو تم لوگ اور یہ کیا ہے؟" انہوں نے بڑھ کر وہ پرچہ اٹھا لیا اور جوں جوں اس پر نظریں دوڑاتے گئے ان کی رنگت متغیر ہوتی گئی۔

"ابا!"

زندگی کے چھبیس سال اسی آس میں گزار دیے کہ دوستوں کے والدین کی طرح آپ بھی کبھی ہمارے لیے کچھ لے کر آئیں۔ کوئی کینڈی، کوئی پنسل اور

نہیں تو ایک مسکراہٹ یا ایک پیار بھرا فقرہ ہی ہماری جھولی میں ڈال دیتے تو آج ہم سب بہن بھائی اک ادھوری زندگی نہ جی رہے ہوتے۔ پر آپ نے ہیشہ لیا ہی لیا۔ ہماری خواہش 'اماں کی مسکراہٹ' ہمارا بچپن سب کچھ آپ کی دولت اور روپیہ کمانے کی ہوس میں ہی گم ہو گیا۔ رعنا آپا اور شہزاد بھائی کے ساتھ آپ نے جو کیا' ویسا وہ میں اپنی زندگی میں ہرگز نہیں چاہتی' سو اپنی زندگی میں اپنی خوشی وصول کرنے نکلی ہوں۔ ثاقب میرا کولیگ ہے۔ وہ تو سیدھے سبھاؤ رشتہ لے کر آنے کا خواہاں تھا' پر اتنا امیر ہرگز نہیں تھا کہ آپ کی خواہشات یا شرائط پر پورا اتر پاتا۔ سو میں نے خود ہی اسے منع کر دیا ہے۔ آپ نے جو ہمیں دیا میں آپ کو وہی لوٹا کر جا رہی ہوں۔ ہاں اماں سے بہت شرمندہ ہوں۔ پر مجھ میں نہ تو مہر کی طرح اپنے دل میں محبت کی قبر بنا کر آپ کی خوشی کے لیے چپ رہ جانے کا حوصلہ ہے نہ رعنا آپا کی طرح ساری عمر شہزاد بھائی کے سامنے شرمندہ رہ جانے کی ہمت۔ آپ کی آنکھوں پر تو پیسے اور دولت کی ایسی پٹی بندھی ہے کہ آپ کو بیٹے کے نہ تو جذبے نظر آسکے نہ اس کی عمر کے گزرتے سنہری سال جو آپ کی بے جا ضد کی نذر ہو رہے ہیں۔ آپ سے کوئی معافی بھی نہیں مانگوں گی سوائے اماں کو دکھ دینے کے' میں اپنے آپ کو اپنے اس عمل میں حق بجانب سمجھتی ہوں۔ یہ ردعمل ہے اس عمل کا جو آپ نے ہمارے ساتھ ساری عمر روا رکھا اور نہ جانے کب تک رکھنے کا ارادہ ہے۔ آج میرا ثاقب کے ساتھ نکاح ہو جائے گا۔ اویس بھائی یہ سب جانتے ہیں اور ان کی دعاؤں کے سائے میں اپنی نئی زندگی کا آغاز کرنے جا رہی ہوں۔

سارہ

انہوں نے خط کے پرزے کیے اور چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد نفیسہ بیگم پھوٹ پھوٹ کر رو دیں اور مہران کو سنبھالنے میں لگ گئی۔

☆ ☆ ☆

وقت کسی کو بھی اپنے اوپر حکمرانی کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ جلال احمد جو پتا نہیں کس زعم اور خواہش کے تحت یہ سب کر رہے تھے محض تین دن بعد صبح سے اٹھے تو ان کا جسم اپنے چند اعضا کو حرکت دینے سے قاصر تھا۔ ان پر فالج کا اٹیک ہوا تھا۔ مہران کا ناشتہ دینے آئی تو بستر پر پڑے بے بس سے تایا کو دیکھ کر گھبرا گئی۔ اس نے فوراً" رعنا آپا اور شہزاد بھائی کو فون کیا۔ وہ لوگ دوڑے چلے آئے۔ شہزاد بھائی ان کو اسپتال لے کر گئے انہیں اسپتال ایڈمٹ کر لیا گیا۔ رعنا آپا نے اویس کو سعودیہ عرب فون کر کے ساری صورت حال بتائی' لیکن بہت چاہنے کے باوجود اویس فوراً" نہیں پہنچ سکتا تھا۔

اگلے دن صبح مہر جب ناشتا لے کر اسپتال جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ تو سارہ اپنے شوہر کے ساتھ آگئی۔ وہ نفیسہ بیگم اور رعنا آپا کے گلے لگ کر خوب روئی تھی۔

"خدا گواہ ہے آپا! میں نے ایسا تو کبھی بھی نہیں چاہا تھا۔ اماں! آپ جانتی ہیں ناکہ میں اور بھائی صرف ان کے اندر یہ احساس جگانا چاہتے تھے کہ ہم اگر ان کے فرماں بردار تھے یہ صرف آپ کی تربیت تھی اور اگر ایسا کوئی قدم اٹھایا ہے تو وجہ ان کا رویہ اور طرز عمل تھا۔" وہ نفیسہ بیگم سے لپٹی روئے جا رہی تھی۔ بمشکل جب ہوئی تو دونوں مہر کے ساتھ اسپتال پہنچے۔ سارہ نے وہاں جا کر ابا کے پاؤں پکڑ لیے اور رونا شروع کر دیا۔

"ابا۔ ابا! مجھے معاف کر دیں میں۔۔۔ میں ایسا نہیں چاہتی تھی۔ خدا کی قسم! آپ نے جو کچھ بھی کیا ہم نے اسے آپ کی فطرت کا حصہ سمجھا۔ بدگمان بھی ہوئے۔ ناراض بھی ہوئے پر۔ یہ کبھی نہیں چاہا کہ آپ اس حال میں پہنچیں۔"

مہر نے تایا کی آنکھوں سے آنسو نکل کر ان کی کنپٹی پر بہتے دیکھا۔ وہ کچھ بولنا چاہتے تھے۔ اپنے ہاتھوں کو آہستہ سے اٹھا کر انہوں نے سارہ کی طرف نہ میں انگلی کی۔ جیسے ان کو سارہ کے اس عمل سے تکلیف ہو رہی ہو۔

☆ ☆ ☆

مہر نے بہت دنوں بعد آفس دوبارہ جوائن کیا تھا۔ اس کی ذمہ داریاں بہت زیادہ بڑھ گئی تھیں۔ نفیسہ بیگم اپنی بیماری بھلا کر جلال احمد کی خدمت اور تیمار داری میں کمربستہ ہو گئیں۔ سارہ اور رعنا آپا اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئیں۔ نفیسہ بیگم نے ایک کل وقتی ملازمہ رکھ لی تھی۔ اس کے ساتھ مل کر مہر کھانا بنا لیتی پھر نماز ادا کر کے تایا کو ایکسرسائز کراتی۔ اس دن تائی نفیسہ تایا کو سوپ پلا رہی تھیں۔ انہوں نے خالی پیالہ سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور رومال سے ان کا منہ صاف کیا جب تایا نے ان کے ہاتھ پر اپنا کمزور ہاتھ رکھا اور کچھ کہنے کی کوشش کی۔

"مم۔۔۔ مم۔۔۔ مجھے معاف۔۔۔ کک۔۔۔ کر دو۔۔۔ اویس تک۔۔۔ کو۔۔۔ بلاؤ۔۔۔ رر۔۔۔ رخ۔۔۔ ر۔۔۔ رخصتی۔۔۔"

انہوں نے بدقت کہا۔ ان کی آنکھیں آنسو بہانے لگیں۔ نفیسہ بیگم خود بھی رونے لگی تھیں۔ کل اس شخص کے آگے کسی کی مجال نہیں تھی' جو دم مار سکے اور آج لاچاری و بے بسی کی تصویر بنا وہ ہر قسم کی حرکت کے لیے دوسرے انسانوں کا محتاج تھا۔ ان کی ساری زندگی کی پونجی' بینک بیلنس اور دولت ان کے کسی کام نہ آئی تھی۔

"وہ آجائے گا رعنا کے ابا۔۔۔ بھلا اولاد اور ماں باپ بھی ایک دوسرے سے ناراض ہو سکتے ہیں۔" انہوں نے روتے ہوئے ان کو تسلی دی اور جب پورے آٹھ ماہ بعد رعنا آپا کے ہاں ایک صحت مند اور گول مٹول بچہ پیدا ہوا تو ابا ان سب کی دعاؤں' توجہ اور علاج کی بدولت اتنے قابل ہو گئے تھے کہ سہارے کے ساتھ اٹھ کر بیٹھ جاتے۔ نواسے کو دیکھ کر ان کے چہرے پر روشنی سی پھیل جاتی۔ انہی دنوں جب ابا کی زبان کی لکنت کچھ تو بہتر ہوئی تھی۔ انہوں نے شہزاد بھائی کو بلا کر سب کے سامنے جیک تھما کر معافی کے لیے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔ شہزاد بھائی نے فوراً" آگے بڑھ کر ان کے بندھے ہاتھوں کو کھول دیا۔ ابا نے اشارے سے رعنا آپا اور

سارہ کو پاس بلا کر دائیں بائیں بٹھالیا۔

"مہر۔۔۔ میری اصل دولت تو میری اولاد ہے بیٹا۔۔۔ اس حقیقت کو جاننے میں 'میں نے بہت عرصہ لگا دیا۔" ان دونوں کے کندھوں کے گرد اپنا ایک ایک بازو پھیلائے انہوں نے کہا۔

"مہر میری بچی۔۔۔ ادھر آؤ۔۔۔ یہ تو بیٹیاں ہیں پرایا مال ہیں۔ تم تو میری وہ صابر بچی ہو' جسے میں نے اپنی خود غرضی کی بھینٹ چڑھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔۔۔ مجھے معاف کردے میری میری بچی۔۔۔" سامنے بیٹھی مہر کے سامنے انہوں نے ہاتھ جوڑے تو اس نے نم آنکھوں کے ساتھ ان کے بندھے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ جذبات کا ایسا شدید ریلا اس پر حملہ آور ہوا کہ وہ کچھ نہ بول سکی۔

☼ ☼ ☼

اگلے ہفتے اویس احمد کی آمد نے ان سب کی خوشیوں کو چار چاند لگا دیے۔ ابا کے گلے لگتے ہی اس کے آنسو بھی نکل پڑے۔ آخر باپ تھے اس کے' اسے باپ کو اس حال میں دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔

"گستاخی معاف ابا۔۔۔ آپ میرے والد ہیں۔ آپ کا ہر حکم سر آنکھوں پر' لیکن مجھے اب اس شادی پر مجبور مت کیجئے گا نہ ہی اپنی حالت یا بیماری کا واسطہ دے کر کمزور کیجئے گا۔ میرے جذبوں کو اتنی بری طرح مجروح کیا گیا ہے کہ مجھے لگتا ہے کہ اب میں نے شادی کر بھی لی تو اسے شاید اسے صحیح طور پر سے نبھا نہ پاؤں۔"

اویس نے باپ کی رخصتی کی التجا پر ٹھوس لہجے میں کہا اور ان کو ساکت چھوڑ کر وہاں سے باہر نکل گیا۔ جب کہ اندر آتی مہر کے قدم دروازے کی چوکھٹ میں ہی تھم گئے تھے۔ اویس نے ایک نگاہ غلط ڈالنا بھی اس پر گوارا نہیں کیا۔ بس بت بنی مہر کی سائیڈ سے ہو کر نکلتا چلا گیا۔ مہر میں اندر آنے اور تایا کا سامنا کرنے کی ہمت باقی رہی تھی نہ سکت۔ وہ آہستہ سے اپنے بے جان جسم کو گھسیٹتی اپنے کمرے کی جانب آگئی۔ لیکن محض دو گھنٹے بعد ہی نفیسہ بیگم تایا کا پیغام لے کر آئیں کہ وہ اسے بلا رہے ہیں۔

"جی تایا! آپ نے بلایا؟" اس نے ان کے پاس بیڈ کی سائیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ تایا اونچے تکیے رکھے نیم دراز تھے۔

"میرا اویس مجھ سے بہت خفا ہے اس کی آنکھوں میں میں نے بہت بار تمہاری محبت دیکھی ہے بیٹا! اپنے خود غرض خیالات کے باعث لیے نظر انداز کر کے تمہیں بھی اس سے بدظن کر دیا۔ مجھ سے تو وہ ہر قسم کی توقع رکھتا تھا پر اس کو یقین تھا کہ تم اس کا مان کبھی نہیں توڑو گی' ہر قسم کے حالات میں اس کے ساتھ کھڑی نظر آؤ گی۔ مجھے خوش کرنے کی کوشش میں تم نے اسے ناراض کر دیا ہے۔ میرے بچے کو منالو مہر! تم میری ہر بات مانتی آئی ہو۔

میری کوتاہیوں کی میرے بچوں نے اور تم نے بہت سزا جھیل لی ہے اب اسے منالو۔۔۔" اگرچہ وہ رک رک کر الفاظ کو ادا کر رہے تھے کیوں کہ زبان میں روانی ابھی تک نہیں آئی تھی۔ مگر ان کی باتوں کا مفہوم بہت واضح تھا اور پہلی نظر ڈالتے پر ہی وہ مہر کو اتنے شکستہ دکھائی دیے کہ اس سے دوسری نظر نہ ڈالی گئی۔

ٹپ۔۔۔ ٹپ کئی آنسو ایک کے بعد ایک اس کے شفاف گالوں پر سے ہوتے اس کے ہاتھوں پر گرنے لگے۔ مزید بیٹھنے کا یارا نہ تھا سو اثبات میں سر ہلا کر تیزی سے اٹھ آئی۔ مگر اویس سے بات کرنے کی جرات نہ کر سکی۔ اسے دیکھتے ہی اس کے تاثرات اتنے برفیلے ہو جاتے کہ مہر اندر تک کانپ جاتی تھی' وہ دوبارہ جانے کے لیے پر تول رہا تھا جبکہ سارہ اور نفیسہ بیگم اس سے رکنے کے لیے اصرار کر رہی تھیں۔

"میں نے تمہیں باہر جانے کے لیے اکسایا تھا نا اویس۔۔۔ اب میں ہی تمہیں حکم دے رہی ہوں کہ تم اپنا ٹرانسفر یہاں کرالو۔ تمہارے ابا بھلے بے نیاز اور لاپروا بنے پھرتے تھے' پر صحت مند تھے۔ ہمیں سہارا تھا ایک مرد کا۔ اب ان کی حالت تم دیکھ چکے ہو بیٹا! ان کو ہم سب کو تمہاری ضرورت ہے۔" نفیسہ بیگم نے

اس کے گھنے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا تو وہ بھی لاڈ سے ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔

"آپ کی بات ٹالنے کی مجھ میں ہمت نہیں ہے ماں! لیکن کیا کروں اب دل نہیں لگتا یہاں۔۔۔" وہ آنکھیں موند کر بے بسی سے بولا تو مہر وہیں سے پلٹ کر اپنے کمرے میں جانے کے بجائے اس کے کمرے میں آگئی اور صوفے پر بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگی۔

ایک فقرہ سوچتی تو ذہن میں بنے ہوئے دوسرے جملے کی ترتیب بدل جاتی۔ یونہی نجانے کتنی دیر گزری' جب بے آواز دروازہ کھول کر وہ اندر آگیا۔ اسے وہاں دیکھ کر ایک لمحے کے لیے چونکا' ٹھٹکا پر دوسرے ہی پل بے نیازی کا خول چڑھا کر ایسے ہو گیا جیسے کمرے میں اس کے علاوہ کوئی اور موجود نہ ہو۔ جیکٹ اتار کر بیڈ پر ڈالی' بازو موڑ کر آستینوں تک چڑھائے۔ لیپ ٹاپ کو ٹیبل سے اٹھا کر بیڈ پر رکھا اور خود ابھی بیڈ پر بیٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اس کی دبی دبی سسکیوں کی آواز پر بغور اس کی طرف دیکھا۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی وہ وہ سر جھکائے رونے کے شغل میں مصروف تھی۔

"اپنا آپ یہ شغل اپنے کمرے میں جا کر پورا کر سکتی ہیں' میں ڈسٹرب ہو رہا ہوں۔" وہ واقعی ڈسٹرب ہو گیا تھا۔

"اویس۔۔۔ مجھے معاف کر دو۔۔۔ میں نے تمہارا بہت دل دکھایا۔ میرے ساتھ ویسا مت کرو جیسے میں نے تمہارے ساتھ کیا۔۔۔ تایا میری وجہ سے تمہاری وجہ سے سخت پریشان ہیں۔ وہ بیمار ہیں ان کی بیماری کا ہی خیال کرلو۔ مجھے پتا ہے میں بہت بری ہوں۔۔۔ تمہارے ساتھ بہت برا کیا ہے' لیکن تم۔۔۔ تم بہت اچھے ہو۔۔۔" نظریں جھکائے ہچکیاں لیتے وہ کہے گئی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا صوفے کے عین سامنے گھٹنے موڑ کر کارپٹ پر بیٹھ گیا۔

"مہر! ہر بار تم نے دل توڑا اپنے تایا کے لیے۔۔۔ اب اس ٹوٹے دل کو جوڑنے آئی ہو تو بھی تایا کی خاطر۔۔۔ تمہاری زندگی میں میری جگہ کہاں ہے مہر۔۔۔!" وہ سنجیدگی سے گویا ہوا۔

"میری زندگی میں تمہاری جگہ کہیں نہیں ہے۔ میری تو پوری زندگی ہی تم ہو اویس۔۔۔ بس کبھی بتانے کی ہمت۔۔۔ لیکن میرا خدا گواہ ہے کہ تم سے دور رہ کر۔۔۔ تمہارا دل دکھا کر خوش تو میں بھی نہیں رہی تھی۔" بھیگی آواز میں نظریں جھکائے اپنی محبت کو بہت دیر سے عیاں کرتی' وہ اسے بہت اپنی لگی' پر اسے ابھی اور ستانا مقصود تھا۔ جب ہی وہ مسکراہٹ کو دبا گیا۔

"او کے۔۔۔ تمہاری بات مان بھی لوں تو کیا گارنٹی ہے کہ پھر اپنے تایا کی باتوں میں آکر مجھے نہیں چھوڑو گی۔"

مہر نے تڑپ کر سر اٹھایا اور اسے ایک بار پھر بہت زور سے رونا آگیا۔

"بس کرو یار۔۔۔ تمہارے ان آنسوؤں میں میں آج بہہ ہی نہ جاؤں کہیں۔" وہ بے بسی سے بولا اور آگے بڑھ کر آہستگی سے اس کے آنسو کسی متاع کی طرح اپنی پوروں پر سمیٹ لیے۔

"اچھا ایک شرط ہے میرے ماننے کی۔۔۔" وہ صوفے پر اس کے بالکل برابر بیٹھ کر بولا۔

"میں تمہاری ہر بات۔۔۔ ہر شرط ماننے کو تیار ہوں۔" اس نے تیزی سے کہا تو اویس اس کی جلد بازی پر بے اختیار مسکرا دیا۔

"او کے ابھی تو صرف نکاح تھا تو تم تو نخرے سے کام چلا لیتی تھیں۔ اب جب بادولت شوہر نامدار کے عہدے پر باقاعدہ فائز ہوں گے تو یہ سب نہیں چلے گا۔" اس نے شوخی سے کہا تو مہر ایک بار پھر تیزی سے بول اٹھی۔

"مجھے منظور ہے جو تم۔۔۔" اس نے زبان دانتوں کے نیچے دبائی اور چور نظروں سے اویس کی جانب دیکھا۔ اسے مسکراتے دیکھ کر اس کی سانس بحال ہوئی اور ہونٹوں پر بھی شفاف مسکراہٹ روشنی بن کر چمک اٹھی۔ آگے کی راہیں بہت شفاف اور روشن تھیں ان دونوں کی روشن مسکراہٹ کی طرح۔

☼

تنزیلہ ریاض

عہد الست

نیوو کی لائبریری اینڈ فریمنگ پوائنٹ

نور محمد برطانیہ میں رہائش پذیر ہے اور لوٹن کی جامع مسجد میں موذن ہے۔ پیسے والا اور خوب دل والا ہے۔ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتا ہے۔ جس کا ایک کمرا ایک عربی طالب علم اپنے دوست کے ساتھ شیئر کرتا ہے جبکہ دوسرے کمرے میں اس کے ساتھ ایرانی زین العابدین رہتا ہے۔ اسے اپنے ایرانی ہونے پر فخر ہے۔ وہ برطانیہ میں اسٹڈی ویزے پر جاب کرتا ہے۔ سخت محنتی ہے مگر پاکستان میں موجود بارہ افراد کے کنبے کی کفالت خوش اسلوبی سے نہیں کر پا رہا۔

عمر شہروز کا کزن ہے، جو اپنی فیملی کے ساتھ انگلینڈ میں مقیم ہے۔ وہ لوگ تین چار سال میں پاکستان آتے رہتے ہیں۔ عمر اکثر اکیلا بھی پاکستان آجاتا ہے۔ وہ کافی منہ پھٹ ہے۔ اسے شہروز کی دوست امائمہ اچھی لگتی ہے۔ شہروز کی کوششوں سے ان دونوں کی منگنی ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر زارا شہروز کی سادہ مزاج منگیتر ہے۔ ان کی منگنی بڑوں کے فیصلے کا نتیجہ ہے۔ ان دونوں کے درمیان محبت ہے، لیکن شہروز کے کھلنڈرے انداز کی بنا پر زارا کو اس کی محبت پر یقین نہیں ہے۔

اس کے والد نے اسے گھر پر پڑھایا ہے اور اب وہ اسے بڑی کلاس میں داخل کرانا چاہتے ہیں۔ سر شعیب انہیں منع کرتے ہیں کہ ان کا بچہ بہت چھوٹا ہے۔ اسے چھوٹی کلاس میں ہی داخل کروائیں مگر وہ مصر رہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے بچے پر بہت محنت کی ہے۔ وہ بڑی کلاس میں داخلے کا مستحق ہے۔ سر شعیب اسے بچے پر ظلم سمجھتے ہیں مگر اس کے باپ کے

مکمل ناول



اصرار پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ وہ بچہ بڑی کلاس اور بڑے بچوں میں ایڈجسٹ نہیں ہو پاتا۔ اسکالرشپ حاصل کرنے والے ان بچے سے حیرت انگیز طور پر ٹیچرز اور فیلوز میں سے بیشتر ناواقف ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ اس کے باپ کی طرف سے غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لینے پر سخت مخالفت ہے۔

وہ خواب میں ڈر جاتا ہے۔

73ء کا زمانہ تھا اور روپ نگر کا علاقہ۔

بلی انڈیا میں اپنے گرینڈ پیرنٹس کے ساتھ آیا تھا۔ اس کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ برطانیہ کے رہنے والے تھے۔ گرینڈ پا یہاں کسی پروجیکٹ کے سلسلے میں آئے تھے۔ گرینی نے یہاں کوچنگ سینٹر کھول لیا تھا۔ جتارا اوا اس کے ہاں پڑھنے آتی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ ماس مچھلی کھانے والے کسی کے دوست نہیں بن سکتے۔ وہ وفادار نہیں ہو سکتے۔ گرینڈ پا کو بتایا وہ اسے سمجھاتے ہیں کہ قدرت نے ہمیں بہت محبت سے تخلیق کیا ہے اور ہماری فطرت میں صرف محبت رکھی ہے۔ انسان کا اپنی ذات سے اخلاص ہی اس کی سب سے بڑی وفاداری ہے۔

امائمہ کے کسی رویے پر ناراض ہو کر عمر اس سے انگوٹھی واپس مانگ لیتا ہے۔ زارا شہروز کو بتاتی ہے۔ شہروز اور عمر کا جھگڑا ہو جاتا ہے۔

اس کی کلاس میں سلیمان حیدر سے دوستی ہو جاتی ہے۔ سلیمان حیدر بہت اچھا اور زندہ دل لڑکا ہے۔ سلیمان کے کہنے پر پڑھائی کے ساتھ ساتھ کھیل میں بھی دلچسپی لینے لگتا۔ وہ اپنے گھر جا کر ای سے بیٹ کی فرمائش کرتا ہے تو اس کے والدین جان لیتے ہیں' وہ اس کی بری طرح پٹائی کر دیتے ہیں۔ ماں بے بسی سے دیکھتی رہ جاتی ہے۔ پھر اس کے والد اسکول جا کر منع کر دیتے ہیں کہ اسے سلیمان حیدر کے ساتھ نہ بٹھایا جائے۔ سلیمان حیدر اس سے ناراض ہو جاتا ہے اور اسے ابنارمل کہتا ہے۔ جس سے اس کو بہت دکھ ہوتا ہے۔

کلاس میں سلیمان حیدر پہلی پوزیشن لیتا ہے۔ پانچ نمبروں کے فرق سے اس کی سیکنڈ پوزیشن آتی ہے۔ یہ دیکھ کر اس کے والد غصے سے پاگل ہو جاتے ہیں اور کمرا بند کر کے اسے بری طرح مارتے ہیں۔ وہ وعدہ کرتا ہے کہ آئندہ پینٹنگ نہیں کرے گا۔ صرف پڑھائی کرے گا۔

اس کے والد شہر کے سب سے خراب کالج میں اس کا ایڈمیشن کراتے ہیں۔ تاکہ کالج میں اس کی غیر حاضری پر کوئی کچھ نہ کہہ سکے اور اس سے کہتے ہیں کہ وہ گھر بیٹھ کر پڑھائی کرے۔ باہر کی دنیا سے اس کا رابطہ نہ ہو۔ اس کا کوئی دوست نہیں ہے۔

امائمہ کی والدہ شہروز کو فون کرتی ہیں۔ شہروز کے سمجھانے پر عمر کو عقل آجاتی ہے اور وہ اپنے والد کو فون کرتا ہے جس کے بعد عمر کے والد امائمہ کے والد کو فون کر کے کہتے ہیں کہ بچوں کا نکاح کر دیا جائے۔ دونوں کے والدین کی رضامندی سے عمر اور امائمہ کا نکاح ہو جاتا ہے۔ نکاح کے چند دن بعد عمر لندن چلا جاتا ہے۔

نکاح کے تین سال بعد امائمہ عمر کے اصرار پر اکیلے ہی رخصت ہو کر لندن چلی جاتی ہے۔ لندن پہنچنے پر عمر اور اس کے والدین امائمہ کا خوشی خوشی استقبال کرتے ہیں۔

امائمہ عمر کے ساتھ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں آجاتی ہے جبکہ عمر کے والدین اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔ امائمہ عمر اتنے چھوٹے فلیٹ میں رہنے سے گھبراتی ہے اور عمر سے اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے عمر کے والدین کے گھر رہنے کو کہتی ہے جسے عمر یہ کہہ کر رد کر دیتا ہے کہ وہ اپنے والدین پر مزید بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔

اس شخص کے شدید اصرار پر نور محمد اس سے ملنے پر راضی ہو جاتا ہے۔ وہ اس سے دوستی کی فرمائش کرتا ہے۔ نور محمد انکار کر دیتا ہے' لیکن وہ نور محمد کا پیچھا نہیں چھوڑتا ہے۔ وہ نور محمد کی قرات کی تعریف کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس نے نماز پڑھنا نور محمد سے سیکھا ہے۔ پھر وہ بتاتا ہے کہ اسے نور محمد کے پاس کسی نے بھیجا ہے۔ نور محمد کے پوچھنے پر کہتا ہے۔ خضر الٰہی نے بھیجا ہے۔

روپ نگر سے واپس برطانیہ آنے پر گرینڈ پا کا انتقال ہو جاتا ہے اور گرینی مسٹر ایرک کی دوستی بڑھنے لگتی ہے۔ وہ بلی سے کہتی ہیں کہ وہ اپنی ممی سے رابطہ کرے۔ وہ اسے اس کی ممی کے ساتھ بھجوانا چاہتی ہیں۔ بلی کے انکار کے باوجود وہ کوہو کو بلا لیتی ہیں اور اسے ان کے ساتھ روانہ کر دیتی ہیں۔

میری کالج میں طلحہ اور راشد سے واقفیت ہو جاتی ہے۔

عمر اسے پبلک لائبریری کا راستہ بتا دیتا ہے۔ عمر کو آرٹ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ لیکن وہ امائمہ کی خاطر دلچسپی لیتا ہے۔ دونوں بہت خوش ہیں۔ لیکن امائمہ وہاں کی معاشرت کو قبول نہیں کر پا رہی۔ عمر کی دوست مارتھا کے شوہر نے امائمہ کو گلے لگا کر مبارک باد دی تو اسے یہ بات بہت ناگوار گزری گھر جا کر دونوں میں جھگڑا ہو گیا۔

گرینی کے انتقال کے بعد بلی کوہو کے ساتھ رہنے پر مجبور تھا۔ کوہو پہلے بھی گرینی سے اچھا خاصا معاوضہ وصول کرتی رہی تھی۔ بلی کو اپنے پاس رکھنے کے معاملے پر کوہو نے مسٹر ایرک سے جھگڑا کیا کیونکہ گرینی نے انہیں بلی کا نگراں مقرر کیا تھا۔ پھر دونوں نے سمجھوتا کر لیا اور کوہو نے مسٹر ایرک سے شادی کر لی۔

نور محمد' احمد معروف کو اپنے ساتھ گھر لے آیا تھا۔ احمد معروف کے اچھے اطوار' عمدہ خوشبو' نفیس گفتگو' اعلا لباس کے باعث وہ سب اسے پسند کرنے لگے تھے۔ نور محمد بھی اس سے گھل مل گیا تھا۔ احمد نے کہا تھا کہ وہ جہاں رہتا ہے وہاں سے مسجد کافی دور ہے اس لیے وہ اس کے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔ نور محمد اس سے کہتا ہے اسے دنیا سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اس کے لیے اللہ کا دین کافی ہے۔ احمد معروف کہتا ہے۔ اللہ کا دین تو کیا دنیا اللہ کی نہیں ہے۔ اسلام کی سب سے اچھی بات یہی ہے' اس میں دنیا کا انکار نہیں ہے۔ آپ دنیا کے ساتھ وہ مت کریں جو ابلیس نے آپ کے ساتھ کیا تھا۔

صبا نورین کالج کی ذہین طالبہ ہونے کے ساتھ ساتھ بہت چالاک بھی تھی۔ صبا نے اس سے صرف نوٹس حاصل کرنے کے لیے دوستی کی تھی۔ اکیڈمی کے لڑکوں طلحہ اور راشد نے اسے دوسرا رنگ دے کر اس کا مذاق بنا لیا۔ اس مسئلہ پر لڑائی ہوئی اور نوبت مار پیٹ تک آگئی۔

امائمہ اور عمر میں دوستی ہو گئی لیکن دونوں کو احساس ہو گیا تھا کہ ان کے خیالات بہت مختلف تھے۔

کوہو کے ساتھ رہتے ہوئے بھی زندگی کا محور صرف کتابیں اور اسکول تھا۔ ایک دوست کے ہاں پارٹی میں ایک عرصے بعد اس کی ملاقات جتارا اوا سے ہوئی۔ وہ اب نیا کہلاتی تھی۔ اس کا تعلق ہندوستان کے ایک بہت اعلا تعلیم یافتہ گھرانے سے تھا۔ وہ رقاصہ کے طور پر اپنے آپ کو منوانا چاہتی تھی اس لیے گھر والوں کی مرضی کے خلاف یہاں چلی آئی تھی۔

احمد معروف کی باتوں سے نور محمد عجیب الجھن میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اپنے ذہن میں اٹھنے والے سوالوں سے گھبرا کر احمد معروف کو سوتے میں سے جگا دیتا ہے۔ نور محمد معروف کے سامنے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہے اور اسے اپنے ماضی کے بارے میں بتانے لگتا ہے۔

اکیڈمی میں ہونے والی لڑائی کے بعد جنید اور طلحہ کے والدین کے ساتھ نور محمد کے والد کو بھی بلوایا گیا تھا۔ طلحہ اور جنید کے والدین اپنے بیٹوں کی غلطی ماننے کے بجائے نور محمد کو قصوروار ٹھہراتے ہیں جبکہ نور محمد کے والد اس کو مورد الزام ٹھہرا کر لاتعلقی ظاہر کرتے ہیں۔ اکیڈمی کے چیئرمین حمید کاردوانی جنید اور طلحہ کے ساتھ نور محمد کو بھی اکیڈمی سے فارغ کر دیتے ہیں۔ نور محمد اکیڈمی سے نکالے جانے سے زیادہ اپنے والد کے رویے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ اسٹیشن کی طرف نکل جاتا ہے۔ ٹرین میں سفر کے دوران نور محمد کی ملاقات سلیم نامی جیب کترے سے ہو جاتی ہے۔ سلیم کو پکڑنے کے لیے پولیس چھاپہ مارتی ہے تو سلیم بھاگنے میں کامیاب ہو جاتا ہے' جبکہ نور محمد کو پکڑ کر پولیس تھانے لے آتی ہے اور پھر نور محمد کے والد پولیس کو رشوت دے کر اسے چھڑا کر گھر لے آتے ہیں۔

بھائی پھیرو سے لاہور تک کے پورے راستے میں نور محمد سے اس کے والد کوئی بات نہیں کرتے۔ لیکن گھر آکر وہ اونچی آواز میں چلا کر غصے کا اظہار کرتے ہوئے اس سے کہتے ہیں کہ "وہ آج سے اس کے لیے مر چکے ہیں اور اس سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔" پہلی بار اس کی ماں بھی کہہ اٹھتی ہیں کہ اس سے بہتر تھا کہ وہ مر جاتا۔ نور محمد' احمد معروف کو اپنے بارے میں سب بتا دیتا ہے۔ جسے سن کر احمد معروف کا دل بوجھل ہو جاتا ہے اور اسے نور محمد کو سنبھالنا مشکل لگتا ہے۔

بلی ثیا کو بے حد چاہتا ہے، لیکن وہ انتہائی خود غرض، مطلب پرست اور چالاک لڑکی ہے۔

بلی کے گھر فیملی فرینڈ عوف بن سلمان آتا ہے۔ جس کا تعلق سعودی عرب سے ہے۔ عوف کو فوٹو گرافی کا جنون کی حد تک شوق ہوتا ہے۔ بلی عوف سے ثیا کو ملواتا ہے۔ ثیا، عوف سے مل کر بہت خوش ہوتی ہے۔ عوف اپنے کیمرے سے رقص کرتی ثیا کی بہت سی خوب صورت تصویریں کھینچ لیتا ہے۔ عوف اور ثیا تصویروں کو فرانس میں ہونے والی کسی تصویری مقابلے میں بھیج رہے تھے۔ بلی، ثیا کو ایسا کرنے سے روکنا چاہتا ہے۔ لیکن ثیا اس بات پہ بلی سے ناراض ہو جاتی ہے۔ عوف بتاتا ہے کہ وہ ثیا جیسی بناوٹی، خود پسند لڑکی کو بالکل پسند نہیں کرتا۔

بلی کو پتا چلتا ہے کہ اس کی ماں کو ہو کے عوف سے تعلقات ہیں، زارا کے والدین زارا اور شہروز کی شادی جلد از جلد کرنا چاہتے ہیں، جبکہ شہروز ایک، ڈیڑھ سال تک شادی نہیں کرنا چاہتا ہے، کیونکہ اس نے ایک مشہور اخبار کا چینل جوائن کر لیا ہے اور اسے اپنی جاب کے علاوہ کسی چیز کا ہوش نہیں رہا ہے۔ شہروز، زارا سے کہتا ہے کہ جب تک وہ اسے شادی کرنے کے لیے گرین سگنل نہیں دیتا اس وقت تک وہ پھپھو (یعنی اپنی والدہ) کو اس کے ڈیڈی سے شادی کی بات کرنے سے روک کر رکھے۔ زارا کے لیے یہ ساری صورت حال سخت اذیت کا باعث بن رہی ہے۔

9 نویں قسط

"پیشنٹ کیسی ہے؟" مریم نے پوچھا تھا، اس نے گردن موڑ کر اس کی جانب دیکھا پھر دوبارہ سینی ٹائزر ہتھیلی پر انڈیلنے لگی۔

"ٹھیک ہے..." اس نے گہری سانس بھری پھر انگلیوں کی درمیانی جگہ اور ہاتھوں کی پشت کو سینی ٹائزر سے رگڑتے ہوئے اپنی جگہ پر آبیٹھی۔

"میم ندا بتا رہی تھیں کچھ پرابلم ہو گئی تھی۔" مریم نے اپنا بیگ اور اسٹیتھو اسکوپ اس کے قریب میز پر رکھ دیا۔ اس کے ہاتھ میں بن کا پیکٹ بھی تھا۔

زارا نے اس کے سرسری انداز میں چھپے تجسس کو محسوس کیا۔ ہر پیشے کی طرح اس کے پیچھے میں بھی لابیاں بنی ہوئی تھیں۔ یہاں بھی ٹانگ کھینچنے والوں کی کمی نہیں تھی۔ زارا کی مریم سے دوستی تو تھی لیکن مریم سینئرز کی اس لابی کی نور نظر تھی جنہیں جونیئر ڈاکٹرز کی غلطیاں پکڑنے اور ان غلطیوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کا شوق تھا۔ وہ اپنی غلطیوں کی پردہ پوشی کی خاطر اکثر دوسری کولیگز کی شکایات لگاتی رہتی تھی۔ میم ندا موسٹ سینئر سرجن تھیں اور ایک زمانے میں زارا کی ممی کی حریف رہی تھیں۔ وہ لیڈی ولنگڈن میں زارا کی جگہ اپنی کسی رشتہ دار کو اپائنٹ کروانا چاہتی تھیں۔ زارا بھی ان کی گڈ بک میں نہیں رہی تھی۔ وہ اس کی ہر غلطی کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کی عادی تھیں۔ اسے ان کی روک ٹوک اور ڈانٹ ڈپٹ کا اکثر سامنا کرنا پڑتا تھا۔

"پیشنٹ کا فرسٹ بے بی تھا اور وہ کو آپریٹ نہیں کر رہی تھی۔ بے بی بہت پہلے ہی تھا تو اس کا ہیڈ سروِیکل میں پھنس گیا تھا۔ تمہیں پتا ہی ہے بچیاں گھبرا جاتی ہیں... بہت چھوٹی سی ہے۔ اٹھارہ کی بھی نہیں ہے۔ فوری سرجری کرنا پڑی۔"

زارا نے بجھے ہوئے انداز میں کہا۔ اس کا دل ابھی بھی قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ لیبر روم میں کبھی کبھی اتنی مشکل صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا تھا کہ دل لرزنے لگتا تھا۔ وہ ایک سی سیکشن کر کے فارغ ہوئی تھی۔ چوہنگ (قصبہ) سے لائی گئی وہ مریضہ بہت چھوٹی اور دبلی پتلی تھی۔ مزید برآں وہ کافی تاخیر سے لائی گئی تھی، جس کی بنا پر اس کی حالت کافی خراب ہو رہی تھی۔ وہ خوف زدہ بھی تھی اور اس کے ہمراہ آنے والی خواتین نے شور مچا مچا کر اس بچی کو مزید ڈرا دیا تھا۔ اس نے بالکل ہی ہاتھ پاؤں چھوڑ دیے تھے۔ لیبر روم میں موجود نرسز ہی نہیں آن ڈیوٹی زارا بھی پریشان ہو گئی تھی۔ اسی بنا پر سرجری کرنا پڑی، جبکہ ساتھ آئی ہوئی دیہاتی خواتین نے بڑا آپریشن بڑا آپریشن کر کے وہ وبال مچایا تھا کہ زارا اکتا گئی تھی۔ زارا کو ویسے بھی ابھی تک اپنی حساس طبیعت پر قابو پانا نہیں آیا تھا۔ بیماروں کی آہ و زاریاں سن کر وہ خود رونے والی ہو جاتی تھی، اور اس کا رنگ زرد پڑنے لگتا تھا یہ اس کی غلطی تھی۔ اسے خود پتا تھا کہ اس نے کانپتے ہاتھوں سے سرجری کی تھی جو کہ ایک ڈاکٹر کے لیے بہت غیر ذمہ دارانہ رویہ تھا۔

ایسی چیزیں میم ندا کو مزید شہ دیتی تھیں۔

"ارے یہ واقعی بڑا مسئلہ ہے... کچھ پیشنٹس اتنا تنگ کرتے ہیں کہ ایک تھپڑ لگانے کو دل چاہتا ہے۔"

مریم کیبن سے پی نٹ بٹر اور چیز کے جار نکال کر میز پر رکھ رہی تھی۔ ٹی بریک ہو چکا تھا۔ وہ لوگ اکثر ناشتہ کیے بغیر آتی تھیں تو ٹی بریک میں باہر سے کچھ آرڈر کر دیتی تھیں یا اسی طرح بن پر پی نٹ بٹر یا چکن اسپریڈ وغیرہ لگا کر کھا لیا کرتی تھیں۔ زارا چائے بنانے کی غرض سے الیکٹرک کیٹل کے قریب آگئی تھی۔ مریم نے اسے ایک بن تیار کر کے تھما دیا تھا۔

"پیشنٹ کو تو نہیں پر آج اس کی اماں کو تھپڑ لگانے کا بہت دل چاہا میرا... اس نے تو رونا ہی تھا، تکلیف جو تھی، مگر اماں نے الگ واویلا مچا رکھا تھا۔ ہاتھ پاؤں پھیلائے دے رہی تھی۔ ہائے شہلا ہائے شہلا کرتی جا رہی تھی۔ اتنی بار کہا کہ باہر چلی جاؤ مگر ٹل ہی نہیں رہی تھی۔ پانچ منٹ بعد ہائے ہائے کرتی اندر آجاتی تھی اور پھر سرجری کے بعد تو وہ دماغ کھایا میرا کہ ننھی سی بچی تھی ہماری اس کا پیٹ کیوں چیر ڈالا۔ لیبر سے آپریشن تھیٹر میں شفٹ کیا تو بس ساتھ آنے والی ساری عورتیں چلانے لگیں۔ میم ندا نے آکر سب کی طبیعت صاف کی تو ذرا سکون ہو ورنہ ہٹ ہی نہیں رہی تھیں۔"

زارا نے مگ میں ٹی بیگ رکھے پھر بن کا لقمہ لیتے ہوئے مریم کی جانب دیکھا۔ وہ یہ بات گول کر گئی کہ میم ندا نے اس کو بھی ڈانٹا تھا۔

"یہ اچھی ڈرامہ بازی شروع کر دیتی ہیں عورتیں... ان کا خیال ہے ڈاکٹرز کو سی سیکشن کرنے میں مزا آتا ہے اور وہ جان بوجھ کر ایسا کرتے ہیں اور پھر خدانخواستہ پیشنٹ کو کچھ ہو جائے تو بھی ڈاکٹر کو کوستے ہیں کہ مریض کی جان لے لی۔ تم ایک تھپڑ لگا کر باہر نکال دیتیں نا سب کو۔ ایسے لوگوں کے ساتھ ذرا سختی سے پیش آنا چاہیے، ورنہ یہ بہت مسئلے پیدا کر دیتے ہیں۔ میں تو ویسے بھی پیشنٹ کے رشتہ داروں کے لیبر روم میں آنے کے سخت خلاف ہوں۔ اتنا جمگھٹا لگا دیتی ہیں عورتیں... اور پھر لیبر کو مشورے بھی دیتی ہیں کہ ایسے کرو ویسے کرو... ڈاکٹر کو تو پاگل کر دیتی ہیں... وہاں یورپ امریکہ میں تو ایسا نہیں ہوتا... میری بھابھی ہیں سعودیہ کنگ فہد ہاسپٹل میں ہوتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ وہاں کسی کو لیبر میں آنے نہیں دیتے... یہ گورنمنٹ لاء ہے۔ شوہر کے علاوہ کسی کو اجازت نہیں دیتے کہ لیبر روم میں یا سرجری کے وقت آسکے۔ پاکستان میں الٹے ہی قوانین بنا رکھے ہیں۔"

وہ ناک چڑھا کر بولی۔ زارا سر ہلاتے ہوئے چائے کے کپ میز پر رکھنے لگی تھی۔ اسی دوران سیل فون کی بیپ بجنے لگی۔ اس نے بیگ سے فون نکالا پھر شہروز کا نام دیکھ کر خوش ہوئی۔

"تم زیادہ سویٹ ہو گئے ہو یا یہ میری نظر کا دھوکا ہے۔ آج کل جلدی جلدی فون کرنے لگے ہو۔"

اس نے فون کان سے لگاتے ہوئے کہا تھا پھر ہاتھ میں پکڑا اسینڈوچ سا سر میں رکھ کر وہیں بیٹھ گئی تھی۔ شہروز کو کون سا اس سے بہت طویل بات کرنی تھی، یہ سوچ کر اس نے پرائیویسی ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"یہ تو تم بتاؤ زارا؟" اس نے شہروز کی آواز میں سرد مہری کو فوراً محسوس کیا تھا۔ اس نے مریم کی جانب کن انکھیوں سے دیکھا جو اسے ہی شرارتی نظروں سے تک رہی تھی۔

”میں تو خیر ہوں ہی بہت سویٹ“ اس نے شہروز کے انداز پر الجھنے کے باوجود اپنے لہجے کی بشاشت کو برقرار رکھا تھا۔

”مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی زارا، تم نے مجھے بہت مایوس کیا ہے۔ میں ہمیشہ تمہاری ہر مشکل میں' ہر الجھن میں' ہر مسئلے میں تمہارے ساتھ کھڑا ہوا ہوں اور اب جب مجھے تمہارے تعاون کی ضرورت پڑی ہے تو تم ہاتھ جھاڑ کر سائیڈ پر کھڑی ہو گئی ہو۔“ شہروز کے انداز میں بے حد بیزاری تھی۔

”شہروز۔۔۔ کیا ہوا۔۔۔ سب ٹھیک ہے نا!“ اس نے اپنی حیرت چھپائی تھی۔ شہروز نے اس انداز میں اس سے پہلے کبھی بات نہیں کی تھی۔ اس کو قطعاً“ اندازہ نہیں تھا کہ وہ کس بات پر اس سے شکوہ کر رہا ہے۔ وہ مریم کے سامنے یہ بات نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے اپنا بن، بیا سر سے اٹھایا اور مریم کو اشارہ کرکے باہر نکل آئی تھی۔

”زارا۔۔۔ کم آن۔ اب اتنی معصوم بھی مت بنو۔“ وہ سابقہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

”تم خفا ہو مجھ سے۔۔۔ لیکن کیوں۔۔۔ میں نے تو کچھ نہیں کیا۔“ وہ روہانسی ہو کر بولی۔

گزشتہ کئی دن ہوئے وہ شہروز کو بالکل تنگ نہیں کرتی تھی۔ اس نے اسے بے وقت بلاوجہ کالز نہیں کی تھیں۔ افسردہ' تھکے ہوئے دل جلے ٹیکسٹ نہیں کیے تھے اور اپنے کسی مسئلے کے متعلق رونا رو کر بھی نہیں دکھایا تھا۔ وہ بن ہاتھ میں پکڑے فون کان سے لگائے چلتی چلتی نرسنگ اسٹیشن تک آگئی تھی۔ وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔ ٹی بریک کی وجہ سے سب تتربتر ہوئے تھے۔ وہ کاؤنٹر کے گرد کرسی پر آبیٹھی تھی۔

”تم سے میں نے صرف اتنی ریکویسٹ کی ہے کہ تم اپنے پاپا کو چند مہینے ٹھہر جانے کا کہہ دو۔۔۔ میں کہیں بھاگا تو نہیں جا رہا کہ تم لوگوں نے شادی شادی کی رٹ لگا رکھی ہے۔ تمہارا میرا رشتہ دو دن یا دو مہینے پرانا تو نہیں ہے تاکہ اپنا اعتبار قائم رکھنے کے لیے اتنے پاپڑ بیلنے پڑیں۔“

وہ انتہائی سرد مہر لہجے میں بول رہا تھا۔ زارا کے لیے اس کا انداز ہی نہیں الفاظ بھی بہت نئے تھے۔ وہ اس کے پاپا کے لیے پہلی بار انکل کا لفظ استعمال کیے بغیر بات کر رہا تھا۔

”کیا ہوا ہے شہروز“ وہ تڑپ کر بولی تھی۔

”تمہیں عمر سے بات کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔

”کیا بات۔۔۔ کون سی بات شہروز“ وہ نہیں سمجھ پا رہی تھی' ہاتھ میں پکڑا بن اسی طرح سالم موجود تھا۔

”زارا پلیز۔۔۔ ختم بھی کرو اب۔۔۔ یہ ہماری آپس کی بات تھی کہ ہم پھپھو کو شادی کی بات کرنے سے کچھ عرصہ روک کر رکھیں گے۔ تمہیں کسی تیسرے شخص سے یہ بات نہیں کرنی چاہیے تھی' میں اتنا آکورڈ محسوس کر رہا تھا جب عمر نے مجھ سے یہ بات کی۔“ زارا نے اس کی بات کاٹ دی۔

”تم کیا کہہ رہے ہو میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ میری تو عمر سے کافی عرصہ ہوا طریقے سے بات ہی نہیں ہوئی۔۔۔ اور پھر میں اس سے یہ بات کیوں کروں گی کیا اس نے تم سے کہا کہ میں نے اس سے یہ بات کی ہے۔“

”اس نے تمہارا نام نہیں لیا لیکن اس کو الہام ہوتے ہیں کیا جو اس نے یک دم شادی کی بات کی کہ وہ پاکستان آرہا ہے سو ہم شادی کی ڈیٹ کا فیصلہ کرلیں۔۔۔ اس نے پہلے تو نہیں کہا تھا ایسا۔۔۔ اب یک دم اس کو یہ خیال اچانک آگیا۔ اس کو ہی نہیں سب کو ہی خیال آنے لگے ہیں اچانک۔۔۔ خاندان میں جس کو دیکھو میری شادی کے متعلق بات کر رہا ہے۔۔۔ دبئی آنے سے پہلے بہروز بھائی بھی اشاروں کنایوں میں مجھ سے پوچھنے لگے۔۔۔ پھر سمجھانے لگے کہ سنجیدگی سے سوچو یہی وقت ہے۔۔۔ عمر کی مثال دے رہے ہیں' مہروز بھائی کی مثال دے رہے ہیں کہ سب کی شادیاں لگ بھگ اسی عمر میں ہوئی تھیں اور جانتی ہو انہوں نے مجھے کہا کہ اگر میں اخراجات کی وجہ سے پریشان ہوں تو مجھے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔۔۔ وہ مجھے کہتے ہیں کہ شہروز ڈیڈی کا بزنس اور تمہارے بھائیوں کے دل اتنے چھوٹے نہیں کہ لاڈلے بھائی کے اخراجات نہ اٹھ سکیں۔۔۔ زارا! تمہیں احساس ہے کہ مجھے کتنی شرمندگی ہوئی۔“

”لیکن اس بات سے یہ اندازہ کیسے ہوا تمہیں کہ میں نے ان کو کچھ کہا ہے یا میرے پیرنٹس نے کوئی بات کی ہو گی۔“ زارا نے بڑی دقت سے جملہ ادا کیا تھا۔ اس کو ایسی صورت حال میں نجانے کیوں رونا آنے لگتا تھا۔

”تم نے نہیں کی تو پھپھو نے کی ہو گی' ورنہ وہ مجھے اس طرح نصیحتیں کبھی نہیں کرتے۔ بہروز بھائی وہ واحد انسان ہیں جو میری جاب کرنے پر معترض نہیں تھے اور اب وہی مجھے کہہ رہے ہیں کہ اس خالی خولی شوشا والی جاب میں معاشی طور پر مستحکم زندگی گزارنا مشکل محسوس ہو رہا ہے تو میں ڈیڈی کا بزنس جب چاہوں جوائن کر سکتا ہوں۔۔۔ اپنے کیریئر کی خاطر زارا میں دن رات ایک کر رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں سب لوگ کہیں کہ شہروز نے جاب جوائن کرنے سے پہلے اگر کچھ بن جانے کا عزم کیا تھا تو کچھ غلط نہیں کیا تھا اور تم لوگوں کی وجہ سے اب مجھے یہ سننے کو مل رہا ہے کہ میں نے بزنس نہ کرکے غلطی کی ہے۔ یہی بات میں سننا نہیں چاہتا تھا اور یہی بات سننے کو مل گئی۔ میری اب سمجھ میں آگیا ہے زارا کہ تم میری خاطر بھی کچھ نہیں کرو گی۔ میں یہ امید نہ ہی کروں کہ تم میری کسی مشکل میں میری مدد کرنے آؤ گی۔“

اس کے ایک ایک لفظ میں اکتاہٹ بھری تھی۔ زارا نے بدقت آنسو پیے۔ وہ ہاسپٹل میں تھی۔ ٹی بریک ختم ہو چکی تھی۔ نرسز' وارڈ بوائز اس کے کولیگز اپنے اپنے کیبنز سے نکلنے لگے تھے۔ وہ رو کر تماشا نہیں بنوا سکتی تھی۔

”شہروز میں نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔۔۔ تمہیں

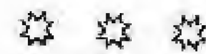
غلط فہمی ہوئی ہے۔" اس نے دھیمی آواز میں کہا تھا۔
ایک نرس اس کے بے حد قریب آکھڑی ہوئی تھی۔

"جی سلیمہ۔۔۔ اینی پرابلم؟" سلیمہ سوالیہ انداز میں اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی سو اسے سیل کان سے ہٹا کر پوچھنا پڑا۔

"ڈاکٹرز! دو نئے پیشنٹ آئے ہیں" اس نے غائب دماغی سے سر ہلا دیا تھا۔ یعنی اسے واپس جانے کے لیے کہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ کوئی اس کی آنکھوں میں چھپی نمی کو محسوس نہ کرلے۔ سلیمہ سر ہلاتی واپس چلی گئی تھی۔

"تم کام کرو زارا اور فرصت ملے تو خود کو میری جگہ رکھ کر سوچنا۔ تمہیں اندازہ ہوگا کہ جن سے محبت کی جاتی ہے جب وہ ہرٹ کرتے ہیں تو کیسا محسوس ہوتا ہے۔۔ اور کچھ نہیں کہنا مجھے بس ایک بات یاد رکھنا، میں تم سے اب کوئی فیور نہیں مانگوں گا۔۔۔ کبھی نہیں۔"

اس نے اپنی بات پوری کی تھی اور کال کٹ دی تھی۔ زارا کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ جب وہ لوگ ہرٹ کرتے ہیں جن سے انسان بہت محبت کرتا ہے تو کیسا محسوس ہوتا ہے۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے بن کی جانب دیکھا جس کا ایک ہی لقمہ کھایا گیا تھا اس سے۔ وہ خود کو رونے سے روک نہیں پا رہی تھی۔ آنسو ٹپک ٹپک کر اسے اپنی بے بسی کا احساس دلانے لگے تھے۔ اس نے اپنے گال رگڑ کر صاف کیے۔ سلیمہ ایک بار پھر سامنے سے آتی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے دو تین گہری سانسیں بھریں اور اپنے کیبن سے چیزیں اٹھانے کے لیے اس سمت چل دی۔



"تمہیں بچے پسند ہیں؟" میں نے ثیا سے پوچھا تھا، میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ بچوں کو دیکھ کر بہت پرجوش ہو جاتی تھی اور ان کو گود میں لینے کے لیے مچلنے لگتی تھی۔ اس کی آنکھوں کے رنگ بدلنے لگتے تھے اور وہاں بڑا میٹھا سا تاثر ابھرنے لگتا تھا۔ ہم اپنے طویل ہنی مون کے آخری حصے میں پرتگال آئے ہوئے تھے۔ پرتگال میں سیاحت کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا اور ثیا کی ہمراہی میں اور بھی مزا آ رہا تھا۔ پرتگال سیاحوں کے لیے کسی جنت سے کم نہیں۔ ہم الگریو میں تھے جہاں کے ساحل اور خوب صورت قدرتی مناظر دل موہ لینے والے تھے۔ یہاں ساتوں رنگ اتنے باکمال امتزاج سے ایک دوسرے سے ملتے تھے کہ انسان کو بعض اوقات اپنی آنکھوں دیکھے منظر پر کسی زبردست فن پارے کا گمان ہونے لگتا تھا۔ میں نے گزشتہ سالوں میں بہت سیاحت کی تھی، لیکن الگریو جیسے ساحل اور مناظر مجھے کہیں اور نہیں ملے تھے۔ یہ دل کھینچ لیتے تھے اور آنکھوں کو چندھیا دیتے تھے۔ قدرت کی خوب صورتی اور من پسند ساتھی کی ہمراہی مجھے مسرور کیے دے رہی تھی، لیکن ثیا کو مناظر سے زیادہ وہاں موجود دوسرے سیاحوں میں دلچسپی تھی، بالخصوص وہ گنے چنے سیاح جن کے ہمراہ بچے تھے ثیا کی خصوصی توجہ کا مرکز تھے۔

اسی لیے میں نے ثیا کی جانب دیکھتے ہوئے یہ سوال کیا تھا۔

"بچے بھی کسی کو ناپسند ہو سکتے ہیں" اس نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے مجھ سے سوال کر ڈالا۔

"مجھے ناپسند ہیں۔۔۔ تم کوئی بچہ دیکھتی ہو تو دیوانی ہو جاتی ہو، مجھے نظر انداز کر کے اس کی جانب راغب ہو جاتی ہو۔ مجھے حسد محسوس ہوتا ہے۔"

میں نے مصنوعی آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ہم الگریو میں تھے۔ سامنے تاحد نظر نیلا آسمان تھا جو غروب آفتاب کے بعد اپنا لباس بدل چکا تھا اور اس کے سیاہ لباس کی کشش نیلے سے کہیں زیادہ تھی اور سیاہ آسمان کی آغوش میں سمندر کسی بچے کی طرح اٹھکھیلیاں کرتا مطمئن خوش باش نظر آتا تھا، درجہ حرارت بڑا معتدل سا تھا۔ بدن کو حرارت ملتی تھی تو خون جوش کھانے لگتا تھا۔ میں اپنے آپ کو اپنی عمر سے دس سال چھوٹا محسوس کرتا تھا۔

ہم الگریو کے مشہور ریز ورٹ بیلا وسٹا کے اوپن ایر حصے میں اپنی مختص میز کے گرد بیٹھے تھے۔ میڈیٹیرین کھانوں کی خوش بو ہمارے اردگرد پھیلی ہوئی تھی۔ ہم نے تلے ہوئے جھینگوں کے ساتھ ٹماٹر کی سلاد کا آرڈر دیا تھا۔ عمدہ وائن، یہاں کی مشہور پیسٹریز اور بیلا وسٹا کا مشہور زمانہ کیولنری آرٹ ہماری میز پر دل لبھانے کے لیے موجود تھا اور ثیا کی ساری توجہ ساتھ والی میز پر بیٹھے اس آسٹریلین جوڑے پر تھی جن کے ساتھ نو دس مہینے کی بچی موجود تھی اور اس کی قلقاریاں سارے میں گونج رہی تھیں۔

"حسد۔۔۔؟" اس نے بچی سے نظریں ہٹا کر میری جانب دیکھتے ہوئے تحیر بھرے انداز میں سوال کیا تھا پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر بولی تھی۔

"معصوم بچوں سے کون حسد کرتا ہے۔۔۔ جب ہمارے بچے ہوں گے تو کیا تم ان سے بھی حسد کرو گے۔"

مجھے خفیف سا جھٹکا لگا۔ مجھے بچوں کی خواہش کبھی نہیں رہی تھی۔ میں نے کبھی بچوں کے بارے میں سوچا ہی نہیں تھا۔ میں نے کبھی اپنے دل میں باپ بننے جیسی کسی خواہش کو محسوس نہیں کیا تھا۔ یہ میرے لیے انوکھی سی بات تھی۔

"میں نے اس بارے میں کبھی نہیں سوچا ثیا۔ میرا خیال ہے ابھی ہم اس ذمہ داری کو اٹھانے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں ہیں۔ اس بارے میں دس پندرہ سال بعد بات کریں گے۔" میرا لہجہ عام سا تھا۔

"میں نے اس بارے میں بہت سوچا ہے نل۔ میں بہت جلدی ماں بننے کی خواہش رکھتی ہوں۔ عورت کے لیے ماں بننے سے زیادہ بڑا درجہ کوئی نہیں ہو سکتا۔ میں اس درجے پر فائز ہونا چاہتی ہوں۔ تمہیں نہیں پتا نل۔۔ میرے اندر ایک خلا ہے، مجھے لگتا ہے میری گود میں میرا اپنا بچہ آجائے گا تو شاید یہ خلا پر ہو سکے۔ ہماری ویدوں میں لکھا ہے کہ بچہ ماں کو مکمل کرنے کا باعث بنتا ہے۔ میں نے سنا ہے ہر مقدس کتاب میں ماں اور اس کی اولاد کے درمیان کسی ہم آہنگی کا ذکر ملتا ہے۔ عورت کی زندگی میں کوئی پہیلی ہوتی ہے جو اولاد نام کی چیز سلجھا کر اسے ماں بنا دیتی ہے۔ اولاد عورت کا دوسرا جنم ہوتی ہے۔ اولاد عورت کو اپنے آپ میں گم کر کے ماں کے روپ میں ڈھال دیتی ہے لیکن ماں اپنی اولاد میں فنا ہو کر بھی ختم نہیں ہوتی مجھے یقین ہے اولاد کہیں نا کہیں عورت کی اکملیت کا ذریعہ ہے۔ میں مرنے سے پہلے مکمل ہونا چاہتی ہوں نل۔"

اس نے کہا تھا۔ اس کی آنکھیں اس ذکر سے گویا چمکنے لگی تھیں۔ مجھے اس کی بات میں وزن نہیں لگا تھا میں نے "ماں" نام کی ایک بھیانک چیز کو اپنی زندگی میں برتا تھا، مجھے اس لفظ میں یا اس جذبے میں کوئی کشش نظر نہیں آتی تھی۔ میں نے اپنے خیالات کو اس تک پہنچانا ضروری سمجھا تھا۔

"تم ابھی بھی مکمل ہو ثیا۔۔۔ ایسی باتیں مت سوچا کرو۔ مجھے دکھ ہوتا ہے جب تم خود کو نامکمل سمجھتی اور کہتی ہو۔ ہم دونوں ایک ساتھ ہیں۔ میری زندگی میں اب کوئی تشنگی نہیں ہے۔ محبت انسان کو مکمل کر دیتی ہے جب میں تمہارے ساتھ خود کو مکمل سمجھتا ہوں تو پھر تمہیں کیوں خلا محسوس ہوتا ہے۔ میری محبت کی ایسی ناقدری مت کرو۔" ثیا نے مسکراتے ہوئے میری بات سنی پھر میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر بولی۔

"تمہاری محبت میرا اثاثہ ہے، میری دولت ہے۔ میں اتنی قیمتی چیز کی ناقدری نہیں کر سکتی۔" اس کے لہجے میں صداقت ہی صداقت تھی۔ میرا دل خوشی کے احساس سے بھر گیا تھا۔

"میں اس محبت میں اضافے کی خواہاں ہوں نل" اس نے کہا تھا۔ مجھے اندازہ تھا وہ اولاد کو محبت میں اضافے کا باعث قرار دے گی، میں اتنے اچھے ماحول میں بحث نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اولاد کے بارے میں فیصلہ کرنا یا اولاد کی خواہش کا ہونا ثیا کا بنیادی حق تھا ثیا کی خواہش کا احترام مجھ پر لازم تھا۔ میں نے وعدہ کیا تھا کہ میں اسے زندگی کی ہر وہ خوشی دوں گا جو وہ چاہتی ہوگی سو اگر وہ اولاد چاہتی تھی تو مجھے بھی اولاد چاہیے تھی۔

"مجھے تمہاری بات سن کر خوشی ہوئی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا تھا اور اس کو کھانے کی جانب راغب کرنے کے لیے وائن کا گلاس اٹھایا تھا۔ کھانا بہت لذیذ تھا اور ہم نے دل کھول کر اس کی تعریف کی۔ کھانا ختم کرکے ہم اٹھنا چاہ رہے تھے۔ ہمیں واپسی کی تیاری کرنی تھی لیکن ایک اجنبی شخص مسکراتے ہوئے میری جانب آیا تھا۔

"میں اس خوب صورت جوڑے کے درمیان خلل کا باعث بننے کے لیے معذرت خواہ ہوں لیکن میں خود کو روک نہیں پارہا۔ میں اگر غلطی پر نہیں ہوں تو آپ مشہور ادیب بل گرانٹ ہیں۔"

اس نے بہت شائستگی سے کہا تھا۔ وہ شستہ انگریزی بول رہا تھا۔ ایک ہم زبان کا مل جانا کوئی حیرانی کی بات تو نہیں تھی لیکن پھر بھی مجھے اچھا لگا۔ میں نے سر ہلایا تھا۔ فخر کا ایک مخصوص احساس میرے اندر پیدا ہوا تھا' مسکراہٹ میرے لبوں پر پھیل گئی۔

"میں لندنر (لندن میں رہنے والا) نہیں ہوں۔ میری پیدائش بیڈ فورڈ لوٹن کی ہے لیکن میں پلا بڑھا لندن میں ہی ہوں آپ کی طرح۔۔۔ اور کتابیں میرا بھی پہلا پیار ہیں آپ کی طرح۔۔۔ میں نے بی بی سی پر آپ کی ڈاکیومینٹری میں یہ باتیں سنی تھیں اور میں نے آپ کی سب کتابیں پڑھ رکھی ہیں۔ آپ انسان نہیں جادوگر ہیں۔"

وہ لمبی بات کرنے کا شوقین تھا۔ میں مزید مسکرایا' ایسے سینکڑوں مداح ملتے رہتے تھے لیکن بیرون ملک کسی مداح کا مل جانا زیادہ خوشی کا باعث بنتا تھا۔

"آپ کو ناگوار نہ گزرے تو میں آپ کا کچھ وقت لے سکتا ہوں۔" اس نے لجاجت بھرے لہجے میں درخواست کی تھی۔ میں نے ٹیا کی جانب دیکھا۔ اس نے مسکرا کر گردن ہلائی تھی۔ اس نے اس شخص کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"اوہ ہاں میں آپ کو اپنا نام بتانا بھول ہی گیا۔۔۔ میں ٹیرن ہوں۔۔۔ کیا آپ نے کبھی یوپی ایل کا نام سنا ہے" اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"میں مایوس نہیں ہوں۔ میں جانتی ہوں چالیس سال کے بعد اولاد کا حصول مشکل ہو جاتا ہے لیکن میری ساری زندگی مشکلات سے عبارت ہے۔ میں جانتی ہوں مجھے میری من پسند چیزیں تاخیر سے ملتی ہیں اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ مجھے جو بھی چیز تاخیر سے ملتی ہے وہ بے حد قیمتی اور انمول ہوتی ہے۔"

ٹیا نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ ہماری شادی کو ایک سال سے زیادہ ہونے والا تھا اور ہم ابھی بھی اپنے خاندان میں اضافہ نہیں کرپائے تھے۔ میں تو کسی پریشانی کا شکار نہیں تھا' لیکن ٹیا اس معاملے میں عجلت چاہتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کی بڑھتی عمر مزید مسائل کا باعث بن سکتی ہے سو اسے جلدی اولاد چاہیے تھی۔ میں نے اسی کے اصرار پر لندن کے بہترین گائناکولوجسٹ سے اپائنٹمنٹ لی تھی۔ ڈاکٹر پال آرمسٹرونگ ایک بہت اچھے گائناکولوجسٹ تھے۔ پہلے ہم ہارٹ ہاسپٹل میں ان سے مل چکے تھے پھر ہم نے پرائیویٹ اپائنٹمنٹ لی تھی۔ انہوں نے ہمیں پرسکون رہنے کا مشورہ دیا تھا اور ہمیں سمجھایا تھا کہ ہم تحمل سے قدرت کی مہربانی کا انتظار کریں۔ انہوں نے ٹیا کے لیے چند طاقت کے کیپسولز تجویز کردیے اور ہمیں پرامید رہنے کی تلقین کرتے ہوئے رخصت کردیا تھا' ڈاکٹر پال سے مل کر ٹیا خوش تھی اور میں اس کی خوشی میں خوش تھا ہماری ازدواجی زندگی مکمل طور پر سیٹ ہو چکی تھی۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ بے حد کامیاب تھے زندگی اچھی گزر رہی تھی۔

یہ 2003ء کی بات ہے میں نے اپنے نئے ناول پر کام شروع کرنے کے لیے ہوم ورک شروع کردیا تھا۔ مجھے ذہنی طور پر بہت اطمینان تھا۔ میرا نیا ناول میرے لیے ایک بہت بڑا چیلنج تھا۔ میں نے اس موضوع پر یا اس طرح کے موضوع پر ابھی تک کوئی کام نہیں کیا تھا۔ میں نے ابھی تک ٹیا سے بھی اس ناول کے متعلق بات نہیں کی تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اب ہر

وقت اولاد کے جلد از جلد حصول کے لیے نجانے کون کون سی مذہبی رسومات کی ادائیگی میں مصروف رہتی تھی۔ وہ چند مہینوں کے لیے انڈیا بھی گئی تھی' اس نے آیورویدک علاج بھی کروایا تھا مگر پھر بھی تاخیر ہو رہی تھی اور اس کی وجوہات نامعلوم تھیں۔

ثیا اور میں جب بھی فراغت سے مل بیٹھتے وہ اس موضوع پر بات کرنا پسند کرتی تھی' یہ امر میرے لیے اکتاہٹ کا باعث بھی بن جاتا تھا لیکن میں اسے کہتا نہیں تھا۔ میں جانتا تھا ایک عورت کے لیے یہ بہت حساس موضوع ہو سکتا ہے جبکہ وہ ادھیڑ عمری کی سیڑھیاں تیزی سے چڑھ رہی تھی لیکن ہم اس سلسلے میں بے بس تھے' جبکہ ثیا یہ بات سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ ذہنی دباؤ کا شکار رہنے لگی تھی حالانکہ میں اس کو خوش رکھنے کا ہر جتن کرتا تھا۔ لیکن میری کوششیں ناکام ہو رہی تھیں۔ میں نے اپنے نئے ناول کے لیے چند حیرت انگیز کتابیں خریدی تھیں۔ میں ان کے متعلق ثیا سے بات کرنا چاہتا تھا' وہ ابھی بھی کتاب پڑھنا پسند نہیں کرتی تھی لیکن وہ میری باتوں میں دلچسپی ضرور لیتی تھی اور مجھے یہ اچھا لگتا تھا لیکن ثیا اولاد کے مسئلے پر اتنا الجھی ہوئی رہتی تھی کہ اس کا ذہن کسی اور چیز کے بارے میں سوچنے ہی نہیں دیتا تھا۔

✫ ✫ ✫

"یہ دنیا مذاہب کی وجہ سے جس قدر اذیت کا شکار ہو رہی ہے اتنا شاید ہی کسی اور عنصر نے دنیا کو برباد کیا ہو۔ مذاہب بالخصوص تنگ نظر شدت پسند مذاہب نے ہماری نسلوں کا بیڑا غرق کر کے رکھ دیا ہے اور یہ بات کس سے ڈھکی چھپی ہے کہ مذہب اسلام جسے نام نہاد امن کا مذہب کہا جاتا ہے دنیا کا سب سے تنگ نظر مذہب ہے۔ آپ ان کے مردوں کو دیکھیں تو انتہائی دو غلے' دھونس جمانے والے' ہر شخص کو جہنم کی آگ سے ڈرانے والے۔ حلال حرام کی تسبیح پڑھ پڑھ کر ہر فطری تقاضے کو مارنے کا درس دینے والے۔ اپنی عورتوں کو ٹینٹ پہنا کر پھراتے ہیں جبکہ ہماری چھوٹی بچیوں کو ہراساں کرنے سے باز نہیں آتے۔ آپ بیڈ فورڈ یا روچڈیل کا چکر لگائیں' آپ کو ہر غیر قانونی کام میں مسلمان ملوث نظر آئیں گے اور المیہ یہ ہے کہ انہوں نے ہمارے ملک کو یرغمال بنایا ہوا ہے۔ ان علاقوں میں پولیس بھی ان پر ہاتھ جلدی نہیں ڈالتی کہ پھر یہ مذہب کو آڑ بنا کر فساد برپا کرتے ہیں اور ہماری حکومت سو رہی ہے اس کو اتنی فرصت نہیں کہ امیگریشن کی کوئی ٹھوس پالیسی ترتیب دے لے۔ ہر سال ہزاروں لوگوں کو پلیٹ میں رکھ کر برطانوی شہریت تحفے میں دینے کا مقصد کیا ہے۔ مجھے تو کبھی یہ سمجھ میں نہیں آسکا یہ لوگ اپنے ملکوں میں کیوں جا کر نہیں رہتے۔ ہم کیوں ان طفیلیوں کو اپنی نسلوں کے خون پر پال رہے ہیں۔"

مسٹر ٹیرن کی آواز رندھ گئی تھی اور ان کا گلا سوکھا ہوا لگتا تھا۔

"آپ کبھی لوٹن آئیں سر! آپ کو لوٹن میں اور لاہور میں کوئی فرق نظر نہیں آئے گا۔ اتنے مسلمان ہیں کہ لگتا ہے کہ ہم ان کے مقدس شہر مکہ میں موجود ہیں۔ یہ کالے کالے لمبے لمبے ٹینٹ پہنے عورتیں نظر آئیں گی' مرد ہیں تو وہ چہروں پر جھاڑ جھنکار بڑھائے رعونت سے ہماری سرزمین پر ہماری گلیوں میں ہمارے بچوں کو شریعت کے نفاذ کا درس دیتے نظر آتے ہیں۔ مجھے بتائیں مسٹر گرانٹ! یہ کیسا امن کا مذہب ہے جو عورت کو دیکھ لینے پر جہنم کی آگ میں جھلس جانے کا ڈراوا دینے لگتا ہے' جو بچیوں کو ان کی پسند کا لباس پہننے پر لتاڑتا ہے' جہاں مرضی کی شادی نہیں کر سکتے' من پسند عورت کا ہاتھ شادی سے پہلے نہیں پکڑ سکتے' اسے گلے نہیں لگا سکتے۔ ایسی تنگ نظری کہ عورت کو ابارشن کروانے پر گنہگار قرار دیا جاتا ہے۔ عورت اپنی مرضی سے اپنا لائف پارٹنر نہیں چن سکتی۔ مسلمان وائن پی لے یا پورک کھالے تو اس کا عمل حرام ٹھہرتا ہے۔

اتنی تنگ نظری' اتنی گھٹن کسی اور مذہب میں نہیں ہے اور ستم ظریفی یہ کہ مسلمان یہ بات ماننے کو تیار نہیں ہیں۔ آپ سے التجا ہے میری کہ کبھی ان کے علاقوں کا' ان کے اسکولز کا معائنہ کریں۔ آپ پریشان ہو جائیں گے۔ آپ کو ایسی ایسی کہانیاں سننے کو ملیں گی کہ اپنے کانوں پر یقین نہیں آئے گا۔ ان کی اسی سوچ کی وجہ سے ان کے ملکوں میں جرائم کا ریٹ باقی تمام دنیا سے کہیں زیادہ ہے۔ یہ خودکش بمبار' یہ دہشت گرد' یہ حقوق پامال کرنے والے' یہ دھوکے باز۔"

یہ مسٹر رابنسن کی آواز تھی۔ اشتعال ان کے ہر ہر لفظ سے عیاں تھا۔ یہ ایک چار رکنی گروپ تھا جو لوٹن کے رہنے والے تھے اور یو پی ایل سے وابستہ تھے۔ یو پی ایل ایک سفید فام لوگوں کی بنائی ہوئی تنظیم تھی اور ان کا کہنا تھا کہ انہوں نے یہ تنظیم "المہاجرون" کو کڑا جواب دینے کے لیے بنائی تھی۔ "المہاجرون" افغانستان پر نیٹو فورسز کے حملے کے بعد ریڈیکلز مسلمز (شدت پسند مسلمان) کی جانب سے بنائی گئی تھی۔ میں نے اس تنظیم کے بارے میں اخبار میں پڑھ رکھا تھا کہ یہ تنظیم آئے دن احتجاج کرتی تھی اور یہ لوگ علاقے میں خوف و ہراس کا باعث بن رہے تھے۔ اخبارات کی جانب سے اس تنظیم کو فاشسٹ قرار دیا جا رہا تھا۔ اسی لیے یو پی ایل سے وابستہ لوگ مجھ سے ملنے آئے تھے۔

یہ سب مجھ سے میرے نئے ناول کے سلسلے میں ملنے کے لیے آئے تھے۔ مسٹر ٹیرن وہ شخص تھے جن سے میری ملاقات پرتگال میں ہوئی تھی۔ انہوں نے مجھے لوٹن کے متعلق چند بہت خوفناک باتیں بتائی تھیں اور مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں ان مسائل کو ہائی لائٹ کرنے کے لیے اپنے اگلے ناول میں لوٹن اور اس کی نوجوان نسل کو موضوع بناؤں۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اپنے ہی ملک میں اقلیتوں کی طرح رہنے پر مجبور ہیں۔ ہماری پہلے بھی ایک ملاقات ہو چکی تھی اور اب یہ لوگ لندن میں مجھ سے ملنے کے لیے آئے تھے۔ میں نے باضابطہ طور پر ان سے ہامی نہیں بھری تھی لیکن میں رضامند تھا کہ یہ موضوع مجھے بھی اچھا لگا تھا۔ میں نے اپنے طور پر اس پر کام بھی شروع کر دیا تھا تاکہ یہ جانچ سکوں کہ یہ میرے لیے کتنا فائدہ مند ثابت ہو سکتا ہے۔

"ہم راشسٹ نہیں ہیں۔ ہم اسلام کے خلاف بھی نہیں ہیں۔ وہ لوگ جو لبرل سوچ کے مالک ہیں اور ہمارے ساتھ مل جل کر رہنا چاہتے ہیں ہم انہیں ہمیشہ خوش آمدید کہتے ہیں' ہمارا اختلاف صرف اور صرف ان مسلمانوں کے ساتھ ہے جو تنگ نظر ہیں' دہشت گرد ہیں اور ہر وقت شریعت کے نفاذ کے متعلق درس دیتے ہیں۔ ان سب فاشسٹ مسلمانوں سے میرا صرف ایک سوال ہے کہ یہ لوگ اپنے ملکوں کو چھوڑ کر ہمارے ملک میں کیوں آتے ہیں۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے اور سب ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ ہمیں کوئی بتائے کہ یہ کیوں آتے ہیں۔ یہ اپنی تنگ نظری' اپنی گھٹن زدہ سوچ کے ساتھ وہیں کیوں نہیں رہتے۔ ہماری نسلوں نے اس مقام تک آنے میں بہت محنت کی ہے۔ ہم کسی کا استحصال کیے بغیر ترقی کی ان منزلوں تک پہنچے ہیں' جبکہ یہ مسلمان ہماری ٹانگیں کھینچ کر اس ترقی کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ خود محنت کیوں نہیں کرتے۔ یہ خود کیوں اپنے آپ کو کسی قابل نہیں بناتے۔ یہ الٹے سیدھے ہتھکنڈوں سے کب تک ہمیں نقصان پہنچاتے رہیں گے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم کیسے ان دہشت گرد مسلمانوں کو اپنی نسلوں کو تباہ کرنے کی اجازت دیں۔ یہ ہمارے بچوں کو اپنی غلط روایات کے شکنجوں میں کس رہے ہیں۔ آپ سوچ نہیں سکتے کہ ان علاقوں میں کیا کیا ہو رہا ہے۔ ہمارے بچوں کو بتایا جاتا ہے کہ حرام حلال کیا ہے۔ یہاں کے اسکولز میں بچیوں کو حجاب کی اہمیت پر لیکچر دیے جاتے ہیں۔ لوٹن میں جتنی بھی فاسٹ فوڈ چینز ہیں وہاں پر حلال میٹ استعمال ہوتا ہے۔ ستم ظریفی یہ

ہے کہ یہ خود تو ہماری لڑکیوں سے تعلقات بڑھاتے ہیں لیکن اپنی مسلمان لڑکیوں کے ہمارے لڑکوں سے ملنے پر مرنے مارنے پر اتر آتے ہیں۔ دوغلا پن یہ ہے کہ یہاں ہماری بچیاں اپنی پسند کے لباس میں باہر نہیں نکل سکتیں۔ یہ اپنے بچوں کو سکھاتے ہیں کہ اپنے فطری تقاضوں کو مار کر زندہ رہنا سیکھو اور پھر توقع کرتے ہیں کہ ہم بھی اپنے بچوں کو ایسی تنگ نظری کے ساتھ تربیت کریں۔ ہم بہت مشکل میں ہیں۔ ہمیں آپ جیسے بڑے لوگوں کی معاونت چاہیے۔ ہم نے ابھی کچھ نہیں کیا تو اگلے چند سالوں میں یہاں ایک نئی اینگلو مسلم نسل تیار کھڑی ہوگی اور تب ہمیں رونے اور منہ چھپانے کے لیے دیوار کا سہارا بھی نہیں ملے گا۔"

وہ بتا رہے تھے اور رونگٹے میرے کھڑے ہو رہے تھے۔ میں "اسلام" کے بارے میں اتنا زیادہ نہیں جانتا تھا۔ میری زندگی میں بہت پہلے کچھ لوگ آتے رہے تھے جن کے ساتھ میرے روابط رہے تھے۔ ان کی بہت سی باتوں نے مجھے متاثر کیا تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ میں وہ باتیں بھولتا چلا گیا تھا۔ 6 اسٹینڈرڈ میں اسکول میں ایک پراجیکٹ کیا تھا اور اپنی کلاس ٹیچر کے ساتھ مسجد دیکھنے بھی گیا تھا۔ اتنی سی ہی معلومات تھیں میری' اسی لیے یہ باتیں میرے اوسان خطا کیے دے رہی تھیں۔ اتنی بری صورت حال کے بارے میں تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا' یہ حقیقت تھی کہ لوٹن میں کچھ عرصے سے جرائم کی شرح بڑھ گئی تھی اور نت نئی خبریں سننے کو مل رہی تھیں' لیکن جتنی خوفناک باتیں یہ لوگ بتا رہے تھے اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا میں نے۔

"ہم آپ سے صرف اتنا چاہتے ہیں کہ آپ ایک ناول لکھیں جس میں ان تمام مسائل کی نشاندہی کریں۔" مسٹر ٹیرن نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"سر! صرف مسائل کی نشاندہی نہیں کرنی' اس کا حل نکالنا ہے' اس کی جڑ کو پکڑنا ہے۔" مسٹر فلاں جو ساری گفتگو کے درمیان چپ بیٹھے رہے تھے بولے۔

"جڑ؟" میں نے ان کا چہرہ دیکھا۔ وہاں عجیب سے عجیب رنگ بکھرے تھے۔ مجھے لگا میرا سارا وجود کڑوا ہونے لگا ہے۔

"تم اچھا نہیں کر رہے۔" مجھے اپنے عقب سے چبھتی ہوئی آواز سنائی دی تھی۔ میں نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ میری پیشانی پر لکیریں نمودار ہوئی تھیں۔

"میں نے کچھ برا بھی نہیں کیا۔" اپنے سامنے پڑے کاغذات کے پلندے کو غائب دماغی سے دیکھتے ہوئے میں نے اسی کے انداز میں کہا تھا۔

مجھے غصہ آیا ہوا تھا۔ میں بہت چاؤ سے اس کے ساتھ وقت گزارنے کے لیے سب کام نمٹا کر بیٹھا تھا اور وہ ٹی وی پر عورت اور اس کی صحت سے متعلق کوئی پروگرام دیکھ رہی تھی۔ ایک گھنٹہ اس کے ساتھ بیٹھ کر میں نے صرف وہ پروگرام ہی دیکھا تھا اور میرے اصرار پر بھی ثیا نہیں اٹھی تھی۔ میں کہیں باہر جانا چاہتا تھا جبکہ اس کی ساری دلچسپی ٹی وی میں تھی اور اب جب میں اکتا کر اسٹڈی میں آگیا تھا تو وہ مجھ سے شکوہ کرنے آگئی تھی۔ میں اگر اس کے پاس بیٹھا رہتا تب بھی اس نے یہی باتیں کرنی تھیں کہ ہم کب صاحب اولاد ہوں گے' قدرت ہم پر کب مہربان ہوگی' اولاد ہماری اکملیت کا ذریعہ ہے وغیرہ وغیرہ اور میرے پاس ان سوالوں کا جواب نہیں تھا۔ میرے پاس اب ان سوالوں کو سنتے رہنے کی ہمت بھی نہیں رہی تھی۔ انسان ایک ہی موضوع پر کب تک توجہ مرکوز رکھ سکتا ہے۔ یہ حقیقت تھی میں واقعی اکتا چکا تھا۔

"تم مجھے نظر انداز کر رہے ہو مِل — مت کرو ایسا میرے ساتھ" وہ اکتائے ہوئے انداز میں کہہ رہی تھی۔

میں خاموش رہا۔ میں اس سے بحث نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں اس سے بحث کر کے ہار جاتا تھا۔ میں اسے سمجھا نہیں سکتا تھا کہ میں اسے نظر انداز نہیں کر رہا تھا بلکہ وہ مجھے نظر انداز کر رہی تھی۔ میں اس کی زندگی میں کہیں نہیں رہا تھا۔ "اولاد" اس کی زندگی کا نیوکلئیس بن چکی تھی اور مرکز — تو ایک ہی ہوا کرتا ہے۔ وہ صبح شام اسی ایک موضوع پر بات کرتی تھی۔ اس کے

متعلق سوچتی رہتی تھی۔ ہماری شادی کو چوتھا سال شروع ہو چکا تھا اور وہ اولاد جسے ثیا اپنی اکملیت کا ذریعہ سمجھتی تھی اس کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔

ہم نے آیورویدک علاج کروایا تھا۔ ہم ہومیوپیتھی آزما چکے تھے۔ تیسرے مرحلے پر روحانی علاج کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

میں تھکنے لگا تھا۔ میری ذہنی صحت بگڑ رہی تھی۔ ثیا میری بات سمجھتی نہیں تھی۔ اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ میرا کام کس قدر ذہنی توجہ اور ارتکاز مانگتا ہے۔ میں گزشتہ کئی مہینوں سے اپنے نئے پراجیکٹ پر کام کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن مجھے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑ رہا تھا۔ میں جب بھی لکھنا چاہتا تھا' میری ذہنی رو بھٹک جاتی تھی۔ میں عجیب مشکل میں پھنسا تھا۔ میرے ساتھ پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ میرا ذہن اس قدر منجمد ہوا ہو۔ ذہنی انجماد میرے لیے بہت پریشانی کا باعث تھا۔ میرا ہنر میرا پیشہ نہیں تھا۔ لیکن میرا اوڑھنا بچھونا' میرا جینا مرنا ضرور تھا۔ میرا دلی سکون میرے لکھنے سے مشروط تھا۔ ایک طرف میں ذہنی بانجھ پن کا شکار ہو رہا تھا تو دوسری طرف ثیا الگ مجھے بے سکون کر رہی تھی۔ ہم ہر وقت اسی موضوع پر بات کرتے تھے بلکہ بات تو وہ کرتی تھی میں تو صرف خاموش رہ کر سنا کرتا تھا۔ ثیا مجھے ذہنی طور پر لاچار کر رہی تھی۔ ہمارے درمیان جھگڑے بڑھ گئے تھے۔ ہمیں ایک دوسرے کی موجودگی سے اکتاہٹ ہونے لگی تھی' ثیا اس کے لیے مجھے ذمہ دار ٹھہراتی تھی جبکہ میں سمجھتا تھا کہ اگر وہ اولاد کی خواہش کے لیے بے صبری کا مظاہرہ کرنے کے بجائے سب کچھ قدرت پر چھوڑ دے تو ہمارے درمیان پہلے جیسے تعلقات ہو سکتے تھے۔

"میں تمہیں نظر انداز کر رہی ہوں؟ تمہیں پتا بھی ہے نظر انداز کرنا کیا ہوتا ہے؟ تم کبھی ان کتابوں کی دنیا سے نکلو تو تمہیں پتا چلے کہ تمہارے ارد گرد بسنے والے انسان تمہاری توجہ کے منتظر ہیں۔"

ثیا کی آواز ابھی بھی عقب سے سنائی دی رہی تھی۔ اس کی آواز میں طنز کی آمیزش تھی' مجھے یکدم نجانے کیا ہوا۔ اس کا طعنہ نیا نہیں تھا۔ وہ یہ بات پہلے بھی کہتی رہتی تھی لیکن مجھے اتنا برا پہلی بار لگا تھا میرے دماغ کی رگیں تن گئی تھیں۔ میرے بدن میں جیسے بجلی دوڑ گئی تھی۔ میں نے اپنے سامنے میز پر پڑی ساری کتابیں اور کاغذات ہاتھ مار کر گرا دیے تھے۔

"ثیا' تمہیں میری کتابوں سے اتنی چڑ ہے تو تم چھوڑ دو مجھے۔ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ میں تھک گیا ہوں تم سے۔ تم نے میری زندگی کو آزار بنا کر رکھا ہے۔ تمہارے ساتھ میری زندگی کسی جوہڑ سے کم نہیں ہے۔ تم مجھے گندے پانی کا خوردبینی کیڑا کہا کرتی تھیں' حقیقت یہ ہے ثیا! کہ میں اب تم سے شادی کے بعد خوردبینی کیڑا بن گیا ہوں۔"

میں غرا کر بولا تھا۔ مجھے اپنی زندگی میں کبھی اتنا غصہ نہیں آیا تھا۔ میرے کانوں اور جبڑوں میں درد کی ہلکی لہریں اٹھ رہی تھیں۔

"تم نے اولاد کی گردان کر کر کے مجھے عجیب سے احساس جرم میں مبتلا کر دیا ہے۔ میں اپنے آپ سے شرمندہ رہنے لگا ہوں۔ تم کو اگر اولاد کا اتنا ہی شوق تھا تو تم تیس سال کی عمر میں شادی کر لیتیں۔ اس بڑھاپے میں شادی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔" میں نے مزید کہا تھا' ہمارے معالج کا یہی کہنا تھا کہ تاخیر کی وجہ ثیا کی ادھیڑ عمری ہے۔ میرے سر میں درد کی اتنی لہریں اٹھ رہی تھیں کہ مجھ سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ میں نے ثیا کو اپنے قریب آتے دیکھا تھا۔ میں نے اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا تھا۔ میرے ساتھ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

"مِل تم ٹھیک ہو نا — تم بیٹھ جاؤ — یہاں بیٹھ جاؤ تم۔" ثیا نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ مجھے کرسی پر بیٹھ جانے کے لیے کہا تھا۔

"تم پانی پیو مِل" اس نے مجھے گلاس تھمایا تھا' مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا' میں نے غائب دماغی کی حالت میں گلاس تھام لیا تھا۔ ثیا میری پشت سہلانے لگی تھی۔ مجھے نہیں پتا' وہ کب تک ایسا کرتی رہی

تھی۔ میری حالت آہستہ آہستہ بہتر ہونے لگی تھی۔ میں نے آنکھیں پھیلا کر ثنیا کا چہرہ دیکھا۔ وہ ابھی بھی خوب صورت تھی۔ وہ ابھی بھی میرے دل کے قریب تھی۔

"مجھے معاف کردو ثنیا.... مجھے پتا نہیں کیا ہوگیا تھا۔ مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔ مجھے معاف کردو۔" میں لاچاری کے عالم میں بولا تھا۔ ثنیا نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تھا۔

"تم ٹھیک نہیں لگ رہے مجھے بل... کیا ہوا ہے تمہیں" وہ میرے لیے بے حد پریشان تھی' مجھے بے پناہ شرمندگی ہوئی۔

"مجھے نہیں پتا ثنیا۔ مجھے کیا ہوا تھا؟" میں اس سے پوچھ رہا تھا۔ مجھے واقعی نہیں پتا تھا کہ مجھے یک دم کیا ہوا تھا۔

✡ ✡ ✡

اس کے بعد اگلے کئی دن میں نے کچھ نہیں کیا تھا' کسی کام کو ہاتھ نہیں لگایا تھا' کوئی کتاب نہیں پڑھی تھی' کسی شخص سے نہیں ملا تھا۔ میں اپنی زندگی میں ہونے والی ان تبدیلیوں پر غور کرتا رہا تھا جو گزشتہ چھبیس چھبیس مہینوں میں بہت تیزی سے رونما ہوئی تھیں۔ میں جسمانی اور روحانی طور پر کچھ مسائل کا شکار تھا لیکن مجھے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کس سے اس کے متعلق بات کروں۔ میرے لیے یہ امر بہت تکلیف دہ تھا کہ میں لکھ کیوں نہیں پا رہا تھا۔ پہلے تو میرا دل ہی نہیں چاہتا تھا کہ میں ایسا کوئی کام کروں اور اگر میں زبردستی کچھ لکھنے کی کوشش بھی کرتا تھا تو میرے دماغ کی رگیں تن جاتی تھیں' مجھے خوامخواہ غصہ آنے لگتا تھا۔ میرا دل چاہتا تھا میں اپنی سب چیزوں کو آگ لگا دوں۔ میں ہائپر ٹینس ہو رہا تھا۔ اسی لیے میں نے سوچا تھا کہ اب میں کچھ عرصہ اپنی ساری روٹین سے جان چھڑا کر پرسکون رہنے کی کوشش کروں گا۔

میں ثنیا کے ساتھ اپنے برے رویے کا ازالہ بھی کرنا چاہتا تھا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے سے معافی مانگی تھی اور نئے سرے سے زندگی کی منصوبہ بندی کی تھی۔ ہم نے ایک نئے معالج سے رابطہ کیا تھا۔ انہوں نے ہمیں کم سوڈیم اور کم چکنائی والی غذاؤں کے استعمال کا مشورہ دیا تھا اور ساتھ ہی انہوں نے ہمیں ایک صوفی کلینک کا پتا بتایا جہاں روحانی اور نفسیاتی علاج کیا جاتا تھا۔ ان سے مل کر ہماری امید بندھی تھی کیونکہ انہوں نے ہمیں آئی وی ایف (غیر مصنوعی طریقہ تولید) کی تجویز دی' یہی تجویز پہلے معالج نے مسترد کر دی تھی اور وجہ وہی تھی کہ ثنیا کی عمر چالیس سے زیادہ ہوچکی تھی۔ اس کی کامیابی کے امکانات کافی کم تھے اس کے باوجود ہم نے ہر حال میں پرسکون رہنے کا تہیہ کیا تھا۔ اگلے چند مہینے بہت مطمئن اور پرسکون گزرے تھے۔ آئی وی ایف کے طویل اور صبر آزما سائیکل شروع ہوگئے تھے اور یہ چھٹا سائیکل تھا جب قدرت کو ہم پر ترس آگیا تھا۔ ثنیا ماں بننے والی تھی۔

"کیا کر رہے ہو؟" ثنیا نے مجھ سے سوال کیا تھا۔ وہ ابھی ابھی میرے پاس آکر بیٹھی تھی۔ میں مسکرایا۔ ابھی ابتدائی مہینے تھے مگر وہ ایسے چلتی تھی جیسے ملکائیں دھیرے دھیرے قدم اٹھایا کرتی ہیں۔ اس کے وجود پر حاملہ عورتوں والے کوئی اثرات ظاہر نہیں ہونا شروع ہوئے تھے مگر وہ اپنے آپ کو پورے دنوں کی حاملہ عورت کی طرح سنبھال سنبھال کر استعمال کر رہی تھی۔ وہ اتنی پرسکون لگتی تھی کہ مجھے اسے دیکھ دیکھ کر اطمینان ہونے لگتا تھا۔ کیا وہ واقعی مکمل ہونے جا رہی تھی۔

ہم دونوں بہت خوش تھے۔ میرا ذہنی ارتکاز لوٹ رہا تھا۔ میرا اپنے کام میں دل لگنے لگا تھا۔ میں نے دوبارہ سے اپنی چیزیں نکال کر میز پر سجالی تھیں۔ میں اپنے نئے ناول پر کام کرنے کے لیے تیار تھا۔ تنگ نظر شدت پسند مذاہب دنیا کے لیے واقعی ناسور تھے۔ میں نے اپنا ہوم ورک مکمل کر لیا تھا۔ میں اب تمام تر مواد کو لفظوں کا روپ دے کر دنیا کے سامنے لانے کے لیے تیار تھا' میری نئی تخلیق میرے بچے کی آمد پر

دنیا کے سامنے لانے کے لیے مجھے تمام کام تیزی سے کرنا تھا' سو یہ وقت مناسب تھا کہ میں کام شروع کر دیتا۔ یو پی ایل بھی چاہتی تھی کہ میں اس سال کے اختتام تک یہ ناول مکمل کرلوں۔ ان کا دباؤ بھی بڑھ رہا تھا۔

"میں نے نئے ناول پر کام شروع کردیا ہے۔" میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

"اچھی بات ہے۔۔۔ میں خوش ہوں کہ تم اپنے کام کو وقت دے پا رہے ہو۔۔۔ اس ناول کا کیا عنوان ہے؟" وہ پوچھ رہی تھی۔

"میں نے ابھی نہیں سوچا۔۔۔ میں پہلے کام مکمل کروں گا اس کے بعد عنوان کا فیصلہ ہوگا۔۔۔ تم کچھ مدد کرنا چاہو گی؟" میں نے سابقہ انداز میں کہا تھا۔

"تم نے مجھے ابھی تک اس کے موضوع کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔" اس نے کہا تھا۔

"صحت مند معاشروں کو لاحق سب سے بڑی بیماری' سب سے بڑا ناسور۔۔۔ تنگ نظر مذاہب۔۔۔ میرے اس ناول کا موضوع ہے۔ میں اس ناول میں دنیا کو بتادوں گا کہ انہیں مذاہب کے چنگل سے نکل کر انسانیت کو اپنانا پڑے گا۔" میں نے پرجوش انداز میں بتایا تھا۔

"میں ایک بہت منفرد طریقے سے لوگوں کو اس جھنجھٹ سے نکلنے کا طریقہ سمجھاؤں گا۔ یہ ناول مسلمانوں کے بارے میں ہے اور میں بہت پرامید ہوں کہ یہ دنیا بھر میں سراہا جائے گا۔" میں دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن مجھے اندازہ تھا کہ میری آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"دلچسپ لگ رہا ہے۔۔۔ تفصیل سے بتاؤ" ثیا نے کہا تھا۔ میں نے اپنے انداز نشست کو آرام دہ بناتے ہوئے سرہلایا تھا۔ میں تو خود منتظر تھا کہ وہ پوچھے تو میں اس کے ساتھ چیدہ چیدہ نکات زیر بحث لاسکوں۔

"یہ ناول مسلمانوں کے آخری نبی کے بارے میں ہے۔" میں نے کہنا شروع کیا تھا۔

✲ ✲ ✲

یہ کچھ روز بعد کی بات ہے' ہر چیز ٹھیک چل رہی تھی۔ میرا لکھنے کا کام تیزی سے جاری وساری تھا۔ ثیا کی صحت بھی ٹھیک تھی۔ وہ ادویات اور خوراک کے معاملے میں بہت محتاط تھی۔ ہم اور ہمارا معالج سب مطمئن تھے کہ اچانک' جو امید بندھی تھی' ختم ہوگئی۔ ثیا رات کو پرسکون نیند لے رہی تھی مگر صبح بیدار ہونے پر اس نے ناسازی طبیعت کا بتایا۔ میں اسے کلینک لے گیا اور بس سب ختم۔۔۔ یہ کوئی اتنی غم ناک بات نہیں تھی' لیکن ایک ادھیڑ عمر جوڑے کے لیے جو فرٹیلیٹی کلینکس کے چکر لگا لگا کر اس خوشی کو حاصل کر پایا ہو۔ اس کے لیے یہ غم اندوہ ناک تھا۔ میں کچھ دنوں میں سنبھلنے لگا' مگر ثیا سنبھل نہیں پائی تھی۔ وہ اگلے چند ہفتوں میں جیسے بالکل ٹوٹ کے رہ گئی۔ میں ذہنی طور پر اس کی وجہ سے بے اطمینان تو تھا مگر میں نے اسے حقیقت سمجھ کر قبول کرلیا تھا۔ اسی لیے میں ان دنوں تیزی سے لکھ رہا تھا' میں جلد از جلد کام ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے اپنی ذہنی رو کو بھٹکنے نہیں دیا تھا۔ ای ڈی ایل انتظامیہ بھی مزید مہلت دینے کو تیار نہیں تھی' لیکن میرا اپنا مسئلہ پھر عود کر آیا تھا' میں رات بھر لکھتا تھا اور دن کو غیر مطمئن ہو کر اسے تلف کر دیتا تھا۔ میرے لفظ اپنی کشش کھو رہے تھے' میرا ہنر زنگ آلود ہو رہا تھا جبکہ دوسری جانب ثیا نے میری زندگی کو مشکل ترین بنا دیا تھا۔ اس کا رونا ہی ختم نہیں ہوتا تھا۔ ہر تیسرے روز پینک اٹیک اسے لاغر کر رہے تھے۔ وہ اپنے ہر مسئلے کے لیے مجھے موردالزام ٹھہراتی تھی۔ ہمارے درمیان ایک بار پھر فاصلہ اور جھگڑے بڑھنے لگے تھے۔

پھر ایک روز ایک عجیب بات ہوئی۔ سارے جھگڑے مسئلے ایک دم ختم ہوگئے۔

ثیا نے خودکشی کرلی تھی۔

✲ ✲ ✲

"اور جب آپ کے رب نے اولاد آدم کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان سے ان ہی کے متعلق

اقرار لیا کہ "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟" سب نے جواب دیا "کیوں نہیں" ہم سب گواہ بنتے ہیں تاکہ تم لوگ قیامت کے روز یوں نہ کہو کہ ہم تو اس سے محض بے خبر تھے۔"

وہ آواز اتنی خوب صورت تھی کہ ایک لمحے کے لیے میں کہیں گم ہو گیا تھا۔ ہمیں سیشن سے پہلے بتادیا گیا تھا کہ آج ایک مسلم لیکچر ہوگا۔ مجھے اتنا تو سمجھ میں آرہا تھا کہ وہ شخص مسلمانوں کی مقدس کتاب (قرآن کریم) کی تلاوت کر رہا تھا لیکن اس تلاوت کا مفہوم مجھے بالکل سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اس کے باوجود مجھے یہ اعتراف کرنا پڑا تھا کہ اس آواز نے مجھے ٹرانس میں لے لیا تھا' مجھے بہت عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ میں اس وقت بلیک برن کے اسی صوفی کلینک میں موجود تھا۔ جہاں کا پتا ہمیں ہمارے گائناکولوجسٹ نے دیا تھا۔

ثیا کی زندگی میں بھی ہم اس کلینک پر آتے تھے۔ یہ ایک حیرت انگیز جگہ تھی۔ ہم ہفتے میں ایک بار ہی یہاں آپاتے تھے لیکن اس کے لیکچرز اور یوگا سیشنز کا اثر اتنا مثبت تھا کہ ہم بہت عرصے اسی سحر انگیز کیفیت میں رہتے تھے۔ اس کلینک کی اچھی بات یہ تھی کہ یہاں ہر مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگ آتے تھے لیکن کوئی نامی گرامی لوگ اپنے گھسے پٹے تجربات بیان نہیں کرتے تھے بلکہ عام لوگ عام سے انداز میں اپنی کمزوریوں مجبوریوں اور پھر اس کے بعد ملنے والی کامیابیوں کا تذکرہ کرکے سب کی ہمت بندھاتے تھے۔

ثیا کی خودکشی نے مجھے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ میرے ساتھ مکمل ہونے چلی تھی اور میں نے اسے کس دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا کہ اس نے اپنے ہاتھوں اپنی جان لے لی تھی۔ یہ احساس مجھے سونے نہیں دیتا تھا۔ میں بہت کمزور ہوگیا تھا۔ میری ذہنی حالت مخدوش ہو چکی تھی۔ میں بیٹھے بیٹھے بے ہوشی کی کیفیت محسوس کرنے لگتا تھا۔ میرا دماغ ماؤف ہو جاتا تھا جبکہ میری میڈیکل رپورٹس ثابت کرتی تھیں کہ میں بالکل فٹ ہوں۔ میری حالت عجیب ہوگئی تھی۔ میں کچھ لکھنے کے قابل نہیں تھا۔ میرا ہنر کھو چکا تھا۔

میں ایک بار پھر وہی پرانا بارہ سال والا ایلی تھا' نامکمل شکست خوردہ تھکا ہوا مایوس۔۔۔ خواب جیسے ٹوٹ گیا تھا آنکھ جیسے کھل گئی تھی۔ آنکھ کھلی تھی تو روشنی ہونی چاہیے تھی مگر روشنی نہیں تھی۔۔۔ میرے اردگرد اتنی تاریکی کیسے ہوگئی تھی۔ میں روشنی کی تلاش میں بھٹکتا ہوا اس جگہ آیا تھا۔ لیکن کیا روشنی تلاش کرنے سے مل جایا کرتی ہے۔ یہ سیشن خاص طور پر ڈپریشن کے مریضوں کے لیے مختص تھا۔

ہمارے سامنے ایک بیس یا بائیس سالہ لڑکا تھا۔ وہ جب ہال میں آیا تھا تو اس کی شخصیت میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوئی تھی۔ وہ ڈرپوک بزدل سا انسان لگتا تھا لیکن جب اس نے تلاوت شروع کی تو ہم سب مسحور ہونے لگے تھے۔ ہال میں نیلگوں اور دودھیا روشنی کے درمیان مودب ہو کر بیٹھنے اور اس کلام کو سننے میں عجب سا سکون پورے وجود میں اترتا محسوس ہونے لگا تھا۔

اس لڑکے نے عربی کے بعد انگلش میں ترجمہ سنانا شروع کیا تھا۔ ترجمہ کو سن کر مزید دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔

وہ لڑکا اپنا کام ختم کرکے وہاں سے اٹھ گیا تھا پھر ایک عربوں کے مخصوص جبے میں ملبوس ایک شخص ہمارے سامنے آبیٹھا تھا۔

اس آیت میں "عہد الست" کا ذکر ہے۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"آپ میں سے بہت سے لوگوں نے اس لفظ کو شاید پہلی بار سنا ہو' لیکن آپ نہیں جانتے کہ آپ اس "عہد" سے ازلوں سے واقف تھے۔ عہد الست وہ عہد ہے جو اللہ رب العزت نے حضرت آدم کی تخلیق کے بعد ان کی پشت سے ہونے والی تمام اولاد سے لیا تھا۔ اللہ رب العزت نے تمام اولاد آدم کو اپنے سامنے پھیلایا اور ان سے پوچھا "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟" سب نے جواب دیا "کیوں نہیں' ہم آپ کے رب ہونے کی گواہی دیتے ہیں" وہ شخص بے حد سادہ

تکبر پر اثر انداز میں بولا تھا۔

"اس عہد کا ایک مطلب تو واضح ہے کہ دنیا کا ہر بچہ دین حق پر پیدا کیا جاتا ہے۔ وہ اپنی فطرت پر پیدا ہوتا ہے اور اس کی فطرت میں نیکی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ وہ خالص ہوتا ہے 'معصوم ہوتا ہے۔ اس کے بعد کی ذمہ داری اس کے والدین کی ہے وہ اسے جو مرضی بنا دیں۔ رب کی ربوبیت کا اقرار انسان کی فطرت میں ہے۔ یہ ہی عہد الست انسان کو ودیعت کیا گیا ہے۔ اللہ سبحان تعالیٰ فرماتے ہیں کہ انسان کو "حنیف" پیدا کیا گیا ہے یعنی وہ فطرتاً" پوری یکسوئی کے ساتھ اپنے رب کی طرف متوجہ ہونے والا ہے۔ لیکن شیطان اسے گمراہ کرکے دین فطرت سے ہٹا دیتا ہے۔ یہی دین فطرت عہد الست ہے۔ اسے ہی دین حق کہتے ہیں' جو ہر دور میں حق تھا ہے اور رہے گا۔ اس سے دوسری بات جو سمجھ میں آجاتی ہے وہ یہ ہے کہ ہمارا رب روز محشر اس عذر کو قبول نہیں کرے گا کہ ہم لاعلم تھے۔"

انہوں نے خاموش ہو کر ہال میں بیٹھے تمام لوگوں کو دیکھا۔ مجھے بیزاری محسوس ہوئی۔ دنیا بھر میں لوگوں نے ڈپریشن کے مسئلے کا یہی حل نکالنا شروع کر دیا تھا کہ مذہب کی طرف راغب ہو جاؤ۔ یہ بات تو مجھے پہلے سے پتا تھی۔ میں اس سیشن میں وہ باتیں سننے نہیں آیا تھا جو میں نے پہلے بھی سن رکھی تھیں۔ میں بے دلی سے ہال سے اٹھ کر باہر آگیا تھا۔

✲ ✲ ✲

"ہمیں آپ کے نقصان کا احساس ہے۔۔۔ یہ چھوٹی بات نہیں ہے زندگی کے ساتھی کا اس طرح ساتھ چھوڑ جانا بے حد تکلیف دہ ہوتا ہے۔" مسٹر ٹیرن کہہ رہے تھے۔ میں نے فقط سر ہلایا۔

"اب اس بات کو کافی وقت گزر چکا ہے اور یہ بے حد مناسب وقت ہے۔ آپ اپنے نئے پراجیکٹ پر دھیان دیجیے۔ آپ کو توجہ اور ارتکاز دوسری چیزوں کی جانب مرکوز کرنا چاہیے۔" مسٹر روز بیری بولے تھے' وہ خصوصاً" مجھ سے ملنے آئے تھے۔ میں چپ رہا تھا' میرا بولنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ 2004ء اپنے اختتام کی جانب گامزن تھا۔ ثیا کو اس دنیا سے گئے کافی مہینے ہو چکے تھے۔ میں کملا چکا تھا' میرے دل میں ثیا کی طرح خود کشی کرنے کا خیال آنے لگا تھا اور یہ چیز مجھے ڈرانے لگی تھی۔ میں ایسی موت نہیں مرنا چاہتا تھا۔

"میں یہی نہیں کرپا رہا اسی لیے تاخیر ہو رہی ہے۔۔۔ میں بس کام شروع کرنے ہی والا ہوں۔" میں نے دھیمی سی آواز میں کہا تھا۔ مسٹر ٹیرن اٹھ کر میرے ساتھ والے کاؤچ پر آگئے۔

"آپ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ ایک بار ہمارے ساتھ لوٹن چلیں۔۔۔ یہ سب چیزیں اپنی آنکھوں سے دیکھیں' خود تجزیہ کریں۔ اس سے آپ کو لکھنے میں آسانی ہوگی اور مزید مواد بھی ملے گا۔ آپ کے پڑھنے والے بے چینی سے منتظر ہیں۔" وہ میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھے کہہ رہے تھے۔ میں نے ان کا چہرہ دیکھا۔

"آپ میری بات مان کر دیکھیں۔۔۔ آپ کو ایسے ایسے شعبدہ باز دکھاؤں گا کہ آپ کے ہوش اڑ جائیں گے۔" مسٹر ٹیرن پھر بولے تھے۔

"میں کافی ریسرچ کر چکا ہوں۔۔۔ مواد کی فکر نہیں ہے دراصل میرے ساتھ ہونے والے حادثے نے مجھے ذہنی طور پر لاچار کر دیا ہے' مجھے اپنی بیوی سے بہت محبت تھی۔" میں نے گلوگیر لہجے میں کہا تھا' میں زود و رنج ہو گیا تھا۔

"ایسی صورت حال میں آپ کو ضرور ایک دفعہ لوٹن آنا چاہیے۔ آپ کو دوسروں کے دکھ سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ وہ مائیں جن کی اولادیں ان ریڈیکلز (شدت پسند) نے بگاڑ کر رکھ دی ہیں ان کی حالت آپ کو اپنے دکھ بھلا دے گی۔ آپ کا دل ان کے لیے نرم پڑنے لگے گا جو جادوگروں کے ہتھے چڑھ کر سدھ بدھ کھو چکے ہیں۔" وہ اصرار کرنے لگے تھے' میں نے استفہامیہ انداز میں ان کا چہرہ دیکھا۔

"آپ اتنا حیران کیوں ہو رہے ہیں کیا آپ نے نہیں سنا کہ مسلمان جادوگر ہوتے ہیں جو نجانے کون کون سے منتر پڑھ کر ہوش مندوں کو دیوانہ کر دیتے ہیں۔ یہ تو ان کے پرانے ہتھکنڈے ہیں۔" مسٹر ٹیرن کی آنکھوں میں نفرت تھی۔

"کیا لوٹن میں بھی ایسے لوگ ہیں۔" میں نے پوچھا تھا۔ مسٹر ٹیرن نے سر ہلایا۔ سامنے بیٹھے مسٹر فلپ اس دوران پہلی بار بولے تھے۔

"ان کو نور محمد کے بارے میں بتائیے۔" انہوں نے مسٹر ٹیرن کو کہا تھا۔

"نور محمد تو بہت ہی بڑا شعبدہ باز ہے۔۔۔ حلیے سے پاگل لگتا ہے۔ جامعہ مسجد میں موذن ہے۔۔۔ موذن پتا ہے آپ کو کسے کہتے ہیں۔۔۔؟" وہ مجھے کسی شخص کے بارے میں بتانے لگے تھے۔

"نور محمد۔" میں نے دل ہی دل میں دہرایا۔ میں نے یہ نام پہلے بھی سن رکھا تھا۔

✲ ✲ ✲

"میرے ساتھ کام کرنے میں کیا قباحت کیا ہے۔" اس نے رضوان اکرم کو کہتے سنا۔۔۔ کانفرنس کا آخری دن تھا۔ ان کے وفد میں بارہ لوگ تھے جن میں سے دس شام کی فلائٹ سے واپس جا رہے تھے۔ شہروز کی اگلے دن صبح کی فلائٹ تھی' جبکہ رضوان صاحب دو دن بعد لندن جا رہے تھے۔ انہوں نے اسے مزید ایک دن ٹھہر جانے کا کہا تھا اور اپنے ساتھ کافی پینے کے لیے بلایا تھا۔

شہروز کے مزاج پر کسل مندی سی طاری تھی۔ عمر سے بات کرنے کے بعد وہ جہاں اچھا محسوس کر رہا تھا' وہیں اس کی آخری بات نے اسے اکتاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا اگر رضوان صاحب نے نہ بلایا ہوتا تو شاید وہ سارا دن کمرے میں ہی پڑا رہتا۔ اس نے زارا کو فون کرکے اسے کافی سخت باتیں سنا تو دی تھیں مگر اب افسوس بھی ہو رہا تھا۔ اس کا مزاج کافی خراب تھا لیکن پھر بھی وہ کافی پینے آگیا تھا۔

رضوان صاحب کے ساتھ دو اور لوگ بھی براجمان تھے۔ ایک تو طاہر وارثی صاحب تھے' جو سیاست دان تھے شوقیہ کالم نگاری بھی کرتے تھے اور ایک اخبار کے ساتھ بھی وابستہ تھے۔ ان کی رضوان اکرم سے بہت دوستی تھی جبکہ دوسرا شخص سلمان حیدر تھا۔ اسے شہروز یونیورسٹی کے زمانے سے جانتا تھا' وہ ان سے کافی سینئر تھا۔۔۔ ان کے ماسٹرز کے دوران وہ ایم فل کر رہا تھا اور اسی وجہ سے شہروز اسے جانتا تھا۔ وہ تیسرے چوتھے سمسٹر میں ان کی کلاس کو کبھی کبھی ایکسٹرا لیکچر دینے کے لیے آیا کرتا تھا۔ انسان تو بے حد ذہین تھا' فری لانسنگ کرتا تھا' مگر بہت منہ پھٹ اور بے لچک انسان تھا' شہروز اور اس کے دوست اسے اہلفی کہا کرتے تھے کیونکہ اس کی خود سری کے باوجود ٹیچرز اس کی تعریف میں رطب اللسان رہتے تھے اور شہروز کے ٹولے کو اس کی وجہ یہی نظر آتی تھی کہ وہ ٹیچرز کی خوشامد کرتا تھا اور ان کے ساتھ چپکا نظر آتا تھا۔ وہ چاروں رٹز کارلٹن کے ڈائننگ ہال میں بیٹھے تھے۔

"میں مجبور ہوں۔" شہروز نے اس کے جواب کو سنا پھر خاموشی سے رضوان صاحب کا چہرہ دیکھا۔

اسے نجانے ایسا کیوں محسوس ہو رہا تھا کہ ان تینوں کے درمیان وہ مس فٹ تھا۔ اس کے دونوں قابل احترام سینئرز سلمان حیدر کو اس کی نسبت زیادہ قابل سمجھ رہے تھے' حالانکہ وہ شہروز کے مقابلے میں زیادہ شاندار شخصیت کا مالک نہیں تھا۔ شہروز نے اسے ہمیشہ عام سے حلیے اور کپڑوں میں ہی دیکھا تھا۔

"جس کام میں مجھے فائدہ نہ نظر آتا ہو۔۔۔ وہ کام مجھ سے نہیں کیا جاتا سر!" سلمان اپنے مخصوص دو ٹوک انداز میں کہہ رہا تھا۔

"تمہیں یہ غلط فہمی کیسے ہوگئی کہ تمہیں فائدہ نہیں ہوگا۔" رضوان صاحب نے بھنویں اچکائی تھیں۔

"آٹومیٹک سسٹم ہے سر۔۔۔ نقصان کے سگنلز دور سے پکڑتے ہی میرے اندر الارم بجنے لگتے ہیں۔۔۔ سلمان بیٹا محتاط ہو جاؤ کی آوازیں میرے کانوں میں سائیں سائیں کرنے لگتی ہیں۔" اس نے جوس کا گلاس ہاتھ میں پکڑا تھا اور اپنی نشست پر آرام دہ حالت میں بیٹھ گیا تھا۔

"سلمان یہ خود فریبی کی عینک اتار کر دیکھو۔۔۔ یہ چھوٹی آفر نہیں ہے۔۔۔ اپنی خوش قسمتی پر ناز کرو اور اوکے بول دو بہت بڑا پراجیکٹ ہے۔ سو پچاس لوگوں کی ٹیم تو عام سی بات ہے تم نے دیکھا ہزاروں لوگوں کا روزگار لگ گیا ہے۔" رضوان صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں کہا تھا۔

"مجھے کیا ملے گا۔" اس کی سوئی ایک انچ نہیں ہلی تھی۔ شہروز کو اکتاہٹ محسوس ہوئی۔ وہ نہیں جانتا تھا وہ کس بارے میں بات کر رہے تھے۔

"تم نے کب سے تاجروں والے سوال شروع کر دیے؟" یہ وارثی صاحب کا سوال تھا۔

"تجارت کوئی بری چیز نہیں ہے وارثی صاحب۔۔۔ میں نے تو آپ جیسے لوگوں سے ہی سیکھا ہے جو بھی سیکھا ہے۔" رضوان صاحب مسکرائے۔

"یہ طنز کر رہا ہے وارثی صاحب۔۔۔ اس دشت کی سیاحی میں یہ بھی سیاہ ہوتا جاتا ہے۔"

"ارے بخدا نہیں۔۔۔ میں سچ بول رہا ہوں میری مجال کہ طنز کروں۔ یہی حقیقت ہے جو میں نے بیان کی ہے میں تو جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے صحافی کا ٹیگ کالر پہ لگا کر گھومنا شروع ہوا ہوں۔ یہ تجارت یہ طنزیہ نفع نقصان کی باتیں تو اس دشت کی سیاحی میں پہلے قدم پر ہی سیکھ لیتا ہے انسان۔۔۔ عمر گزاریں گے تو نکھر جائیں گے جناب۔" مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر چمکتی ہی رہتی تھی۔ اس کی اس خصوصیت سے شہروز پہلے سے آگاہ تھا۔ اسے بلاوجہ اہلفی نہیں کہتے تھے وہ دوست۔

"میری بات سنو سلمان۔۔۔ تم نے جتنا نکھرنا تھا نکھر لیا۔۔۔ برٹش ایمبیسڈر نے خود تمہارا نام لیا ہے۔ انہیں تم میں کوئی اسپارک نظر آیا ہو گا تو تمہیں اس پراجیکٹ کی آفر کر رہے ہیں۔ یہ صرف پاکستان میں نہیں ہو رہا۔ دنیا بھر میں امریکی امداد تعلیم اور غربت مٹانے کے لیے فنڈنگ کرتی ہے۔ برطانوی امداد بھی تعلیم کی مد میں خرچی جائے گی۔ یو ایس ایڈ اور دوسری فارن ایڈز بھی تعلیم ہی کے ضمن میں پیسہ پانی کی طرح بہائیں گے۔ تم بھی تر جاؤ گے۔۔۔ سب کی خشکی ختم ہو گی۔ رضوان کی بات پر غور کرو۔ تم قابل بندے ہو تم کر سکتے ہو۔ تمہیں پچاس صحافیوں میں سے شارٹ لسٹ کیا گیا ہے تو کوئی بات ہی ہو گی نا۔" وارثی صاحب ہمیشہ بحث ختم کرنے کے لیے میدان میں اترتے تھے۔

"مجھے آج واقعی خود پر فخر محسوس ہو رہا ہے۔۔۔ وارثی صاحب نے میری تعریف میں ساڑھے سات جملے بولے ہیں۔ مجھے آج رات نیند نہیں آئے گی۔ حسن والے تعریف سن کر نہ جانے کیسے لمبی تان کر سو جاتے ہیں۔" اس کا انداز غیر سنجیدہ تھا۔

"دھت تیرے کی۔۔۔ یہ آدمی ہاتھ سے نکل چکا ہے رضوان! اس پر محنت مت کرو اس کے سگنلز واقعی پہلے سے ایکٹو ہو چکے ہیں۔" وارثی صاحب مزاحیہ انداز میں بولے تھے۔

"تمہیں اعتراض کیا ہے؟" رضوان صاحب نے پوچھا تھا۔ شہروز صرف خاموش بیٹھا ان کی باتیں سن رہا تھا، ان کے اشارے کنائے اس کے پلے نہیں پڑ رہے تھے۔ اسے صرف اتنا پتا تھا کہ امریکی امداد اور دوسری جتنی بھی امداد ملک میں آ رہی تھیں وہ صرف تعلیم کی مد میں خرچ ہوئی تھیں۔ ان کا چینل اس پراجیکٹ کے لیے ایک مہم چلا رہا تھا جس کی پبلسٹی پر خوب پیسہ خرچ ہو رہا تھا، لیکن یہ پراجیکٹ تو اس کے علم کے مطابق اب سے کچھ عرصہ پہلے شروع ہوا تھا۔ گزشتہ کچھ سالوں میں کئی این جی اوز صرف تعلیم عام کرنے کے نیک مقصد کے لیے رجسٹر ہوئی تھیں۔

"مجھے اس پراجیکٹ کی نیت پر اعتراض ہے۔" اس نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ وارثی صاحب نے اس کی بات کاٹ دی۔

"اس ملک میں جب بھی کسی نے کوئی تعمیری کام کرنا چاہا تو تمہارے جیسے لوگوں نے اس پر ناک ہی چڑھائی ہے۔۔۔ آئی ایس آئی تمہیں ایسی باتوں کے الگ پیسے دیتی ہے یا اسی پانچ صفر والی تنخواہ میں ہی سارا کچھ بول دیتے ہو۔"

رضوان صاحب کے چہرے پر بھی طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ سلمان کے چہرے پر بھی مسکراہٹ تھی۔

وہ آپس میں کافی بے تکلف لگتے تھے۔ شہروز کو اب کی بار پھر بے چینی سی محسوس ہوئی۔ اس سے ابھی تک کسی نے کوئی بات نہیں کی تھی۔

"جان دیو سر جی۔۔۔ آپ کو بھی سب پتا ہی ہے کون کہاں کہاں سے تنخواہ لیتا ہے۔ مجھ معصوم پر تو یہ الزام آئی ایس آئی والے بھی لگا دیتے ہیں جب میں ان کو کوئی عقل والی مت دینے کی کوشش کرتا ہوں کہ تم امریکن ایجنٹ ہو، حالانکہ میں سب کچھ ہو سکتا ہوں صرف ایجنٹ نہیں ہو سکتا۔ میں فنڈنگ پر پلنے والی مخلوق نہیں ہوں۔" وہ سفاک لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"اوہ کم آن! دنیا کے ہر ملک میں امداد آتی ہے ہر ملک شرائط کے ساتھ اس امداد کو قبول کرتا ہے۔" رضوان صاحب نے ناگواری سے کہا تھا۔

"میں آپ کی بات سے متفق ہوں لیکن پاکستان شاید واحد ملک ہے جو امداد لے کر اسے اپنی بربادی کا سامان بنا لیتا ہے۔" سلمان ابھی بھی اپنے نکتے پر ڈٹا تھا۔

"انڈیا کو بھی تو امداد دی جا رہی ہے تم دیکھو ان کی ترقی کا عالم۔۔۔" رضوان صاحب کی بات اس نے کاٹ دی تھی۔

"انڈیا کی بات مت کریں۔۔۔ وہ تعلیم کے لیے امداد نہیں لیتے۔ وہ کبھی اپنے نقصان کا سودا نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر وہ امداد لیتے ہیں انڈین کبھرو جوان اور پاکستانی خوب صورت مگر عقل سے پیدل لڑکی کی رومانٹک فلم بنا کر کشمیری اور پاکستانی رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے' اور پاکستان نے امداد لی وہ بکواس فلمیں چلانے کے لیے' ایسا ہوتا ہے کہیں کہ نیشنل ٹی وی اپنے قومی مفادات کا سودا کرے یہ اس ملک میں ہوتا ہے کیونکہ آپ ان کو تعلیم کے نام پر ایسی چیزیں پڑھانے کی باتیں کر رہے ہیں جو دو قومی نظریے کی نفی کرتے ہیں۔"

"باخدا تم بہت بحث کرتے ہو سلمان یہاں انڈیا کا کیا ذکر یہ یو ایس ایڈ کی بات ہو رہی ہے اور یہ امداد تعلیم پر خرچ ہو گی تو بربادی کیسے ہو گی۔" وارثی صاحب اکتا رہے تھے اور یہی حال شہروز کا تھا۔

"وارثی صاحب اب آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ اس بات سے لاعلم ہیں۔ یہ اچھا مذاق کیا آپ نے فنڈز آنے سے پہلے ایک مہم چلائی جاتی ہے اور ملک بھر میں یہ شور مچ جاتا ہے کہ ہمارا نظام تعلیم فرسودہ ہے اور ہماری کتابوں میں صرف دہشت گردی اور بربریت کو سکھانے والی باتیں ہیں۔ اس کے بعد ہمیں سکھایا جاتا ہے کہ یہ نصاب سعودی آغوش میں پرورش پانے والے جرنیل کی سازش تھی جو طالبان اور القاعدہ کا حامی تھا۔ اس کے بعد اس ملک میں غیر ملکی تنظیمیں آتی ہیں اور ہمیں بتاتی ہیں کہ ہمارے بچے عدم برداشت کا سبق پڑھ رہے ہیں اور ہمارے اساتذہ بچوں میں جارحیت کو بڑھا رہے ہیں۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ ہمارے اسکولز اور مدرسوں میں جنگ جو پیدا ہو رہے ہیں اس کے بعد نصاب از سر نو مرتب کیا جاتا ہے اور پھر اپنی مرضی کے نکات شامل کروا لیے جاتے ہیں۔ ایسا نصاب ترتیب دیا جاتا ہے جس میں جہاد' سود' پردہ اور دوسری اسلامی اقدار پر بات کرنا آؤٹ ڈیٹڈ قرار پاتا ہے اور زنا' شراب' رقص و سرور مذہب کی خلاف ورزی نہیں بلکہ کلچرل ویلیوز قرار پاتے ہیں۔ ہماری نسلیں یہ کتابیں پڑھیں گی اور اب جو ان نکات پر اعتراض کرے گا اس پر بنیاد پرست ملا ہونے کا الزام لگا دیا جائے گا اور ملا ہونا اس ملک میں گالی ہے۔" وہ لمحہ بھر کے لیے چپ ہوا تھا۔

"الزام' یہ الزام نہیں ہے حقیقت ہے میری جان! اس ملک میں ہر اچھے کام پر بنیاد پرست ملا چیخنے لگتے ہیں اور اگر وہ نہ چیخیں تو پھر تم جن کے درپردہ ایجنٹ ہو وہ چلانے لگتے ہیں' اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ہمارا نظام تعلیم فرسودہ ہے۔ ہمارے نصاب کو اب ٹو ڈیٹ کرنے کی ضرورت تھی۔ آخر ہم اپنی نسلوں کو کب تک پتھروں کے زمانے کی چیزیں پڑھاتے رہیں۔"

"بنیاد پرست ملائیت کوئی چیز ہی نہیں ہے سر" یہ جتنے بھی مولانا حضرات الٹی سیدھی اسلام کے نام پر غیر

اسلامی باتیں پڑھاتے یا بتاتے ہیں یہ خود فنڈنگ اور امداد لے لے کر اپنے گھر چلانے والے لوگ ہیں۔ یہ سب ایک ہی تھالی کے چٹے بٹے ہیں اور یہ دلیل بھی تو پتھروں کے زمانے کی ہے سر جو آپ دے رہے ہیں۔ مغلوں کے زمانے سے ہم جدیدیت اور اندھی ترقی کے سہانے سپنے دکھا دکھا کر لوٹے گئے ہیں۔ مغربی قومیں ایسے ہتھکنڈوں کا استعمال کرتی رہی ہیں۔ جب برصغیر کے ساحلوں پر ان کے جہاز لنگر انداز ہوئے اور انہوں نے اپنے فائدے کے اسباب پالیے تو اگلے جہازوں سے عیسائی مشنری آنے لگے۔ میٹھی میٹھی زبانوں میں عیسائیت کی کتابیں تعلیم کے نام پر پڑھائی جانے لگیں۔ ہمیں بتایا جانے لگا کہ ہم چھری کانٹے سے کھانا نا کھا کر کس قدر غلط کر رہے ہیں۔ مخلوط تقریبات کو وقت کی ضرورت اور عوامی مطالبہ قرار دیا جانے لگا۔ ہمارے آباء نے بھی یہ طعنے سنے ہیں اور ہم بھی سن رہے ہیں۔"

"یار تم تو جذباتی ہی ہوگئے ہو' اتنا دماغ ہے میرا نہ وقت کہ تم پر خرچ کروں۔ تمہیں سمجھ ہی نہیں آرہی میری بات۔ وہ اور وقت تھے جب عوام بے وقوف بن جاتی تھی اب لوگ سیانے ہوگئے ہیں۔ انہیں آگاہی کی ضرورت ہے' یہ ان کی خواہش ہے۔ ٹیکنالوجی کا دور ہے' نصاب میں تبدیلی وقت کی ہی نہیں لوگوں کی بھی ضرورت ہے۔ اب ایک کلک سے دنیا آپ کی آنکھوں کے سامنے کھلتی جاتی ہے ایسی صورت حال میں ہم کب تک انہیں وہ ہی گھسی پٹی ویلیوز پڑھاتے رہیں گے۔ سیدھا بیٹھ' چپ کرجا' پانی پی' شور نہ کر' یہ باتیں اب بچوں کو سکھانے کا وقت نہیں رہا۔ نصاب بدلنا کوئی غیر ملکی ایجنڈا نہیں ہے تم کیوں نہیں سمجھ پاتے کہ یہ واقعی عوامی مطالبہ ہے۔"

"یہ نصاب نہیں عقیدہ بدلنے کی کوششیں ہیں سر۔ قومیں عقیدوں کے سہارے ترقی کرتی ہیں اور عقیدے ختم تو ہو سکتے ہیں لیکن بدلے نہیں جاسکتے۔ آپ اپنی نسلوں کو پلنے پڑھنے کے لیے کچی مٹی پر کھڑا کردیں وہ تناور درخت بن جائیں گی۔ انہیں چٹانوں پر کھڑا کردیں وہ بیٹھے چشمے بن کر بہنے لگیں گی مگر انہیں دلدل میں مت پھینکیں۔ وہ دھنس جائیں گی۔" وہ سفاک سے انداز میں کہہ رہا تھا۔ وارثی صاحب نے اکتائے ہوئے انداز میں اسے دیکھا۔

"اچھا تم کیا چاہتے ہو پھر۔ ہم غاروں کے زمانے کی لکھی کتابیں الف انار ب بابا پڑھاتے رہیں۔ تم چاہتے ہو جب دوسری قومیں خلاؤں میں اترنے کی باتیں کریں تو ہمارے بچے پتنگ اڑانا اور ہماری بچیاں سوئی میں دھاگا ڈالنے کے طریقے سیکھتی رہیں۔" وارثی صاحب نے کہا تھا۔

"یہ ہی چاہتا ہے۔ اور المیہ یہ ہے کہ ایسے لاتعداد لوگ اس ملک میں موجود ہیں' جو کنویں کے مینڈک ہیں اور جنہیں ترقی کی باتیں سن کر کھجلی ہوتی ہے۔ بندہ خدا تم زمانے کا چلن تو دیکھو۔ دنیا کہاں سے کہاں چلی گئی' یہ اکیسویں صدی ہے۔ اقوام عالم کی ترقی کا معیار دیکھو اور اپنے دا ویلے دیکھو۔" وہ چبا کر بولے تھے۔

"ترقی" کرنے کا ہے ترقی۔ مجھے بتائیں تو سہی ترقی آخر کہتے کسے ہیں۔ مصنوعی بادلوں سے بارش برسانے کا نام ترقی ہے یا لیبارٹری کے بیکر میں جانور نما انسان پیدا کرنا ترقی کہلاتا ہے۔ کون سی قوم نے ترقی کی ہے مجھے بھی تو پتا چلے کہ اقوام عالم نے کون سا ایسا کام کرلیا جو پاکستانی نہیں کرپائے۔ آپ چائنا کی ترقی کی بات کررہے ہیں؟ مجھے بتائیں کیا ترقی کی ہے اس قوم نے۔ کتے بلی تک تو چھوڑتے نہیں ہیں سنڈیاں مینڈک کاکروچ سب کھا جاتے ہیں جو چوبیس میں سے بائیس گھنٹے صرف اس لیے کام کرتے ہیں کہ یہ کام ان سے جبرا" لیا جارہا ہوتا ہے۔ امریکہ نے ترقی کی ہے جہاں ہر تیسرا انسان اپنے باپ کے اصل نام کو جاننے کے لیے ڈی این اے ٹیسٹ کا سہارا لینے پر مجبور ہوتا ہے جہاں جانور کو ٹارچر کرنے کی سزا عورت کو ٹارچر کرنے کی سزا سے زیادہ ہے۔ یا پھر برطانیہ اور یورپ نے ترقی کی ہے جہاں ماں باپ اٹھارہ سال کے بعد بچوں کی شکل دیکھنے لگتے ہیں کہ یہ کب ہمارے گھروں سے دفعان ہوں گے اور اولادیں ماں باپ کو ریٹائر ہوتے ہی اولڈ ہاؤسز میں چھوڑ آتی ہیں۔ جہاں بچوں کو اڈاپشن کے لیے گورنمنٹ کے حوالے کردیا جاتا ہے۔"

وہ سابقہ انداز میں بول رہا تھا۔ شہروز نے محسوس کیا کہ اس کے دونوں سینئرز کو سلمان کی باتوں میں زیادہ دلچسپی نہیں تھی اسے کمینی سی خوشی ہوئی اگرچہ اسے سلمان کی دو ایک دلیلوں میں دم لگا تھا۔

"یہ سب بے کار کی باتیں ہیں سلمان۔ تم موضوع سے ہٹ رہے ہو۔" رضوان صاحب نے کہا تھا۔

"نہیں سر یہ بے کار کی نہیں۔ ایک قلم کار کی باتیں ہیں۔ یہ وہ باتیں ہیں جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں۔ یہ وہ باتیں ہیں جو یہاں نہ ٹی وی پر دکھائی جاتی ہیں نہ اخبارات میں چھپوائی جاتی ہیں۔ ایک ملک معاشی طور پر خوشحال ہو' لیکن وہاں ویلیوز نہ ہوں تو آپ اسے ترقی کرنا کہتے ہیں تو پھر میری طرف سے ایسی ترقی کو سات سلام۔"

"بہت خوب تو پھر تم بتادو ترقی کس نے کی ہے؟؟" وارثی صاحب بولے۔

"یہ اب اسلامی جمہوریہ پاکستان کا نام لے گا۔ جو دنیا بھر میں دہشت گرد بنانے والی فیکٹری کے طور پر بہت ترقی کرچکا ہے۔" رضوان اکرم نے استہزائیہ انداز میں کہا تھا۔

"بے شک میں پاکستان کا نام لوں گا۔ یہاں ہی ہوئی ہے ترقی۔ آپ پاکستان بننے کے بعد سے لے کر اب تک ذرا جائزہ لیں۔ ہم کہاں کمزور پڑے۔ ہم نے اپنے محدود ترین وسائل میں کیا نہیں کرکے دکھایا۔ ہم نے فیکٹریاں لگائیں' ہم نے اسپورٹس گڈز بنائیں۔ ہم نے سرجیکل گڈز بنائیں۔ ہم نے لیدر گڈز بنائیں۔ ہماری پاس بہترین میزائل سسٹم' ہمارے پاس اٹامک پاور۔ کیا کیا نہیں ہے اس ملک کے پاس' لیکن یہ وہ باتیں ہیں جو کبھی ہائی لائٹ نہیں کی جاتیں۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ ہماری مختاراں مائی دکھلاتے ہیں' ہماری عافیہ صدیقی نہیں دکھاتے۔ معاشی طور پر کمزور ملک ہونا کوئی برائی تو نہیں ہے' برائی یہ ہے کہ آپ اخلاقی طور پر کمزور ترین اقدار رکھتے ہوں۔ ہم اخلاقی طور پر قطعا" کمزور نہیں تھے۔ ہمیں اخلاقی طور پر تباہ کیا گیا ہے اور مسلسل کیا جارہا ہے اور یہ اس ملک میں تب سے ہونا شروع ہوا جب ہم نے اپنی اولادوں کی تربیت کی ذمہ داری غیروں کے سپرد کردی۔ ہم نے اپنی پالیسز ڈالر اور پاؤنڈز لے کر بنانا شروع کیں۔ ہم نے اپنے بچوں کو سکھایا کہ تمیز سے بولنا ضروری نہیں ہے' انگریزی بولنا ضروری ہے۔ آپ کے اندر خوب صورتی نہ ہو تو کوئی بات نہیں' لیکن آپ کا رنگ گورا ہونا چاہیے۔ لڑکوں کو سکھایا کہ مضبوط ہونا اہم نہیں' اہم یہ ہے کہ موبائل پر ستر لڑکیوں سے دوستی ہو' جن سے رات رات بھر عقل کی باتیں سیکھی اور سکھائی جاسکیں۔ ٹیکنالوجی کو سستا کردیا۔ ٹی وی کو نام نہاد کلچر آئی کون بنا کر مشرف بہ اسلام کردیا۔ دو قومی نظریے کا تیا پانچہ کردیا۔ وہ اقدار جن پر کسی بھی صحت مند معاشرے کا ڈھانچہ کھڑا ہو سکتا ہے وہ ہم نے اپنے ہاتھوں ختم کردیں۔ تباہی یہ نہیں ہوتی سر کہ ایک ملک میں مشہور و معروف برگر اور ڈونٹس کی آؤٹ لیٹس نہیں ہیں' تباہی یہ ہوتی ہے کہ آدھا ملک یہ سب کھا کر سکون سے سو سکتا ہے اور باقی آدھا ملک بھوک سے بلکتے بچوں کو سوکھی روٹی پانی سے نرم کرکے کھلانے پر مجبور ہوتا ہے۔ سوکھی روٹی کھا کھا کر پلنے والا کب تک تر نوالہ کھانے والے کو خوشی سے دیکھتا رہے گا۔ ہم نے اپنی نسل کو چھوٹے چھوٹے پریشر ککر بنا کر رکھ دیا۔" وہ کافی جذباتی ہوچکا تھا۔

"او بھائی او بھائی۔ اوہ میرے بھائی! یہ میرے ہاتھ دیکھ تیرے آگے جوڑتا ہوں' یہ کسی فوڈ چین کا یا ٹیکنالوجی ریفارمز کی ایڈ نہیں ہے۔ یہ سراسر تعلیمی گرانٹ ہے جس کا مقصد تعلیم اور فلاح و بہبود ہے۔ یہ یہاں پر جدید طرز کے اسکولز بنائیں گے۔ سلمان حیدر تمہیں بھی عادت ہی پڑگئی ہے نارووال جانے والی ٹرین کو چک جھمرہ لے جاتے ہو۔ ہر بات پر اعتراض

کرنے لگتے ہوئے اسکولز کھلیں گے، علم و ہنر بڑھے گا تو آگہی بڑھے گی۔ یہ ترقی کا زینہ ہے۔ تمہاری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی ہر بات پر اعتراض کرنے لگتے ہو۔" طاہر وارثی صاحب نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

"میں آپ کو سچ بتاؤں تو واقعی مجھے ہر بات پر اعتراض ہے۔ آپ کو پتا ہے میں تعلیم کے خلاف ہوں۔ میں ہر اس کمپین کے خلاف ہوں جو تعلیم کے فروغ کے لیے چلائی جاتی ہے۔" شہروز کو پہلی بار سلمان کا اطمینان مصنوعی لگا۔

"تعلیم کوئی چیز نہیں ہے۔ اصل چیز علم ہے اور علم حاصل کرنے کے لیے مہنگے اسکولز کھول کر کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں آپ سب لوگ۔ غریب کو پڑھنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ وہ بس اونچے اونچے گھروں میں پوچا لگانے والی مخلوق ہے۔ وہ آپ کے بچوں کے جوتے سیدھے کرنے کے لیے اس دنیا میں بھیجے گئے ہیں۔ یہ ایڈز جو اس ملک میں اس کی ابتدا سے آ رہی ہیں ان سب کا مقصد صرف ہماری محرومیوں کو بڑھانے کے سوا کچھ نہیں رہا۔ آپ اگر اس تعلیم کے داعی ہیں تو معذرت کے ساتھ اس ملک کو ایسی تعلیم نے غربت کے سوا کچھ نہیں دیا ہے۔ اس فنڈ کے آنے کے بعد یہ عجیب تماشا شروع ہوا اس ملک میں۔ ایک کے بعد ایک نئے سے نیا اسکول کھلنا شروع ہو گیا۔ اتنی محنت اور روپیہ پرانے اسکولز کی حالت سدھارنے پر خرچ کیا جاتا تو حیرت انگیز نتائج نکلتے لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ جیسے زمین میں خزانے کا پتا تو ہے مگر چوروں سے بچنے کے لیے اس پر کثیر منزلہ عمارت تعمیر کرلی جائے۔ یہ پرانے اسکول کسی خزانے سے بڑھ کر تھے، ہیں اور رہیں گے اور میں یہ ثابت کر کے رہوں گا۔ میں فطرتاً" مزدور بندہ ہوں، لیکن میں دلدل پر گھر پھر بھی نہیں بنا سکتا۔ کوئی بھی نہیں بنا سکتا سر۔" وہ خاموش ہو گیا تھا لیکن ایسا لگتا تھا اس کے پاس بولنے کے لیے ابھی بھی کافی کچھ ہے، مگر رضوان صاحب نے گہری سانس بھر کر ہار مان لی۔

"اچھا ٹھیک ہے تمہاری مرضی۔ میں تمہاری ستر فیصد باتوں سے اختلاف کرتا ہوں مگر اس وقت میرے پاس بحث کرنے کا وقت نہیں ہے۔ میں نے ہار مان لی۔" وہ بولے تھے، سلمان کے چہرے پر مسکراہٹ ابھری۔

"آپ میرے بزرگ ہیں، میرے استاد ہیں۔ میں نے آپ سب لوگوں سے ہی سیکھا ہے سر۔ آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔ آپ یوں سمجھ لیں کہ بس آپ فیصل آباد کی بس میں بیٹھے ہیں اور مجھے ساہیوال جانا تھا مجھے بس بدلنی ہی تھی۔" وہ ابھی بھی مسکرا رہا تھا۔ وارثی صاحب کے چہرے پر کھلتی ہوئی مسکراہٹ چمکی، لیکن رضوان صاحب کا انداز ابھی بھی ہار ماننے والا تھا۔ سلمان حیدر نے کافی کا کپ ختم کیا تھا، اور اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ تینوں وہیں بیٹھے رہے تھے۔

"اچھا بندہ تھا ویسے۔ کام کرنے والا۔ مگر اس کی مرضی۔" وارثی صاحب نے اس کے جانے کے بعد کہا تھا۔

"جب پی ہوئی ہوتی ہے تو کچھ زیادہ ہی اچھا ہو جاتا ہے۔ نشہ اترے گا تو روتا ہوا واپس آجائے گا۔" رضوان صاحب نے ناک چڑھا کر کہا تھا۔ شہروز نے تاسف سے بلاوجہ اس سمت دیکھا جس سمت میں وہ اٹھ کر گیا تھا۔

"یہ شہروز ہے، اس سے ملے ہیں آپ۔ بہت کام کا بچہ ہے۔ میرا دعوا ہے۔ آپ یاد رکھیے گا۔ آنے والے وقتوں میں یہ ہم سب کو پیچھے چھوڑ دے گا۔" رضوان صاحب نے یکدم اس کی جانب دیکھ کر کہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر جھینپی سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ مزاج پر چھائی ہوئی صبح کی ساری بیزاری غائب ہونے لگی تھی۔



"کم آن۔ ہری اپ امائمہ!" اس نے اکتا کر دوبارہ سے کال بیل پر ہاتھ رکھا تھا۔ وہ کافی دیر سے بیل بجا کر دروازہ کھلنے کا انتظار کر رہا تھا لیکن امائمہ دروازہ کھولنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ اس نے تھک ہار کر ڈپلی کیٹ چابی نکالنے کے لیے لیپ ٹاپ کا بیگ کھولا تھا۔ اس کی دو کلائنٹس کے ساتھ میٹنگ تھی۔ ان کے ساتھ بحث کر کر کے اس کے دماغ کا اچھا خاصا فالودہ بن گیا تھا۔ سر میں درد ہونے لگا تھا، اسی لیے وہ روٹین سے ذرا پہلے واپس آگیا تھا۔

"کہاں ہو یار۔ دیکھوں ذرا، صبح جیسی چھوڑ گیا تھا۔ ویسی ہی ہو یا اب اور خوب صورت ہو گئی ہو۔" وہ اندر داخل ہوتے ہوئے ذرا اونچی آواز میں بولا تھا تاکہ امائمہ اگر اوپر بیڈ روم میں ہے تو سن کر نیچے آجائے۔ اس نے لیپ ٹاپ کاؤچ کے سامنے رکھی تپائی پر رکھا تھا پھر فریج سے پانی کی بوتل نکالنے لگا تھا۔ گھر میں سناٹا ہی تھا۔ باتھ روم سے بھی پانی کی آواز نہیں آرہی تھی۔

"کیا زیادہ خوبصورت ہو گئی ہو۔ اللہ۔ میرے نصیب۔" وہ اسے چڑانے کے لیے جملے بولتے رہتا تھا۔ امائمہ کا جوابی جملہ پھر بھی سنائی نہیں دیا تھا۔ وہ پرسوچ انداز میں آگے بڑھا تھا۔ گھر میں بے ترتیبی کا احساس ہر چیز پر حاوی تھا۔

"خوب صورت ہو گئی ہو تو نخرے بھی ہو گئے ہیں۔ ملکہ عالیہ! نیچے آجائیے۔" وہ پھر چلایا تھا لیکن اس بار بھی کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ اس نے لمحہ بھر سوچا تھا پھر وہ کسی اور نتیجے پر پہنچا تھا۔

"امائمہ کی بچی! یہ سونے کا وقت ہے کیا؟" اس نے گہری سانس بھر کر چلا کر کہا پھر پانی کی بوتل واپس اس کی جگہ پر رکھ کر سیڑھیوں کی طرف بڑھا تھا لیکن اوپر پہنچ کر اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ امائمہ گھر میں نہیں ہے، اس کا موڈ یکدم آف ہونے لگا۔ امائمہ غائب تھی اور گھر کی سب لائٹس جل رہی تھیں۔

"اس لڑکی کو کتنی بار سمجھایا ہے کہ ایسی حماقتیں نہ کیا کرے۔" اس نے غیر ضروری روشنیاں گل کرتے ہوئے سوچا تھا پھر وہ اکتا کر بستر پر گر گیا۔

اس نے تنقیدی نگاہ سے کمرے کا جائزہ لیا تھا۔ ہر چیز بکھری ہوئی تھی حتیٰ کہ بیڈ پر پڑا کمبل بھی تہ کر کے اس کی جگہ پر نہیں رکھا گیا تھا۔ اس کو سلیقے سے رکھنے کی شاید ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی تھی۔ ہر چیز بے ترتیب ہو رہی تھی۔ اس کا موڈ مزید خراب ہونے لگا۔ امائمہ کی توجہ گھر سے بالکل ہٹتی جا رہی تھی۔ وہ پہلے کی طرح گھر کی صفائی ستھرائی پر بالکل دھیان نہیں دیتی تھی بلکہ کئی کئی دن ویکیوم کلینرز کو بھی ہاتھ میں لگاتی تھی۔ جھاڑ پونچھ کرنا تو جیسے اسے بھول ہی گیا تھا حالانکہ یہی کام پہلے وہ اتنی دل جمعی سے کرتی تھی کہ عمر کو اسے ٹوکنا پڑتا تھا کہ یہاں اتنی گرد نہیں ہوتی اس لیے اتنی محنت مت کرو جبکہ امائمہ صفائی ستھرائی سے فراغت کے بعد بھی ہاتھوں سے نادیدہ گرد صاف کرتی نظر آتی تھی اور اب عمر کو ٹوکنا پڑتا تھا۔ کچرا جمع ہو رہا ہے، ڈسٹنگ نہیں ہوئی، عمر جس دن ٹوک دیتا اس روز امائمہ کچھ صفائی ستھرائی کر لیتی تھی ورنہ کئی کئی دن ایسے ہی گزر جاتے تھے۔

عمر کو یہ سب باتیں شاید اتنی ناگوار گزرتیں نہ ہی محسوس ہوتیں اگر اس نے امائمہ کو یہی سب بہت محنت اور دھیان سے کرتے نہ دیکھا ہوتا۔ وہ بہت سلیقہ مند تھی اور ایسی بے ترتیبی اس کی طبیعت کا حصہ نہیں تھی تو پھر اب ایسا کیا ہو گیا تھا یہ وہ سوال تھا جس کا جواب اسے نہیں مل رہا تھا۔ وہ کچن کے کاموں سے بھی جان بچاتی نظر آتی جبکہ یہی کام پہلے اس کو بہت پسند تھے۔

وہ اس سے اس کی پسند پوچھ پوچھ کر کھانے بنایا کرتی تھی اور اب ہفتہ ہو چلا تھا، وہ اس سے کہہ رہا تھا کہ کالے چنوں کا گاڑھے گاڑھے شوربے والا سالن بنا کر کھلاؤ تو وہ بھول جاتی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اب وہ کھانا پکانے سے بھی چڑنے لگی تھی۔ وہ اکثر کھانا بناتی ہی نہیں تھی یا پھر بناتی بھی تو ایسی چیزیں جو جھٹ پٹ تیار ہو جاتی تھیں کھانے کی میز پر اب زیادہ تر ابلے سادہ نوڈلز، تلے ہوئے مرغی یا مچھلی کے قتلے اور فرائز موجود ہوتیں۔

وہ جب لندن آئی تھی تو عمر کو ٹوکتی تھی کہ ریڈی ٹو کک چیزوں سے پرہیز کیا کرو اور اب وہ گروسری خود کرنے جاتی تھی تو فریزر ایسی ہی چیزوں سے بھرا رہنے

لگا تھا۔

اس کے علاوہ اس کا زیادہ تر وقت گھر سے باہر گزرنے لگا تھا۔ پہلے جب وہ گھر سے باہر جاتے تھے تو عمر اس کو تلقین کرتا تھا کہ راستوں کو سمجھنے کی کوشش کیا کرو وہ توجہ نہ دیتی اور اب وہ اتنا باہر جانے لگی تھی کہ گھر پلیٹ ہو کر رہ گیا تھا۔ عمر اس پہلو کو نظر انداز کرتا چلا آرہا تھا۔ اس نے جس ماحول میں پرورش پائی تھی وہاں کسی کی غیر موجودگی کو انا کا مسئلہ بنانا شخصی آزادی کی خلاف ورزی تصور کیا جاتا تھا لیکن وہ بھی کیا کرتا۔ اب یہ اکثر ہونے لگا تھا۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ لائمہ اپنے والدین کی کمی محسوس کرتی تھی اور وہ اعتراف کر بھی چکی تھی۔ اسی لیے عمر نے شہروز سے بات بھی کی تھی تاکہ پاکستان جانے کا کوئی منصوبہ بنا سکے لیکن یہ سب کچھ راتوں رات تو نہیں ہونے والا تھا مگر لائمہ کچھ سمجھتی ہی نہیں تھی۔

اس نے اگر ایسا رویہ شروع میں اپنایا ہوتا تو عجیب نہ لگتا لیکن اب اتنے مہینے گزر جانے کے بعد وہ یکدم ایسی ہو گئی تھی۔ وہ نا صرف لاپروا اور غیر ذمہ دار ہوتی جا رہی تھی بلکہ زود رنج بھی ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں منٹ سے پہلے آنسو آجاتے تھے اور استفسار پر صرف یہی کہتی تھی کہ امی کی یاد آرہی ہے۔ وہ اس کا دل بہلانے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ اس کی خاطر پاکستان بھی جا رہا تھا لیکن کیا یہ مسئلے کا حل تھا۔ اسے محسوس ہوتا تھا لائمہ کو جو مسئلہ درپیش ہے، وہ اسے چھپا رہی ہے اور اسے یہ بات اچھی نہیں لگتی تھی لیکن وہ اس سے خفا نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اس کی وجہ سے پریشان رہنے لگا تھا کیونکہ اسے اس کی فکر تھی۔ وہ اس سے محبت کرتا تھا۔ اس کی پرواہ کرتا تھا۔ اسی لیے وہ خود کو سمجھاتا تھا کہ یہ فطری سی بات ہے لائمہ اپنے والدین کے لیے اداس ہے، اسی لیے لاپرواہ ہوتی جاتی ہے۔ وہ بھی تو تین مہینے کے لیے پاکستان جاتا تھا تو اپنے گھر والوں بالخصوص ممی کے لیے اداس ہو جایا کرتا تھا پھر لائمہ کو تو ایک سال ہونے والا تھا اسی لیے اس کا جی گھر سے اچاٹ ہوتا جا رہا ہے۔ یہی سوچ کر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے اپنے موزے پاؤں سے اتارنے شروع کیے تھے۔

وہ بیڈ پر جس رخ سے لیٹا تھا وہاں سے سامنے والی دیوار پر لگی لائمہ کی بڑی سی تصویر بالکل واضح نظر آتی تھی۔ یہ تصویر بہت پرانی تھی اور عمر نے لائمہ کے آنے سے بھی پہلے یہ تصویر ان لارج کروا کر سنبھال کر رکھی ہوئی تھی۔ وہ اس تصویر میں نظر آنے والے چہرے کا اسیر تھا۔

"اس نے لائمہ کو پہلی بار کب دیکھا تھا؟" یہ وہ سوال تھا جس کا جواب اس نے شہروز کو بھی کبھی طریقے سے نہیں دیا تھا۔ اس کے استفسار پر وہ ہمیشہ مذاق میں کہتا تھا کہ اس نے لائمہ کو خواب میں دیکھا تھا۔ جس پر شہروز اس کا خوب ریکارڈ لگاتا تھا لیکن عمر کو لگتا تھا کہ سچ ہے۔ وہ ہمیشہ سے لائمہ جیسی لڑکی کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ اسے خوب صورتی متاثر کرتی تھی لیکن لائمہ میں صرف خوب صورتی نہیں تھی جس نے عمر کو ٹھٹھک کر رک جانے پر مجبور کیا تھا۔ لائمہ سے پہلے اس کی زندگی میں دو لڑکیاں آئی تھیں جن کے ساتھ اس کا ٹھیک ٹھاک افیئر چلا تھا اور وہ دونوں بھی کافی خوب صورت تھیں، لیکن ان دونوں نے اسے ایک سبق سکھایا تھا اور وہ یہ کہ عورت کے لیے صرف خوب صورت ہونا کافی نہیں ہوتا۔ یہ کچھ اور چیز ہے جو مرد کو عورت کا اسیر بنا دیتی ہے اور یہ چیز اسے لائمہ میں نظر آئی تھی۔

یہ کچھ سال پہلے کی بات تھی جب وہ گریجویشن کے بعد پاکستان گیا تھا۔ پاکستان جا کر وہ ہمیشہ خوش ہوتا تھا، وہاں چاہنے والے رشتہ دار تھے اور وہاں شہروز تھا جس سے اس کی خوب جمتی تھی اور شہروز کے دوستوں کا بھی وہ دوست تھا، وہ سب اسے شاہی پروٹوکول دیتے تھے جس کی بنا پر وہ کبھی بور نہیں ہوتا تھا، لیکن اس سال شہروز کے ایگزامز تھے۔ وہ اور اس کے سب دوست مصروف تھے تو اس کا زیادہ وقت پھپھو کے گھر زارا کے ساتھ گزرتا تھا۔ وہاں ہی اس نے ایک دن زارا کے لیپ ٹاپ پر اسی کی لگائی ہوئی ایک سی ڈی پر

لائمہ کو دیکھا تھا۔ وہ کالج کے کسی پروگرام کی ریکارڈنگ تھی جس میں رومیو جولیٹ پیش کیا گیا تھا۔ جولیٹ کا کردار تھا جس نے اسے مبہوت کر دیا تھا۔ وہ لڑکی جو بھی تھی، بے پناہ خوب صورت تھی۔ اس کا لمبا سفید گھیردار فراک، اس کے شہد رنگ گھنگھریالے لمبے بال اور اس کے سر پر ٹکا ننھا تاج۔ ہر چیز اس کی خوب صورتی کو بڑھا رہی تھی، لیکن ایک چیز جس نے عمر کو پلکیں جھپکنے پر مجبور کر دیا تھا، وہ تھا اس کی شخصیت کا وقار، اس کے وجود سے چھلکتی تمکنت اور اس کی آنکھوں میں چھپا اپنے کچھ ہونے کا احساس۔ وہ بول رہی تھی تو اس زعم کے ساتھ کہ دنیا صرف اس کو سنے گی۔ وہ چلتی تو اس فخر کے ساتھ کہ زمانہ ساتھ چلے گا اور وہ پلکیں جھپکتی تو اس اعتماد کے ساتھ کہ روشنی اس کی آنکھوں کی محتاج ہے۔

عمر نے بہت بار اس ریکارڈنگ کو دیکھا۔ اسے لگتا تھا لائمہ جولیٹ نہیں ہے بلکہ کوئی ملکہ ہے یا جادوگرنی جو لوگوں کو پتھر کا بنا سکتی ہے۔ ان دنوں اس کی زارا کے ساتھ اتنی زیادہ دوستی نہیں تھی۔ وہ اس سے بات کرنا چاہتا تھا، لیکن یہ سوچ کر نہ کر سکا کہ وہ مذاق نہ اڑائے پھر ان کی دادو کا اچانک انتقال ہو گیا تو ان کے دکھ میں وہ سب بھول بھال گیا، لیکن واپسی میں غیر ارادی طور پر وہ سی ڈی بھی اس کے سامان میں آگئی کیونکہ اس نے وہ زارا کو واپس ہی نہیں کی تھی۔ بعد میں بھی وہ کبھی کبھار وہ ریکارڈنگ دیکھا کرتا تھا، لیکن اس میں محبت جیسے کسی جذبے کا عمل دخل نہیں تھا۔ بس وہ لڑکی اسے اچھی لگتی تھی اور پھر تین ساڑھے تین سال بعد اس نے اسی لڑکی کو شہروز کی کلاس فیلو کے روپ میں دیکھا۔

سردیوں کے دن تھے اس نے لانگ کوٹ پہن رکھا تھا۔ سر پر گلابی اسکارف، آنکھوں پر سن گلاسز، کندھے پر لٹکا بیگ اور ہاتھ میں پکڑی کتابیں... ایسا کیا تھا جس کے قیمتی ہونے کا احساس اس لڑکی کی شخصیت میں وہ زعم پیدا کرتا تھا کہ اس کے وجود سے روشنیاں پھوٹتی محسوس ہوتی تھیں، یہی وہ روشنیاں تھیں جس کی بدولت عمر نے اسے فوراً" پہچان لیا تھا اور تب اس نے جانا تھا کہ عورت صرف خوب صورت ہو، یہ کافی نہیں ہوتا۔ اسے پروقار ہونا چاہیے۔ اپنے وجود پر نازاں ہونا چاہیے اور اپنی شخصیت پر فخر ہونا چاہیے تب ہی وہ مکمل عورت بنتی ہے۔

اس نے تب ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس سے شادی کرے گا۔ وہ تب بھی اس سے محبت نہیں کرتا تھا۔ وہ اسے اپنے لیے مناسب لگی تھی۔ مناسب ترین۔ ایک اچھی لڑکی۔ سوائے جو چیز اچھی لگ جاتی تھی، وہ اس کے حصول کے لیے آخری حد تک جاتا تھا اور تب اسے اس بات کی پروا نہیں رہتی تھی کہ کوئی اسے جذباتی یا جلد باز کہے گا۔ لائمہ کے سلسلے میں بھی اس نے یہی کیا تھا۔ اس کو پا کر وہ خوش تھا۔ مطمئن تھا۔ ان کے رشتے میں کچھ مسائل آئے بھی تو خزاں رسیدہ پتوں کی طرح جھڑ جھڑ کر گرتے رہے۔ وقت نے ان کو بے حد قریب کر دیا تھا اور تب عمر اس کی محبت میں گرفتار ہوتا چلا گیا تھا۔ آہستہ آہستہ زندگی میں استحکام آگیا تھا اور لائمہ بھی اس کے ساتھ خوش تھی، لیکن گزشتہ چند ہفتوں میں جو صورت حال ہو چکی تھی وہ عمر کو مضطرب کر رہی تھی۔ وہ اسی سوچ میں گم تھا کہ اسے دروازہ کھلنے کی آواز آئی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

"ممی! آپ کو ایک بار بھائی سے بات کرنی چاہیے۔" عمر آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تھا کہ عمیر کے بولنے کی آواز باہر کوریڈور تک سنائی دی۔ اس کے پاس ہمیشہ ہی گھر کی ڈپلی کیٹ کی چابی ہوا کرتی تھی۔ اپنے گھر شفٹ ہو جانے کے بعد بھی اس نے اس گھر میں داخل ہونے کے لیے ہمیشہ اپنی ہی چابی استعمال کی تھی۔ وہ ڈور بیل بجا کر کبھی بھی اندر نہیں آتا تھا مگر آج وہ کچھ پزل سا ہو گیا تھا شاید ایسا نہ ہوتا اگر وہ ممی کا اگلا جملہ نہ سن لیتا۔

"تم تھوڑی دیر کے لیے خاموش نہیں رہ سکتے۔ تمہیں پتا ہے نا، وہ آنے والا ہے۔ میں ابھی اس سے بات نہیں کرنا چاہتی۔"

ممی کی آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کافی اکتائی ہوئی ہیں۔ عمر تذبذب میں گھر کر سوچنے لگا کہ آیا وہ قدم چل

کر اندر داخل ہو جائے یا دو قدم پیچھے ہٹ کر باہر نکل جائے۔ اسے آج سے پہلے کبھی ایسی صورت حال کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ ممی ہمیشہ سے اس کی سہیلی رہی تھیں۔ ممی نے کبھی اس سے کوئی بات مخفی نہیں رکھی تھی۔ اس طرح اسے کوئی بھی بات پتا چلتی تھی تو بتانے کے لیے سب سے پہلے ممی کی ذات ہی تلاش کرتا تھا۔ وہ ابھی بھی بہت پرجوش اور خوشگوار انداز میں آیا تھا' لیکن ممی اور عمیر کی باتیں سن کر وہ خوشگواریت بھی زائل ہونے لگی تھی۔

"ممی! آپ سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں۔۔۔ یہ کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔" عمیر کا انداز جارحانہ تھا۔ وہ ہمیشہ ہی اپنی بات میں ناکام ہو جانے پر اس طرح کا انداز اپنا لیتا تھا اور تب عمر کو اس میں اپنی جھلک محسوس ہوتی تھی۔

"اب ختم بھی کرو عمیر۔۔۔! میں پہلے ہی بے زار بیٹھی ہوں۔" ممی کی آواز میں اب خفگی بھی تھی۔ ان کی آواز اب زیادہ واضح سنائی دے رہی تھی شاید وہ کچن میں آگئی تھیں جو داخلی دروازے کے قریب تھا۔ عمر کا حوصلہ بس اتنا ہی تھا' ممی کے اس طرح کہنے پر وہ ہمیشہ کی طرح جذباتی ہو کر آگے بڑھا تھا۔

"ممی! کیا پرابلم ہے؟" اس نے کچن میں داخل ہوتے ہی پہلا سوال یہ کیا تھا۔ وہ دونوں چونکے تھے پھر عمیر تو دوبارہ سے نارمل ہو کر اپنے ہاتھ میں پکڑے پیالہ میں چمچ چلانے لگا جبکہ ممی کے چہرے پر پریشانی اور اکتاہٹ کے آثار واضح تھے۔ وہ چند ثانیے عمر کی شکل دیکھتی رہیں پھر بمشکل خود کو نارمل کرتے ہوئے بولی تھیں۔

"اچھے ٹائم پر آگئے ہو۔۔۔ میں سمجھی تھی شاید دیر سے آؤ گے۔۔۔ بیٹھو۔۔۔ لنچ کر کے آئے ہو؟ میں نے ماش کی دال کے دہی بڑے بنائے ہیں۔ تمہارے لیے پلیٹ بنا دوں املی پودینے کی چٹنی کے ساتھ۔۔۔ بہت اچھے بنے ہیں۔ تمہارے ابو کافی تعریف کر رہے تھے۔"

عمر نے چہرے کا انتہائی برا زاویہ بنایا۔ وہ کوئی چھوٹا بچہ تو نہیں تھا کہ اسے ایسے ٹالنے کی کوشش کی جاتی۔ اس نے عمیر کی جانب دیکھا جو ان دونوں کی جانب ہی دیکھ رہا تھا' لیکن اس کے دیکھنے پر فوراً" نظریں ہٹا کر پھر سے کارن فلیکس کھانے لگا۔ عمر نے کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے رکھی تھی۔

"تم بتاؤ گے یا تمہارے پاس بھی املی پودینے کی چٹنی والے ماش کی دال کے دہی بڑے ہی ہیں۔" اسے غصہ آنے لگا تھا اور اس سے غصہ چھپایا بھی نہیں جاتا تھا۔

"ممی۔۔۔ بتا دوں؟" عمیر نے ممی کی جانب دیکھ کر پوچھا تھا۔ عمر کو مزید غصہ آگیا۔

"اوکے۔۔۔ ایز یو وش۔۔۔ کھائیں آپ لوگ ماش کی دال کے دہی بڑے۔۔۔ چٹنیاں ڈال ڈال کر۔۔۔ میں چلا جاتا ہوں۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور ممی جانتی تھیں کہ وہ اسی طرح ناراض ہو کر چلا بھی جائے گا۔ انہوں نے گہری سانس بھری پھر ہاتھ میں پکڑی صافی سلیب پر رکھ کر اس کی جانب آگئی تھیں۔

"تم جاؤ یہاں سے۔" انہوں نے عمیر کو اشارہ کیا تھا۔

"میں تو کچھ بھی نہیں کہہ رہا۔۔۔ ٹی وی دیکھ رہا ہوں۔۔۔ آپ لوگ کریں بات۔" عمیر تڑپ کر بولا تھا۔ اسے گھر میں کوئی بھی بڑا سمجھنے کو تیار نہیں ہوتا تھا۔

"عمیر۔۔۔" ممی نے گھرک کر کہا تھا۔

"مجھ سے رکھ لیں سارے سیکریٹ بلکہ ایسا کریں مجھے بوتل میں ڈال کر ڈھکن لگا دیں اور فریج میں رکھ دیں۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے اٹھ کر سیڑھیوں کی جانب چل دیا تھا۔

"بیٹھو۔" ممی نے عمیر کے جانے کے بعد اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اپنے دونوں بیٹوں کو منہ سے ایک بھی لفظ کہے بغیر وہ جتا چکی تھیں کہ ان کا مزاج برہم ہو چکا ہے۔

"ہر بات میں عجلت کا مظاہرہ کرنا چھوڑ دو عمر۔ اب تم چھوٹے بچے نہیں ہو' بڑے ہو گئے ہو۔ میں جانتی تھی اگر تمہارے کانوں میں بھنک بھی پڑ گئی تو تم اسی طرح میرا دماغ چاٹو گے۔ میں نے روکا بھی تھا عمیر کو مگر وہ بھی تمہارا ہی بھائی ہے۔" وہ لمحہ بھر کے لیے رکیں پھر جیسے انہوں نے مناسب الفاظ کا چناؤ کیا۔

"عمیر آج اپنے پراجیکٹ کے سلسلے میں لوٹن گیا تھا۔ وہاں اس نے امائمہ کو دیکھا۔ ایک کیفے ٹیریا میں۔" انہوں نے رک رک کر بات مکمل کی تھی۔ عمر کے چہرے کے تاثرات یک دم خفگی سے حیرانی میں منتقل ہوئے۔

"واٹ۔۔۔ کہاں دیکھا؟" الفاظ میکانکی انداز میں اس کے منہ سے نکلے۔

"لوٹن میں۔" انہوں نے دوہرایا پھر جیسے اسے نارمل کرنے کی غرض سے بولیں۔ "یہ کوئی اتنی حیرانی کی بات بھی نہیں ہے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ امائمہ کہاں جاتی ہے' کیا کرتی ہے' یہ اس کا اور تمہارا پرسنل میٹر ہے' لیکن۔۔۔" وہ ایک بار پھر اٹک گئی تھیں' لیکن عمر ساکت بیٹھا ان کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

"عمر! حالات اب پہلے جیسے نہیں رہے۔ مسلمانوں کے لیے بالخصوص پاکستانیوں کے لیے برٹش پالیسی تیزی سے تبدیل ہو رہی ہے۔ اس صورت حال میں ہمیں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ میں خود اب دور دراز کے علاقوں میں اکیلے جاتے گھبراتی ہوں حالانکہ میں کتنے سالوں سے یہاں رہ رہی ہوں اور پھر ایسی سائیڈ پہ جانے کو تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں۔ وہاں کوئی ہے ہی نہیں ہمارا۔۔۔ ہمارے دوست احباب' رشتہ دار ملنے جلنے والے سب یہیں آس پاس بکھرے ہیں۔۔۔ اتنی دور جانے کا کوئی جواز ہی نہیں بنتا۔ وہ علاقہ اب زیادہ اچھی شہرت نہیں رکھتا۔ اخبارات میں کتنا ذکر آنے لگا ہے۔ وہاں آئے دن کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا ہوا ہوتا ہے۔ وہ علاقہ اب باقاعدہ ریڈیکلز مسلمز (انقلابی مسلمانوں) کا گڑھ بن چکا ہے' میں عمیر کو ڈانٹ رہی تھی کہ وہ وہاں کس لیے جاتا ہے؟ امائمہ تو بالکل انجان ہے' اسے آئے تو ابھی ایک سال بھی نہیں ہوا۔ تم سمجھ رہے ہو نا میری بات۔" اسے خاموش پا کر انہوں نے پوچھا تھا۔ عمر دقت مسکرایا پھر اس نے ناک سے مکھی اڑائی تھی۔

"ممی! آپ بھی نا ذرا سی بات کو ہارر موی بنا کر رکھ دیتی ہیں۔۔۔ کچھ بھی نہیں ہو رہا لوٹن میں۔۔۔ دراصل اب غیر قانونی طور پر آئے ہوئے لوگوں پر سختی شروع ہو گئی ہے تو اس لیے آئے دن وہاں کا ذکر آتا ہے اخباروں میں اور امائمہ صاحبہ بھی روز روز نہیں جاتیں اس طرف۔۔۔ آپ پریشان نہ ہوں' اس نے بتایا تھا مجھے۔ اسے بیٹھے بٹھائے گھومنے پھرنے کا شوق ہو گیا ہے۔ اپنا روٹ سینس بہتر بنانے کا کریز ہو گیا ہے۔ ڈے کارڈ لے لیتی ہے پھر سارا دن جگل ہوتی ہے۔ اچھا ہے نا گھر میں رہ کر بھی کیا کرے گی۔" وہ کوشش کر رہا تھا کہ ممی کو اس کا انداز نارمل لگے' ممی نے اثبات میں گردن ہلائی۔

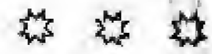
"مجھے اندازہ تھا کہ ایسی ہی کوئی بات ہو گی۔۔۔ میں نے عمیر کو کہا بھی تھا۔ بہرحال تم اپنے ابو کے سامنے بات مت کرنا وہ پریشان ہوں گے اور پلیز امائمہ سے کہو کہ تھوڑی محتاط رہے تو اچھا ہے۔" انہوں نے نصیحت کرنا ضروری سمجھا تھا۔ عمر نے سابقہ انداز میں گردن ہلائی پھر بولا۔

"میرے دہی بڑے پیک کر دیں۔" اس نے ریموٹ اٹھا لیا تھا اور مانچسٹر یونائیٹڈ کا کوئی پرانا میچ لگا کر دیکھنے لگا تھا۔

وہ ممی سے مزید کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس میں اب ہمت نہیں تھی۔ وہ امائمہ کے رویے سے پہلے ہی پریشان تھا۔ وہ کچھ عجیب طرح کا برتاؤ کرنے لگی تھی اور مزید پریشانی کی بات یہ تھی کہ وہ اس موضوع پر بات بھی نہیں کرنا چاہتی تھی کہ آیا اسے کوئی پریشانی ہے۔ اس دن بھی وہ چاہتے ہوئے بھی اس سے اگلوا نہیں پایا تھا۔ اس کے استفسار پر امائمہ نے صرف اتنا ہی کہا تھا کہ وہ کافی پینے کے لیے گھر سے باہر نکلی تھی تاکہ کچھ تازہ ہوا بھی کھا سکے۔ ٹی وی دیکھتے ہوئے اس کے ذہن میں گھڑی سی چلنے لگی تھی۔

انقلابی مسلمانوں (ریڈیکل مسلمز) کے علاقوں میں امائمہ کا آنا جانا حیرانی ہی نہیں پریشانی کی بات بھی

تھی۔ اسے امائمہ کی عادت کا پتا تھا وہ مذہبی تنگ نظری کا شکار تھی۔ اسے امائمہ کے ساتھ ہونے والا اپنا جھگڑا یاد آنے لگا۔ اس نے کتنی بحث کی تھی اس کے ساتھ کہ اس کا دماغ چکرا کر رہ گیا تھا۔ اسے سب یاد آنے لگا تھا اور وہ الجھتا جا رہا تھا۔



وہ بہت بے چینی کے ساتھ گھر واپس آیا تھا اور اس نے بیل بجانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اسے جیسے یقین تھا کہ امائمہ گھر موجود نہیں ہوگی مگر گھر کے اندر داخل ہوتے ہی اس کا یقین غلط ثابت ہوا تھا۔ باتھ روم سے پانی گرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ باتھ روم میں تھی۔ عمر فلور کشن پر بیٹھ گیا تھا۔ وہیں زمین پر لیپ ٹاپ کھلا پڑا تھا۔ یہ عمر کا پرانا لیپ ٹاپ تھا لیکن اب یہ امائمہ کے استعمال میں تھا۔ عمر کو احساس جرم تو محسوس ہوا لیکن اس نے پھر بھی امائمہ کا لیپ ٹاپ اٹھا کر گود میں رکھ لیا تھا۔ وہ ہسٹری چیک کرنے لگا تھا جیسے جیسے وہ دیکھتا جاتا تھا اس کے چہرے پر حیرانی کے تاثرات بڑھ رہے تھے پھر اس نے لیپ ٹاپ واپس اس کی جگہ پر رکھ دیا تھا اور اٹھ کر کچن کے مختصر سے شاف کی طرف آیا تھا۔

امائمہ کا آئی فون اکثر وہیں پڑا ہوتا تھا لیکن آج وہ وہاں موجود نہیں تھا۔ عمر نے بجلی کی تیزی سی سے ٹی وی کے ریک کو چیک کیا تھا۔ وہاں بھی فون نظر نہیں آیا تھا لیکن عمر کی نگاہ نے اسے فلور کشن کے قریب زمین پر پڑا دیکھ لیا تھا۔ امائمہ اسے وہیں رکھ کر اٹھ گئی تھی۔ عمر نے آگے بڑھ کر فون اٹھایا تھا اور اسے بھی چیک کرنے لگا تھا۔ اس کی پیشانی پر تیوریاں بڑھ رہی تھیں۔ امائمہ نے لوٹن اور روچڈیل کے متعلق لاتعداد ویب پیجز کھولے ہوئے تھے۔ اس نے فون سے بل ادا کیے ہوئے تھے۔ لوٹن تک جانے کے لیے کوچ کی بکنگ کروائی ہوئی تھی۔ عمر کو اس کی ہسٹری میں تین بار بکنگ کی ای میلز ملی تھیں۔ وہاں لوٹن اور روچڈیل کے روٹس کے نقشے محفوظ تھے۔ وہ حیرانی اور پریشانی سے سب دیکھتا جا رہا تھا پھر وہ دوبارہ سے لیپ ٹاپ کی طرف آگیا تھا۔ اس کا ہاتھ تیزی سے حرکت کر رہا تھا۔

"تم کب آئے؟" امائمہ کی آواز عقب سے سنائی دی تھی کہ اس نے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس کے لیپ ٹاپ کی جانب دیکھ رہا تھا وہاں کچھ تصاویر ملی تھیں جو دیکھنے میں بہت پرانی سی لگتی تھیں یہ تصاویر کسی اخبار میں سے کھینچی گئی تھیں لیکن وہ اتنی واضح نہیں تھیں۔ ایک تصویر کسی کلاس روم کے باہر لی گئی تھی۔ وہ تصویر کسی سیشن کے اختتام پر لی گئی تھی جس میں تین پوزیشن ہولڈرز کے چہرے واضح تھے ایک تصویر میں بہت سے لڑکے ترتیب سے کھڑے تھے۔ ایک لڑکے کے چہرے کے گرد دائرہ کھینچا تھا۔ عمر اس لڑکے کو نہیں جانتا تھا۔ اس نے اس لڑکے کو کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن وہ اس کے ساتھ کھڑے لڑکے کو ضرور پہچانتا تھا۔ وہ سرور بھائی تھے۔

"کیا کر رہے ہو عمر؟" امائمہ نے لرزتی آواز میں پوچھا تھا۔ عمر اب کی بار اس کی جانب مڑا تھا۔

"یہ تو اب تمہیں بتانا پڑے گا۔ امائمہ... کیا کر رہی ہو تم؟" عمر کی آواز بے حد سرد تھی۔ امائمہ کے چہرے کا اڑتا رنگ اس کی نظروں سے چھپا نہیں رہا تھا۔

"امائمہ! اب بول بھی دو... بتا دو سب... اس سے زیادہ صبر نہیں ہے مجھ میں۔" وہ سابقہ انداز میں بولا تھا۔ اس نے امائمہ کو چہرہ صاف کرتے دیکھا۔ وہ دیوار سے لگ گئی تھی پھر اس نے گہری سانس بھری تھی۔

"تمہیں سن کر شاک لگے گا لیکن اب چھپانا بے کار ہے... میرا ایک بھائی ہے..." وہ کانپتی ہوئی آواز میں اتنا ہی بولی تھی کہ عمر کے چہرے کے تاثرات بدلتے دیکھ کر چپ ہوگئی۔

"نور محمد...؟ مجھے پتا ہے... آگے بولو۔" عمر نے کہا تھا۔ شاک امائمہ کو لگ گیا تھا۔



نور محمد کے ماموں روچڈیل میں رہتے تھے۔ ماموں بہت سالوں پہلے اس چھوٹے سے قصبہ نما شہر میں

آئے تھے۔ انہوں نے چھوٹی چھوٹی ملازمتیں اور کئی گھنٹے اوور ٹائم کر کے کچھ رقم جمع کی اور پھر پاکستان میں اپنے آبائی گھر اور ترکے میں ملنے والی رقم اکٹھا کر کے یہاں اپنا کاروبار جمایا تھا۔ ان کی ریڈی میڈ گارمنٹس کی شاپ تھی جو اچھی چلتی تھی۔

2000ء میں نور محمد روچڈیل آگیا۔ وہ ایک عرصے سے دوائیاں کھا رہا تھا لیکن جگہ اور ماحول کی تبدیلی نے تریاق کا کام کیا۔ وہ تیزی سے بہتر ہونے لگا۔ روچڈیل آنے سے پہلے اور بعد میں بھی اس کی ذہنی رو نہیں بھٹکی تھی۔ اسے دورے پڑنا بند ہوگئے تھے۔ ماموں نے اسے اپنی دکان پر ہی کام دے دیا تھا۔ ان کے پاس ایک پارٹ ٹائم ملازم تھا۔ جو ہفتے میں پانچ دن آتا تھا۔ نور محمد کی وجہ سے انہیں کافی سہولت ہوگئی تھی۔ وہ صبح ماموں کے ساتھ ہی آجاتا دکان کھولنے میں ان کی مدد کرتا جھاڑ پونچھ صفائی ستھرائی کرتا اور چیزوں کو ترتیب سے رکھ دیتا۔ شیلفس کو ارینج کر دیتا۔ ڈسپلے پر رکھی چیزوں کو ترتیب سے رکھتا جاتا۔ پہلے بھی اس کی زندگی میں ڈسپلن کے علاوہ تھا ہی کیا... سو یہی اس کا کام آنے لگا۔

ماموں کو اس کے کام نے مطمئن کر دیا تھا جبکہ ان کی فیملی کو بھی اس کا لیا دیا انداز اور بلاوجہ ٹوہ نہ لینے کی عادت پسند نہیں تھی۔ وہ تینوں بہن بھائی اب پہلے کی طرح نور محمد سے بے تکلف نہیں تھے ویسے بھی ان کا سامنا زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ ماموں کا دو بیڈ کا دو منزلہ گھر تھا اوپر والی منزل انہوں نے چند بیچلرز کو کرائے پر دے رکھی تھی۔ نور محمد کو بھی ان کے ساتھ ایڈجسٹ کر دیا گیا۔ اس کو ملا کر وہ سات لوگ تھے۔ سب کے سب پاکستانی تھے اور سب اپنی اپنی جگہ مشکلات کا شکار تھا۔ وہ سب اپنے کام سے کام رکھتے۔ ان کے پاس اپنے دکھوں پر کڑھتے رہنے کے بعد اتنا وقت ہی کہاں بچتا تھا کہ وہ نور محمد جیسے کسی شخص سے بات کرتے۔

نور محمد کو اس لیے ہی وہاں رہنے میں مشکل پیش نہیں آئی تھی۔ وہ چپ چاپ اپنے آپ میں مگن رہتا۔ اسے کم گوئی اس قدر عزیز ہوگئی تھی کہ وہ اکثر اوقات چاہتے ہوئے بھی بول نہ پاتا تھا۔ بولنے کے مواقع یوں بھی ملتے ہی کب تھے۔ وہ صرف کھانا کھانے کی غرض سے رات کو ممانی کے پاس نچلے پورشن میں جاتا تھا۔ ممانی نے اسے بہت جلد یہاں کے طور طریقے اور قاعدے قوانین سمجھا دیے تھے۔ وہ اپنے لیے فرائیز نگٹس اور فرائز تل سکتا تھا۔ اسے مرغی مچھلی کے قتلے گرل کرنے اور کیچپ، مایونیز لگا کر سینڈوچ بنانے بھی آگئے تھے یا بعض اوقات وہ سادہ بن میں کریم لگا کر دودھ کی بوتل کے ساتھ ڈنر کے طور پر کھا لیا کرتا تھا۔ ممانی کا موڈ ہوتا تو وہ اس کے لیے کچھ نہ کچھ بنا دیتیں یا اسے بتا دیتیں کہ وہ خود کچھ بنا لے۔ نور محمد کی زندگی میں ہلچل تو پہلے بھی نہیں رہی تھی اب تو جیسے جمود طاری ہو گیا مگر اسے یہ جمود عزیز تھا۔

یہاں آنے سے پہلے کہیں نہ کہیں اسے موہوم سی امید تھی کہ اس کے ابو اسے روک لیں گے لیکن انہوں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ وہ اپنے دل میں ابو کے لیے اب کوئی جگہ نہیں پاتا تھا۔ اسے کسی کی یاد نہیں آتی تھی۔ وہ اپنی امی کو کسی کال کو نہیں سنتا تھا اور خط لکھنا تو جیسے اسے آتا ہی نہیں تھا۔ وہ اپنے ماضی کو بھلا کر خوش تھا اس کی یہ خوشی شاید اسی طرح برقرار رہتی اگر اس کے ماموں اس پر اپنا ارادہ ظاہر نہ کر دیتے۔

"نیک، فرماں بردار اولاد دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے اور میں اس نعمت کے معاملے میں بڑا ہی نامراد ثابت ہوا۔ پیسہ کما لیا دولت جمع کر لی مگر اولاد کی طرف توجہ نہ دے سکا۔"

ماموں نے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے یاسیت سے کہا۔ کام ختم کر کے نور محمد نکلنے لگا تھا جب انہوں نے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ دونوں ملازم پہلے ہی جا چکے تھے۔ ماموں کافی دکھی لگ رہے تھے اور شاید ان کو کسی سامع کی ضرورت تھی۔ نور محمد کو ان کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر تکلیف ہوئی لیکن کسی کے دکھ کو کم کرنے کے لیے دلاسا کیسے دیا جاتا ہے یہ اسے نہیں آتا تھا۔ اس نے ماموں کے گھر میں کشیدہ صورت حال کو پہلے بھی محسوس

کیا تھا لیکن وہ کسی سے استفسار نہیں کرتا تھا۔ اسے ماموں کے دونوں بیٹوں اور اکلوتی بیٹی کی آزادانہ روش پہ حیرت بھی ہوتی تھی مگر وہ اس بارے میں زیادہ نہیں سوچتا تھا۔

ماموں کے دکھ کے اظہار کے بعد اس نے یاد کرنا چاہا کہ اسے ان سب کے درمیان تعلقات نارمل لگتے تھے یا نہیں۔ اسے یاد آیا اس نے ان سب کو آپس میں گفتگو کرتے بہت کم دیکھا تھا۔ ماموں کے دونوں بیٹے دکان پر بہت کم آتے تھے' اسی طرح ان کی بیٹی بھی بدمزاج اور تنک مزاج سی تھی۔ وہ آپس میں جب بھی بات کرتے اس پر جھگڑے کا گمان ہوتا۔ ممانی بھی عجیب لاپرواہ سی عورت تھیں۔ وہ یا تو ٹی وی دیکھتی رہتیں یا کدو کے بیج چھیل چھیل کر پھانکتی رہتیں یا اپنی جوڑوں کے درد کی بیماری کا رونا روتی رہتیں یا پھر ان کے وہ رشتہ دار جو یہاں مقیم تھے' ان کے ساتھ فون پر گپیں لڑاتی رہتیں۔

نور محمد نے یہ سب یاد کرتے ہوئے ماموں کا چہرہ دیکھا تو وہ اور بھی زیادہ غم زدہ لگے۔ ماموں جب بھی پاکستان آتے تھے' ان کے گھر ضرور آتے۔ ان کا ہنستا مسکراتا' خوش باش چہرہ اور خوش حال حلیہ انہیں دنیا کا خوش قسمت ترین شخص ثابت کرتا۔ نور محمد کو ان کے خوش قسمت چہرے کے عقب میں جھول نظر آیا۔ وہ اگر یہاں نہ آتا تو کبھی یہ سب جان نہ پاتا۔

"میں اولاد سے بازپرس اور سختی کو ہمیشہ غیر انسانی قرار دیتا تھا۔ میں تمہارے ابو کو ظالم قرار دیتا تھا اور برملا اس کا اظہار بھی کرتا تھا لیکن اب سوچتا ہوں کہ اولاد پر سختی جائز ہوتی ہے۔"

ماموں اب انگلیاں بھی چٹخا رہے تھے۔ نور محمد کا دل چاہا کہ وہ بھی یہی کرنے لگے اسے دکھ ہوا۔ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ ماموں کبھی اس کے ابو کے رویے کو جائز قرار دیں گے۔

"وسیم' نعیم کو کاروبار میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ اپنی ذمہ داری کو پہچانتے ہی نہیں۔ ان کا خیال ہے' زندگی اس طرح لاپروائی سے دوستوں' سہیلیوں میں گزر جائے گی اور ان کا باپ محنت کرکے انہیں پالتا رہے گا۔" انہوں نے بیٹوں کا ذکر کرتے ہوئے اکتاہٹ بھرا انداز اپنالیا۔ نور محمد کو پہلی بار ان کے چہرے اور اپنے ابو کے چہرے میں مماثلت نظر آئی۔

"مجھے بیٹوں سے کوئی امید ہے نہ غرض مگر گڑیا کے لیے پریشانی ختم نہیں ہوتی۔ وہ لڑکی ذات ہے اس کی بہت ذمہ داری ہے مجھ پہ۔ اس کی شادی ہوجائے تو میں سکون سے مرسکوں گا ورنہ شاید اولاد کا دکھ مجھے مرنے بھی نہ دے۔" ماموں جذباتیت کی انتہا پر پہنچ چکے تھے۔ نور محمد کو ان کی بات سن کر بہت دکھ ہوا۔ اس نے دل ہی دل میں ماموں کی بات پر "خدانخواستہ" بھی کہا لیکن باآواز بلند وہ ماموں کو کوئی تسلی نہیں دے پایا تھا۔

"تم مجھے اپنے بیٹوں طرح عزیز ہو۔ تم سمجھ دار فرماں بردار ہو۔ تمہارے لیے میرے دل میں ایک بہت ہی مخصوص جگہ ہے اور وہ جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔"

ماموں بات کرتے ہوئے بہت توقف کررہے تھے۔ نور محمد واقعی سمجھ دار ہوتا یا اس میں کوئی دنیاوی چالاکی ہوتی تو وہ اتنی لمبی تمہید کے بعد فوراً" سمجھ جاتا مگر نور محمد کو اتنی سمجھ بوجھ کہاں تھی۔ اس نے منہ اٹھا کر ماموں کو دیکھا پھر فوراً" سر جھکالیا۔ اسے تعریف وصول کرنی نہیں آتی تھی۔

"میں چاہتا ہوں' تم ہمیشہ میرے ساتھ رہو میرے بیٹے بن کر۔ یہاں میرے پاس۔ میرے گھر میں۔ ہمیشہ۔"

نور محمد کی ابھی بھی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ یہ تو وہ پاکستان سے ہی سوچ کر آیا تھا کہ اسے اب ماموں کے ساتھ ہی رہنا تھا۔ وہ کبھی واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔

"تم کتنے مہینوں سے یہاں رہ رہے ہو۔ تمہیں اندازہ ہوگیا ہوگا کہ یہاں کی زندگی کتنی مختلف ہے۔ یہاں سکون ہے۔ کوئی پابندی نہیں ہے۔ دقیانوسیت نہیں ہے۔ ذہنی آزادی ہے۔ تمہیں یہاں اچھا لگا ہے نا؟ تم یہاں مستقل رہنے کے بارے میں کیا

نہیں سوچتے۔"

ان کے چہرے کے تاثرات ذرا سی دیر کو بدلے تھے پھر پرانے سانچے میں ڈھل گئے۔ نور محمد نے سرہلایا۔ ماموں نے گہری سانس بھری۔ وہ چاہتے تھے کہ نور محمد کی اب بات سمجھ میں آہی جائے لیکن وہ شاید ان کے منہ سے سننا چاہتا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ نور محمد ان کی اتنی لمبی چوڑی تمہید و تفصیل کے بعد بھی کچھ نہیں سمجھا تھا۔

"نور محمد" انہوں نے بہت آہستگی سے اس میں گھر کر اس کا ہاتھ تھاما۔

"میری گڑیا سے شادی کرلو۔"

نور محمد کو جھٹکا لگا۔

✲ ✲ ✲

"شادی!" اس نے چت لیٹے ہوئے چھت کو تکتے ہوئے دل میں دہرایا تھا۔ اس نے کبھی شادی کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ وہ ابھی اتنا بڑا ہی کب ہوا تھا کہ ایسی باتیں سوچ سکتا۔ اس کی ذہنی عمر تو ابھی تک تیرہ چودہ کے ہندسے پر جم کر کھڑی تھی۔ اسی لیے اس کے دل میں شادی کے نام پر کوئی ہلچل مچی نہ کوئی خوش کن خیال جاگا۔

"گڑیا سے شادی۔؟" اس نے کروٹ بدلی۔

گڑیا عمر میں اس سے کچھ بڑی تھی۔ وہ دیکھنے میں فربہ مگر خوب صورت تھی لیکن نور محمد کو اس سے ڈر لگتا تھا۔ وہ بہت بدزبان اور غصیلی تھی۔ نور محمد کے سامنے کئی بار اس کی اور ممانی کی جھڑپ ہوچکی تھی جبکہ نور محمد کو تو وہ مخاطب کرنا ہی پسند نہیں کرتی تھی۔

ماموں کے بیٹے بھی اسے بہت ہی کم مخاطب کرتے تھے لیکن ان کے انداز میں اس کے لیے تمسخر اور حقارت کے بجائے لاتعلقی ہوتی تھی جبکہ گڑیا کی آنکھیں ان سب جذبات کا مکسچر اس پر انڈیلتی محسوس ہوتیں۔ نور محمد نے گڑیا کی چہرے کو تصور کی آنکھوں سے دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ خوب صورت تو تھی۔

وہ خوب صورت نہ بھی ہوتی تب بھی شاید نور محمد اس کے بارے میں اس رات ضرور سوچتا کیونکہ گڑیا وہ پہلی لڑکی تھی جس کے ساتھ اس کی شادی کا باقاعدہ ذکر چلا تھا۔ وہ اتنا معصوم' اتنا سادہ دل انسان تھا کہ اسے گڑیا کے وجود میں یک دم ہی ایک مہربان دوست کی جھلک نظر آئی۔

"میری شادی۔" وہ ایک بار پھر سیدھا ہو کر لیٹ گیا۔ اسے لگا اس کے دل میں اندر ہی اندر کہیں ہلکی سی گھنٹی بجی ہے۔ اس کے ماموں اس کی شادی اپنی بیٹی سے کرنا چاہ رہے تھے۔ اس کے سامنے یہ ذکر پہلی بار چلا تھا۔ کسی نے اس کے سامنے یہ بات پہلی بار کی تھی۔ اسے اچھا لگا۔ یہ تو خوشی کی بات تھی۔ اسے ایک جیون ساتھی مل جاتا جو اس کے سارے دکھ چن کر سمیٹ لیتا۔ اسے واقعی ایک ساتھی کی ضرورت تھی۔ وہ چھت کو تکتے ہوئے مسکرایا۔

اس رات وہ بہت دیر تک گڑیا کے متعلق سوچتا رہا۔ ایک جوان لڑکے کے لیے یہ بہت فطری سی بات تھی۔ اسے یہ سب بہت خوش کن لگ رہا تھا۔ اس کی زندگی میں بھی کچھ نارمل ہونے جارہا تھا۔ اس نے ماموں کو پہلے ہی "آپ کی مرضی" کہہ کر گرین سگنل دے دیا تھا۔ اسی لیے اس رات ایک نئی زندگی کے خواب دیکھتے ہوئے وہ کافی مطمئن' میٹھی اور پرسکون نیند سویا۔

✲ ✲ ✲

"میں اس کگھو گھوڑے سے شادی نہیں کروں گی۔" گڑیا کی چلاتی ہوئی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔ وہ اپنے لیے پنیر آملیٹ بنا کر ابھی ٹیبل کے گرد بیٹھا ہی تھا کہ ماموں کے کمرے سے آوازیں آنے لگی تھیں۔

"آہستہ بولو۔ وہ باہر کھانا کھا رہا ہے۔" یہ ماموں کی آواز تھی۔ نور محمد کو جذباتی دھچکا لگا۔ وہ اسی کے بارے میں بات کررہے تھے۔

"میں کیوں آہستہ بولوں۔ میں ڈرتی نہیں ہوں

کسی سے۔ اور آہستہ کس کے لیے بولوں۔ اس مزاحیہ الیکٹرک کھلونے کے لیے جو بولتا ہے نہ سنتا ہے۔ صرف منہ اوپر کیے سب کو ہونقوں کی طرح دیکھتا رہتا ہے۔ آپ کا دماغ چل گیا ہے جو آپ ایسا سوچ رہے ہیں۔"

وہ پہلے سے زیادہ بلند آواز میں بولی تھی۔ نور محمد نے ہاتھ میں پکڑے توس کو پلیٹ میں رکھ دیا۔

"میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ گڑیا نہیں مانے گی۔ یہ کب سنتی ہے کسی کی۔"

ممانی کی لاچار سی آواز آئی تھی جس کے بعد ماموں کی گھرکی سنائی دی۔ نور محمد نا چاہتے ہوئے بھی ان کی بات پر دھیان دینے لگا۔

"اسے سننی ہی پڑے گی۔ اسے سوچنا چاہیے تھا۔ ماں باپ کی عزت نیلام کرنے سے پہلے اسے بھی تو سوچنا چاہیے تھا۔ اسے نہیں پتا تھا کہ جو کالک میں ماں باپ کے منہ پر ملنے جارہی ہوں" اس کا انجام کتنا بھیانک ہوگا۔ یہ اگر یہ سوچ لیتی تو میں یہ سب نہ سوچتا۔ اس نے مجھے مجبور کیا ہے کہ میں یہ سب سوچوں اور اگر تم اس کی تربیت پر دھیان دیتے یقین تو یہ دن نہ دیکھنے پڑرہے ہوتے۔" ماموں کی آواز آہستہ اور لہجہ سخت اور تلخ تھا۔

"کم آن ڈیڈی۔ اتنا میلوڈرامائک مت ہوں۔ کچھ نہیں کیا میں نے۔ آپ فطرت کو اگنور نہیں کرسکتے۔ میں چھوٹی بچی نہیں ہوں۔ بالغ ہوں۔ اپنا اچھا برا سمجھ سکتی ہوں۔ میں اپنی زندگی جس طرح چاہے گزار سکتی ہوں۔ مجھے ایسا کرنے کا پورا حق ہے۔"

گڑیا چلا چلا کر بول رہی تھی۔

"بند کرو اپنی بکواس۔ تمہیں شرم نہیں آتی اپنے باپ کے سامنے یہ سب باتیں کرتے ہوئے۔ اتنی بے حیا ہوچکی ہو تم۔ بے غیرت۔ ایک تو چوری اوپر سے سینہ زوری۔ دفع ہوجاؤ میرے سامنے سے' اس سے پہلے کہ میں تمہیں تھپڑ دے ماروں۔"

ماموں کی اتنی اونچی آواز نور محمد نے پہلی بار سنی تھی۔ اس نے پلیٹ کھسکا کر پرے کی۔ کرسی گھسیٹی اور اٹھ کر باہر کی طرف بھاگا تاکہ اوپر جانے کے لیے عقبی سیڑھیاں استعمال کرسکے۔ اس کا دل ضرورت سے زیادہ تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ انشاء اللہ)



بھرم

ایمل رضا

سر سبز زمین پر شبنم اور تھور کا سفیدہ نظر آنے لگا اور۔

"اور۔ اس عمر میں عورت کے پاس صرف بھرم ہی تو رہ جاتا ہے۔ اگر وہ بھی ٹوٹ جائے تو۔ پھر پیچھے کیا رہ جاتا ہے شکیل دیہ۔ پھر پیچھے کیا باقی رہ جاتا ہے بھلا۔" پھوپھی نے کہا

اور۔ پھر بڑی دیر خاموش رہی۔

صبح کے نوخیز سورج میں تمازت کی حدت نے ابھی تجاوز نہیں کیا تھا۔ ابھی تو صرف بھور سمے کا وقت پیلاہٹ میں تبدیل ہونا شروع ہوا تھا۔ گم نام سائے جنم لینے لگے تھے اور چیزیں اپنی موجودگی' اپنی اصل ہیئت کا پتا بتانے لگی تھیں۔ قریب ایک مرغ نے رکاوٹ آمیز بانگ دی تھی۔ پہلے سیال کی پہلی بانگ۔ دور مسجد میں نماز فجر کی ادائی اور لمبی دعا کے بعد بچے لہک لہک کر نعتیں پڑھنے لگے تھے۔ ایسی دل کو آ لگنے والی خاموشی میں کسی نے باہر بڑے دروازے کی آہنی کنڈی کو بڑے زور سے للکار کر بجایا تھا۔ اکرم جو تولیے سے چہرہ خشک کرتا آفس جانے کی تیاری کر رہا تھا نے دروازہ کھولا تو سامنے پھوپھی کو کھڑے پایا۔ بند بازار کی طرح ویران اور اداس عورت کو۔

"پھوپھی جی! آپ اس وقت اتنی صبح صبح۔ خیریت تو ہے اور پھوپھا جی کہاں ہیں۔"

چھوٹتے ہی اکرم نے سوالوں کے فائر کر ڈالے۔ پھوپھی کل رات ذات کی نفی سے آشنا ہو جانے کے باوجود بنا ڈگمگائے اندر جا پہنچی۔

"اس نے مجھے طلاق دے دی۔"

اپنی بات پر ہونے والے ممکنہ احتجاج کے خوف سے اس نے بڑی اونچی آواز میں کہا۔ ورنہ آج وہ اپنی ہی پرچھائی بن کر تو رہ گئی تھی۔ اتنے میں بھاوج پراٹھا سینکتے ہوئے چمٹا لیے باورچی خانے سے نکلی اور حیرانی سے پھوپھی کو دیکھا۔ جیسے وہ کسی صورت ان کی بات پر ایمان نہ لا سکے گی۔

"طلاق۔ مگر کس نے۔؟" طلاق کا سن کر ہی شاید بھاوج اتنا سٹپٹا گئی تھی کہ بوکھلاہٹ میں عجیب ہی سوال کیا۔ اس نے کچن کی چھوٹی جالیوں سے اپنی کھڑکی سے اپنی پچپن سالہ نند کو اندر آتے دیکھ لیا تھا۔ ابھی دو مہینے پہلے ہی پھوپھی یہاں پورے چالیس دن رہ کر گئی تھی۔ پھوپھا کریم سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ انہوں نے بار بار آکر معافی مانگی تو پھوپھی جانے پر تیار ہوئی تھی۔ بھاوج اب بھی دیکھ کر دل ہی دل میں مسکرائی تھی کہ بڈھا بڈھی میں پھر کوئی نیا جھگڑا ہو گیا ہے اور نند ہمیشہ کی طرح اپنے پچھلے ریکارڈ کے مطابق گھر چھوڑ آئی ہو گی۔ لیکن براہ راست طلاق کا لفظ سن کر بھاوج سن سی ہو کر رہ گئی۔ کیسی بے خبری کی خبر تھی۔ کیسی سناؤنی تھی یہ؟

"لیکن کیوں۔ کس بات پر باجی؟" بڑا وقت گزر جانے کے باوجود بھاوج اپنے حواس دوبارہ نہ جیت سکی۔

"کہنے لگا' چائے بنا دے۔ میں نے کہا میرے سر میں درد ہے۔ بس اسی بات پر کھڑے کھڑے طلاق دے دی۔" پھوپھی نے کہا تو ماں' بیٹا دونوں ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔ سارا دن دیکھتے رہے۔ خود کو اور پھوپھی کو۔

رات کو بھائی شکیل آیا تو اسے بھی یہ ہی بات سنائی

گئی۔

"اتنی سی بات پر طلاق۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" بے چینی سے وہ کمرے کے چکر لگانے لگا۔

"خرم کہاں تھا اس وقت؟" شکیل نے پھوپھی کے سب سے چھوٹے بیٹے کے بارے میں پوچھا۔

"وہ کراچی چلا گیا۔ میں نے ہی بھیج دیا اسے۔۔۔ اب تو بتا مجھے، کتنے دن تک برداشت کر سکتا ہے۔۔۔ نہ تیرے گھر میں جگہ لینے کی آس ہے، نہ تیرے دل میں۔۔۔ کہے تو آج ہی اپنے لیے کوئی لوارہ ڈھونڈ لوں۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو آپی۔" شکیل یہ سب سن کر مزید بے چین ہوا۔

"حقیقت سے آشنا ہو جانے کے بعد فریب میں زندگی نہیں گزاری جا سکتی شکیل ویر۔"

"تینوں لڑکوں کو پتا ہے سب؟"

"میں نے نہیں بتایا، وہ بتائے سو اس کی مرضی۔۔۔ لیکن تجھے بتا دیتی ہوں میں اب لڑکوں کے پاس بھی ہرگز نہیں جاؤں گی۔۔۔ خون تو اپنے باپ کا ہی ہے ان کی رگوں میں بھی۔۔۔ سالوں بعد نجانے وہ بھی کن کن الفاظ میں تعلق توڑ دیں۔۔۔ میں تو ان کی بیویوں کی خدمت کرنے جوگی بھی نہیں رہی اب۔"

شکیل نے کمرے میں ٹہلتے ٹہلتے ہی آج دو، تین کلومیٹر کا سفر طے کر لیا۔ پہلے تو اسے طلاق کی بات پر ہی یقین نہیں آ رہا تھا اور اب بہن کی ایسی عجیب عجیب باتیں۔۔۔ گندم کی ٹہنی پر باجرہ اگ آیا تھا جیسے۔ اس عمر میں تو میاں، بیوی لمبی رفاقت کے باعث اکائی بن جاتے ہیں۔ کمزور وجود کے ساتھ ٹھوس رشتہ ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ کیسی انہونی تھی۔ جس کے آگے پیچھے کسی طرح کا موقف نہ تھا۔

پھوپھی کے چہرے کی جھریاں مزید گہری تھیں اور وجود۔۔۔ وجود بھلا اب رہ ہی کیا گیا تھا۔ اس سب کے باوجود اس کی چپ کی گہرائی میں کوئی کشتی بے پتوار نہیں تھی۔ یادوں کا لاوا اندر ہی اندر دہکتا تھا۔ لیکن اس کی تپش باہر نہ محسوس ہوتی تھی۔

طلاق کا کوئی دکھ اور زندگی کی ترتیب کی بے ترتیبی کا کوئی غم اس کی آنکھوں سے نہ جھلکتا تھا۔ جیسے طلاق نہیں ہوئی۔ کوئی عزم مکمل ہو گیا ہے۔ حقیقتاً بھرم کا سودا جو دل میں سمایا تھا۔ اس کا نتیجہ نکل آیا تھا۔ رشتے، دار پر چڑھ کر کانٹ چھانٹ کا شکار ہو گئے تھے اور اب جو بچا تھا وہ۔۔۔ اب کچھ بچا ہی تو نہیں تھا۔

برعکس بھی بہت کچھ ہوا تھا۔ کچھ عزم ٹوٹ بھی گئے تھے ساتھ جینے مرنے کے۔ سارے کا جو دھاگہ پکڑ کر وہ چڑھائی چڑھ رہی تھیں اس دھاگے کو ادھر راستے میں سے ہی توڑ دیا گیا تھا۔

کسی دیوار پر پیپل کا درخت ایک دن میں نہیں اگ آتا۔ کچھ قصور سرکش ہواؤں کا ہوتا ہے۔ جو کسی آوارہ بیج کو دیوار کی درز میں دھکیل دیتی ہیں۔ کچھ مکاری بارشوں کی بھی ہوتی ہے اور تھوڑی کمزوری پرانی دیوار بھی دکھاتی ہے۔ تینوں عوامل ایک دوجے سے پرخلوص ہو کر باہم گلے ملتے ہیں۔ مکین کو پتا بھی نہیں چلتا اور اس کے خلاف اندر کھاتے ہی سازش شروع ہو جاتی ہے۔ اب جوں جوں پیپل پھیلتا ہے، مکان کو کمزور کرتا چلا جاتا ہے۔ پھوپھی کے دل میں بیج نے اسی دن جڑ پکڑ لی تھی۔ جس دن عثمان کے پوتے کے عقیقہ کا بلاوا آیا تھا۔ پھر جیسے جیسے عقیقے کے دن قریب آنے لگے تنے پر پتے اگنے لگے۔

"اتنی دور کہاں جائے گی تو۔۔۔ تھک جائے گی۔۔۔ میں چلا جاتا ہوں، رات تک آ جاؤں گا۔" پھوپھا کریم نے بڑی سادگی سے کہا تھا۔

"ٹھیک ہے، آپ ہی چلے جائیں۔۔۔ ویسے بھی میں وہاں جا کر کیا کروں گی۔" پھوپھی نے بڑی فرماں برداری سے جواب دیا۔ وہ شروع ہی سے سراپا خدمت و صفائی تھیں۔ شوہر کے آگے احتجاج کرنا انہوں نے کبھی سیکھا ہی نہیں تھا۔

پینتیس سالہ شادی شدہ زندگی ٹرین کے ڈبوں کی طرح پٹری پر بڑی ڈھب ڈھب کر کے گزری تھی۔ کبھی جنکشن پہنچ نہیں ہوا اور کبھی ٹرین ڈی ریل نہیں

ہوئی۔ شروعاتی دس سال بڑے گلابی گلابی سے تھے۔ تازہ کھلے پھول کی طرح ہر وقت خوشبو دینے والے۔ جن میں جذبات کا سمندر چاروں اور بکھرا رہتا، لہراتا رہتا تھا۔

دسویں سال جب تیسرا بیٹا خرم پیدا ہوا تو پھوپھا کریم کی توجہ کا دھارا بھی نجانے کیوں اور کیسے چھوٹی چھوٹی مختلف سمتوں میں بہہ نکلا۔ ساری زندگی پھوپھا کریم لوئی کی بکل میں قید اندر ہی اندر دھنسے ایک سربستہ راز رہے تھے۔ ایسا راز جو سراسر صرف پھوپھی پر عیاں تھا۔

یہ لوئی کی بکل کھلی بھی تو گانٹھوں گانٹھ نکلی۔ اب وہ ہر وقت گھر کے بجائے دوستوں میں گھرے رہتے تھے۔ سیاست، مذہب، حکمران، ملک، جاگیرداری، بے حیائی، فحاشی، عورت، ملکی ابتری پر بڑے جوش سے تقریریں کرتے۔ اپنا سارا جوش جلد ہی انہوں نے ایسی باتوں کے لیے وقف کر دیا۔

رات گئے گھر واپس آتے تو خالی برتن کی سی کیفیت ہوتی۔ پھوپھی کو ان سب موضوعات پر اپنی کم علمی کا اندر ہی اندر بڑا دکھ ہوتا۔ رفتہ رفتہ وہ احساس کمتری سے مجرم سی بن گئیں۔ پھوپھا کی مخفل مزاجی کے باعث وہ بیوی سے صرف تین بچوں کی ماں ہو کر رہ گئیں۔

ادھر پھوپھا جی کی ساری انرجی کو نئے محور کی گنجائش نہ مل سکی تو انہیں ادب کا شوق چرایا۔ آہستہ آہستہ گھر میں کتابوں کا ڈھیر لگنے لگا اور پھوپھا کا وجود بھی ایک کتاب کی طرح بس گھر میں "پڑا ہوا" نظر آتا۔ کتابیں زیادہ ہونے لگیں تو پھوپھی انہیں پچھلے چھوٹے کمرے میں منتقل کرنے لگی۔

پھر پھوپھا کریم بھی زیادہ وقت وہیں چھوٹے کمرے میں بتانے لگے۔ رات زیادہ دیر تک پڑھتے رہتے تو وہیں سو جاتے۔ یوں دونوں بوڑھے ہوتے میاں، بیوی ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی کب اور کیسے علیحدہ علیحدہ ہوئے، انہیں خود پتا ہی نہ چلا۔

ہر چیز نے عمل کو لے کر اپنی نوعیت بدل لی۔ محبت کی جگہ احترام نے لے لی اور قربت کی جگہ خدمت نے۔ پھوپھی نے ان ساری باتوں کا انتقام اپنے خود کے پیدا کردہ چڑچڑے پن سے لیا۔ بہت سارے مرحلوں سے گزر کر انہوں نے پیار کو تازہ تڑکا لگانے کے لیے کئی فارمولے ڈھونڈ نکالے۔

مہینے دو مہینے بعد کسی بھی چھوٹی سے چھوٹی بات پر پھوپھی اپنا سامان سمیٹنا شروع کر دیتی۔ تینوں لڑکے ہنسے جاتے۔

"اتنی میری منگیتر مجھ سے ناراض نہیں ہوتی جتنی اماں، ابا سے ہوتی ہے۔" بڑا والا کہتا۔

"اب اماں دو، تین مہینے نہ لڑے تو ابا کو بھی بے چینی ہونے لگتی ہے کہ اللہ خیر کرے، کہیں زوجہ محترمہ کی طبیعت خراب تو نہیں۔"

سب مذاق کرتے رہتے اور پھوپھی اس دوران پھوپھا کے لاکھ منانے پر بھی شکیل ویر کے گھر چلی جاتی۔ اگلے دن پھوپھا کریم بھی وہاں پہنچ جاتے۔ مناتے، معافی مانگتے، کانوں کو ہاتھ لگاتے اور آخر میں جب ہاتھ جوڑنے تک آ جاتے تو پھوپھی چادر سنبھال فوراً گھر واپس چلنے کے لیے راضی ہو جاتی۔

یہ کھیل بڑے عرصے سے جاری تھا۔ لیکن شروع ہونے کے بعد محض ہفتہ دس دن ہی کھیلا جاتا۔ اب تو پھوپھا کریم بھی گھاگ ہو گئے تھے۔ جاننے لگے تھے کہ بیوی رانی شوہر کے ہاتھ جڑنے سے پہلے اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ اس لیے اب وہ آتے ہی پہلا کام یہ کر ڈالتے۔ پھوپھی خود ساختہ ضدی سہی، لیکن اپنے پیارے شوہر کو اس انداز میں دیکھ کر اندر تک ہل جاتی تھی۔ اسی لیے فوراً "اٹھ کھڑی ہوتی، ضد کرنے اور اکھڑپن دکھانے کا باقی مرحلہ وہ گھر جا کر ادا کرتی۔ واپسی کے سفر پر پھوپھی اکثر سوچتی۔

"عورت بڑی ڈھیٹ اور بہانے باز ہے، ہر حالت میں اپنی ہوا نکالنے کا ذریعہ ڈھونڈ ہی لیتی ہے۔"

جتنے دن پھوپھی شکیل ویر کے گھر رہتی وہاں بھی خوب رونق لگی رہتی۔ بچے بڑے سب ہی پھوپھی کو

چھیڑتے۔

"لڑائی ہوگئی پھوپھاجی سے۔۔۔ اب وہ جب تک منانے نہیں آئیں گے آپ ہمارے پاس ہی رہیں گی۔"

"ہاں۔۔۔ تو اور کیا۔" پھوپھی ملکہ وکٹوریہ کی طرح جواب دیتی۔ جیسے کوئی حکم صادر کر رہی ہو۔

"اگر پھوپھاجی نہ آئے تو۔۔۔؟"

ملکہ وکٹوریہ کے بت میں دراڑیں آتیں اندر ہی اندر کہیں۔ "چل جا اپنا کام کر۔"

"پھوپھی اتنے دن آپ ہمارے پاس رہیں گی۔"

"ہاں میرے بچے۔"

"ہرے۔۔۔" بچے نعرہ لگاتے۔ "پھر میں دعا کرتا ہوں کہ پھوپھاجی کبھی نہ آئے۔" کوئی بچہ ہاتھ اٹھا کر باقاعدہ دعا کر ڈالتا۔

"پرے ہٹ مردود۔۔۔ تیرے منہ میں خاک۔۔۔ وہ کیوں نہ آئیں۔" پھوپھی گرجتی۔

"جو بچے کی دعا پوری ہوگئی اور وہ نہ آئے تو۔۔۔" شکست یک مشت پھوپھی کے اندر سرائیت کرجاتی۔

کوئی جوتی اٹھا کر "مردود بچے" کو بھی دے مارتی، پھر آہستہ آہستہ بچوں نے پھوپھی کی یہ چھیڑ ہی بنا ڈالی۔ چارپائیوں، پلنگوں پر وہ پھوپھی کی پہنچ سے دور ہو کر ہاتھ بلند کرکے یہ دعا کر ڈالتے اور اپنی سات آنے والی اور سات گزر چکی نسلوں کی گالیاں سنتے۔

بھاوج بھی منہ چھپائے ہنستی رہتی۔ اس عمر میں آدمی اپنے بچوں کی شادی شدہ زندگی بنانے سنوارنے کے سو سو جتن کرتا ہے اور ہماری نند اپنے ہی گھر والے سے لڑکر آجاتی ہے۔ پھوپھی کا دل کرتا، سروتے میں بھاوج کی گردن ڈال کر چھنگل دیا دیں۔

دو مہینے پہلے پھوپھا کریم پورے چالیس دن تک آتے رہے تھے۔ روز۔۔۔ بلاناغہ۔۔۔ لگاتار۔۔۔ سورج کی طرح پابندی سے۔ لیکن بات چونکہ کافی بڑی تھی۔ اس لیے پھوپھی چالیس دن کی ناراضی کا چلہ کاٹ کر ہی اپنے گھر واپس گئی تھی۔

عثمان کے پوتے کا عقیقہ تھا اور پھوپھی ہر بات کو بڑے غور سے نوٹس کر رہی تھی۔ لوہے کا گھڑا جو سالوں سے ایک ہی جگہ پر دھرا رہا تھا۔ اب ادھر ادھر لڑھک کر شور پیدا کرنے لگا تھا اور دھات کی آواز پورے گھر میں گونجنے لگی تھی۔ پھوپھی نے کانوں میں روئی دی، نہ لبوں کو اجازت، لیکن دل ضرور کالا ہونے لگا تھا۔

"لٹھے کا سوٹ جو نیا سل کر آیا ہے۔ کلف لگوا کر استری کروا دینا اور پشاوری چپل بھی پالش کروا دینا۔ یا دونوں کام بازار سے کروا لوں۔ اچھے ہو جائیں گے ذرا۔"

پھوپھا کریم کی عادت تھی یا درویش صفتی۔۔۔ کبھی باہر جاتے وقت کپڑے، جوتی کا خیال نہ رکھا تھا۔ جہاں جانا ہو جو کپڑے پہنے ہیں خواہ کل کے پہنے ہوں اسی میں چل دیے۔ جنازہ، موت تو ایک طرف، وہ تو شادی بیاہ کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔ پھوپھی نے جو دیا پہن لیا۔ مہندی کی رات کے پہنے سوٹ میں ہی شادی کے تینوں دن گزار دیتے۔ شادی بیاہ پر زیادہ وقت دیگوں پر بیٹھ کر ہی گزارتے۔ شامیانے تلے آتے بھی تو بڑے جھینپے سے رہتے۔ اس دن سوٹ، جوتی کا جو آرڈر دیا تو پھوپھی کے پہلے سے کھڑے کان مزید کھڑے ہوگئے۔

ساری زندگی کھدر پوش تحریک کے سرگرم رکن رہنے والے اپنے شوہر کے نئے لٹھے کی چمک سے اس کی آنکھیں چندھیانے لگیں۔ پھر گھر سے نکلنے سے پہلے پھوپھا کریم نے وہ "پرنا" لیا جو بڑے بیٹے نے سعودیہ سے بھیجا تھا اور جو دو سال سے ٹرنک میں پڑا ہوا تھا۔ سعودیہ کا ہی عطر لگایا۔ جس کی بوتل عید پر بھی نہ نکلی تھی اور تو اور دس سالہ پرانی سفید داڑھی اور سر کے بالوں کو وسمہ و حنا سے رنگ ڈالا۔ پھوپھی خاموش۔۔۔ سب دیکھتی رہی اور برداشت کرتی رہی۔ ہونٹوں پر سوئی دھاگے سے ٹکندے ڈالے اور سینے پر ٹھنڈا گھڑا رکھ لیا۔

رات کو پھوپھا کی واپسی ہوئی۔ پورا وجود جو مکمل ناسپاسی کے احساس سے اپنا وجود کھو دینے والا تھا۔ اچانک سانس لینے لگا۔ ایک تو پچھلے ہفتے سے آج صبح تک کی ساری کارروائی، دوسرا خلاف توقع پھوپھاجی کا واپسی پر ہمیشہ کی طرح تھکے ہونے کے بجائے بڑے خوش گوار موڈ میں ہونا اتنی دور کا سفر کرنے کے باوجود بھی۔۔۔ تیسرا ہونٹوں پر حامد سراج کی دل پسند حمد کے بجائے خلافِ عادت ایک سولی ہی بولی تھی۔ پھوپھی نے غور سے سنا تو لگا جیسے ان کے پلنگ کے چاروں پائے آپس میں دھڑا دھڑ بجے ہوں۔

"مینہ آوے گا بھیج جان کے لک لنوں لنوں"

"یہ کیا واہیات خرافات ہے۔"

وہ تنگی الماری میں گم پھوپھاجی نے پلٹ کر بھوتنی بنی بیوی کو دیکھا تو ہنسی دبا کے مسکرانے لگے۔

"ہاں۔۔۔ بس وہاں عثمان نے لگایا ہوا تھا۔"

"عقیقوں پر ایسی خرافاتیں۔"

"ہاں۔۔۔ بس۔۔۔" وہ زیادہ وضاحت نہ دے سکے۔ مبادا کہیں ہنسی ہی نہ چھوٹ جائے۔ یہ بھی مونگ پھلی کی طرح ان کے منہ کو لگتی تو پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا تھا۔ اندر ہی اندر خوش ہونے لگے۔ بیوی کا پیار آج بھی ویسا ہی تھا۔ ملکیت جتانے والا۔ غصے میں تھی، تب ہی تو رات پہننے کے لیے کپڑے بھی نہ نکال کر رکھے تھے۔

"سیما بھی ہوگی وہاں۔" پھوپھی کے لہجے میں کاٹ تھی۔

"اس کے بھائی کے پوتے کا عقیقہ تھا۔ اس نے کیسے نہیں ہونا تھا۔" پرنا تہہ کرکے انہوں نے الماری میں رکھا۔

"جوتی کی چمک تو سفر میں ہی ختم ہوگئی ہوگی۔ عطر کی خوشبو، سوٹ کی کلف دھونے پر نکل جائے گی۔ خضاب کو جانے میں مہینہ بھر لگے گا۔ لیکن سیما کی یاد بھلانے میں شاید آپ کو سالوں لگ جائیں۔" پھوپھا کریم اب کے پیچھے پلٹے تو ہنس نہ سکے۔

پینتیس سال ہوگئے ہماری شادی کو۔ ابھی بھی شک کرتی ہو۔"

"یہ شک آپ نے میرے دل میں بھرا ہے۔ خضاب، عطر، لٹھے اور لک لنوں لنوں کے ذریعے۔

جلے میری جوتی۔۔۔ آپ کی سابقہ منگیتر تھی۔ کسی اور کے پاس بیٹھا دیکھ کر آپ کو جلنا چاہیے۔"

"سو جاؤ چپ کرکے۔" بڑی رکھائی سے جواب دیا گیا جو پھوپھی کو مزید بھڑکا گیا۔

"میں تو اس وقت نہ جلی جب آپ روز بن ٹھن کے اس کے گھر پہنچ جایا کرتے تھے۔ سیما کی محبت میں اس کے شوہر سے بھی دوستی گانٹھ لی۔ پھر ہر وقت وہاں، کبھی کبھی راتوں کو بھی۔۔۔ خرم کی پیدائش کے وقت بھی تو وہاں ہی تھے آپ۔۔۔ جب میں درد زہ میں کراہتی صرف آپ کو یاد کر رہی تھی۔ کیا میں نے تب بھی کوئی شکایت کی۔"

"پھر چھوڑ بھی تو دیا ناں سب کچھ تمہاری خاطر۔"

"میری خاطر نہیں۔۔۔ سیما کے شوہر نے بس ٹھکائی نہیں کی آپ کی، ورنہ ذلیل کرنے میں کوئی کسر بھی نہ چھوڑی۔ بھانپ گیا تھا وہ کہ دوستی تو مجھ سے گانٹھ رکھی ہے۔ لیکن نظر میری بیوی پر ہے کریم کی۔"

"بس چپ کر۔۔۔ سو جا اب۔"

"سچی بات کڑوی لگتی ہے ہمیشہ۔"

"کڑوی تو مجھے تو بھی لگتی ہے۔" انتہائی نخوت سے کہا گیا۔

بس جی، یہ بات تھی ساری اسے اتنا کہہ لیں یا اتنا۔۔۔ پھوپھی کی آنکھوں میں ریگستان کو جانے والے راستے نظر آنے لگے اور پھوپھی چلہ کاٹنے بھائی کے گھر جا پہنچی۔۔۔ بھائی اور بھابھی تازہ دم ہونے کے لیے سارے قصے کو نئے سرے سے سنتے۔ ہاں اس دفعہ کچھ نیا مواد ہے، ورنہ تو ہمیشہ رٹی رٹائی باتیں۔ پھوپھا کریم آتے تو دونوں کو کمرے میں اکیلا کر دیا جاتا۔ اس دفعہ پھوپھاجی کے جڑے ہاتھ بھی اپنا اثر نہ دکھا سکے۔

بھاوج باہر نکل کر کھڑکی کے ساتھ کان لگائے رکھتی اور پھوپھی کی غیر موجودگی میں سب کو پھوپھا کی رحم آلود بھیگی ہوئی آواز کی نقل کرکے سناتی۔

لیکن اب اس واقعے کے دو مہینے اور شادی کے پورے پینتیس سال بعد عجیب بات ہوئی تھی۔

طلاق! پھوپھی تو کسی اور کی طلاق کا سن کر ہی عرش کی طرح کانپ اٹھتی تھی۔ چہرہ رنگ بدل لیتا تھا اور سفیدی اڑتے بادلوں کی طرح بڑی دور نکل جاتی تھی اور کیسے اب خود مطلقہ ہوکر آرام سے بیٹھی تھی۔ دو ایک دن تو شکیل بھائی بڑے بے چین بے چین سے رہے۔ بہن کو کریدنے کے نت نئے طریقے تلاش کرتے اور پھوپھی ہر دفعہ ایک ہی جواب دیتی۔

"چائے بنانے کا کہا تھا میں نے کہا سر میں درد ہے تو کھڑے کھڑے طلاق دے دی۔"

شکیل بھائی کی سمجھ میں نہ آئے کہ کس سے بات کریں اور کیا کریں۔ مسئلے کا حل کیسے نکالیں۔ کیا طلاق کے بعد مسئلہ مسئلہ رہ جاتا ہے۔ وہ دل میں سوچتے کہ پھوپھا کریم سے ملیں... لیکن اب کس ناتے سے۔

چوتھے دن پھوپھا کریم خود ہی شکیل کے گھر چلے آئے۔ پھوپھی نے دیکھا تو جھٹ چادر سر پر لی اور دوسرے کمرے میں نکل گئی۔ جیسے غیر محرم سے پردہ کررہی ہو۔ دوجے کمرے میں شکیل بھائی اور پھوپھا کریم میں نجانے کیا کیا باتیں ہوتی رہیں۔ گھنٹے بھر بعد پھوپھا کریم چلے گئے تو شکیل بھائی پھوپھی کے پاس آبیٹھے۔

"تو نے میرے ساتھ جھوٹ بولا بہن... تو لڑائی کرکے آئی ہے اور طلاق کا کہہ رہی ہے۔ وہ تو کہتا ہے کہ اس نے تجھے کوئی طلاق نہیں دی۔"

"جھوٹ بولتا ہے وہ... سفید جھوٹ... اس نے مجھے خود چھوڑا ہے۔ کھڑے کھڑے... تین دفعہ کہا اس نے' میں کیوں غلط بیانی کروں گی بھلا۔"

"چائے بنانے والی بات تو اسے پتا ہی نہیں۔"

"اچھا... جو اس کا یقین ہے تو اسی سے پوچھ لے' پھر ساری بات... مجھ سے کیوں پوچھتا ہے۔" پھوپھی نے گرج کر کہا تو شکیل بھائی چپ ہوگئے۔ لیکن اگلے دن پھوپھا کریم دوستوں کے ہمراہ پھر آگئے۔

معاملہ وہی تھا کہ میں نے طلاق نہیں دی' زبیدہ خود ناراض ہوکر آئی ہے۔ ادھر پھوپھی نے صاف صاف بھائی کو کہہ دیا کہ اگر کریم دوبارہ یہاں آیا یا بھائی نے مزید اس سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی تو وہ کسی دن رات کو اچانک یہ گھر چھوڑ کر چلی جائے گی اور دوبارہ کبھی پھر زندگی بھر کسی کو اپنی شکل نہیں دکھائے گی۔

پھوپھی کی دھمکی کے بعد پھوپھا کریم کبھی شکیل کے گھر نظر نہ آئے۔ دونوں اب مسجد میں ملنے لگے تھے۔

تین مہینے مزید گزر گئے۔

لیکن مسئلہ جوں کا توں رہا۔

☆ ☆ ☆

جس صبح مرغ نے رکاوٹ آمیز سیال کی پہلی بانگ دی تھی اور پھوپھی ناراض ہوکر شکیل ویر کے گھر آئی تھی۔ اس سے کوئی مہینہ پہلے کا واقعہ ہے۔ چھوٹا بیٹا خرم اپنی ذات میں جیسے کسی اور کی ذات کو پالنے لگا تھا۔ گھر آتا تو الجھا الجھا جیسے ہواؤں سے لڑ رہا ہو۔ پھوپھی کو اپنے اس بیٹے سے بہت پیار تھا۔ ایک تو سب سے چھوٹا تھا۔ دوسرے لاڈلا بھی۔ تیسرے گھر پر اب صرف وہ ہی تو رہ گیا تھا۔ سب سے بڑا کراچی میں تھا' اپنی بیوی' بچوں کے ساتھ' اس سے چھوٹا سعودی عرب میں... اب جو دکھ سکھ تھے وہ اسی کے ساتھ تو تھے۔

پھوپھی نے دیکھا۔ بیٹا بڑے دنوں سے کسی گم سی ٹیس میں مبتلا ہے۔ کچھ کہنے بتانے کے لیے منہ کھولتا ہے' لیکن ہمت جیسے آدھے راستے ہی جواب دے جاتی ہے۔

"ماں! کھانا گرم کردے... چل رہنے دے' مجھے بھوک نہیں ہے" ادھوری ادھوری باتیں کرنے لگا تھا۔

"میں کراچی جارہا ہوں بڑے بھائی کے پاس... پر کیسے جاؤں اگلے ہفتے تو ٹیسٹ ہیں۔" یادداشت بھی

کمزور ہونے لگی تھی۔

"تیری دوائیاں تو ختم نہیں ہوگئیں۔ بیچ ڈاکٹر نے تو کہا تھا کہ ایک ہی ہفتے کا کورس ہے۔" ایسی ہی بہکی بہکی باتوں کے دوران پھوپھی نے ایک دن بیٹے کو جالیا۔

"کون ہے وہ لڑکی؟" جوگر کے تسمے باندھتے خرم نے چونک کر ماں کو دیکھا اور پھر اس بات پر مکمل ایمان لے آیا کہ ماں تو... جوتشی ہوتی ہے۔

"تجھے کیسے پتا چلا ماں؟"

"جب کوئی ادھوری باتیں کرنے لگے تو اس کے من کے اندر ضرور کچھ پورا ہوگیا ہوتا ہے۔ تو بتا کون ہے وہ؟" بند ٹوٹا اور پانی کا ریلا بہہ نکلا۔

"تجھے بتاتے ڈر لگتا ہے ماں۔" خرم واقعی ڈرا ہوا تھا۔ "وہ ہماری دور کی رشتے دار سیما کی بیٹی ہے اور تجھے سیما سے خدا واسطے کا بیر ہے۔"

پھوپھی کو واقعی سیما سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ تب ہی تو وہ سن کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی تھی۔ بیٹے نے ناامید ہوکر ماں کو دیکھا۔ اور ماں نے... بیٹے کو۔

ساری رات پھوپھی نے سوچتے گزار دی۔ جس عورت کا نام کبھی اس کے شوہر کے ساتھ جڑا رہا تھا اور اس کا شوہر جو شاید ابھی تک اپنی سابقہ منگیتر کے لیے دل میں محبت کا بہی کھاتا کھولے رکھتا تھا۔ اس عورت سے وہ کیسے رشتے داری کرسکتی تھی۔ صبح ہوتے ہوتے اس نے اپنے سارے خیالات کی خود ہی نفی کرڈالی۔ اس عمر میں کیسی جلن اور کیسا عشق آتش... اس عمر میں تو صرف بھرم ہی رہ جاتا ہے جو اللہ کے کرم سے قائم ہے۔ کچھ کریم اور سیما کو چوٹ دینے کی بھی سوچ لی اور اپنی سوچ پر وہ خود ہی مسکرادی۔

"لڑکی بھی محبت کرتی ہے تجھ سے۔" خرم نے دیکھا' ماں کا سنولایا چہرہ دوبارہ پرنور سا ہوگیا تھا۔

"پتا نہیں' جب بھی بات کروں بس ہنستی رہتی ہے۔ کہتی ہے' پہلے اپنی ماں سے پوچھ' پھر مجھ سے۔"

"کالج سے کسی دن اسے سیدھا یہاں لے آ... کہنا میری ماں نے بلوایا ہے۔"

تھوڑے دن بعد خرم لڑکی کو لے آیا۔ وہ لڑکی نہیں تھی۔ دودھ کی بوتل تھی' جس میں قدرت نے انار کا رس بھی ملادیا تھا۔ بیٹا ریجھ گیا تھا تو اس میں اس کا بھی کوئی قصور نہیں تھا۔ حسن ہی لشکارے مارتا ہوا تھا۔ نام آرزو تھا اور جو دیکھتا تھا دل میں ایک آرزو سی ضرور پال لیتا تھا۔

"خشک حسن ہے تیرا... تیری ماں کو تو ابھی تک اپنے آپ سے ہی فرصت نہیں ہوگی۔ تجھ پر کیا توجہ دے گی وہ بھلا۔" آرزو کے سر میں تیل لگاتی پھوپھی نے کہا۔

بڑے آرام سے وہ اپنے سر کی مالش کرواتی رہی اور ہنستی رہی۔ تیل لگوا کر پلٹی تو اس نے پھوپھی کے دونوں ہاتھ چوم لیے۔ پھوپھی کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو آگئے۔ بھینچ کر اسے گلے لگالیا۔ پھر تینوں نے مل کر کھانا کھایا' جو پھوپھی صبح سے بنانے میں جتی ہوئی تھی۔ کھانے کے بعد آرزو گھر جانے لگی تو سامنے سے پھوپھا کریم گھر کے اندر داخل ہوئے۔ نظریں نیچی کرکے بڑے ادب سے آرزو نے سلام کیا۔ پھوپھا کریم کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور کئی گئے۔ سلام کا جواب دینا بھی بھول گئے۔ پھوپھی کا مارے خوشی کے برا حال ہوگیا۔ بازی لڑی بھی نہیں چاروں خانے چت گرادیا۔ خرم آرزو کو لے کر باہر نکل گیا۔

"یہ لڑکی یہاں کیا کرنے آئی تھی؟" اندر جاکر کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے لہجے کو حد درجہ نرم رکھ کر پوچھا گیا۔ جیسے اپنی کوئی تشویش چھپانا چاہ رہے ہوں یا بات کو سرے سے اہمیت ہی نہ دے رہے ہوں۔ پھوپھی لوٹ پوٹ ہوگئی۔

"سیما کی بیٹی ہے۔" لفظ سیما پر زور دے کر بتا نہیں جتایا گیا یا جتایا گیا' پر بات کا جواب نہ دیا گیا۔

"مجھے پتا ہے۔ یہاں کیا کرنے آئی تھی؟" لاکھ کوشش کے باوجود بھی وہ کھلی کتاب کے اندر غرق نہ ہوسکے۔

"گھر دیکھنے آئی تھی' جہاں اب اس نے ہمیشہ کے لیے آجانا ہے۔"

"کیا مطلب؟" کتاب پھوپھا کریم کے ہاتھوں سے گر گئی۔

"بہو بناؤں گی اس کو اس گھر کی۔۔۔ خرم نے پسند کرلیا ہے اسے۔" مستقل فق رنگ پھوپھا کریم کے چہرے پر تن گیا۔

"ایسے کیسے بہو بنائے گی تو اس کو۔۔۔ مجھے یہ رشتہ پسند نہیں۔"

"آپ سے پوچھتا کون ہے۔"

"بیٹا تو اپنے پیچھے سے لائی تھی۔"

"پیچھے سے نہیں لائی تھی' اس لیے تو جواب دے رہی ہوں' ورنہ تو بات بھی نہ سنتی۔"

"سیما کبھی نہیں مانے گی' مجھے پتا ہے۔"

"آپ دونوں کے دل کی راہیں تو شاید ہموار ہیں ابھی بھی۔۔۔ میں اس کے شوہر سے بات کروں گی۔ سنا ہے بڑا سمجھ دار آدمی ہے۔ بیٹی کی خوشی اور پسند کو ضرور سمجھے گا۔ ایسے بھی بات نہ بنی تو میں دونوں کی کورٹ میرج کروادوں گی۔"

"نہ میں نے کہہ دیا' یہ شادی نہیں ہوگی۔" پھوپھا کریم غصے کو دبائے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"بیٹے کی خوشی کا کیوں قتل کر رہے ہیں' کوئی وجہ بھی تو ہو۔"

"مجھے ان کا خاندان نہیں پسند۔" تھوڑی دیر لگی وجہ گھڑنے میں۔

"آپ کا ہی خاندان ہے۔ میں نے بھی تو جیسے تیسے کرکے گزارہ کر ہی لیا ہے پینتیس سال۔۔۔ خرم بھی کرلے گا۔"

"بند کر اپنی بکواس۔۔۔ خرم کو سمجھا دے' یہ فتور اپنے دماغ سے نکال دے۔ یہ شادی نہیں ہوگی کسی صورت۔۔۔" پھوپھا کریم کہتے ہوئے گھر سے باہر نکل گئے۔ پھوپھی نے کوئی اثر نہ لیا۔ ہفتے بھر بعد خرم سے کہہ کر اس نے ایک پھل اور دو مٹھائی کی ٹوکریاں منگوالیں۔ خرم خود باہر ٹیکسی لینے چلا گیا۔

"یہ کیا ہے؟" پھوپھا کریم گھر میں داخل ہوئے' پہلے سجی ہوئی ٹوکریوں کو دیکھا' پھر لشکارے مارتی پھوپھی کو۔

"رشتہ مانگنے جارہی ہوں۔۔۔ آرزو کا۔۔۔ خرم کے لیے۔۔۔ سیما کے گھر۔۔۔ آپ نے چلنا ہے' تو چلیے۔۔۔ اندر استری ہوئے کپڑے پڑے ہیں۔"

پھوپھا کریم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ٹوکریوں کو غصے سے چیرنا پھاڑنا شروع کردیا۔ ساتھ ساتھ چیختے بھی جاتے۔

"نہیں ہوگی یہ شادی' ہرگز نہیں ہوگی۔۔۔ کسی قیمت پر نہیں ہوگی۔" پھل اور مٹھائی فرش پر جابجا بکھر گئی۔ پھوپھی سہم کر پیچھے ہوگئی۔ مبادا کریم اسے بھی اسی طرح ادھیڑ نہ ڈالے۔ لیکن پھر اگلے ہی لمحے سہمی ہوئی پھوپھی پر سے دھند چھٹنے لگی اور اندر سے ایک کڑیل عورت نکل آئی۔

"اب تو میں یہ شادی کرواکر رہوں گی۔ چاہے میری جان کیوں نہ چلی جائے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے' میں سمجھوں گا اتنے سال مٹی کے ساتھ گزار دیے۔۔۔ تو میرے لیے کوڑے کا ڈھیر میں تیرے لیے پڑا رہا۔۔۔ ہمیشہ کے لیے۔۔۔ ہمیشہ کے لیے۔۔۔ ہمیشہ کے لیے۔"

ایک کرنٹ سا پھوپھی کو لگا۔ جیسے کسی نے جان انگوٹھے تک کھینچ کر دوبارہ جسم میں ڈال دی ہو۔ سمندر کے کھارے پانی کا ذائقہ اس نے اپنے حلق میں اترتا محسوس کیا۔

"اب یا تو بیٹے کا گھر بسائے گی یا اپنا۔" واردات سے گزر کر ہانپتے پھوپھا کریم کی آنکھوں میں اس نے جھانکا۔

"اتنی مخالفت بے سبب نہیں ہوسکتی' کہیں ایسا تو نہیں کہ سیما کی بیٹی آرزو کی رگوں میں تیرا خون دوڑ رہا ہے۔ کہیں وہ خرم کی سوتیلی بہن تو نہیں؟" دروازے تک پہنچے پھوپھا کریم وہیں کھڑے کھڑے مڑے۔ ان کا چہرہ دھواں دھواں ہورہا تھا۔ خود کو انہوں نے بڑی مشکل سے سنبھالا۔

"جو ایسا سوچ لیا ہے تو ایسا ہی سمجھ لے۔ لیکن اگر تو وہاں گئی تو خود کو مطلقہ سمجھیں۔" یہ کہہ کر وہ رکے نہیں' باہر نکل گئے۔

بیٹا اندر آیا تو فرش کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ پھر ماں پر نظر پڑی تو گویا پہاڑ گر پڑا۔ ہاتھ جوڑے ماں آنکھوں میں آنسوؤں کا طوفانی سیلاب لیے کھڑی تھی۔

"تجھ سے کبھی کچھ نہیں مانگا' نہ مانگوں گی۔۔۔ بس ایک احسان کردے' بنا وجہ پوچھے اس رشتے کو بھول جا۔۔۔ آرزو کو بھول جا۔" روتی بلکتی ماں کو ہاتھ جوڑے دیکھ کر خرم کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کو چپ کروائے یا اس کی بات مانے۔

"لے کچھ پیسے' کراچی چلا جا۔۔۔ اپنے بھائی کے پاس۔۔۔ وہاں سے چاہے سعودیہ عرب نکل جائے اور دوبارہ کبھی واپس نہ آنا' کبھی بھی نہ۔"

"تو جیسا چاہے گی ویسا ہی کروں گا۔۔۔ لیکن خدا کے لیے رو مت۔۔۔"

"بس آج ہی تو رو رہی ہوں۔ آج کے بعد پھر کبھی نہیں روؤں گی' پکا وعدہ۔۔۔ جا اب چلا جا۔"

جس ٹیکسی پر خرم' آرزو کی طرف جانا چاہتا تھا اس ٹیکسی پر وہ ریلوے اسٹیشن چلا گیا۔ وہ رات ڈاکازن کی طرح ایک دم سے آدھمکی تھی۔ لیکن پھر چوروں کی طرح بڑی آہستگی سے گئی۔ صبح کے عالم میں بھی رات ہی غالب رہی۔ پھوپھی ہمیشہ کے لیے بھائی شکیل کے گھر چلی گئی۔

تین ماہ سے بھی زیادہ کا عرصہ ہوگیا۔ کراچی' سعودیہ والے بیٹوں کے فون بھی آگئے۔ بہو نے بھی آکر چکر لگالیا۔ لیکن پھوپھی اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئی۔

"جھوٹ بولتا ہے وہ۔۔۔ اس نے مجھے خود طلاق دی ہے۔۔۔ صحن کے بیچ و بیچ۔۔۔ کھڑے کھڑے۔۔۔"

"پر زبیدہ باجی۔۔۔" شکیل نے بڑی لجاجت سے کہا "کریم مسجد میں بیٹھ کر کہتا ہے کہ اس نے تجھے طلاق نہیں دی۔ کہتا ہے کہ قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم کھانے کو تیار ہوں۔" پھوپھی نے ایک ٹک بھائی کو دیکھا جو بڑے دنوں سے گھن چکر بنا ہوا تھا۔

"میں بھی قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم کھانے کو تیار ہوں۔ اس نے مجھے کہا تو میرے لیے کوڑے کا ڈھیر میں تیرے لیے پڑا رہا۔۔۔ ہمیشہ کے لیے۔۔۔ ہمیشہ کے لیے۔۔۔ ہمیشہ کے لیے۔"

"یہ الفاظ بولے تھے اس نے؟" شکیل نے حیرت سے بہن کو دیکھا۔

"ہاں ہاں۔۔۔" املتاس کے پتے گرنے لگے۔

"تو پگلی! ایسے طلاق تھوڑی نہ ہوتی ہے' طلاق تو۔۔۔" شکیل کو بات بیچ میں ہی روک دینا پڑی۔ پھوپھی اس کی طرف ایسے دیکھ رہی تھی جیسے کسی جن کو دیکھ رہی ہو۔

"صرف طلاق کا لفظ نہیں بولا۔۔۔ لیکن باقی پیچھے چھوڑا بھی کیا؟" شکیل دوبارہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے خرم' آرزو' سیما' کریم کا قصہ پہلی بار سنا۔ زبیدہ کے منہ سے ہی۔ پھوپھی نے یہ سب بتانے سے پہلے اللہ کا پکا وعدہ لیا تھا۔ کسی اور کو نہ بتانے کا۔ سب سن کر شکیل چپ ہوگیا۔ بڑی دیر ماتھے کو سہلاتا رہا۔

"مان لے۔۔۔ تیرے دل میں ابھی بھی اس کی چاہت ہے۔ ورنہ تو بتانے سے پہلے وعدہ نہ لیتی۔۔۔ تو پردہ رکھنا چاہتی ہے اس کے گناہ کا۔"

"غور سے سن شکیل ویر۔۔۔ اور پلے باندھ۔۔۔ ایک بھرم عورت کا ہوتا ہے اور ایک دعوا مرد کا۔۔۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ اس کو بے پردہ کروں۔۔۔ لیکن اس نے میرا بھرم توڑ دیا ہے۔"

"یہ طلاق۔۔۔ اس عمر میں۔" شکیل اسی طرح سوچوں میں گم رہا۔ کمرے میں ہوتے ہوئے بھی غیر حاضر۔ وہی تو میں کہتی ہوں شکیل ویر۔۔۔ طلاق کی تو یہ عمر نہیں۔ اس عمر میں تو عورت کے پاس صرف بھرم ہی رہ جاتا ہے۔ وہ ٹوٹ جائے تو بھلا پھر پیچھے کیا رہ جاتا ہے۔ تو بتا پھر پیچھے کیا باقی رہ جاتا ہے۔" پھوپھی نے کہا۔۔۔ اور بڑی دیر خاموش رہی۔

اپنے ماتھے کو سہلاتے شکیل نے دور خلاؤں میں گھورتی آنسوؤں کے بند باندھے اپنی بہن کو دیکھا۔ جس کے جھریوں زدہ چہرے پر بڑے عجیب سے رنگ تھے۔ بڑے ہی عجیب سے۔

☆

نمرہ احمد

نمل

فارس غازی انٹیلی جنس کے اعلا عہدے پر فائز تھا۔ فارس غازی اپنے سوتیلے بھائی وارث غازی اور اپنی بیوی کے قتل کے الزام میں چار سال سے جیل میں قید ہے۔ سعدی یوسف فارس غازی کا بھانجا ہے جو اپنے ماموں فارس غازی سے جیل میں ہر ہفتے ملنے آتا ہے۔

سعدی یوسف تین بہن بھائی ہیں۔ ان کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ سعدی یوسف کی والدہ نے کڑی مشقت کر کے بچوں کی پرورش کی ہے، حنین اور اسامہ، سعدی سے چھوٹے ہیں۔ ان کی والدہ ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ چلاتی ہیں۔ زمر، سعدی

مکمل ناول



پانچویں قسط ۵

یوسف کی پھپھو ہے۔ وہ چار سال قبل فائرنگ کے ایک واقعہ میں زخمی ہوجاتی ہے۔ فائرنگ کا الزام فارس غازی پر ہے۔ فارس غازی کو شک تھا کہ اس کی بیوی اس کے بھائی کے ساتھ انوالو ہے۔ اس نے جب فائرنگ کی تو زمر اس کی بیوی کے ساتھ تھی فائرنگ کے نتیجہ میں بیوی مرجاتی ہے اور زمر شدید زخمی ہوجاتی ہے۔ ایک انگریز عورت اپنا گردہ دے کر اس کی جان بچاتی ہے۔ فارس غازی 'سعدی یوسف کا ماموں ہے۔ اسے یقین ہے کہ اس کا ماموں بے گناہ ہے۔ اسے پھنسایا گیا ہے۔ اس لیے وہ اسے بچانے کی کوشش کرتا ہے' جس کی بنا پر زمر اپنے بھتیجے سعدی یوسف سے بدظن ہوجاتی ہے۔ بدظن ہونے کی ایک اور بڑی وجہ یہ ہے کہ زمر جب موت و زندگی کی کشمکش میں ہوتی ہے تو سعدی اس کے پاس نہیں ہوتا۔ وہ اپنی پڑھائی اور امتحان میں مصروف ہوتا ہے۔

جواہرات کے دو بیٹے ہیں۔ ہاشم کاردار اور نوشیرواں۔

ہاشم کاردار بہت بڑا وکیل ہے۔ ہاشم اور اس کی بیوی شہرین کے درمیان علیحدگی ہوچکی ہے۔ ہاشم کاردار کی ایک بیٹی سونیا ہے۔ جس سے وہ بہت محبت کرتا ہے۔ ہاشم سونیا کی سالگرہ دھوم دھام سے منانے کی تیاریاں کررہا ہے۔

فارس غازی 'ہاشم کاردار کی پھپھو کا بیٹا ہے۔ جیل جانے سے پہلے وہ ہاشم کے گھر میں' جس میں اس کا بھی حصہ ہے' رہائش پذیر تھا۔ فارس غازی کے جیل جانے کے بعد اس کا پورشن مقفل ہے۔

سعدی یوسف کے لیے وہ دن خوشیوں سے بھرپور تھا جب اسے فارس غازی کے رہا ہونے کی خبر ملتی ہے۔

ہاشم نے یہ خبر سن کر عہد کیا کہ اگر اس میں سعدی کا ہاتھ ہے تو اسے اس کا حساب دینا ہوگا۔ فارس غازی جیل سے نکلتا ہے تو سعدی یوسف ان کا منتظر ہوتا ہے۔ فارس اس سے قبرستان چلنے کو کہتا ہے۔ قبرستان جاکر فارس دو قبروں پر فاتحہ پڑھتا ہے۔ وہ گاڑی سے اترتے ہوئے سعدی کا موبائل لے لیتا ہے۔ قبرستان میں وہ کسی کو فون کرکے کوئی ہتھیار منگواتا ہے۔

ہاشم کاردار' زمر کو اپنی بیٹی سونیا کی سالگرہ کا کارڈ دینے کے ساتھ سعدی کا کارڈ بھی زمر کو دے دیتا ہے۔

زمر کے والد کو اپنے پوتے سعدی یوسف سے بہت محبت ہے۔ وہ زمر سے کہتے ہیں' سعدی کی سالگرہ پروش کرنے ان کے گھر جائے۔ وہ پھول لے کر کارڈ دینے سعدی کے گھر جاتی ہے۔ زمر کو دیکھ کر سعدی کے ساتھ تمام گھر والے حیران ہوجاتے ہیں۔ زمر' سعدی کو سونیا کی سالگرہ کا کارڈ دیتی ہے۔

زمر کے جانے کے بعد سعدی نے ہاتھ میں پکڑے سیاہ اور سنہرے کارڈ کو دیکھا۔ اسی وقت ایک منظر اس کی آنکھوں کے سامنے جھلملایا۔ اس نے ہوٹل میں ہاشم کے لیپ ٹاپ پہ فلیش ڈرائیو لگایا تھا۔ وہ اس کے لیپ ٹاپ سے ڈیٹا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ سعدی نے جب بیگ سے ٹیبلٹ نکالا تو اسے پریس کرنے کے بعد اسکرین پہ پیغام آیا کہ آپ کی ڈیوائس کو ایک ہارڈ ڈرائیو ملی ہے' کیا آپ سارا ڈیٹا کاپی کرنا چاہیں گے؟ سعدی نے مسکراتے ہوئے "لیس" دبایا۔ اسکرین پہ دوسرا پیغام دیکھ کر سعدی کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔

اسکرین پہ پیغام جل بجھ رہا تھا کہ "پاس ورڈ داخل کریں" سعدی کے پاس 'پاس ورڈ نہیں تھا۔

سعدی یوسف' ہاشم کاردار کی سابقہ بیوی شہرین سے ایک شاپنگ مال میں مل کر کہتا ہے۔ مجھے آپ سے ہاشم بھائی کے لیپ ٹاپ کا پاس ورڈ چاہیے۔ شہرین' سعدی سے کہتی ہے کہ "تم کیا کرنے جارہے ہو؟" سعدی زخمی مسکراہٹ کے ساتھ کہتا ہے کہ "ہاشم بھائی نے جو ہم سے چرایا تھا' میں وہ واپس چرانے جارہا ہوں۔"

شہرین نوشیرواں کے پاس جاکر کہتی ہے کہ سونیا کو اس کی اور ہاشم کی ہنی مون کی پکچرز چاہئیں۔ یہ جھوٹ بول کر نہایت چالاکی سے شہرین نوشیرواں سے ہاشم کے لیپ ٹاپ کا پاس ورڈ حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتی ہے۔

حنین یوسف پر اس کی دوست کی وجہ سے کمرہ امتحان میں نقل کا الزام لگتا ہے' ٹیچرز حنین سے کہتی ہیں کہ اس پر کیس بنے گا اور وہ تین سال تک پیپرز نہیں دے سکتی۔ وہ حنین کو آفس میں بٹھا کر چلی جاتی ہیں تو حنین کی نظر میز پہ سپرنٹنڈنٹ کے پرس کے ساتھ رکھے موبائل پر پڑتی ہے۔ حنین موبائل اٹھا کر دھڑکتے دل سے ہاشم کا نمبر ملا کر اسے تمام صورت حال

سے آگاہ کرتی ہے۔ ہاشم کچھ دیر بعد ہی امتحانی مرکز میں پہنچ جاتا ہے اور کمال ہوشیاری سے حنین کو مشکل وقت سے نہ صرف نکلواتا ہے بلکہ حنین کو پیپر مکمل کرنے کے لیے ٹیچرز سے ایکسٹرا ٹائم بھی دلوا دیتا ہے۔

پیپر دینے کے بعد حنین ہاشم کا شکریہ ادا کرتی ہے اور ہاشم سے کہتی ہے۔ کہ سعدی بھائی کو اس معاملے کے بارے میں مت بتائیے گا۔ ہاشم حنین سے پارٹی میں آنے کا پوچھتا ہے' جس پر حنین کہتی ہے کہ پارٹی میں ہم سب آئیں گے۔

قصر کے سبزہ زار میں سیاہ شام سنہرے تاروں کے ساتھ جلوہ گر تھی۔ روشنیاں' قہقہے' سیاہ اور سنہری امتزاج سے سجی سونیا کی سالگرہ کی تقریب کی رونق عروج پر تھی۔

حنین سنہری فراک میں جبکہ سعدی' اسیم اور زمر سیاہ سوٹ میں ملبوس تقریب میں شریک تھے۔ شہرین ان کی میز کے پاس آکر زمر کو ڈی اے کہہ کر پکارتی ہے اور سعدی سے رسمی سا حال احوال پوچھ کر کمال مہارت سے ٹیب پکڑا کر وہاں سے چلی جاتی ہے۔ سعدی ٹیب کو کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ کر سوچتا ہے کہ آدھا کام ہوگیا مگر ابھی پاس ورڈ لینا باقی ہے۔

جواہرات دو' تین خواتین کے ساتھ سعدی اور زمر کی میز کی طرف آتی ہے۔ جواہرات اپنی فرینڈز سے زمر کا تعارف کرواتی ہے پھر سعدی یوسف کا تعارف بھی کروا کر سعدی سے کہتی ہے کہ وہ اپنا شجرہ نسب ان خواتین کو بتائے۔ نوشیرواں قدرے فاصلے پر کھڑا تند نظروں سے ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔ سعدی سمجھ جاتا ہے کہ جواہرات اس وقت نوشیرواں کی بے عزتی کا بدلہ اتار رہی ہے پھر سعدی اپنا شجرہ نسب ایسا بتاتا ہے کہ جس سے نوشیرواں کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور جواہرات کے چہرے کا رنگ اڑ جاتا ہے اسی دوران جواہرات اپنی فرینڈز سے زمر کے سابقہ منگیتر حماد کا ذکر چھیڑ دیتی ہے' جس کی وجہ سے زمر ڈسٹرب ہوجاتی ہے۔

شہرین بڑی ہوشیاری سے سعدی کو پاس ورڈ بتادیتی ہے۔

دوسری جانب زمر کا گیسٹ روم میں فارس سے سامنا ہوجاتا ہے فارس کو دیکھ کر زمر غصے میں باہر کی طرف آجاتی ہے۔

پاس ورڈ ملنے کے سعدی ہاشم کے کمرے میں جاکر اس کے لیپ ٹاپ پہ فلیش ڈرائیو لگا کر ڈیٹا کاپی کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔

چیف سیکیورٹی آفیسر خاور' ہاشم کو اس کے کمرے کی فوٹیج دکھاتا ہے' جس میں سعدی کمرے میں جاتے ہوئے نظر آتا ہے' ہاشم' خاور کے ساتھ بھاگتا ہوا کمرے میں پہنچتا ہے' لیکن سعدی پکڑ میں آئے بغیر وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔

ہاشم غصے میں خاور سے کہتا ہے کہ سعدی جیسے ہی ایگزٹ پر پہنچے' اسے روکو۔ جبکہ ملازمہ فوراً ہاشم کے کہنے پر جان بوجھ کر سعدی سے ٹکراتی ہے اور اس کے کوٹ میں نیکلس ڈال کر معذرت کرتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہے۔

جیسے ہی زمر' سعدی' حنین اور اسیم گھر جارہے ہوتے ہیں تو خاور انہیں روک کر بتاتا ہے کہ مسز جواہرات کا نیکلس چوری ہوگیا ہے' زمر غصے میں خاور سے کہتی ہے کہ یہ میری فیملی کے بچے ہیں' ان کی تلاشی لینے سے پہلے میری تلاشی لینا ہوگی۔ اسی دوران ہاشم بھی وہاں آجاتا ہے اور پھر بگڑتی صورت حال دیکھ کر انہیں جانے دیتا ہے۔

ریسٹورنٹ کا بل دینے کے لیے سعدی حنین سے اپنے کوٹ سے والٹ نکالنے کو کہتا ہے' حنین کے ہاتھ میں والٹ کے بجائے نیکلس آجاتا ہے۔ زمر کی نگاہیں نیکلس کو دیکھ کر ٹھہر جاتی ہیں' زمر غصے میں سعدی کو کہتی ہے اسے گھر ڈراپ کردے۔

ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی اس کے کمرے میں لیپ ٹاپ سے ڈیٹا کاپی کرنے آیا تھا اور شہرین نے نوشیرواں کو استعمال کرکے پاس ورڈ سعدی کو دیا تھا۔

دوسری جانب بڑے ابا زمر کو یہ بتادیتے ہیں کہ زمر کو کسی یورپین خاتون نے نہیں بلکہ سعدی نے گردہ دیا تھا۔ یہ سن کر زمر کو بے حد دکھ ہوتا ہے۔

زمر سعدی کے ریسٹورنٹ جاتی ہے اور اسے کہتی ہے کہ بڑے ابا نے اسے بتادیا ہے کہ اسے گردہ کسی خاتون نے نہیں بلکہ اس نے دیا ہے۔ اسی دوران فارس وہاں آجاتا ہے جسے دیکھ کر زمر نفرت آمیز نگاہ فارس پر ڈال کر وہاں سے چلی جاتی ہے۔

سعدی بہت دنوں بعد آفس جاتا ہے اور اپنی باس سارہ کو فیلڈ رپورٹ دے کر کہتا ہے کہ اس نے کام مکمل کرلیا ہے' اور

فیلڈ پہ جانے کی تیاری بھی مکمل کرلی ہے۔

مرحوم ذوالفقار یوسف کے گھر میں سعدی کے دادا' پھپھو زمر' والدہ اور بہن بھائی خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ اسی دوران حنین سعدی کے کمرے میں جاتی ہے تو وہاں سعدی کے کھلے لیپ ٹاپ کے اسکرین پہ چلتے نمبرز دیکھ کر حیران ہوتی ہے سعدی جلدی سے آکر لیپ ٹاپ پر اپنا ایک ہاتھ مار کر بند کردیتا ہے۔

ہاشم سعدی سے ملاقات کا کہتا ہے۔ وہ ہاشم کو ٹالنے کے لیے ہاں کہہ دیتا ہے۔

نوشیرواں ایک بار پھر ڈرگز لینے لگتا ہے اس بات پر جواہرات فکرمند ہے۔

حنین اپنے اور سیم کے مشترکہ کمرے میں آتی ہے جب الماری کھولتی ہے تو اس کی نظر سنہری مخملیں ڈبے پر پڑتی ہے تو اس کے اندر ایک لاکٹ رکھا تھا۔ اس کی زنجیر میں سیاہ ہیرے کی شکل کا پتھر پرویا تھا جس کے اوپر سنہرے حروف میں "اینٹس ایور آفٹر" کندہ تھا۔ یہ سعدی کی چین کا جزداں تھا۔

سارہ آفس جانے کے لیے تیار ہورہی تھی کہ فارس آجاتا ہے۔ فارس سارہ سے پوچھتا ہے کہ کیا اس کے خیال میں اس نے ہی وارث کو قتل کیا تھا؟ سارہ جواب میں کہتی ہے کہ اسے یقین ہے کہ اسے پھنسایا گیا تھا۔

ہاشم کی سیکریٹری کال کرکے اسے بتاتی ہے کہ آج سعدی اپنی مصروفیت کی بنا پر نہیں آرہا۔ وہ سمجھ جاتا ہے کہ سعدی کو جب تک کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملے گا' وہ اس سے ملاقات کو یونہی ٹالتا رہے گا۔

ہاشم سعدی کو فون کرتا ہے کہ کیا ہم اچھے وقتوں میں واپس جاسکتے ہیں' جب تم مجھے دل سے ہاشم بھائی کہتے تھے۔ ہاشم کی بات پہ سعدی "شاید نہیں" کہہ کر کال کاٹ دیتا ہے۔

دوسری طرف سعدی لیپ ٹاپ پہ فائلز کھولنے کی کوشش کرتا ہے لیکن فائلز ڈیمج ہوجاتی ہیں۔ سعدی پریشان ہوکر سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیتا ہے۔ اس وقت سعدی اپنے ماضی کے اچھے وقتوں کی یادوں میں کھوجاتا ہے۔ وہ سب باتیں یاد آنے لگتی ہیں جب ہاشم کو دل سے بھائی کہتا تھا اور جواہرات کے دل میں اس نے کس طرح اپنی جگہ بنائی تھی اور نوشیرواں سے بھی اس کی اس وقت دوستی ہوگئی تھی۔ ماضی کے تمام واقعات ایک ایک کرکے سعدی کے سامنے کسی کہانی کے کرداروں کی طرح گھوم رہے تھے۔

سعدی حنین کو بتاتا ہے کہ وہ گیم کے ہائی اسکورز کی فہرست میں پہلے نمبر پر نہیں ہے' حنین حیران ہوکر اپنی گیم والی سائٹ کھول کر دیکھتی ہے تو پہلے نمبر "آنٹس ایور آفٹر" (Ants ever after) لکھا ہوتا ہے وہ علیشا ہے وہ جیت گئی ہے۔ حنین کی علیشا سے دوستی ہوجاتی ہے۔

سعدی نے ہاشم کے کمپیوٹر سے جو فائلز لی تھیں' وہ انہیں ری اسٹور نہیں کرپاتا' وہ ڈیٹا تباہ ہوجاتا ہے۔

ایک رشتے دار کی شادی کی تقریب میں زمر اور سعدی کی فیملی کے ساتھ زمر کے سابق منگیتر حماد اور اس کی بیوی کرن بھی آئے ہوئے ہوتے ہیں۔ کرن زمر کو دیکھ کر اپنی کزن سے زمر کے بارے میں ایسی باتیں کرتی ہے جسے سن کر زمر کو بہت دکھ ہوتا ہے۔

اسی دوران سعدی کی والدہ ندرت زمر کو سعدی کے لیے لڑکی دکھاتی ہیں۔ زمر کو وہ لڑکی اچھی لگتی ہے۔

سیم ندرت سے کہتا ہے کہ اگر لڑکی والوں نے رشتہ دینے سے انکار کردیا تو؟

اس پر زمر کہتی ہے کہ کیوں انکار کریں گے؟ کوئی وجہ بنتی ہے کیا؟ اس بات پر حنین بے ساختہ کہتی ہے۔

"بغیر وجہ کے بھی انکار ہوجاتے ہیں جیسے آپ نے فارس ماموں کے رشتے سے انکار کیا تھا۔" یہ سن کر زمر بالکل ساکت خاموش رہ جاتی ہے۔

درحقیقت زمر کو فارس کے رشتے کے بارے میں کچھ بھی علم نہیں تھا کہ کب رشتہ مانگا گیا تھا؟ کب انکار ہوا؟

زمر کے ذہن میں یہ بات آتی ہے فارس نے اس سے ٹھکرائے جانے کا انتقام لیا تھا۔

زمر بصیرت صاحب کو فون کرکے کہتی ہے کہ اسے ایک کیس فائل چاہیے۔

"سرکار بنام فارس غازی"

"بیماری میں اور صحت میں"

اے گلاب
تم بیمار ہو
نادیدہ کیڑا جو رات میں اڑتا ہے
برستے طوفان میں
اس نے ڈھونڈ لیا ہے تمہارا بستر
سرخ لطف تک
اور اس کے گہرے خفیہ عشق نے
برباد کردی ہے
تمہاری زندگی
(ولیم بلیک کی نظم "بیمار گلاب")

(وارث غازی قتل سے تین دن پہلے)

ذوالفقار یوسف کے گھر کے چھوٹے سے کچن میں شرارت بھری خاموشی چھائی تھی۔ کاؤنٹر پہ دو ڈشز رکھی تھیں۔ ایک خالی' ایک میں تازہ بیک شدہ کیک جس کی تہیں کاٹ کر اندر کریم بھری گئی تھی۔ اب اس کیک کو دوسری صاف ڈش میں رکھنا تھا۔

سعدی نے نچلا لب دبائے مسکراتے ہوئے حنین کو دیکھا جو آستینیں چڑھائے کیک کے قریب ہاتھ لے جاتی' پھر واپس کھینچ لیتی۔

"میں ڈال دوں حنہ؟"

"خبردار! یہ نرم ہے۔ ٹوٹ جائے گا۔ اسے ہاتھ بھی مت لگایئے گا۔" وہ غصے سے بولی۔

"انگلی لگالوں؟" سعدی نے انگلی اس طرف بڑھائی۔ حنین نے زور سے اس کی انگلی پہ ہاتھ مار کر پیچھے ہٹایا۔

"میں چھت سے نیچے پھینک دوں گی آپ کو۔ پھپھو کی شادی میں پلستر چڑھا ہوگا۔" آج کل حنین کی ہر بات میں دو ہفتے بعد ہونے والی پھپھو کی شادی کا تذکرہ ضرور ہوتا تھا۔

"اول فول نہ بولا کرو ہر وقت۔" ندرت نے اسے گھورتے ہوئے کفگیر دکھایا۔ سعدی دل کھول کر ہنسا۔

"یار حنہ! امی کو ابھی تک ہمارے خلاف کفگیر' جوتے اور وائپر کے علاوہ کوئی ہتھیار نہیں ملا؟"

ندرت نہ چاہتے ہوئے بھی ہنس دیں اور چولہے کی طرف مڑ گئیں۔ حنہ کا کیک ابھی تک ویسے ہی پڑا تھا اور وہ ڈرتے ڈرتے ہاتھ اس طرف بڑھا رہی تھی تب ہی فون کی گھنٹی بجی۔

ندرت نے "سعدی" کو پکارا اور سعدی نے حنین کو دیکھا' پھر نظروں سے اس کا دروازے سے فاصلہ ناپا۔ "تم قریب ہو تم اٹھاؤ۔"

اور یہ تو ان کا اصول تھا کہ جو قریب ہوگا' وہی کام کرے گا' حنین اونہہ کرکے لاؤنج میں گئی۔ جلد ہی واپس بھی آگئی۔ دوبارہ آستینیں چڑھالیں۔

"زرتاشہ آنٹی کا فون تھا۔" خود سے دس گیارہ سال بڑی زرتاشہ کو آنٹی کہنا عجیب لگتا تھا مگر پانچ ماہ سے کہہ کہہ کر وہ عادی ہوگئی تھی۔

"کیا کہہ رہی تھی؟" اس نے ندرت کا سوال نظر انداز کیا۔ وہ چمچے اٹھا کر احتیاط سے کیک تلے لائی' اسے اٹھایا اور آہستہ سے دوسری ڈش میں بچھایا۔ پھر "شکر" کہتی سیدھی ہوئی۔ سعدی ہنوز مسکرا رہا تھا۔

"وہ پوچھ رہی تھیں کہ ہم پرسوں سونیا کی سالگرہ میں آرہے ہیں یا نہیں؟"

"یہ سونیا کی سالگرہ سال میں کتنی دفعہ ہوتی ہے؟" سعدی کو حیرت ہوئی۔ "میری سالگرہ سے چھ دن بعد ہوتی ہے اس کی اور میری دو ماہ پہلے گزر چکی۔"

"مگر دو ماہ پہلے ہاشم بھائی باہر گئے ہوئے تھے' وہیں منائی پھر واپس آکر یہاں کا فنکشن کرنے کا وقت اب ملا ہے۔ یہ بھی زرتاشہ آنٹی نے بتایا ہے۔ ہاں مگر میں نہیں جاؤں گی۔"

ندرت نے ہانڈی میں چمچ ہلاتے ہوئے تعجب سے پلٹ کر اسے دیکھا جو اپنے کیک پر کافی بے ڈھنگے انداز میں کریم پھیلا رہی تھی۔ (کب سیکھے گی یہ لڑکی سلیقہ؟)

"کیوں؟"

"کیا فائدہ امیروں کی دعوت میں جانے کا اگر وہ کیمرہ' موبائل ہی اندر نہ لے جانے دیں۔ بندہ پکچرز ہی بنالیتا ہے۔"

"یہ کوئی وجہ نہیں۔ تم نے جب یہی بات پچھلی دفعہ ہاشم بھائی سے کہی تھی تو انہوں نے کہا تھا کہ تم لے آیا کرو کیمرہ، تمہیں کوئی نہیں روکے گا۔ اور پھر تمہیں پارٹی کی تصویریں بھی ای میل کروادی تھیں۔"

"بس بھائی کو موقع چاہیے ان ہاشم بھائی کے دفاع کا۔ بالکل بھی نہیں پسند مجھے مصنوعی مسکراہٹوں والے ہاشم بھائی اور ان کی ممی۔ انکل اچھے ہیں' اور وہ بم پھٹے بالوں والا نوشیرواں بھی بہتر ہے۔"

پھر چونک کر سعدی کو دیکھا' ذرا قریب کھسک آئی اور سرگوشی کی۔ "آپ کی اس سے صلح ہوئی؟"

"صلح؟ بات تک نہیں ہوتی۔ جب سے ڈر گزوالی بات اس کی ممی کو بتائی تھی تب سے مجھے بس غصے سے گھور کر نکل جاتا ہے۔"

"کیا اب بھی ڈر گز لیتا ہے؟" حنین کو تجسس ہوا۔

سعدی نے اسے گھورا۔ "نہیں لیتا میرے خیال سے مگر یہ بات دہرانا نہیں آگے پیچھے۔"

"اب رکھ بھی دو اس کیک کو فریج میں۔ کھانا بننے والا ہے' پہلے وہ تو کھاؤ۔" امی نے ڈانٹ کر کہا۔ وہ کریم لگاتے ہوئے بے نیازی سے بولی۔

"امی! میں اس بات پہ یقین رکھتی ہوں کہ انسان کو خوب مزے سے ہر چیز کھالی چاہیے' اور جو منع کرے۔" نظر اٹھا کر ندرت کو گھورا۔ "اسے بھی کھا جانا چاہیے تھا۔"

ندرت کچھ کرارا سناتیں' مگر ڈور بیل بجی۔ اب کے سعدی قریب تھا۔

"جاؤ سعدی! پھپھو ہوں گی۔" وہ مسکرا کر دروازے کی طرف جانے لگا' پھر رکا' مسکراہٹ غائب ہوئی' چہرے پہ خفگی آئی' بھنویں بھینچ لیں' اور سنجیدگی سے جاکر دروازہ کھولا مگر یوں کہ ہینڈل پکڑے رکھا اور راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

باہر زمر تھی۔ نکھری نکھری سی' سعدی کو دیکھ کر مسکرائی۔ وہ مشکوک نظروں سے اسے گھورتا رہا۔

"کون ہے سعدی؟" کوئی آواز نہ آنے پہ ندرت نے پکارا۔

"ایک خاتون ہیں۔ بال گھنگھریالے' آنکھیں بھوری' عمر انتیس سال' اور چہرے پہ خوشامدی مسکراہٹ۔" پھر ذرا وقفہ دے کر زمر کو مخاطب کیا۔ "جی فرمایئے؟"

وہ اسی طرح مسکراتے ہوئے بولی۔ "لارڈ وولڈیمورٹ کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

سعدی ناراضی سے پیچھے ہوا' اور دروازہ بند کر دیا۔ ندرت نے کچن سے نکلتے ہوئے یہ منظر دیکھ لیا' ہکا بکا رہ گئیں۔ "پھپھو کو اندر بلاؤ۔"

"رہنے دیں امی! یہ خاتون باہر کھڑی زیادہ اچھی لگ رہی ہیں۔" منہ دروازے کے قریب کرکے اونچی آواز میں کہا۔ زمر نے مسکراتے ہوئے انگلی سے دروازہ بجایا۔ اس نے دوبارہ دروازہ کھولا' اسی سنجیدگی سے پوچھا "جی؟"

"پروفیسر اسنیپ ٹھیک ہے؟"

سعدی برا سا منہ بنا کر پھر سے دروازہ بند کرنے لگا' زمر نے جلدی سے اپنا پاؤں چوکھٹ پہ اڑا دیا۔ اور مصالحانہ انداز میں بولی۔ "اچھا چلو' تم رون ویسلے کا کردار لے لو۔ اب خوش؟"

ساتھ ہی ہاتھ میں موجود کاغذوں کا پلندہ لہرایا۔ سعدی مشتبہ نظروں سے اسے گھورتا رہا' پھر راستہ چھوڑ دیا۔ وہ مسکراتی ہوئی اندر آئی' کاغذ کے پلندے سے اس کا شانہ تھپکا' اور گول میز تک آئی۔

حنین تب ہی باہر آئی۔ زمر کو دیکھ کر مسکرائی' سلام کیا۔ وہ بھی جواباً مسکرائی۔ فارس کے رشتے کے انکار کو ایک سال بیت چکا تھا' اور حنین کی سرد مہری ختم تو نہیں' مگر کم ضرور ہو گئی تھی۔

"آؤ بیٹھو۔ کیسی ہو تم؟" ندرت ہاتھ پونچھتی ادھر آئیں' ساتھ ہی سعدی کو لتاڑا۔ "یہ کیا طریقہ ہے' پھپھو کو اندر کیوں نہیں آنے دے رہے تھے؟"

"یہ اس وقت بالکل بھی میری پھپھو نہیں ہیں۔" وہ جل کر بولا۔ "یہ صرف پراسیکیوٹر ہیں جو ہیری پوٹر کو سزا دلوانا چاہتی ہیں۔"

(ایک تو یہ موا ہیری پوٹر بھی نا…) ندرت نے

سوالیہ ان سب کو دیکھا۔ زمر مطمئن سی مسکراتی ہوئی کرسی کھینچ کر بیٹھی۔

"میرے پرانے کالج میں ایک موک ٹرائل ہے سرکار بنام ہیری پوٹر۔ مجھے پہلے بطور جج مدعو کیا گیا تھا مگر دفاع کے پاس ایک پرانا ٹیچر تھا' اور میری پراسیکیوشن کے اسٹوڈنٹس سے بنتی بہت ہے' سو میں نے جج کے بجائے استغاثہ بننا بہتر سمجھا۔ اب اس کو دو دن سے کہہ رہی ہوں' کوئی کردار بن کر گواہی دینے کے لیے آجائے' مگر نہیں۔"

"موک ٹرائل؟" ندرت نے استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

"موک ٹرائل جس میں کسی فیری ٹیل' جنگی واقعہ' یا کسی بھی حقیقی یا فرضی کیس کو لے کر کارروائی کی جائے' اور فیصلہ سنایا جائے۔ مقصد عموماً طلبا کو سکھانا ہوتا ہے۔" زمر نے وضاحت کی۔

"سرکار بنام ہیری پوٹر؟" حنین کو دلچسپی ہوئی مگر جھجکتے ہوئے پوچھا۔ "ہیری پہ الزام کس چیز کا ہے؟"

"میں بتاتا ہوں۔" سعدی جو دو دن سے اس "غیر انسانی" کیس پہ تپا ہوا تھا' بولنے لگا۔ "یاد ہے فورتھ بک میں' ٹورنامنٹ کے اختتام پہ ہیری کے ساتھ مقابلے باز لڑکے سیڈرک کو وولڈیمورٹ نے مار دیا تھا؟"

حنین نے اثبات میں سر ہلایا۔

"مگر جب ہیری سیڈرک کی لاش اور ٹورنامنٹ کے کپ کے ساتھ واپس آیا تو پولیس نے اسے گرفتار کر لیا اور اس پہ الزام لگایا کہ اس نے ہی سیڈرک کو قتل کیا ہے۔" "اور پھپھو استغاثہ میں ہیں۔ اور ہیری کو قاتل ثابت کروا کر ہی دم لیں گی۔"

زمر نے شانے اچکائے۔ "فیصلہ کرنا جج کا کام ہے۔ میں تو صرف دلائل دوں گی۔ آخر ہیری اپنے حریف کی لاش کے ساتھ ملا تھا۔"

"مگر آپ کو رون کی گواہی کی ضرورت کیوں ہے؟" سعدی الجھا۔ "رون تو ہیری کا دوست ہے' وہ تو اس کے حق میں گواہی دے گا۔"

"ہاں' ٹھیک ہے' دے دے حق میں گواہی۔" وہ اب اسے وہ کاغذ نکال کر دے رہی تھی جن میں رون سے متعلق نوٹس تھے۔ چونکہ یہ نان اسکرپٹڈ ٹرائل تھا' اس لیے مشکل تھا۔ زمر عدالت میں کوئی بھی سوال کر سکتی تھی۔ وہ ذرا متوجہ ہو کر سننے لگا۔

حنین خاموشی سے اٹھ آئی۔ امی کی ہانڈی دم پہ تھی اور وہ سعدی کے کمرے میں اس کی چیزیں جوڑ رہی تھیں۔ وہ ہفتہ پہلے آیا تھا' ڈیڑھ ماہ کے لیے۔ ملنے ملانے میں ہی یہ دن گزر گئے زمر کی شادی سر پہ تھی۔ اس سے پہلے وہ کوئی چھ ماہ قبل آیا تھا' بھاگم بھاگ چار دن کے لیے۔ بڑی امی کی وفات پہ۔ سب نے منع کیا کہ "مت آؤ' ایگزامز قریب ہیں۔" مگر وہ آگیا اور چلا بھی گیا۔

حنین امی کو مصروف دیکھ کر پلٹنے لگی' پھر سعدی کی اسٹڈی ٹیبل پر دھرا خالی مگ دیکھ کر سوچا' اگر اسے کچن میں جا کر رکھ دے تو امی پہ احسان عظیم ہو جائے گا۔ ویری گڈ۔ وہ قریب آئی' مگر مگ اٹھانے سے پہلے سعدی کے بیگ سے نکلی کتابوں تک رک گئی جو امی میز پہ ڈھیر کر رہی تھیں۔ ان میں ایک کتاب کا نام منفرد سا تھا۔ اس نے وہ اٹھائی' صفحے الٹ پلٹ کیے۔ ہاشم کے دستخط' نیچے مجھ اولیٰ کے۔ بھائی کو غالباً ہاشم بھائی نے تحفے میں دی تھی۔

حنین کرسی پہ بیٹھی' اور مزید صفحے پلٹے۔ تیرھویں صدی کے کسی عالم کی لکھی گئی عربی کتاب کا انگریزی ترجمہ۔ اس نے دیباچہ پلٹا' کوئی ناول ہو۔ مگر نہیں' وہ نان فکشن تھا۔ وہ نہیں پڑھنا چاہتی تھی' مگر پھر بھی پڑھنے لگی۔

کتاب کے صفحے کورے تھے' اور ان پہ جگمگاتے الفاظ سیاہ ہیروں جیسے۔ اور قلم سے لکھے الفاظ اگر اللہ چاہے تو صدیوں تک امر ہو جاتے ہیں۔ کتاب اور اس کے درمیان موجود سات سو سال کا فاصلہ ان الفاظ کی طاقت کو روکنے کے لیے ایسا تھا جیسے نور کے چشمے کی راہ میں رکھا کوئی لکڑی کا ٹکڑا' جیسے سنہرا پانی محسوس تک

"یہ کوئی وجہ نہیں۔ تم نے جب یہی بات پچھلی دفعہ ہاشم بھائی سے کہی تھی تو انہوں نے کہا تھا کہ تم لے آیا کرو کیمرہ، تمہیں کوئی نہیں روکے گا۔ اور پھر تمہیں پارٹی کی تصویریں بھی ای میل کروادی تھیں۔"

"بس بھائی کو موقع چاہیے ان ہاشم بھائی کے دفاع کا۔ بالکل بھی نہیں پسند مجھے مصنوعی مسکراہٹوں والے ہاشم بھائی اور ان کی ممی۔ انکل اچھے ہیں' اور وہ بم پھٹے بالوں والا نوشیرواں بھی بہتر ہے۔"

پھر چونک کر سعدی کو دیکھا' ذرا قریب کھسک آئی اور سرگوشی کی۔ "آپ کی اس سے صلح ہوئی؟"

"صلح؟ بات تک نہیں ہوتی۔ جب سے ڈر گزوالی بات اس کی ممی کو بتائی تھی' تب سے مجھے بس غصے سے گھور کر نکل جاتا ہے۔"

"کیا اب بھی ڈر گز لیتا ہے؟" حنین کو تجسس ہوا۔

سعدی نے اسے گھورا۔ "نہیں لیتا میرے خیال سے مگر یہ بات دہرانا نہیں آگے پیچھے۔"

"اب رکھ بھی دو اس کیک کو فریج میں۔ کھانا بننے والا ہے' پہلے وہ تو کھاؤ۔" امی نے ڈانٹ کر کہا۔ وہ کریم لگاتے ہوئے بے نیازی سے بولی۔

"امی! میں اس بات پہ یقین رکھتی ہوں کہ انسان کو خوب مزے سے ہر چیز کھالی چاہیے' اور جو منع کرے۔" نظر اٹھا کر ندرت کو گھورا۔ "اسے بھی کھا جانا چاہیے تھا۔"

ندرت کچھ کرارا سناتیں' مگر ڈور بیل بجی۔ اب کے سعدی قریب تھا۔

"جاؤ سعدی! پھپھو ہوں گی۔" وہ مسکرا کر دروازے کی طرف جانے لگا' پھر رکا' مسکراہٹ غائب ہوئی' چہرے پہ خفگی آئی' بھنویں بھینچ لیں' اور سنجیدگی سے جا کر دروازہ کھولا مگر یوں کہ ہینڈل پکڑے رکھا اور راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

باہر زمر تھی۔ نکھری نکھری سی' سعدی کو دیکھ کر مسکرائی۔ وہ مشکوک نظروں سے اسے گھورتا رہا۔

"کون ہے سعدی؟" کوئی آواز نہ آنے پہ ندرت نے پکارا۔

"ایک خاتون ہیں۔ بال گھنگھریالے' آنکھیں بھوری' عمر انتیس سال' اور چہرے پہ خوشامدی مسکراہٹ۔" پھر ذرا وقفہ دے کر زمر کو مخاطب کیا۔ "جی فرمایئے؟"

وہ اسی طرح مسکراتے ہوئے بولی۔ "لارڈ وولڈیمورٹ کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

سعدی ناراضی سے پیچھے ہوا' اور دروازہ بند کر دیا۔ ندرت نے کچن سے نکلتے ہوئے یہ منظر دیکھ لیا' ہکا بکا رہ گئیں۔ "پھپھو کو اندر بلاؤ۔"

"رہنے دیں امی! یہ خاتون باہر کھڑی زیادہ اچھی لگ رہی ہیں۔" منہ دروازے کے قریب کر کے اونچی آواز میں کہا۔ زمر نے مسکراتے ہوئے انگلی سے دروازہ بجایا۔ اس نے دوبارہ دروازہ کھولا' اسی سنجیدگی سے پوچھا "جی؟"

"پروفیسر اسنیپ ٹھیک ہے؟"

سعدی برا سا منہ بنا کر پھر سے دروازہ بند کرنے لگا' زمر نے جلدی سے اپنا پاؤں چوکھٹ پہ اڑا دیا۔ اور مصالحانہ انداز میں بولی۔ "اچھا چلو' تم رون ویسلے کا کردار لے لو۔ اب خوش؟"

ساتھ ہی ہاتھ میں موجود کاغذوں کا پلندہ لہرایا۔ سعدی مشتبہ نظروں سے اسے گھورتا رہا' پھر راستہ چھوڑ دیا۔ وہ مسکراتی ہوئی اندر آئی' کاغذ کے پلندے سے اس کا شانہ تھپکا' اور گول میز تک آئی۔

حنین تب ہی باہر آئی۔ زمر کو دیکھ کر مسکرائی' سلام کیا۔ وہ بھی جواباً" مسکرائی۔ فارس کے رشتے کے انکار کو ایک سال بیت چکا تھا' اور حنین کی سرد مہری ختم نہیں' مگر کم ضرور ہو گئی تھی۔

"آؤ بیٹھو۔ کیسی ہو تم؟" ندرت ہاتھ پونچھتی ادھر آئیں' ساتھ ہی سعدی کو لتاڑا۔ "یہ کیا طریقہ ہے' پھپھو کو اندر کیوں نہیں آنے دے رہے تھے؟"

"یہ اس وقت بالکل بھی میری پھپھو نہیں ہیں۔" وہ جل کر بولا۔ "یہ صرف پراسیکیوٹر ہیں جو ہیری پوٹر کو سزا دلوانا چاہتی ہیں۔"

(ایک تو یہ موا ہیری پوٹر بھی نا...) ندرت نے

سوالیہ ان سب کو دیکھا۔ زمر مطمئن سی مسکراتی ہوئی کرسی کھینچ کر بیٹھی۔

"میرے پرانے کالج میں ایک موک ٹرائل ہے سرکار بنام ہیری پوٹر۔ مجھے پہلے بطور جج مدعو کیا گیا تھا مگر دفاع کے پاس ایک پرانا ٹیچر تھا' اور میری پراسیکیوشن کے اسٹوڈنٹس سے جتنی بنتی ہے' سو میں نے جج کے بجائے استغاثہ بننا بہتر سمجھا۔ اب اس کو دو دن سے کہہ رہی ہوں' کوئی کردار بن کر گواہی دینے کے لیے آجائے' مگر نہیں۔"

"موک ٹرائل؟" ندرت نے استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

"موک ٹرائل جس میں کسی فیری ٹیل' جنگی واقعہ' یا کسی بھی حقیقی یا فرضی کیس کو لے کر کارروائی کی جائے' اور فیصلہ سنایا جائے۔ مقصد عموماً" طلبا کو سکھانا ہوتا ہے۔" زمر نے وضاحت کی۔

"سرکار بنام ہیری پوٹر؟ حنین کو دلچسپی ہوئی مگر جھجکتے ہوئے پوچھا۔ "ہیری پہ الزام کس چیز کا ہے؟"

"میں بتاتا ہوں۔" سعدی جو دو دن سے اس "غیر انسانی" کیس پہ تپا ہوا تھا' بولنے لگا۔ "یاد ہے فورتھ بک میں' ٹورنامنٹ کے اختتام پہ ہیری کے ساتھ مقابلے باز لڑکے سیڈرک کو وولڈیمورٹ نے مار دیا تھا۔؟"

حنین نے اثبات میں سر ہلایا۔

"مگر جب ہیری سیڈرک کی لاش اور ٹورنامنٹ کے کپ کے ساتھ واپس آیا تو پولیس نے اسے گرفتار کر لیا اور اس پہ الزام لگایا کہ اس نے ہی سیڈرک کو قتل کیا ہے۔" "اور پھپھو استغاثہ میں ہیں۔ اور ہیری کو قاتل ثابت کروا کر ہی دم لیں گی۔"

زمر نے شانے اچکائے۔ "فیصلہ کرنا جج کا کام ہے۔ میں تو صرف دلائل دوں گی۔ آخر ہیری اپنے حریف کی لاش کے ساتھ ملا تھا۔"

"مگر آپ کو رون کی گواہی کی ضرورت کیوں ہے؟" سعدی الجھا۔ "رون تو ہیری کا دوست ہے' وہ تو اس کے حق میں گواہی دے گا۔"

"ہاں' ٹھیک ہے' دے دے حق میں گواہی۔" وہ اب اسے وہ کاغذ نکال کر دے رہی تھی جن میں رون سے متعلق نوٹس تھے۔ چونکہ یہ نان اسکرپٹڈ ٹرائل تھا' اس لیے مشکل تھا۔ زمر عدالت میں کوئی بھی سوال کر سکتی تھی۔ وہ ذرا متوجہ ہو کر سننے لگا۔

حنین خاموشی سے اٹھ آئی۔ امی کی ہانڈی دم پہ تھی اور وہ سعدی کے کمرے میں اس کی چیزیں جوڑ رہی تھیں۔ وہ ہفتہ پہلے آیا تھا' ڈیڑھ ماہ کے لیے۔ ملنے ملانے میں ہی یہ دن گزر گئے زمر کی شادی سر پہ تھی۔ اس سے پہلے وہ کوئی چھ ماہ قبل آیا تھا' بھاگم بھاگ چار دن کے لیے۔ بڑی امی کی وفات پہ۔ سب نے منع کیا کہ "مت آؤ' ایگزامز قریب ہیں۔" مگر وہ آگیا اور چلا بھی گیا۔

حنین امی کو مصروف دیکھ کر پلٹنے لگی' پھر سعدی کی اسٹڈی ٹیبل پر دھرا خالی مگ دیکھ کر سوچا' اگر اسے کچن میں جا کر رکھ دے تو امی پہ احسان عظیم ہو جائے گا۔ ویری گڈ۔ وہ قریب آئی' مگر مگ اٹھانے سے پہلے سعدی کے بیگ سے نکلی کتابوں تک رک گئی جو امی میز پہ ڈھیر کر رہی تھیں۔ ان میں ایک کتاب کا نام منفرد سا تھا۔ اس نے وہ اٹھائی' صفحے الٹ پلٹ کیے۔ ہاشم کے دستخط' نیچے مجد اولی کے۔ بھائی کو غالباً" ہاشم بھائی نے تحفے میں دی تھی۔

حنین کرسی پہ بیٹھی' اور مزید صفحے پلٹے۔ تیرہویں صدی کے کسی عالم کی لکھی گئی عربی کتاب کا انگریزی ترجمہ۔ اس نے دیباچہ پلٹا' کوئی ناول ہو۔ مگر نہیں' وہ نان فکشن تھا۔ وہ نہیں پڑھنا چاہتی تھی' مگر پھر بھی پڑھنے لگی۔

کتاب کے صفحے کورے تھے' اور ان پہ جگمگاتے الفاظ سیاہ ہیروں جیسے۔ اور قلم سے لکھے الفاظ اگر اللہ چاہے تو صدیوں تک امر ہو جاتے ہیں۔ کتاب اور اس کے درمیان موجود سات سو سال کا فاصلہ ان الفاظ کی طاقت کو روکنے کے لیے ایسا تھا جیسے نور کے چشمے کی راہ میں رکھا کوئی لکڑی کا ٹکڑا' جیسے سنہرا پانی محسوس تک

کیسے بنا بہتا چلا جائے۔

سات صدیوں کا فاصلہ عبور کرنے کے لیے ایک دروازہ تھا' اور حنین اس دروازے کے سامنے کھڑی تھی۔ اکیسویں صدی کی حنین' ٹراؤزر اور لمبی قمیص میں ملبوس' آنکھوں پہ چشمہ' بال فرنچ چوٹی میں۔ وہ ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ اسے کتاب میں داخل ہونے کے لیے یہ دروازہ کھولنا تھا۔ سو اس نے کھول دیا۔ پٹ وا ہو گئے۔ اندر روشنی تھی۔ تیز روشنی۔ حنین نے اندر قدم رکھے۔ دروازہ پیچھے بند ہو گیا۔

وہ ایک کچے راستے پہ کھڑی تھی۔ یہ تیرہویں صدی عیسوی تھی۔ ہر شے زرد' اور پھیکے رنگ کی تھی۔ دمشق کا بازار اور ارد گرد سر ڈھانپے گزرتے لوگ۔

وہ احتیاط سے قدم اٹھاتی آگے بڑھنے لگی۔ لوگ گزرتے رہے۔ اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ایڈونچر اچھا تھا۔ وہ چلتی رہی۔

پھر وہ رکی۔ ایک مسجد نما عمارت کے سامنے مجمع لگا تھا۔ وہ قدم قدم چلتی آگے آئی۔ پنجے اٹھا کر گردن اونچی کر کے کسی کے کندھے کے اوپر سے جھانکا۔

زمین پہ ایک آدمی اکڑوں بیٹھا تھا۔ مریل اتنا گویا ہڈیوں کا پنجر ہو۔ سرخ متورم آنکھیں' ان میں چھپا کرب۔ وہ خراب حالت میں تھا۔ حالانکہ نہ اس کا لباس بوسیدہ تھا' نہ کوئی زخم کا نشان تھا' مگر یا تو ہیں اور اذیت نے اسے نڈھال کر رکھا تھا۔ آنکھ میں کوئی ٹھہرا آنسو تھا' جو نہ وہ پیتا' نہ گراتا۔ اسے کیا ہوا تھا؟

مجمع یکا یک چھٹنے لگا۔ وہ بھی پیچھے ہٹ گئی۔ ادھر ادھر دیکھا۔ لوگ عمارت کی طرف جا رہے تھے۔ وہ بھی پیچھے ہولی۔ عمارت کی کچی چار دیواری کے پار دیکھا۔ کچھ لوگ اندر سے کسی کو اپنے ہمراہ لا رہے تھے۔ نفیس' نرم خو دکھتے شیخ معظم' وہ لوگ اب شیخ کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ وہ سب اس شخص کو دیکھ رہے تھے جو ان سے بے گانہ تھا۔ یکسر بے گانہ۔

کسی صدا لگانے والے نے صدا لگائی۔

"کیا فرماتے ہیں آئمہ دین ایسے شخص کے بارے میں' جس کا دین اور دنیا اس مہلک مرض نے تباہ کر دیا ہو؟ کیا ہے اس مرض کی کوئی دوا اے شیخ (استاد)؟"

امام شیخ نے گردن اٹھا کر آسمان کو دیکھا اور بولے تو حنین کو ان کی آواز صاف سنائی دی' جیسے دل میں اتر گئی ہو۔

"اللہ نے اتاری ہے ہر مرض کی دوا' جو اسے جانتا ہے' وہ اسے جانتا ہے' جو اسے نہیں جانتا' وہ اسے نہیں جانتا۔"

"مگر اسے ہوا کیا ہے؟" حنین کے لبوں سے پھسلا۔ پھر زبان دانتوں تلے دبائی۔ بھلا سات صدیاں پہلے گزرے شیخ اسے کیسے سمجھ سکتے تھے؟ نہ اس کے سوال' نہ اس کے جواب' مگر شیخ نے دیکھ لیا تھا' اسے بھی' اور اس کی آنکھوں میں رقم سوال کو بھی۔ وہ مسکرا کر بولے۔

"اسے مرض عشق ہے۔"

"مرض عشق؟" اس نے تعجب سے دہرایا۔ "عشق مرض ہے؟"

"بلکہ جان لیوا مرض ہے!"

"تو۔۔۔" اس نے گردن موڑ کر اس اکڑوں بیٹھے شخص کو دیکھا اور پھر شیخ کو۔ "تو کیا مرض عشق کی بھی کوئی دوا ہے؟"

"یہ مگ رکھ کر آؤ کچن میں!" دروازے کی دوسری جانب امی آواز دے رہی تھیں' حنین نے شیخ کو دیکھا۔ وہ اس کے ٹھہرنے کے منتظر تھے' مگر وہ نہیں ٹھہری۔ دوڑ کر پیچھے گئی۔ سنہری دھوپ ۔۔۔ سے بھرے دروازے کو دھکیلا اور واپس۔

اس نے کتاب بند کی' پھر ادھر ادھر دیکھا۔ وہ بھائی کی کرسی پہ بیٹھی تھی اور ندرت سر پر کھڑی ڈانٹ رہی تھیں۔ اس نے سر جھٹکا۔ وہی پرانی عادت۔ جو پڑھتی اس کو تصور کرنے لگ جاتی اور اس زمانے میں پہنچ جاتی۔ صرف ایک پیراگراف نے اتنا اثر کیا' پوری کتاب تو پاگل کر دے گی۔ ہٹاؤ بھئی' نہیں پڑھنی ایسی کتابیں۔ وہ اٹھی کتاب شیلف میں رکھ دی' عنوان قدرے مزید واضح ہوا۔

"ایک مکمل جواب اس شخص کے لیے' جس نے سوال کیا تھا' شفا دینے والی دوا کے بارے میں!"

"اچھا امی! سن لیا ہے۔" وہ ان کی بار بار کی ڈانٹ پہ چڑ کر کہتی مگ اٹھائے باہر نکل آئی۔ گول میز کے گرد پھپھو' بھتیجا ابھی تک الجھ رہے تھے۔ آگے آئی۔ زمر نے اسے دیکھا تو کوئی خیال آیا۔

"تمہاری امریکن دوست نے بھی آنا تھا شادی پہ۔ کب آئے گی وہ؟"

"پرسوں۔" وہ ہلکا سا مسکرائی۔ "اسے پاکستان گھومنے کا بہت شوق ہے۔ وہ آئے گی تو ہم سب اسکردو جائیں گے۔" اور مسکرا کر برتن لگانے لگی۔

(اٹی پہ دوسرا احسان)

☼ ☼ ☼

جنگ ہاری نہ تھی ابھی کہ فراز
کر گئے دوست درمیان سے گریز

آفس میں عجیب تناؤ کی سی کیفیت تھی۔ فاطمی صاحب فائل سامنے رکھے تعجب سے ایک کے بعد ایک صفحہ پلٹ رہے تھے۔ ستائش سے نظر اٹھا کر سامنے بیٹھے وارث کو دیکھا۔

"امیزنگ ورک۔ میں نے تمہیں اس کیس کا آئی او بنا کر بہت اچھا کیا۔"

وارث ہلکا سا مسکرایا' سر کو خم دیا۔ "تھینکس سر!" قدرے توقف سے اضافہ کیا۔ "یہ فائلز کرپشن چارجز کے ثبوت اور شواہد کی ہے اور کرپشن کیس کھڑا کرنے کے لیے کافی ہے۔ مگر یہ فائل۔" اس نے الگ رکھی سیاہ کور والی فائل کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ وہ چیزیں جو ہاشم کاردار کے خلاف مجھے ملی ہیں۔ یہ ہمارے دائرہ کار سے باہر ہیں' ہم ان کو ایک دوسری ایجنسی میں بھیج سکتے ہیں۔"

"ہاں' میں ایسا ہی کروں گا۔ گڈ جاب' غازی!" انہوں نے فائل بند کر کے ایک طرف رکھی اور اس کو دیکھا۔ وارث سر کو خم دے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہمیں اریسٹ وارنٹ نکلوا لینے چاہئیں۔"

"شیور۔ میں جلد از جلد یہ کام کروں گا۔"

یہ اختتامیہ جملہ تھا۔ وارث سر ہلا کر دروازے کی طرف آیا۔ پھر باہر جانے سے قبل ایک سوچتی نظر اس نے اپنے باس پہ ڈالی۔ ایک واہمہ۔ مگر سر جھٹک کر نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی فاطمی صاحب اٹھے' دروازہ لاک کیا۔ موبائل نکالا۔ کال ملائی اور فون کان سے لگائے' اس سیاہ فائل کے صفحے پلٹنے لگے۔

ہاشم اپنے آفس میں' میز پہ فائلز پھیلائے' الجھا بیٹھا تھا۔ موبائل کسی فائل تلے رکھا تھا۔ وائبریشن کی زوں زوں پہ اس نے ادھر ادھر ہاتھ مارا' موبائل نکالا' اور ہیلو کہا۔ قدرے اکتاہٹ سے۔ کوٹ اسٹینڈ پہ ٹنگا تھا' اور وہ ویسٹ میں ملبوس تھا۔

"کیا حال ہیں کاردار صاحب؟"

"گڈ۔ آپ سنائیے۔" موبائل کان اور کندھے کے درمیان لگائے' وہ فائل کے صفحے پلٹ رہا تھا۔

"اللہ کا کرم۔" وقفہ "سنا ہے اورنگ زیب کاردار صاحب ہائی الیکشن میں حصہ لے رہے ہیں؟ اگلے الیکشن کی ریہرسل۔"

"جی' ان کے دوستوں نے ان کو سیاست میں دھکیل دیا ہے۔ خیر' گڈ فار ہم۔" وہ فون کان اور کندھے کے درمیان لگائے' شیلف تک گیا اور وہاں رکھی فائلوں کو باری باری نکال کر چیک کرنے لگا۔

"اور کوئی نئی بات؟"

"میرا بیٹا مجھ سے ذرا خفا ہے۔ اس کے لیے کار امپورٹ کروائی تھی۔ وہ کراچی پورٹ پہ کھڑی ہے' ابھی تک۔ میں مصروف تھا' میرا ایک اے ڈی ایک کرپشن کیس پہ کام۔"

"میں بالکل سمجھ گیا' فاطمی صاحب!" جھک کر ایک ڈبہ دونوں ہاتھوں میں اٹھایا اور چلتا ہوا میز تک آیا۔ ذرا سا مسکرایا بھی۔ "ایک اچھے شہری ہونے کا ثبوت دیجیے' کسٹم ڈیوٹی ادا کیجیے' اور کار کلیئر کروا لیں' کیونکہ ہم کام کرتے ہیں آئل کا۔ اور تیل اور پانی میں یہی فرق ہوتا ہے۔ تیل میں کوئی جاندار شے تیر نہیں سکتی' جو گرتا ہے' وہ ڈوب جاتا ہے۔ آپ کے اے ڈی نے جو اسکینڈل بنانا ہے' بنا لے' کیونکہ یہ امریکہ نہیں ہے'

یہاں لوگوں کا اخلاقیات کا معیار امریکیوں جتنا بلند نہیں ہے۔ یہاں کوئی الیشو کوئی کرپشن چارج کسی سیاستدان کا کیریئر خراب نہیں کرسکتا۔"

"میں بالکل سمجھتا ہوں یہ سب' اس لیے میں نے آپ کو فون کیا پہلے۔ آپ چاہیں تو میں کل ہی اپنے لڑکے سے استعفیٰ مانگ کر کیس بند کرسکتا ہوں۔"

"اسے جاری رکھنے دیں' شوق پورا کرلے۔ میرے باپ کے ہاتھ صاف ہیں۔"

چند لمحے خاموشی چھائی رہی۔ پھر فاطمی صاحب نے سیاہ فائل کی جلد پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے سرسری سا کہا۔

"آپ پچھلے مہینے کی دو' تیرہ' اور بائیس تاریخ کو پشاور میں ہونے والی میٹنگز میں شامل تھے' ہاشم!"

ہاشم کا ذبہ لمحا ہاتھ رکا' بے یقینی سے اس نے سر اٹھایا۔ رنگت پھیکی پڑی۔

"آپ نے درست کہا' ہاشم! کرپشن الیشوز ڈونٹ ورکس' یہ پاکستان میں کسی کو تباہ نہیں کرسکتی' مگر ایک چیز کرسکتی ہے۔ علاقہ غیر کے دہشت گردوں کے لیے منی لانڈرنگ کرنا جس کے بدلے وہ آپ کو اپنے علاقوں میں کاروبار کرنے دیتے ہیں۔ اگر آپ ایک دفعہ ملٹری کی بلیک بکس میں آگئے' تو کوئی بھی چیز آپ کو نہیں بچاسکے گی۔"

وہ خاموش' بالکل ساکت کھڑا تھا۔ گردن میں بار بار ابھر کر معدوم ہوتی گلٹی دکھائی دیتی۔ پھر اس نے تیزی سے جھک کر قلم نکالا' نوٹ پیڈ سامنے کیا۔

"کون سی گاڑی ہے' ماڈل اور میک؟ اور کس کے نام ہے؟" وہ تیزی سے قلم کاغذ پہ گھسیٹتا' تفصیلات لکھتا گیا۔ دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔

فون بند کرکے' ڈبہ وہیں چھوڑے' کوٹ کھینچ کر اتارتا' وہ باہر بھاگا' سیکریٹری گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ تیز تیز کاریڈور میں چلتا لفٹ کی طرف جارہا تھا۔ ساتھ ہی موبائل پہ کال مل رہا تھا۔

"خاور' فوراً گھر پہنچو۔ ابھی۔"

☆ ☆ ☆

خواب تو روشنی ہیں' نوا ہیں' ہوائیں
جو کالے پہاڑوں سے رکتے نہیں

کمرہ عدالت میں کارروائی روانی سے جاری تھی۔ معزز جج صاحبان توجہ اور خاموشی سے براجمان کٹہرے میں کھڑے گواہ (لارڈ وولڈیمورٹ) کا بیان سن رہے تھے' جس سے استغاثہ کی جانب سے زمر جرح کررہی تھی۔ وہ سرکار بنام ہیری پوٹر کا عینی شاہد تھا۔ اور پیچھے حاضرین کی نشستوں میں روش کے بائیں جانب بیٹھے لوگوں میں سے ایک سعدی بھی تھا جو خفگی سے اسے گھور رہا تھا۔

"تو آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ جس وقت مقتول لڑکا قتل ہوا' تب آپ قبرستان میں موجود تھے؟" زمر قلم ہاتھوں میں گھماتی آہستہ آہستہ کٹہرے کے سامنے دائیں بائیں ٹہل رہی تھی۔

"جی۔" وولڈیمورٹ نے تابعداری سے اثبات میں سرہلایا۔ وہ ایک اسٹوڈنٹ تھا' جو موقع کی مناسبت سے سیاہ چغے میں ملبوس تھا۔

"اور جس وقت ملزم ہیری مقتول کے ساتھ ادھر آیا' آپ قبرستان میں کیا کررہے تھے؟"

"میں جی اپنے والد صاحب کی قبر پہ فاتحہ پڑھ رہا تھا۔" وہ بڑی ہی مسکینیت سے کہہ رہا تھا۔ سعدی نے کلس کر پہلو بدلا۔ قریب بیٹھی لڑکیوں کا ایک گروپ بمشکل ہنسی روکنے کی کوشش کررہا تھا۔

"آپ تو جانتی ہیں۔" معصوم لارڈ کہہ رہا تھا۔ "کہ ماشاء اللہ یہ ہیری بچپن سے ہی ماہر عملیات تھا۔ سال بھر کی عمر میں اس نے مجھے تعویز کرکے آدھا مار ڈالا' میں تو تب سے جنگلوں میں دربدر بھٹکتا' دروشی کی زندگی گزار رہا تھا۔"

"آبجیکشن' یور آنر!" دفاع کا وکیل کھڑا ہو کر چلایا۔ جج نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"غیر متعلقہ۔" اس نے وجہ بتائی۔

"منظور۔" جج نے گواہ کو تنبیہہ کی۔ "غیر متعلقہ باتیں مت کریں۔"

زمر نے سرہلا کر سنجیدگی سے سوال کیا۔ "تو پھر عدالت کو بتائیے کہ اس رات کیا ہوا؟"

"ہاں جی' اس رات میں نے اسے اپنے حریف کھلاڑی کے ساتھ قبرستان میں آتے دیکھا تو میں نے پیار سے کہا کہ بیٹا' اس وقت تمہیں بستر میں ہونا چاہیے۔ مگر اس نے کہا کہ انکل' ہمارے معاملے سے دور رہو' اور پھر آؤ دیکھا نہ تاؤ' اپنے حریف کو قتل کردیا۔ میں تو تب سے ہی حالت سوگ میں ہوں۔"

اور سعدی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس وولڈیمورٹ کا حشر کردے۔ سب کو پتا تھا کہ وہ وہی اصل قاتل ہے' مگر یہ اہل قانون تو قانون سے زیادہ اندھے تھے۔

اسے بھی کٹہرے میں بلالیا گیا۔ زمر نے سوالات کا آغاز اس سے کیا۔ "کیا یہ درست ہے کہ آپ ملزم ہیری کے بہترین دوستوں میں سے ہیں؟"

"جی' یہ بات اتنی ہی درست ہے' جتنی یہ کہ ہیری بے گناہ ہے۔" وہ سامنے کھڑی زمر کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرا کر بولا۔ زمر نے سادگی سے اسے واپس دیکھا۔

"یعنی کہ آپ وقوعہ کے وقت موجود تھے۔؟"

"آ۔ نہیں۔" وہ گڑبڑایا۔ "مگر ہیری نے مجھے خود بتایا کہ وولڈیمورٹ نے یہ قتل کیا ہے۔"

"آپ یہ اس بنیاد پہ کہہ رہے ہیں جو ملزم نے آپ کو "بتایا" ہے؟"

"مجھے معلوم ہے' وہ سچ کہہ رہا تھا۔"

"یعنی کہ آپ کو معلوم ہوجاتا ہے کہ لوگ کیا سوچ رہے ہیں۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت میں کیا سوچ رہی ہوں؟" وہ سنجیدہ تھی۔ سعدی بالکل چپ ہوگیا۔

"اپنے جوابات میں رائے کا عنصر شامل کرنے سے گریز کیجئے۔" جج نے تنبیہہ کی۔

زمر دائیں سے بائیں چلتی ہوئی کٹہرے کے سامنے آئی۔ سنجیدگی سے سعدی کو دیکھا۔

"کیا آپ کسی چوچانگ نامی لڑکی کو جانتے ہیں؟"

"جی۔ وہ مقتول لڑکے کی گرل فرینڈ تھی اور۔" وہ بے اختیار چپ ہوا۔

"اور ملزم اسی لڑکی کو پسند کرتا تھا' اسی بناپہ وہ مقتول سے رقابت بھی رکھتا تھا۔ کیا یہ درست ہے؟"

"آپ اس بات کو غلط رخ۔"

"ہاں یا نہیں' مسٹر رون!" وہ نرم سی سختی سے بولی۔ اس نے چاروناچار کہا۔

"جی ہاں۔"

"اور کیا یہ بھی درست ہے کہ مقتول اور ملزم ایک ہی ٹورنامنٹ جیتنے کے لیے کوشاں تھے' جس کی وجہ سے دونوں کے درمیان معمولی سا حریفانہ جذبہ بھی تھا؟"

"جی مگر وہ اتنا کم تھا کہ اس کی بناپہ ہیری اسے قتل نہیں کرسکتا تھا۔"

"اور کیا یہ بھی درست ہے کہ جس دن ہیری کا نام مقابلے کے لیے منتخب ہوا تھا' اس رات آپ اس سے ناراض ہوئے تھے' اور جیلس بھی؟ کیونکہ ہیری کی وجہ سے آپ کی شخصیت ہمیشہ دب جاتی تھی۔"

سعدی کا منہ بے یقینی سے کھلا رہ گیا۔ یہ سب واقعات زمر نے دہرائے تھے رات کو' مگر یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ یوں سوال کرے گی۔

"جی میں صرف جیلس ہوگیا تھا مگر بعد میں ہم ٹھیک ہوگئے اور مجھے اس ذرا سی خفگی کے لیے بھی افسوس ہے۔"

"اور اسی افسوس اور احساس جرم کے باعث آپ بار بار ہیری کی حمایت کررہے ہیں۔"

"نہیں تو۔ میں۔"

"آپ ہیری کی حمایت نہیں کررہے؟"

"میں۔ اس وجہ سے نہیں کررہا۔" مگر وہ سنے بنا جج کی طرف رخ کیے کھڑی ہوئی' سر کو خم دے کر کہا۔

"اتنا کافی ہے' یور آنر!" اور واپس پراسیکیوشن کی میز کے پیچھے جا کر ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھ گئی۔

"میں یقین نہیں کرپارہا' ججز کے پینل نے ہیری کو مجرم قرار دے دیا۔ حد ہے۔"

فیصلہ آنے کے بعد کورٹ روم سے نکلتے ہوئے وہ خفگی سے زمر سے بولا تھا۔ زمر مسکراتی ہوئی اس کے

ساتھ چلتی جارہی تھی۔ راہداری میں ادھر ادھر گزرتے اسٹوڈنٹس کے سلام کا سر کے خم سے جواب دیتی۔ مطمئن، پرسکون سی۔

"ثبوت اس کے خلاف جاتے تھے اور اس کا دفاع کمزور تھا۔"

"سب کو پتا تھا کہ ہیری بے گناہ ہے' زمر!" گھنگھریالے بالوں والا لڑکا ہنوز خفا تھا۔

"جج فیصلے جذبات پہ نہیں کرتا' ثبوت پہ کرتا ہے۔"

"اور آپ نے کیا کیا؟ پہلے مجھ سے وہ باتیں کہلوائیں جو ہیری کے خلاف جاتی تھیں' پھر جب دیکھا کہ میری حمایت کا جج پہ اثر ہو جائے شاید' تو میری کریڈیبلٹی مشکوک کردی۔ ہیری سے جیلسی والی بات کرکے۔ میرا تو دل ہی ٹوٹ گیا۔"

زمر نے چلتے چلتے مسکرا کر آنکھیں گھما کر اسے دیکھا۔

"تم انگلینڈ جاکر تھوڑے اسمارٹ نہیں ہوگئے؟" مگر وہ خفا خفا سا چلتا رہا تو زمر نے کاغذات کا رول بنا کر اس کے کندھے پہ دھپ مارا۔ وہ ناراضی سے پلٹا۔

"موک ٹرائل ختم ہوچکا۔ حقیقی زندگی کی طرف لوٹ آؤ۔"

سعدی مسکرا دیا۔ تنے اعصاب ڈھیلے پڑے۔ (دفع کرو ہیری کو' جادوگر کی اولاد نہ ہو تو!)

"آپ کی چھٹی منظور ہوگئی؟"

"ہاں؟" وہ گہری' مطمئن سانس لے کر بولی۔ وہ راہداری سے نکل کر لان تک آچکے تھے۔ اتنے سال کی پڑھائی اور جاب کے بعد یہ چھ ماہ کی چھٹی' یوں لگتا ہے جیسے صدیوں کی تھکن اتارے گی۔ کوئی تو صبح میں بھی جاگوں آفس جانے کی ٹینشن کے بغیر!

"ہوں۔ اور ہاشم بھائی کی بیٹی کی پارٹی میں آرہی ہیں؟" وہ گاڑی تک آتے ہوئے یاد آنے پہ پوچھ بیٹھا۔

"میں بالکل نہ آتی مگر اس دن ابا کورٹ آئے کام سے اور ہاشم مل گیا۔ اس نے خود دعوت دے دی۔ ابا بھرم رکھ لیں گے مگر ان کو بھی وہ میری طرح کوئی خاص پسند نہیں آیا۔"

وہ ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے بتا رہی تھی۔ سعدی "گڈ" کہہ کر بیٹھ گیا۔ ہاشم بھائی کو وہ پسند نہیں کرتی تھی' اس لیے وہ اس ذکر سے کتراجاتا تھا۔

☼ ☼ ☼

میں بڑھتا ہوں زندگی کی جانب لیکن
زنجیر سی پاؤں میں چھنک جاتی ہے

راہداری میں سعدی کے کمرے کا دروازہ کھلا نظر آرہا تھا۔ اندر وہ کھڑا جلدی جلدی ٹائی پہن رہا تھا۔ ابھی مکمل تیار نہیں ہوا تھا اور پارٹی شروع ہونے میں کم وقت رہ گیا تھا۔ آگے چلتے جاؤ تو گول میز آتی۔ اندر جاؤ تو لاؤنج میں اونچی آواز سے ٹی وی چل رہا تھا۔ ایک صوفے پہ فارس' ٹانگ پہ ٹانگ جمائے' گرے کوٹ اور گول گلے کی سفید شرٹ میں ملبوس بیٹھا' بار بار گھڑی دیکھتا' اور کبھی سامنے صوفے پہ بیٹھی ندرت کو جو جیولری پہننے کے ساتھ ساتھ سیم اور سعدی دونوں کو زور سے ڈانٹ کر جلدی نکلنے کا کہہ رہی تھیں پھر توپوں کا رخ سامنے بیٹھی' خفا خفا سی گھر کے کپڑوں میں ملبوس حنین کی طرف ہوا۔

"کب تیار ہوگی تم؟ ماموں کب سے لینے آئے بیٹھے ہیں۔"

وہ سر جھٹک کر بڑبڑا کر رہ گئی۔ "نہیں جانا مجھے کسی پارٹی وارٹی میں۔ بس اتنا کہا تھا کہ مجھے آج شام علیشا سے ملوانے کوئی اس کے ہوٹل لے جائے' مگر نہیں۔"

ندرت نے اسے نظرانداز کیا اور لینڈ لائن فون اٹھا کر ریسور کان سے لگایا' سیٹ گھٹنے پہ رکھا' نمبر ڈائل کرتے آواز لگائی۔

"سعدی! جلدی کرو' پھپھو لوگ پہنچ گئے ہوں گے۔"

فارس نے چونک کر ندرت کو دیکھا۔ "وہ لوگ بھی مدعو ہیں؟" سرسری سا پوچھا۔

(حنین نے کن انکھیوں سے فارس کا سپاٹ تاثر چہرہ دیکھا۔) "ہوں" ندرت اب ہمسائی خاتون سے فون پہ بات کرنے لگی تھیں۔ میٹھے' نرم لہجے میں۔

"السلام علیکم بھابھی۔ جی' میں ٹھیک۔ آپ نے صبح کڑھی بھیجی تھی' میں شکریہ ہی نہیں ادا کرسکی۔ جی۔ آپ نے اتنا تکلف کیا۔ ایک منٹ۔" ریسور کے ماؤتھ پیس پہ ہاتھ رکھا' غصے سے حنین کو دیکھ کر چلائیں۔ "آہستہ کرو ٹی وی کی آواز۔ آگ لگے اس ٹی وی کو۔ میں کیا کہہ رہی ہوں حنین؟ میں ایک دفعہ اٹھ گئی نا' جوتے لگا لگا کر حشر لگا دینا ہے میں نے۔"

حنین نے تلخی سے ریموٹ اٹھا کر زور سے بٹن دبایا۔ آواز بند۔ سارے اداکار گونگے ہوگئے۔ ندرت واپس نرمی سے فون پہ بات کرنے لگیں۔ وہ ان بھولی ماؤں میں سے تھیں جن کو پورا یقین تھا کہ ریسیور کے ماؤتھ پیس پہ ہاتھ رکھ دینے سے آواز دوسری طرف بالکل نہیں جاتی۔

فارس نے آنکھیں سیکڑ کر حنہ کو دیکھا۔ "تمہارا موڈ کیسے بہتر ہوگا؟ اٹالین کھانے سے؟"

"اگر اب میں نے اٹالین کھانے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو میرا نام حنین نہیں۔" وہ کاٹ کھانے کو دوڑی۔

"پھر؟"

"علیشا سے ملنا ہے۔ میری دوست' مگر سب مصروف ہیں۔"

ندرت نے بات کرتے کرتے جھک کر جوتا اتارنا چاہا مگر سینڈل کے اسٹریپ بند تھے۔ اب کون کھولے' وہ بھی اس ڈھیٹ اولاد کے لیے۔ واپس کڑھی نامہ سنانے لگیں۔

فارس نے موبائل نکالا' کال ملائی۔

"وارث! تم اور سارہ آرہے ہو نا؟ اوکے' آپا کی طرف آکر ان سب کو لے جاؤ۔ میں حنین کو اس کی دوست کی طرف لے کر جارہا ہوں۔" موبائل بند کیا اور ہکا بکا بیٹھی حنین کو دیکھ کر ابرو اٹھائی۔

"دس منٹ میں تیار ہوکر آؤ' ورنہ میں جارہا ہوں۔"

ندرت 'نہیں' ہیں" کرتی رہ گئیں' اور وہ کرنٹ کھا کر اٹھی۔ بے یقینی سے فارس کو دیکھا۔

"مگر آپ پارٹی میں کیوں نہیں جارہے؟"

"کیونکہ میں تمہارے ساتھ جارہا ہوں۔"

وہ فوراً" بھاگی' پھر الٹے قدموں واپس آئی' فارس کے کان کے قریب جھک کر معصومیت سے پوچھا۔

"کیا جو ابھی اٹالین کے بارے میں ارادہ ظاہر کیا تھا۔ وہ واپس لے سکتی ہوں؟"

فارس نے صرف گھورا' وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر سوری' سوری کہتی اندر بھاگ گئی۔

جلدی جلدی تیار ہوئی۔ عینک اتار کر کانٹیکٹ لینز لگائے۔ (اف' آنکھ میں ڈالے نہیں جاتے تھے۔ بار بار پھڑک کر باہر نکل آتے۔ بمشکل ڈالے کہ عادت نہ تھی۔ پھپھو کی شادی کے لیے خریدے تھے۔) ماتھے پہ کٹے بال چھوڑ کر باقی کے اطراف میں پن لگا کر کھلے رہنے دیے۔ نیا پرس اٹھایا جو تین ماہ قبل انگلینڈ سے مستقل واپسی پہ سارہ لائی تھی' باہر آئی۔ وارث اور سارہ آچکے تھے۔

وارث کی گاڑی کے قریب فارس اور وہ کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ فارس فکرمندی سے کہہ رہا تھا۔

"تم استعفیٰ نہیں دوگے بھلے آج پہلی دفعہ ہی مانگا ہے' مگر مت دینا۔" ساتھ ہی حنہ کی طرف چابی اچھالی۔ اس نے کیچ کی۔ فارس کی گاڑی تک آئی۔ فرنٹ سیٹ پہ بیٹھ کر شیشہ کھول دیا۔ ان دونوں کی باتوں کی آواز پہنچنے لگی۔

"میں جس کیس کا آئی او ہوں' اس سے متعلقہ لوگوں کے تعلقات ہیں فاطمی سے' الیاس فاطمی میرا باس۔ مجھے لگتا ہے وہ مجھے بیچ آیا ہے۔" وارث کے چہرے پہ بظاہر سکون تھا' مگر وہ اضطراب چھپا رہا تھا۔

"تم کس کیس کے آئی او ہو؟"

"ظاہر ہے' یہ میں نہیں بتا سکتا' یہ کلاسیفائیڈ انفارمیشن ہے۔"

"اوکے۔ مگر۔" ندرت' سعدی' سیم باہر آرہے

تھے۔ فارس نے رک کر پریشانی سے وارث کو دیکھا۔
"تم بس ابھی کچھ مت کرنا۔ ہم کل اس بارے میں بات کریں گے۔ ابھی مجھے نکلنا ہے۔ مگر تم استعفیٰ نہیں دو گے۔ ٹھیک ہے نا وارث؟" اس کو تنبیہ کرتا وہ بار بار دہراتا واپس گاڑی کی طرف آیا۔

وارث سرہلا کر پھیکا سا مسکرایا اور گاڑی کی طرف مڑ گیا۔ فارس اندر بیٹھا' چابی گھمائی' کار ریورس کی' حنین نے دیکھا' اس کا الجھا ہوا چہرہ بے حد فکر مند تھا۔ ایک لمحے کو اس نے ذہن میں دہرایا۔

"الیاس فاطمی۔ الیاس فاطمی۔" پھر علیشا سے ملنے کا خیال ذہن پہ چھا تا گیا۔ لب آپ ہی آپ مسکرانے لگے۔

وہ مگن سی ونڈ اسکرین دیکھنے لگی۔ سڑک کو کاٹتی سفید دھاریاں وقفے وقفے سے گاڑی تلے آکر غائب ہوجاتیں۔ اس نے گنا' تین' تین' تین' ایک' ٹوٹل دس اور پھر سے گنتی شروع۔

☆ ☆ ☆

بنے ہیں اہل ہوس' مدعی بھی' منصف بھی
کسے وکیل کریں' کس سے منصفی چاہیں

سونیا کی دوسری سالگرہ کی دعوت قصر کاردار کے لان کے بجائے لونگ روم اور ملحقہ ڈائننگ روم' ڈرائنگ روم وغیرہ میں منعقد کی گئی تھی۔ سارے دروازے سلائیڈنگ تھے۔ دیواروں میں گھسا دیے گئے۔ گھر کا گراؤنڈ فلور کھلا سا کمرہ بن گیا۔ مہمان ادھر ادھر ٹہل رہے تھے۔

شہرین داخلی دروازے پہ مسکرا مسکرا کر مہمانوں کو ریسیو کررہی تھی۔ فرشی جامنی میکسی میں ملبوس' اپنا اضطراب چھپانے کی کوشش کرتی' ادھر ادھر ہاشم کو تلاش کرتی' پھر مصروف ہوجاتی۔

سیڑھیوں کے اوپر کمروں کے آگے بنی ریلنگ کے ساتھ سیاہ گاؤن میں ملبوس جواہرات کھڑی تھی۔ سرد' گہری مسکراہٹ کے ساتھ' ایک خاتون سے بات کررہی تھی۔ بال سمیٹ کر بائیں کندھے پہ ڈالے تھے۔

دفعتاً "ہاشم پیچھے سے چلتا آیا۔ کوٹ کا بٹن کھلا تھا۔ لب بھینچے ہوئے اور آنکھوں میں سختی تھی۔ اس نے "مجھے اپنی ماں چاہیے کچھ دیر کے لیے۔" کہہ کر جواہرات کی کہنی تھامی اور اپنے ہمراہ آگے لے گیا۔ وہ قدرے حیران' قدرے چونکتی ساتھ کھنچی چلی آئی۔

"ہاشم۔ یہ۔"

"شش۔" وہ اسے اسٹڈی میں لایا۔ خاور پہلے سے موجود تھا۔ جواہرات نے تشویش سے اس کے مقابل کھڑے اسے دیکھا۔

"تم ٹھیک ہو ہاشم؟"

"میں بھی؟ بالکل نہیں۔" بالوں میں ہاتھ پھیر کر' گہرے سانس لے کر خود کو ریلیکس کیا۔ تکان سے ماں کو دیکھا۔

"ہم کس کے لیے منی لانڈرنگ کررہے ہیں۔ وہ جانتے ہیں۔"

جواہرات کا سانس رک گیا۔ "تمہارا باپ جانتا ہے؟"

"اگر وہ جانتے ہوتے تو کیا میں یہاں آپ کو زندہ کھڑا نظر آتا؟" وہ تلخی سے اسے دیکھ کر بولا۔ جواہرات کا سانس بحال ہوا۔

"نیب والے۔ وہ ہماری کمپنیز کی تفتیش کررہے تھے۔ مگر ان کو ہماری دہشت گردوں کے گروپ کے لیے کی گئی منی لانڈرنگ کی معلومات مل گئیں۔ کیس کے سربراہ نے کہا ہے کہ انویسٹی گیشن آفیسر سے استعفیٰ لے لے گا' مگر معلوم ہے' وہ کون ہے؟"

"کون؟" وہ یک ٹک اسے دیکھتے بولی۔

"فارس کا سوتیلا بھائی وارث' آگے آپ خود سمجھ سکتی ہیں کہ ڈیڈ تک میری اور آپ کی ان سرگرمیوں کو پہنچنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔"

جواہرات نڈھال سی ہو کر کرسی پہ گر گئی۔ ماتھوں میں گرالیا۔

"مسئلہ یہ ہے میم کہ وارث کا باس وہ کیس فائلز ہمارے حوالے نہیں کرے گا۔" خاور نے کہنا

شروع کیا۔ "وہ خود پہ کوئی آنچ آنے نہیں دے گا۔ ہمیں وارث کو خود چیک کرنا ہوگا۔"

جواہرات نے سر اٹھا کر گلابی پڑتی آنکھوں سے ہاشم کو دیکھا۔

"تو تم نے اسی لیے اپنے باپ سے فارس کے بھائی کو فون کروایا' تاکہ وہ پارٹی میں ضرور آئے؟ اور ابھی ابھی میں نے دیکھا' وہ آیا بھی کھڑا ہے نیچے۔"

"ہم تین دن سے اس کو فالو کررہے تھے میم! وہ ہاسٹل میں رہ رہا ہے' بیوی اپنی ماں کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس کا لیپ ٹاپ' فائلز' سب ہاسٹل کے کمرے میں ہوتا ہے۔ وہ ادھر ہے اور میں اس کے ہاسٹل جارہا ہوں ہمیں چیک کرنا ہے کہ اس کے پاس کیا کیا ہے اور اس نے کس کس کو دکھایا ہے وہ سب۔"

"اور تم مجھے یہ سب اب بتارہے ہو؟" وہ پھٹ پڑی' غصے سے دونوں کو دیکھا۔

"کیونکہ کل آپ انگلینڈ سے واپس آئی ہیں اور آپ ابھی مجھے نظر آئی ہیں۔"

جواہرات پھر کر ہاشم کے سامنے کھڑی ہوئی اور غرائی۔ "تم نے کہا تھا' کچھ نہیں ہوگا۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ تم سب سنبھال لوگے' تو پھر یہ سب کیا ہے؟"

"میں کوئی عادی مجرم نہیں ہوں۔ دو سال بھی نہیں ہوئے مجھے یہ کام کرتے ہوئے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں اتنی جلدی نظروں میں آجاؤں گا۔"

مگر جواہرات نفی میں سرہلاتی' اس کو سنے بغیر مضطرب سی بولے جارہی تھی۔

"ہاشم۔ ہاشم۔ اس سب کو ختم کرو۔ اس کا منہ بند کرو' کچھ بھی کرو' مگر جلدی۔" ایک سخت نظر ان دونوں پہ ڈال کر وہ باہر نکل گئی۔ ہاشم فوراً" خاور کی طرف پلٹا۔

"اس کو بالکل بھی معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ تم اس کے ہاسٹل گئے ہو۔ اس کے جانے سے پہلے آجانا' کیونکہ اگر اسے کچھ علم ہوا تو وہ انتقام میں آکر ایسی جنگ شروع کرے گا جو میں نہیں چاہتا۔"

"یس سر!" خاور اس کے ساتھ باہر نکلا۔ دونوں سیڑھیوں کے اوپر ریلنگ تک آئے۔ ہاشم نے نیچے دیکھا۔ داخلی حصے پہ شہرین سارہ سے مل رہی تھی۔ ساتھ میں دو بچیاں بھی تھیں۔ آٹھ سال کی جڑواں' کشمیری سیب جیسے گالوں والی' شرما شرما کر ماں کے پیچھے چھپتی۔ ہاشم نے خاموشی سے ان کو دیکھا۔ گردن میں گلٹی سی ابھر کر معدوم ہوئی۔ آہستہ سے بولا۔

"وارث کو ہرٹ مت کرنا خاور! اس کے بچے چھوٹے ہیں۔"

خاور اثبات میں سرہلا کر سیڑھیاں اترنے لگا۔ داخلی دروازے تک پہنچا تو وارث اندر آرہا تھا۔ اس نے خاور کو روکا۔ وہ رکا' سانس بھی گویا رک گیا۔

"میں سیل فون ساتھ لاسکتا ہوں' مجھے ضروری کالز کی فکر ہے۔" موبائل کی طرف اشارہ کیا۔ نپا تلا انداز غور سے خاور کا چہرہ دیکھتا آیا تھا' مگر کھنچا کھنچا سا تھا۔

"شیور سر!" خاور سر کو خم دے کر آگے بڑھ گیا۔

ہاشم گہری سانس لے کر خود کو کمپوز کرتا' مسکراتا ہوا نیچے آیا۔ وارث کو نظر انداز کیا۔ وہ تب تک چھپتا تھا جب تک مقابل شک میں ہو۔ جب حقیقت کھل جائے۔ وہ چھپا نہیں کرتا تھا۔ اعتراف کرلیتا۔ اسی لیے وارث سے کوئی بات نہیں کی۔ سارہ کی طرف آیا۔ وہ زمر کے ساتھ کھڑی تھی۔ ازلی سادہ انداز میں کہتی۔

"ڈیڑھ ہفتہ رہ گیا ہے فنکشنز شروع ہونے میں۔ آپ کیسا محسوس کررہی ہو؟"

"بالکل بلینک۔" زمر نے مسکراتے ہوئے شانے اچکائے۔ وہ میرون لمبی قمیص پہ پھول دار دوپٹہ کندھے پہ ڈالے کھڑی تھی۔ گھنگھریالے بال کھلے تھے۔ ہاشم نے پشت سے اس کے بال دیکھے اور گھوم کر سامنے آیا۔

"ہیلو سارہ۔ اور ہیلو ڈی اے۔"

زمر ذرا سا مڑی' مسکرائی' فرصت سے اسے دیکھا۔
"تھینک یو ہاشم! بہت عرصے سے آپ نے مجھ سے کوئی فیور نہیں مانگا۔"

"بہت عرصے سے میرے کسی عزیز کو کرمنل

Litigation کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔" زمر نے سر جھٹک کر جوس کا گلاس ہونٹوں سے لگایا۔ وہ سارہ کی طرف متوجہ ہوا۔

"آپ کب آئیں انگلینڈ سے؟"

"مجھے تین ماہ ہوئے ہیں ہاشم بھائی! گھر وغیرہ لینے کے چکر میں سارا وقت گزر گیا۔ جاب ابھی اسی ماہ سے شروع کی ہے۔" وہ خوش گواری سے بتانے لگی۔

"تو گھر میں کب شفٹ ہونا ہے؟"

"بس اگلے ہفتے۔" وہ خوش تھی۔ اب ہم ایک فیملی ہوں گے۔"

ہاشم نے مسکرا کر بچیوں کو دیکھا۔ ایک کا گال نرمی سے چھوا۔ "ان کے نام؟"

"ال اور نور۔" سارہ نے اپنے پیچھے چھپتی نور کو سامنے کرنا چاہا مگر وہ راضی نہ تھی۔ ہاشم مسکرا کر رہ گیا۔ پھر کچھ دیر بعد جواہرات کو ادھر لے آیا۔

"زمر! یہ میری ممی ہیں اور یہ ہماری پبلک ڈسٹرکٹ پراسیکیوٹر' زمر یوسف۔" جواہرات مسکرا کر گال سے گال ملا کر اس سے ملی' پھر علیحدہ ہو کر بھرپور اندر تک اترتی نظر ڈالی۔

"سعدی کی آنٹی۔۔۔ ہوں۔"

پھر وہ جواہرات کو ذرا فاصلے پہ کھڑے بڑے ابا سے ملوانے لے آیا وارث ساتھ ہی کھڑا تھا۔ ہاشم بدستور اسے نظر انداز کرتا رہا۔ وہ اپنی عادت سے برخلاف نہیں جا سکتا تھا۔



جائز تھی یا نہیں' تیرے حق میں تھی مگر کرتا تھا جو بھی وہ وکالت تمام شد

لفٹ ہوٹل کے مطلوبہ فلور پہ رکی' دروازے کھلے' پرجوش سی حنین اور منہ میں کچھ چباتا بے تاثر سا فارس باہر نکلے۔ آگے کمروں کی راہداری تھی۔ دونوں طرف دروازے' خوابیدہ زرد بتیاں روشن تھیں۔ حنین نے بڑے پیار سے ساتھ چلتے فارس کو دیکھا۔

"تھینک یو ماموں! آپ مجھے میری بیسٹ فرینڈ سے ملوانے لائے۔"

"فس اوکے تو کیا کرتی ہے تمہاری فرینڈ؟"

حنین چلتے چلتے رکی۔ قدرے چونک کر فارس کو دیکھا۔ "سوری؟"

"مطلب پڑھتی ہے یا جاب وغیرہ؟" وہ بھی ساتھ کھڑا ہو گیا۔ علیشا کے کمرے کا دروازہ چند قدم دور تھا۔

"پڑھائی تو چھوڑ دی۔ کالج نہیں جا سکی۔ ٹیوشن فیس افورڈ نہیں کر سکتی تھی۔ اب پتا نہیں کیا کرتی ہے۔"

"اور اس کے پیرنٹس کیا کرتے ہیں؟"

"مجھے نہیں پتا' مگر آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟" وہ اب کے الجھی تھی۔

"تم نے راستے میں کہا' تم اسے تین سال سے جانتی ہو' مگر تمہیں اس کی بنیادی معلومات ہی نہیں معلوم۔"

"میں نے کبھی پوچھی نہیں۔" وہ دوبارہ چلنے لگے' مگر اب کے فارس مضطرب سا تھا اور حنین الجھی ہوئی تھی۔ روم کے باہر آ کر فارس نے کچھ سوچ کر اسے دیکھا۔

"میں اندر آنا چاہوں گا۔ مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ میں تمہیں درست جگہ لایا ہوں یا نہیں۔"

"شیور!" حنین نے قدرے ناخوشی سے کہتے ہوئے دستک دی۔ دروازہ جلد ہی کھلا اور کھلتا چلا گیا۔ سیاہ شولڈر کٹ بالوں اور سرمئی سبز آنکھوں والی گوری سی علیشا سامنے ہوئی۔ مسکراہٹ لبوں پہ پھوٹتی تھی۔ سیاہ پینٹ اور سفید شرٹ میں ملبوس تھی۔ جس کے بازو کہنی تک تھے۔ کھلے سے۔ قدرے شرارت' قدرے شرماہٹ سے وہ حنین سے گلے ملی۔ الگ ہوئی۔ اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ حنین لب دبائے مسکرا رہی تھی۔

"تم بالکل اپنی ویڈیو جیسی ہو۔" پھر اس نے فارس کو ہیلو کہا اور اندر آنے کی دعوت دی۔

"یہ میرے انکل۔" حنین نے تعارف کروایا۔ پھر

اندر آ گئے۔ فارس گہری نظروں سے علیشا کو دیکھتا' پھر ادھر ادھر دیکھتا صوفے پہ آ بیٹھا۔

حنین گرم جوشی سے بیٹھی اور باتیں کرنے لگی۔ ابھی راہداری کی گفتگو بھول گئی۔ فارس خاموشی سے بیٹھا ان دونوں کو تیز تیز انگریزی میں بولتے اور ہنستے دیکھنے لگا۔ رات کی مناسبت سے کمرے کی ساری زرد بتیاں روشن تھیں۔ علیشا نے اس دوران اٹھ کر روم سروس کال کی' آرڈر دیا۔ واپس آ کر بیٹھی تو شائستگی سے فارس سے پوچھا۔

"اور آپ کیا کرتے ہیں؟"

"گورنمنٹ سیکٹر میں جاب۔" وہ بغور اس کو دیکھتا بولا۔ "اور آپ کی جاب کیا ہے۔"

علیشا ذرا ٹھٹکی' حنین کو دیکھا۔ پھر فارس کو اور بولی۔ "میں نیشنل جیوگرافک کے لیے کام کرتی ہوں۔ ہم ایک ڈاکومنٹری بنانے ادھر آئے ہیں۔"

"اور نیشنل جیوگرافک نے آپ کو نوکری دے دی۔ حالانکہ آپ کبھی کالج نہیں گئیں؟"

علیشا نے چونک کر حنین کو دیکھا۔ جس نے بے چینی سے پہلو بدلا تھا۔ پھر فارس کو۔ مسکراہٹ مدھم ہوئی۔

"اگر میں افورڈ کر سکتی تو ضرور کالج جاتی' مگر اس جاب کے لیے ڈگری سے زیادہ میری قابلیت اہم تھی۔"

"اور کیا ڈاکومنٹری بنا رہے ہیں آپ لوگ۔"

"ہم اس شہر کے تاریخی مقامات کو کور کریں گے۔" وہ گردن اونچی کر کے مسکرا کر بولی۔ فارس نے ابرو اٹھا کر اسے سنجیدگی سے دیکھا۔

"اسلام آباد کے تاریخی مقامات کو؟"

"جی۔"

"ویری گریٹ' کیونکہ مجھے اپنی زندگی کے تینتیس سالوں میں اسلام آباد میں کوئی تاریخی مقام ملا ہی نہیں۔ کیا آپ کو نیٹ جیو والوں نے نہیں بتایا کہ یہ شہر 60ء کی دہائی میں بنایا گیا ایک مصنوعی شہر ہے؟"

علیشا نے تھوک نگلا۔ "میرا مطلب تھا' تاریخی اہمیت کی حامل عمارتیں' جیسے سپریم کورٹ' پارلیمنٹ' پرائم منسٹر ہاؤس وغیرہ۔"

"تو آپ کون سا کیمرہ استعمال کرتی ہیں؟ ہمیں اچھا لگے گا اگر آپ ہمیں اپنے کیمرے دکھائیں۔" فارس نے ادھر ادھر دیکھا' جیسے کچھ تلاشا ہو۔

حنین بالکل چپ سی ہو کر بیٹھی' باری باری دونوں کا چہرہ دیکھتی سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ گفتگو کس سمت جا رہی ہے۔

"میں۔۔۔ دراصل کیمرہ ورک نہیں کرتی۔" علیشا کی مسکراہٹ بالکل غائب تھی۔ وہ ذرا رکی اور پھر روانی سے بولتی گئی۔ "میں کمپیوٹرز میں اچھی ہوں۔ مجھے مختلف کمپنیاں اپنی ویب سائٹس کی سیکورٹی چیک کرنے کے لیے ہائر کرتی ہیں۔ یہ ایک فری لانس جاب ہے۔"

"یہ فقرے مجھے آپ کا پہلا سچ معلوم ہوئے ہیں۔" فارس کے کہنے پر اس کی رنگت پھیکی پڑ گئی۔

"آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ میں یہ سب گھڑ رہی تھی؟"

"میں یہ کہہ رہا ہوں کہ جو آپ گھڑ رہی تھیں۔ اس میں بہت جھول ہیں۔"

حنین پرس اٹھا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ علیشا اور فارس نے بے اختیار اسے دیکھا۔ "بیٹھو پلیز۔"

"نہیں۔۔۔ ہمیں پارٹی پر جانا ہے۔ ہمیں دیر ہو رہی ہے' چلیں ماموں!" اور پھر وہ علیشا کے اصرار پہ بھی نہیں رکی۔ علیشا نے ایک گفٹ پیک اس کے ساتھ کر دیا۔ اس نے کھولا بھی نہیں' لب بھینچے' تندی سے ابرو سکیڑے راہداری میں چلتی گئی۔

"وہ اچھی لڑکی ہے۔ مگر وہ بہت کچھ چھپا رہی ہے اور یہ نیٹ جیو والی کہانی بالکل۔۔۔" فارس سنجیدگی سے ساتھ چلتا کہہ رہا تھا کہ وہ طیش سے اس کی طرف گھومی۔

"تھینک یو سو مچ ماموں! میری بیسٹ فرینڈ کے ساتھ وہ کرنے کا جس کا آپ کو حق نہ تھا۔" احساس

توہین سے اس کا چہرہ سرخ دہکنے لگا۔

"میں نے صرف چند سوال کیے تھے۔ مجھے حق ہے کہ میں تمہاری انٹرنیٹ فرینڈ کو چیک کرسکوں۔"

"کیا ایسے کیا جاتا ہے مہمانوں کے ساتھ؟ وہ کتنا ہرٹ ہوئی ہوگی۔ اس سے بہتر تھا کہ آپ مجھے لاتے ہی نہ۔"

"وہ جھوٹ بول رہی تھی اور میں اس کا جھوٹ پکڑ رہا تھا۔"

"کیا میں نے کبھی آپ کی باتیں پکڑ کر پھپھو کو بتایا کہ وہ نوزپن آپ نے ان کو بھیجی تھی؟"

شدت جذبات میں جو اس کے منہ میں آیا بولتی چلی گئی اور احساس ہونے پہ ایک دم چپ ہوئی۔ سانس تک رک گیا۔ فارس نے بری طرح چونک کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں تعجب' بے یقینی' حتیٰ کہ صدمہ بھی تھا۔ وہ اسی طرح اسے دیکھتا رہا جو اب بظاہر خود کو سنبھالے کھڑی' اندر سے ڈر رہی تھی۔

"تم کون ہو حنین؟"

☼ ☼ ☼

ہاں تلخی ایام ابھی اور بڑھے گی
ہاں اہل ستم مشق ستم کرتے رہیں گے

ہلکا ہلکا میوزک پس منظر میں بج رہا تھا۔ ہاشم گلاس پکڑے مسکراتا ہوا لونگ روم کے اس کونے میں آیا جہاں زرتاشہ کھڑی تھی۔ فون پہ بار بار نمبر ملا کر مایوسی سے بند کرتی' سیاہ ساڑھی میں ملبوس' سیاہ بال بالکل شہرین کے انداز میں کٹے۔ فون بند کرتے ہوئے گردن اٹھائی تو ہاشم کو سامنے کھڑا دیکھا' وہ مسکرا رہا تھا۔ وہ پھیکا سا مسکرائی۔ اس کی آنکھیں بڑی اور سیاہ تھیں اور رنگت سنہری۔

"پریشان ہو؟"

زرتاشہ نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "فارس معلوم نہیں کدھر رہ گئے۔" پھر قریب کھڑے سعدی کو پکارا۔ "سعدی!"

وہ جو ہنستے ہوئے زمر سے کچھ کہہ رہا تھا۔ پلٹا اور تابعداری سے چلتا ادھر تک آیا۔ "جی!"

"فارس؟"

"اوہ ہاں۔ وہ حنہ کو اس کی فرینڈ کی طرف لے گئے ہیں۔ امی نے منع بھی کیا۔ مگر۔" تب ہی کسی نے سعدی کو پکارا۔ وہ مسکرا کر ہاشم بھائی کو دیکھتا واپس چلا گیا۔

"حنہ؟ اوہ۔ وہ سعدی کی چھوٹی چالاک بہن۔" ہاشم کو یاد آیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے گہری نظروں سے زرتاشہ کے چہرے پہ چھاتا دبا دبا غصہ دیکھا۔

"یعنی فارس ایک دفعہ پھر کسی اہم موقع سے غائب ہے؟"

"گھر سے پارٹی کے لیے تیار ہو کر نکلے تھے' پھر نہیں کیا ہوا۔ وہ ہر تقریب پر تو یوں نہیں کرتے۔"

"ہاں' وہ صرف اس تقریب پہ یوں کرتا ہے جہاں یہ ہوتی ہے۔" زمر سے کہتے ہاشم نے ابرو سے اشارہ کیا۔ زرتاشہ نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ سعدی اور زمر' جواہرات کے ساتھ کھڑے تھے۔ زرتاشہ نے الجھ کر واپس ہاشم کو دیکھا۔

"یہ تو سعدی کی پھپھو ہے۔"

"اور فارس کی پرانی ٹیچر بھی۔ کیا تم ہی نے مجھے نہیں بتایا تھا کہ زمر کے والد نے جو تمہاری شادی کی دعوت کی تھی' اس سے بھی فارس تھوڑی دیر بعد غائب ہو گیا تھا۔ اور جب میں نے تم سب کو' زمر سمیت انوائیٹ کرنا چاہا تھا تو اس نے مجھ سے خود کہا کہ مجھے زمر کو نہیں بلوانا چاہیے' صرف گھر کے لوگ کافی ہیں۔"

"تو؟"

"اوہ! کیا تمہیں نہیں معلوم کہ فارس نے زمر کا رشتہ مانگا تھا مگر کسی وجہ سے انکار ہو گیا۔ سعدی نے ایک دفعہ ممی کو بتایا تھا۔" ہاشم ذرا سے شانے اچکائے۔ زرتاشہ حق دق سنتی رہی۔

"میں نے تو کبھی یہ نہیں سنا۔"

"تمہاری شادی کو ہوئے بھی کتنے دن ہیں؟ صرف پانچ ماہ!"

زرتاشہ نے گردن پوری موڑ کر زمر کو دیکھا۔ زمر اب سارہ سے بات کر رہی تھی۔ نیم رخ دکھائی دیتا۔ گھنگریالی لٹ گال پہ گرتی۔ دمکتا چہرہ مسکراہٹ سے بھرپور۔ ہیرے کی لونگ اسی طرف تھی۔ زرتاشہ نے تندی اور غصے سے واپس رخ پھیرا۔

"لوکے۔ مجھے تمہیں نہیں بتانا چاہیے تھا۔ مجھے یقین ہے ان دونوں کے درمیان اب کچھ نہیں ہے۔ یہ ایک پرانی بات تھی۔" ذرا وقفہ دے کر' گلاس لبوں سے لگایا' پھر بولا۔ "یہ ساڑھی اچھی ہے' کیا اسی ڈیزائنر کی ہے جہاں شیری تمہیں لے کر گئی تھی؟"

زرتاشہ کی آنکھوں میں اداسی چھائی۔ گردن دائیں سے بائیں ہلائی۔

"فارس نے کہا' وہ افورڈ نہیں کر سکتے تو میں نے وہ آرڈر کینسل کروا دیا۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟ پے منٹ شیری کے بل میں ہو جاتی۔ تم نے مجھے بتایا ہوتا۔"

"فارس کو اچھا نہ لگتا۔ رہنے دیں ہاشم بھائی۔" وہ اداسی سے رخ موڑ گئی۔

اورنگ زیب کاردار گزرتے ہوئے سعدی کے پاس کے' (زمر کو دیکھا تک نہیں) صرف تنے ابرو سے اس سے سوال کیا۔ "تمہاری بہن نہیں آئی؟" چہرے پہ تنی' اور سرد مہری تھی۔ سعدی فوراً "سے وجہ بتانے لگا۔ وہ "ہوں" کر کے آگے بڑھ گئے۔ سعدی واپس آیا تو زمر سارہ سے بات کر رہی تھی۔ وہ بور سا ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا' تب ہی داخلی دروازے سے جگہ چھوڑ کر آتی شہرین پہ نظر پڑی۔ اس نے بھی ایک تیز سخت نظر سعدی پر ڈالی اور آگے بڑھ گئی۔ وہ خاموش کھڑا رہا۔ نوشیرواں انگلینڈ ہی تھا' اگر وہ ہوتا تو شاید سعدی پارٹی میں نہ آتا۔

لاؤنج کے کونے میں خاموش کھڑے' سب کو باریک بینی سے دیکھتے وارث کا موبائل بجا۔ اس نے فون نکالا اور پیغام دیکھا۔ سسٹم آن کا الرٹ آ رہا تھا۔

وارث اپنی جگہ منجمد ہو گیا۔ اس کا کمپیوٹر اس کے کمرے میں تھا' اور اس کو پیغام بھیج کرتا رہا تھا کہ کوئی اسے آن کر رہا ہے۔ تو کیا کوئی اس کے کمرے میں تھا؟ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ وہ سارہ کے قریب آیا' ہلکی سی سرگوشی کی۔

"میں ایک کال کرنے لان میں جا رہا ہوں' زیادہ دیر ہو جائے تو کہہ دینا کہ میں کہیں آگے پیچھے ہوں۔ اگر جلدی نہ آؤں تو فارس تمہیں گھر لے جائے گا۔"

وہ حیران سی مڑی' سمجھ کر اچھا کہا' اور وارث دھیمی رفتار سے چلتا نکل آیا۔ باہر آ کر اس کی رفتار تیز ہو گئی۔ دل میں عجیب سے خیالات آ رہے تھے۔

ڈائننگ ہال کے کونے میں کھڑے بظاہر کسی سے مسکرا کر بات کرتے ہاشم کو علم تک نہیں ہو سکا کہ وہ کب وہاں سے نکلا ہے۔ یہ رپورٹ اسے خاور دیا کرتا تھا' اور خاور نہیں تھا۔ نہ اس کی کوئی کال آئی تھی۔ ہاشم کا بمشکل چھپایا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

جینے کے فسانے رہنے دو' اب ان میں الجھ کر کیا لیں گے؟

ہوٹل کے ریسٹورنٹ ایریا میں زرد روشنیوں نے سحر انگیز سا فسوں طاری کر رکھا تھا۔ حنین اور فارس آمنے سامنے بیٹھے تھے' یوں کہ حنین کا سر جھکا تھا۔ وہ گھر نہیں گئے' یہیں آ گئے تھے۔ اب اپنی زبان کی پھسلن پہ حنین شرمندہ تھی۔

"تمہیں کیسے پتا چلی نوزین والی بات؟" فارس نے سنجیدگی مگر نرمی سے پوچھا۔ حنین نے خفا خفا سا چہرہ اٹھایا۔

"آپ کی گاڑی میں دیکھی تھی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ آپ وہ پھپھو کو "میوں" بھیجیں گے۔"

"میں نے "میوں" نہیں بھیجی تھی۔" فارس کے ماتھے پہ عادتاً "بل پڑے۔ "صاف بات کرتا ہوں۔ اس وقت مجھے لگا' میری ان سے شادی ہو جائے گی' اور وہ میری لکھائی پہچان جائیں گی۔ تاہم اس لیے نہیں لکھا کہ کوئی اور دیکھ کر غلط نہ سمجھ لے۔"

"پھر آپ نے زرتاشہ آنٹی سے شادی کیوں

کر لی!"

"کیونکہ تمہاری پھپھو سے رشتے کو انکار ہو گیا تھا۔ بات ختم۔ آپا کہہ رہی تھیں' زرتاشہ سے کر لو' میں نے کر لی۔ میں اس شادی سے خوش ہوں۔"

"مگر میں خوش نہیں ہوں۔" وہ سر جھکائے' کولڈ ڈرنک میں اسٹرا گھماتی روٹھی روٹھی سی بولی۔ "مجھے غصہ ہے پھپھو پہ کہ انہوں نے انکار کیوں کیا؟"

"ان کی والدہ نے انکار کیا تھا۔ ان کو تو معلوم بھی نہیں ہو گا۔"

"میں نہیں مانتی!"

"واٹ ایور حنہ۔ میں یہ صرف اس لیے بتا رہا ہوں کہ یہ بات اپنے ذہن سے نکال دو' میرا ان سے کوئی افیئر نہیں تھا۔ اب ان کی شادی ہو رہی ہے۔ کوئی بھی بات ہمارے منہ سے ایسی نہیں نکلنی جو ان کو ہرٹ کرے۔"

"اوکے۔" حنین نے سر مزید جھکا لیا۔ فارس چند لمحے خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

"ان کو کہنا' یہ لونگ اب ان پہ سوٹ نہیں کرتی' اس کو اتار کر کوئی اور پہن لیں۔"

"میں نے کہا تھا' آپ کی شادی کے اگلے دن ہی کہا تھا' مگر وہ کہتی ہیں' مجھے اس کی عادت ہو گئی ہے اور میں تبدیلیوں کے ساتھ بہت دیر سے ایڈجسٹ کرتی ہوں سو اسی کو پہنے رکھوں گی۔"

فارس نے سر ہلایا' پیچھے ہو کر بیٹھا' جوس کا گلاس لبوں سے لگایا اور مسکرایا۔ "تم سے تو ڈرنا چاہیے حنین۔"

ہلکا سا مسکرا کر حنین نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"اسی لیے آپ علیشا کی فکر نہ کریں۔ وہ کوئی جھوٹ نہیں بول رہی۔ اب ہم چلتے ہیں۔ پارٹی پہ بھی جانا چاہیے۔" وہ اٹھ گئی تو فارس والٹ نکالتا کھڑا ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

وہ آئیں تو سرِ مقتل' تماشا ہم بھی دیکھیں گے
یہ شب کی آخری ساعت گراں کیسی بھی ہو ہمدم

وارث غازی کے ہاسٹل کمرے میں اندھیرا تھا۔ خاور' ہاتھوں پہ دستانے چڑھائے' کرسی پہ بیٹھا' غور سے اسکرین کو دیکھتا' لیپ ٹاپ پہ ٹائپ کیے جا رہا تھا۔ یکے بعد دیگرے ڈاکومنٹس کھلتے جا رہے تھے۔ ڈاکومنٹس encrypted تھے' ان کے تالے توڑنے میں وقت لگ رہا تھا' اور ابھی تو بہت سا کام رہتا تھا۔ بار بار محتاط نظروں سے دروازے کو بھی دیکھتا۔ وہ اندر سے بند کر چکا تھا۔

یکایک باہر جوتوں کی آواز آئی۔ خاور پھرتی سے اٹھا' لیپ ٹاپ آف کیا۔ جو کاپی کر رہا تھا' اس کی فلیش کھینچ لی۔ کھڑکی کی طرف آیا' پھر واپس مڑا۔ اونہوں۔ کھڑکی نہیں۔ وہ قد آدم الماری میں آ کھڑا ہوا' پٹ بند کر دیے' تیار' چوکنا۔ ادھر کوئی الماری کھولتا' ادھر وہ اس پر حملہ کرتا۔

چابی گھمانے کی آواز اسے سنائی دی' پھر دروازہ کھلا۔ ڈیم اٹ۔ یہ وارث ہو گا۔ ہاشم صاحب نے اسے کیوں نہیں بتایا کہ وہ پارٹی سے نکل چکا ہے۔ اسے کوفت ہوئی۔

پٹ کی ذرا سی درز کھولے رکھی تھی۔ وارث اندر آیا' کوٹ صوفے پہ پھینکا' جلدی سے کھڑکی چیک کی' وہ اندر سے بند تھی۔ پھر لیپ ٹاپ کی طرف آیا' اس کی اسکرین اٹھائی۔ وہ بند تھا۔ وارث نے اس پہ ہاتھ رکھا۔ گرم تھا۔ یعنی کہ کوئی ادھر تھا۔

اس نے لیپ ٹاپ آن کیا' اور کرسی کھینچ کر بیٹھا۔ ساتھ ہی موبائل نکالا' کال ملا کر کان سے لگایا۔ خاور نے دروازے کو پکڑے پکڑے آگے ہو کر درز سے جھانکا۔ وارث کی اس کی طرف پشت تھی' وہ اتنا قریب تھا کہ خاور اس کے سانس کی آواز بھی سن سکتا تھا۔ اپنا سانس اس نے منہ پہ دوسرا ہاتھ رکھ کر گویا دبا رکھا تھا۔

"سر! میں جانتا ہوں' آپ نے مجھے ہاشم کے ہاتھوں بیچ دیا ہے۔" وارث غصے سے فون پہ کہہ رہا تھا۔ "اس لیے اب آپ چاہیں تو مجھے معطل کر دیں' مگر وہ تمام ثبوت اور ریکارڈز ایک دوسری ایجنسی کو بھیج رہا ہوں'

اب ہم دونوں یہ جاننے والے واحد بندے نہیں رہیں گے۔ اب ہاشم اور اس کی ماں کے خلاف انسداد دہشت گردی ایکٹ تلے تفتیش ہونے سے آپ نہیں روک سکتے۔ کیا آپ نے سنا جو میں نے کہا' سر!"

اور غصے سے فون بند کر کے میز پہ ڈالا۔ وہ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ غم' غصہ' بے بسی' اس کے وجود سے چھلکتی تھی۔ اب آر یا پار' بس اب وہ جو کرے گا' ساری دنیا دیکھے گی۔

وہ ایک فیصلہ کر کے اب ای میل کھول رہا تھا۔ نئی ای میل کا آپشن کلک کیا۔ فارس کا ایڈریس ڈالا۔ لب بھینچے' سوچتے ہوئے وہ ڈاکومنٹس کھولنے لگا اسے کیا کیا بھیجنا تھا؟

خاور کی آنکھیں فکرمندی سے سکڑیں۔ اس نے فارس کے نام کے پہلے حروف پڑھ لیے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اس سب کا کیا مطلب ہے۔ بس ایک لمحہ لگا اس نے فیصلہ کرنے میں' اور آندھی طوفان کی طرح پٹ دھکیلے۔ وارث چونک کر پلٹنے لگا مگر اس سے پہلے ہی خاور نے پستول اس کے سر کی پشت پہ دے مارا۔ وہ اندھے منہ کمپیوٹر ٹیبل پہ جا گرا' اور نیچے لڑھک گیا۔ لمحے بھر کو سارے میں سکوت چھا گیا۔

خاور جھکا' اور اسے سیدھا کیا۔ اس کی بند آنکھیں کھلیں' وہ کراہا بھی تھا' خاور کو بھی دیکھا۔ آنکھوں میں شدید طیش چھلکنے لگا۔ اس نے خاور کا گریبان پکڑنے کی کوشش کی۔

"تمہیں ہاشم نے بھیجا ہے نا۔" مگر خاور نے سختی سے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر موڑے' اسے اوندھے منہ گرایا' کمر پہ گھٹنے سے دباؤ دے کر گرائے رکھا' اور ہاتھ پیچھے کر کے پکڑے۔ بمشکل قابو کیے' جیب سے رسی نکالی جو وہ کسی بھی ایسے موقعے کے لیے ساتھ لایا تھا' ہاتھ باندھے۔ وارث کی آنکھیں سر میں اٹھتے درد کی ٹیسوں کی شدت سے بند ہوئے جا رہی تھیں مگر وہ خود کو ہوش میں رکھنے اور مزاحمت کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے ٹانگ موڑ کر خاور کو دھکیلنا چاہا' مگر خاور اس سے زیادہ مضبوط اور ٹرینڈ تھا۔ اس نے سختی سے اسے نیچے دبائے رکھا اور اس کی ایڑیاں ایک ساتھ باندھ دیں۔ پھر کھڑا ہوا' کپڑے جھاڑے' بوٹ وارث کی کمر پہ رکھ کر اسے کروٹ لینے سے روکے' اس نے موبائل نکالا۔

ہاشم ابھی تک مسکرا کر وہیں کھڑا کسی سے بات کر رہا تھا جب موبائل بجا اس نے خاور کا نام دیکھا' مسکراہٹ سمٹی۔ وہ معذرت کرتا' تیزی سے اوپر آیا۔ کمرے میں آکر دروازہ بند کیا' اور موبائل کان سے لگایا۔

"ہاں' بولو!"

"آپ کو مجھے بتانا چاہیے تھا کہ وہ وہاں سے نکل چکا ہے۔"

"وہ یہاں سے نکل چکا ہے؟" ہاشم نے بے یقینی سے دہرایا۔

"وہ میرے سر پہ آگیا' مجھے اس کو زیر کرنا پڑا۔ وہ فارس کو سارے ڈاکومنٹس ای میل کر رہا تھا۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو؟ اس نے تمہیں دیکھ لیا؟" ہاشم دبا دبا سا غرایا۔ چہرہ سفید پڑا تھا۔

"آپ نے یہ فائلز نہیں دیکھی ہیں۔ اس کے پاس سب ثبوت ہیں۔ گواہ ہیں' ریکارڈز ہیں۔ آپ کے سائن شدہ کاغذات اور اگر میں اس کو نہ روکتا تو وہ یہ سب فارس کو بھیج دیتا۔"

"لعنت ہے تمہارے اوپر خاور! ایک کام تم ڈھنگ سے نہیں کر سکے۔" ہاشم کمرے میں چکراتا' غصے سے کہہ رہا تھا۔

وارث نے نقاہت سے گردن موڑی' حلق سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔

"ہاشم سے کہو' وہ حساب دے گا۔"

خاور نے کوفت اور غصے میں زور سے اس کی پسلی پہ بوٹ کی ٹھوکر ماری۔ وہ ہلکا سا مسکرایا۔

"اب بتائیے' میرے لیے کیا حکم ہے؟ اس کا قصہ ختم ہو جائے تو کوئی ثبوت باقی نہیں رہے گا۔"

"نہیں' ہرگز نہیں۔" وہ بے چینی سے بولا' چہرے پہ پسینہ آرہا تھا۔ پیشانی پہ ہاتھ رکھے وہ بیڈ کے کنارے

بیٹھا گیا۔ ارد گرد گویا دھماکے ہو رہے تھے۔

"سر؟ جلدی بتائیں' کیا کروں۔"

"ٹھہرو۔ مجھے چند لمحے دو۔ چند لمحے خاور۔" اڑی رنگت اور ویران آنکھوں سے کہتے ہوئے ہاشم نے موبائل کان سے لگائے' دروازہ کھولا۔ ریلنگ کے اوپر کھڑے ہو کر دیکھا۔

لاؤنج کے وسط میں سارہ کی بیٹیاں کھڑی تھیں۔ سارہ زمین پہ جھک کر ان میں سے ایک کے جوتے کا اسٹریپ بند کر رہی تھی' ساتھ ہی نرم خفگی سے اس کو کچھ کہہ رہی تھی۔ یقیناً کوئی ایسی بات جو بچپن میں اس کی ماں اس سے کہا کرتی تھی۔ "کھلے تسمہ کے جوتوں سے نہیں بھاگو' تسمہ جوتے تلے آیا تو اوندھے منہ گرو گے۔"

وہ یک ٹک' کمزور' نقاہت زدہ سا ان دو معصوم بچیوں کو دیکھتا رہا' گردن خود بخود نفی میں ہلی۔ کیا وہ ایسا کر سکتا تھا؟ کیا اس کے پاس یہ سب کرنے کی وجہ ان کی معصومیت سے بھی عظیم تھی۔؟

اس کی نگاہیں ان سے گزر کر فاصلے پہ کھڑے اورنگ زیب کاردار پہ گئیں اور پھر ان ہی پہ ٹھہر گئیں۔ وہ ایک سیاست دان دوست کے ساتھ کھڑے ہنس کر کچھ کہہ رہے تھے۔ وہ خوش تھے یا سیاست کی ریہرسل کر رہے تھے۔ نیا کیریر' نیا جوا۔ کیا وہ اس موقع پہ ان کا کوئی اسکینڈل شائع ہونا افورڈ کر سکتا تھا؟ کوئی افیئر ہوتا' کوئی ناجائز اولاد' تو بھی چل جاتا۔ مگر قبائلی علاقوں کے دہشت گردوں سے تعلقات؟ کبھی بھی نہیں۔

ہاشم واپس کمرے میں آیا۔ فون ابھی تک کان سے لگا تھا۔ خاور منتظر تھا۔ ہاشم نے خود کو کہتے سنا۔

"خاور! اسے خودکشی لگنا چاہیے۔" اور موبائل بیڈ پہ پھینک دیا۔ کوٹ بھی اتار کر ساتھ ہی ڈالا۔

خاور نے حکم سن کر آنکھیں بند کیں' پھر چند گہرے سانس لیے۔ آنکھیں کھولیں۔ بوٹ وارث کی کمر سے ہٹایا۔ جھک کر اسے اٹھایا۔ وہ نیم جاں سا بمشکل کھڑا ہو پایا۔ آنکھیں بار بار بند ہو رہی تھیں اور وہ ان کو کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تم کیا چاہتے۔" خاور نے جیب سے رومال نکال کر اس کے منہ میں ٹھونسا۔ میز قریب کی۔ اور وارث کو اس پہ بٹھایا۔ پھر گردن اٹھا کر پنکھے کو دیکھا۔

☆ ☆ ☆

اپنے کمرے میں چلتے ہاشم کے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ وہ باتھ روم تک آیا۔ چوکھٹ کو ہاتھ سے تھام لیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ کرب' درد' دم گھٹنے کی کیفیت وہ چند لمحے یونہی کھڑا رہا۔

☆ ☆ ☆

خاور نے بستر کی چادریں اکٹھی کیں۔ گرہیں لگائیں۔ پنکھے کے گرد پھندا سا لٹکایا۔ وارث اس دوران بمشکل میز پہ بیٹھا تھا' یوں کہ گردن بائیں طرف بار بار لڑھکتی اور وہ بار بار اس کو سیدھا کرتا۔ سر کی چوٹ اس زاویے سے لگائی گئی تھی کہ اس کی ساری مزاحمت دم توڑ گئی تھی۔ خاور نے اسے کندھوں سے پکڑ کر اوپر کھینچا' مگر وہ اپنا پورا زور لگانے لگا' خاور نچلے ہونٹوں کو دانتوں سے دبائے' مزید قوت سے کھینچنے لگا۔ وارث کا سر اوپر ہوا' آنکھوں کے سامنے پھندا لہرایا۔ اس نے بے یقینی سے خاور کو دیکھا۔ ان آنکھوں میں خوف نہیں تھا۔ صرف بے یقینی تھی۔ اور شاید دکھ بھی۔ اور صدمہ بھی۔

☆ ☆ ☆

ہاشم نے آنکھیں کھولیں۔ باتھ روم کا دروازہ دھکیلا۔ اندر قدم رکھے۔ کراش بڑھی تو خودکار بتیاں خود بخود جل اٹھیں۔ پورا باتھ روم روشن ہو گیا۔

واش بیسن کی جگہ کھلی تھی۔ دو سنک لگے تھے۔ اوپر دیوار گیر شیشہ۔ وہ چوکھٹ چھوڑ کر سلیب تک آیا' دونوں ہاتھوں سے اسے تھاما' اور تھامے تھامے جھک گیا جیسے کوئی الٹی کرتے وقت جھکتا ہے۔

☆ ☆ ☆

خاور نے اسے کھڑا کر لیا تھا۔ اس کی گردن کے گرد

پھندا کستے ہوئے کافی دقت ہوئی کہ وہ مزاحمت کر رہا تھا' خود کو چھڑانے کی کوشش۔ ایک آخری کوشش۔ آخری امید' اوہ۔ زندگی کتنی عزیز ہوتی ہے۔ مگر پھندا کس گیا۔ پکا' زور کا۔ خاور نیچے اترا' ایک طویل اور ٹھنڈی سانس اندر اتاری جو ہڈیوں تک میں گھس گئی' اور پھر۔ زور سے میز کو ٹھوکر ماری۔

☆ ☆ ☆

ہاشم نے آنکھیں اٹھا کر آئینے میں دیکھا۔ وہ سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ وہ جھکا' نل تلے ہاتھ لے گیا۔ پانی کی دھار ابلی۔ ہاتھوں کے کٹورے میں جھیل جمع کی' اسے منہ پہ پھینکا۔ آنکھیں بند کیں۔ بوندیں چہرے سے لڑھکتی' گردن پہ ٹپکنے لگیں۔ شرٹ' کف' سب گیلے ہو گئے۔

خاور ٹھوکر مار کر پیچھے ہٹا۔ وارث نے سر ادھر ادھر مارتے' خود کو چھڑانے کی کوشش کی' چند ایک جھٹکے اور۔ سانس حلق میں آپہنچا۔ زندگی کی ڈوری ٹوٹ گئی۔ پنکھے کے پھندے سے جھولتی لاش ساکت ہو گئی۔

خاور نے اس کے ہاتھ کھولے' جلدی جلدی پیر بھی علیحدہ کیے۔ رسی کو پلاسٹک بیگ میں احتیاط سے ڈالا۔ منہ میں ٹھونسا کپڑا نکال کر اس بیگ میں ڈالا' اسے سیل کیا۔ اور اس کے کاغذات' لیپ ٹاپ وغیرہ سمیٹنے لگا۔

☆ ☆ ☆

ہاشم سیدھا ہوا تو لیے سے چہرہ تھپتھپایا' بال دوبارہ برش کیے' اور کوٹ ٹھیک کرتا باہر نکل آیا۔ البتہ اس کے چہرے کا رنگ سفید تھا' پٹیوں میں لپٹی بے جان ممی جیسا سفید اور پژمردہ آنکھیں گلابی تھیں۔ سیڑھیاں اتر کر وہ نیچے آیا۔ سارہ اور بچیوں کے قریب سے گزر گیا' نگاہ ملائے بغیر۔

خاور کی واپسی تک پارٹی جاری تھی خاور پہنچ گیا' اور اسے ترچھی نظروں سے دیکھ کر سر اثبات میں ہلایا۔ ہاشم نے کرب سے آنکھیں بند کر لیں۔ خاور کنٹرول روم کی طرف چلا گیا۔ وہ وہیں کھڑا رہا۔ اس کے اندر بہت کچھ ٹوٹ جڑ رہا تھا۔

فارس اور حنین وہاں پہنچ گئے تھے۔ دونوں خاموش تھے۔ حنین آکر سعدی کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ زمر نے نرمی سے اسے مخاطب کیا۔

"حنین تمہاری دوست سے ملاقات ہو گئی؟" حنین نے ایک خفا خفا سی نظر دور زرتاشہ سے کچھ کہتے فارس پہ ڈالی اور "جی" کہہ کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ زمر خاموش ہو گئی' وہ اس کھنچے کھنچے رویے کی عادی تھی' پھر بھی۔

زرتاشہ تندی سے فارس کو دیکھ رہی تھی۔

"عین پارٹی والے دن ہی حنین کو کہیں جانا تھا اور آپ کو ہی لے جانا تھا؟" وہ دبے دبے غصے سے فارس کو دیکھ کر بولی۔

"یہ پارٹیز تو ہر ہفتے ہوتی ہیں۔" اس نے حسب عادت شانے اچکائے۔ ادھر ادھر دیکھا' حنین ذرا دور تھی' زمر ساتھ تھی' اس نے نگاہیں پھیر لیں۔

"اور آپ صرف ان ہی پارٹیز کو کیوں اٹینڈ نہیں کرتے جن میں پراسیکیوٹر صاحبہ ہوتی ہیں۔"

فارس نے بری طرح چونک کر اسے دیکھا کر پھر بے اختیار حنین کی طرف (کہیں حنہ نے اس سے بھی تو کچھ نہیں کہہ دیا؟) پھر ذرا غصے نے زرتاشہ کو۔ "کیا مطلب ہے اس فضول بات کا؟"

"آپ نے اس کا رشتہ مانگا تھا' نہیں ملا' پھر بھی آپ کے دل میں کیا ہے جو آپ اس سے اعراض برتتے ہیں؟" فارس کے ابرو ناگواری سے سکڑے۔

"میں نے اس کا رشتہ؟ یہ کس نے کہا تم سے ہاں"

"آپ نے نہیں بتایا تو کیا۔ کوئی اور نہیں بتا سکتا؟"

"تم سے کس نے کہا ہے؟" وہ سختی اور طیش سے دبا دبا سا غرایا۔ زرتاشہ ذرا دھیمی ہوئی۔ شوہر کے موڈ کے اتار چڑھاؤ۔ اف

"ہاشم بھائی نے بس اتنا۔"

فارس نے بغیر پلٹا' اور تیز تیز قدم اٹھاتا اندر گیا' ڈائننگ ہال کی چوکھٹ عبور کر کے دائیں بائیں دیکھا' غصے سے کنپٹی کی رگ ابھر آئی تھی۔

دائیں طرف ہاشم پشت کیے کھڑا کسی خاتون سے بات کر رہا تھا۔ فارس تیزی سے اوپر آیا۔ قریب آکر اس کو مخاطب کیا "خاتون دو منٹ دیں' مجھے بات کرنی ہے۔"

ساتھ ہی سخت نظر ہاشم پہ ڈالی' خاتون تو فوراً" ہٹ گئی' مگر ہاشم نے چونک کر اسے دیکھا۔ "کیا ہوا؟"

"تمہیں لگتا ہے مجھے پتا نہیں چلے گا کہ تم کیا کرتے پھرتے ہو میرے پیٹھ پیچھے؟" ہاشم کے حلق میں کچھ اٹکا' ویران نگاہوں سے فارس کو دیکھا' گلاس پکڑے ہاتھ پہ نمی ابھری۔ اسے کیسے پتا چلا؟

"میں واقعی نہیں سمجھا۔"

"میرے بارے میں میری بیوی سے بکواس مت کیا کرو ہاشم!" وہ جتنے غصے سے بولا ہاشم کے تنے اعصاب اتنی تیزی سے ڈھیلے ہوئے' رکا سانس بحال ہوا۔ (اوہ تو یہ بات ہے)

"میں اب تک نظر انداز کرتا آیا ہوں جو ہر وقت تم اسے میری اور اپنی مالی حیثیت کا فرق جتاتے رہتے ہو۔ کبھی میری کسی بات کو نشانہ تنقید بناتا کبھی کسی کو مگر اب مزید یہ نہیں ہوگا تمہارے لیے یہ صرف ایک مشغلہ ہے' مگر اس سے میرا گھر ڈسٹرب ہو رہا ہے آئندہ۔" انگلی اٹھا کر تنبیہ کی۔ "آئندہ میری بیوی سے دور رہنا ورنہ میں بہت برا پیش آؤں گا۔"

کہہ کر وہ مڑ گیا۔ ہاشم خلاف معمول خاموشی مگر سکون سے اسے جاتے دیکھتا رہا' پھر واپس پلٹ گیا۔ اندر کا سارا اضطراب چھپائے۔

دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو یا کرامات کرو ہو

اگلی فجر ابھی تاریک تھی جب جواہرات کی آنکھ کھلی وہ سیدھی اٹھ بیٹھی گردن موڑ کر دیکھا۔ اورنگ زیب کروٹ لیے سو رہے تھے دونوں کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ اس نے تلخی سے سر جھٹکا' جھک کر سلیپر پہنے اور کھڑکی تک گئی۔ باہر سیاہی تھی' روشنی سے ذرا پہلے کا اندھیرا عجیب گھٹن تھی فضا میں جیسے کوئی تعفن زدہ لاش کسی نے بیچ چوراہے پہ رکھی ہو اور اس کی بو نتھوں میں گھس رہی ہو جواہرات کی خوب صورت آنکھوں میں ناگواری ابھری' گاؤن پہنا اور ڈوری کو گرہ لگاتی باہر نکل آئی۔

لاؤنج تاریک تھا۔ بتیاں آٹومیٹک تھیں۔ وہ جس جگہ داخل ہوتی وہاں بتی جل اٹھتی اس نے لاؤنج میں قدم رکھے بتیاں جلتی گئیں۔ وہ ڈائننگ ہال تک آئی۔ آگے نکل گئی۔ بتیاں ساتھ ساتھ بجھتی گئیں' اگلی جلتی گئیں ڈائننگ ہال سے پرے ایک اور راہداری تھی اس کے آگے ایک کمرے کا دروازہ بند تھا نیچے درز سے روشنی آرہی تھی۔ وہ کنٹرول روم تھا' جواہرات چلتے چلتے رکی' آہستہ سے قریب آئی' ساؤنڈ پروف دروازوں سے سننا ناممکن تھا۔ اس نے ہینڈل پکڑ کر گھمایا۔ دروازہ کھلتا گیا۔ ہاشم مضطرب سا ٹہلتا غصے سے کچھ کہہ رہا تھا اور خاور سامنے کھڑا سر جھکائے سن رہا تھا۔

"میں نے کیا بکواس کی تھی؟ اس کو خودکشی لگنا۔" ماں کو دیکھ کر وہ رکا مگر تاثرات نہیں بدلے۔ قریب آیا کہنی سے پکڑ کر حیران پریشان جواہرات کو اندر کیا۔ دروازہ بند کر کے لاک کیا کرسی کھینچ کر کہا "بیٹھیں۔"

وہ نہیں بیٹھی سنگینی محسوس کر کے بے چینی سے اس کا چہرہ تکنے لگی "ہاشم! کچھ غلط ہے' ہے نا؟"

"ہمارے پاس کوئی دوسرا آپشن نہیں تھا۔ وارث واحد شخص تھا جس کے پاس ہمارے خلاف ثبوت تھے میں نے خاور کو اوکے کر دیا' خاور نے اسے مار دیا ہے' اور یہ رہے سارے ڈاکومنٹس' اس کی فائلز' اس کا لیپ ٹاپ۔" اشارہ کیا ان پرزوں کی طرف۔

جواہرات بے دم سی ہو کر کرسی پر گر گئی۔ سر دونوں ہاتھوں میں گرا لیا خاور تفصیلات بتاتا رہا' آخر میں اس نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ گلابی پڑتی آنکھوں سے ہاشم کو دیکھا۔

"کیا اس کی جان لینا ضروری تھا؟ کیا اب ہم قاتل بھی ہو گئے ہیں؟"

"اپنے خاندان کی حفاظت کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں میں۔ بہر حال اب یہ سوچنا ہے کہ آگے

کیا کرنا ہے۔"

"کیا مطلب؟ اس نے خودکشی کرلی' بات ختم۔ ثبوت ہمارے پاس ہیں۔" اس کی حیرانی پر ہاشم نے گھور کر خاور کو دیکھا اس نے سر جھکالیا۔

"خودکشی کب سے لگے گی وہ۔ اس نے اس کے ہاتھ باندھے۔ اس کے سر پر چوٹ لگائی کمر پہ جو مار کھا۔ مزاحمت۔ کے سارے رائی جیسے نشان پوسٹ مارٹم رپورٹ میں پہاڑ بن کر نظر آئیں گے۔ تفتیشی افسر پوسٹ مارٹم کرنے والے ڈاکٹر اور کتنوں کا منہ بند کرنا پڑے گا۔ یہ خودکشی نہیں لگے گی۔" جواہرات اٹھ کھڑی ہوئی۔ بے چینی سے پھرتی رہی پھر چونک کر ہاشم کو دیکھا۔

"تو ٹھیک ہے۔ یہ قتل بھی ہو سکتا ہے ڈاکو آئے سامان لوٹا اور بندے کو مار دیا۔" اس نے چیزوں کی طرف اشارہ کیا جو خاور ساتھ لایا تھا۔

"آسان نہیں ہوگا۔ فارس کبھی بھی اتنے پہ نہیں بیٹھے گا۔" ہاشم بے چینی سے نفی میں سر ہلا رہا تھا' سب خراب ہوتا نظر آرہا تھا۔

"ہاشم! ڈونٹ وری' تم قتل کے وقت پارٹی میں تھے تمہارے پاس alibi (الِبی بائی) ہے۔" جواہرات اپنی بات پہ خود ہی چونکی۔ ہاشم نے بھی چونک کر اسے دیکھا۔ خاور نے بھی بے اختیار سر اٹھایا۔

"الِبی بائی!" ہاشم کسی سوچ میں بھٹک گیا۔ (یعنی کسی شخص کا جرم کے وقت کسی دوسری جگہ پر موجودگی کی شہادت ہونا۔

"مگر۔" جواہرات تیزی سے اس کے قریب آئی اس کی آنکھیں امید سے چمکنے لگیں۔ "فارس پارٹی میں نہیں تھا۔ وہ خاور کی واپسی کے ہی بعد آیا۔ اس دوران وہ جاکر قتل کر سکتا ہے اور واپس آسکتا ہے خاور کے یہاں ہونے کے گواہ ہم دونوں ہوں گے اور ہاشم کی گواہی تو سارے مہمان دیں گے۔"

"فارس۔" وہ سوچتی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ "فارس پارٹی میں نہیں تھا' فارس سوتیلا بھائی ہے' فارس قاتل ہو سکتا ہے۔"

"ہمیں یہ سب فارس پہ پلانٹ کرنا ہے۔" جواہرات نے آگے آکر دائیں بائیں ترتیب سے لگی چیزوں کو دیکھا رسیاں' پلاسٹک بیگ میں تھیں "اس پہ وارث کا ڈی این اے ہوگا' یہ سب اگر پولیس کو فارس کے گھر سے ملے تو اسے اپنی پڑ جائے گی' وہ کیس کے پیچھے ہی نہیں پڑے گا۔"

ہاشم تذبذب سے سنتا رہا جو اسے اس کی ماں چمکتی آنکھوں کے ساتھ بتا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لہو کا سراغ
نہ دست و ناخن قاتل نہ آستین پہ داغ

فجر قضا ہو چکی تھی۔ صبح طلوع ہونے لگی۔ فارس چابی انگلی میں گھماتا ہوا ہاسٹل کی عمارت کے احاطے میں آگے بڑھ رہا تھا۔ منہ میں گم چباتے وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ آج اتوار کی صبح تھی' خاموشی چھائی تھی۔ وہ چلتا گیا چلتا گیا پھر برآمدے میں رکا۔ وارث کے کمرہ کا دروازہ کھٹکھٹایا ایک دفعہ' دو دفعہ' سہ بار۔

پھر موبائل نکالا۔ کال ملائی فون آف تھا اس نے پھر ملایا۔ ساتھ والے کمرے سے ایک آفیسر نکل رہا تھا۔ فارس نے اسے روکا۔ وارث کا پوچھا۔ وہ فارس کو جانتا تھا۔

"ہاں' وہ اندر ہوگا۔ رات کو آگیا تھا پھر باہر نہیں نکلا۔" فارس نے اب کے ذرا زور سے دروازہ کھٹکھٹایا وہ نوجوان بھی ساتھ ہی کھڑا ہو گیا۔ چند لمحے وہ کھڑے رہے۔

"وارث۔ وارث۔ دروازہ کھولو۔" وہ قدرے فکر مندی سے دروازہ دھڑ دھڑانے لگا۔ آہستہ آہستہ دو چار مزید لوگ اکٹھے ہو گئے۔ فارس نے سارہ کو کال کی۔

"سارہ! وارث کہاں ہے؟" اسے اپنی آواز گھبرائی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔

"میری بات نہیں ہوئی رات سے۔ ابھی اٹھی ہوں کال کرنے لگی تھی۔ آج ہم نے۔" فارس نے

بات سنے بغیر فون جیب میں ڈالا اور زور زور سے دروازہ کو ٹھوکریں مارنے لگا۔ وہ اندر سے مقفل تھا۔ دو آدمی آگے بڑھے زور سے دروازے کو ٹھوکریں ماریں۔ لوگ ارد گرد اکٹھے ہو گئے۔ تماشا سا لگ گیا۔

تیسرے منٹ میں دروازے کا لاک ٹوٹا اور وہ اڑتا ہوا دوسری طرف جا لگا۔ پوری قوت سے فارس اندر گرتے گرتے بچا پھر سیدھا ہوا گردن اٹھائی تب اسے لگا وہ کبھی اپنے پیروں پہ کھڑا نہیں ہو سکے گا۔

پنکھے کے ساتھ وارث کی لاش جھول رہی تھی۔ اس نے چیخ و پکار سنی مگر کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے بھاگ کر سب سے پہلے وارث کے پیر پکڑ کر ذرا اٹھائے۔ گردن کی رسی ڈھیلی ہوئی مگر وہ محسوس کر سکتا تھا۔ یہ ٹانگیں بہت سرد تھیں۔ بے جان۔ فارس پیچھے ہٹا ہاتھوں کو پھیلائے سب کو پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا۔

"کوئی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگائے' سب پیچھے۔"

اس کا رنگ سفید پڑ رہا تھا اور وہ اندر داخل ہونے سے سب کو روک رہا تھا سارہ کا فون ابھی بھی ہولڈ تھا۔ اسے بہت سے لوگوں کو خبر دینی تھی کیسے' وہ نہیں جانتا تھا۔

بس جانتا تھا تو ایک ہی بات۔ اسے اپنے جسم سے جان سی نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔

سب ختم ہو گیا تھا۔

کب اشکوں سے جڑ سکتا ہے
جو ٹوٹ گیا' سو چھوٹ گیا

تین دن بعد۔

سارہ کی والدہ کے گھر میں سوگواری چھائی ہوئی تھی۔ وارث کے جنازے کو آج تیسرا دن گزر چکا تھا مگر وہاں پھیلی نادیدہ کافور کی مہک اور میت کے گھر کی ویرانی برقرار تھی۔ سعدی اندر داخل ہوا تو باہر برآمدے کی ایک کرسی پہ پیر اوپر رکھے حنین بیٹھی تھی گال ہتھیلی پہ جمائے کسی غیر مرئی نقطے کو دیکھ رہی تھی آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ سعدی کے دل کو کچھ ہوا۔ وہ قریب آیا۔

وہ ہنوز سامنے دیکھتی رہی۔ آنسو گرتے رہے۔

"بھائی! وہ ماموں تھے فور گرانڈ پیار کرتے تھے' خیال رکھتے تھے سب فور گر تھا۔ ہمارا حق۔ اچھے لگتے تھے۔ عزت کرتی تھی میں ان کی' ٹھیک ہے' بات ختم مگر۔ تین دن سے میں خود حیران ہوں' میں دکھی سے زیادہ حیران ہوں مجھے آج پتا چلا ہے کہ میں تو ماموں سے بہت محبت کرتی تھی مجھے تو پتا ہی نہیں تھا کہ میں ان کو اتنا مس کروں گی میرا دل ایسے دکھے گا مجھے تو کبھی پتا ہی نہیں تھا بھائی۔ مجھے اٹھتے بیٹھتے ماموں کی شکل دکھائی دیتی ہے' سوتے وقت آخری خیال۔ جاگتے وقت پہلا خیال۔ وارث ماموں۔ بس۔" اس نے بھیگی اجنبی نگاہوں سے سعدی کو دیکھا۔ "بس ایک دن چاہیے صرف ایک دفعہ مجھے ماموں سے دوبارہ ملنا ہے اور ان کو بتانا ہے کہ میں ان سے کتنی محبت کرتی ہوں۔ صرف ایک گھنٹے کے لیے۔ بھائی کیا ہم صرف ایک گھنٹے کے لیے بھی اپنی زندگیوں کو ریورس نہیں کر سکتے۔"

وہ خاموشی سے دیکھتا رہا پھر اٹھ گیا۔ دل ایسے اجڑا تھا کہ لگتا تھا آگے کچھ باقی ہی نہیں رہا دنیا میں۔

وہ اندر آیا۔ کچن میں ندرت کرسی پہ بیٹھی تھیں۔ ذکیہ بیگم دور بیٹھی آنسو پونچھتی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ سعدی آ کر ماں کے ساتھ کھڑا ہوا کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ ندرت نے سر اٹھا کر سرخ آنکھوں سے اسے دیکھا۔ ارد گرد بھری رشتے دار خواتین کو یکسر نظر انداز کیے اس سے پوچھا۔

"سعدی! لوگ اس ترتیب سے کیوں نہیں مرتے جس سے وہ پیدا ہوتے ہیں یہ چھوٹے پہلے کیوں مر جاتے ہیں؟ کیسے واپس لاؤں میں اسے؟"

سعدی کا دل بھر آیا۔ اس نے ماں کے کندھے سے ہاتھ اٹھایا اور مڑ گیا۔

اندر ایک کمرے میں بیڈ پہ سارہ بیٹھی تھی۔ اس کی سعدی کی طرف پشت تھی۔ اس کی ہمت نہیں ہوئی۔ چوکھٹ پہ رک گیا پھر دیکھا۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل کے ساتھ وارث کی بیٹیاں کھڑی تھیں۔ امل چپکے چپکے کہہ رہی

تھی۔

"میرے بابا چلے گئے' اب میں اپنے بابا کو کیسے بلاؤں گی؟ اب مجھے ناشتا کون کرائے گا؟"

نور فرش پہ چوکڑی مار کر کہنیاں گھٹنوں پہ جمائے گالوں پہ ہاتھ رکھے بیٹھی تھی۔ ذرا سا سوچا پھر آنکھیں چمکیں' ہاتھ گال سے ہٹائے سر اٹھا کر بہن کو دیکھا اور چہک کر بولی۔

"کوئی بات نہیں۔ ہم بابا کو فون کرلیں گے' وہ ہمارا فون ہمیشہ اٹھاتے ہیں۔" امل نے اداسی سے اسے دیکھا اور نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ سمجھتی تھی اور جو سمجھتی تھی وہ چھوٹی بہن کو نہیں سمجھا سکتی تھی۔

نور اٹھی اور سارہ کا موبائل اٹھا کر جلدی جلدی بابا کا نمبر ملایا اور فون کان سے لگایا۔

"آپ کے مطلوبہ نمبر سے جواب موصول نہیں ہو رہا۔ برائے مہربانی تھوڑی دیر بعد کوشش کریں۔"

"کتنی دیر بعد کروں دوبارہ' سعدی بھائی؟" اس نے چوکھٹ پہ کھڑے سعدی کو پکارا' سارہ سب سن رہی تھی۔ اس کے نام پہ گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ سر جھکا کر آگے آیا۔

سارہ کے سامنے زمین پہ پنجوں کے بل بیٹھا۔ سارہ نے بھیگی' ویران آنکھوں نے اسے دیکھا۔ اس کی ناک اور گال لال ہو رہے تھے۔

"میرا دل چاہتا ہے سعدی! میں اپنی تمام ڈگریوں کو کہیں پھینک آؤں۔ اتنے سال جن کے لیے میں نے ضائع کر دیے' وہ سال میں وارث کے ساتھ بھی گزار سکتی تھی۔ کیا ہم زندگی کو ری وائنڈ نہیں کر سکتے؟ صرف ایک دن کے لیے۔ ایک سال کے لیے۔ تھوڑا سا زیادہ وقت۔ تھوڑی سی زیادہ مہلت سعدی۔" آنکھیں بند کیں ٹپ ٹپ آنسو چہرے پہ لڑھکتے گئے۔

"خالہ!" اس نے جھکا سر اٹھایا۔ "ہم ضرور ان کے قاتلوں کو ڈھونڈیں گے اور ان کو سزا دلوائیں گے۔" اس کے دل کی یاسیت اور اجڑا پن بڑھ گیا تھا۔

"کیا اس سے وارث واپس آجائے گا؟" پھر سارہ نے خود ہی نفی میں سر ہلایا۔ سعدی لاجواب ہو گیا۔

اس سوال کا جواب اس کے پاس تب نہیں تھا۔ یہ جواب اسے کئی سال بعد ملا تھا۔



کون گواہی دے گا اٹھ کر جھوٹوں کی اس بستی میں
سچ کی قیمت دے سکنے کا تم میں یارا ہو تو کہو

بالکونی میں جواہرات اور ہاشم کھڑے تھے۔ دونوں مضطرب مگر بظاہر سکون سے دور انیکسی کی طرف دیکھ رہے تھے جس کے برآمدے میں پولیس کے چند اہلکاروں کے ساتھ فارس کھڑا کوئی بیان دے رہا تھا۔ وہ مسلسل بھنویں سکیڑے کچھ کہے جا رہا تھا اور آفیسر سن رہا تھا۔

"تمہیں وہ چیزیں اس کی گاڑی کے بجائے گھر میں پلانٹ کروانی چاہیے تھیں۔" جواہرات ناگواری سے سامنے دیکھتی بولی۔ ہاشم نے ہلکا سا نفی میں سر ہلایا۔

"کیوں بھول جاتی ہیں کہ اس کا گھر ہماری چار دیواری کے اندر آتا ہے کیا سوچے گا کہ جب کوئی باہر سے اندر سیکورٹی سے گزرے بغیر آ نہیں سکتا تو اس کے گھر تک کیسے پہنچ سکتا ہے؟ گاڑی تو پورے شہر میں گھومتی ہے۔"

مگر جواہرات کا اضطراب کم نہیں ہوا تھا۔

"کیا اب پولیس اسے گرفتار کرلے گی؟"

"نہیں' لیکن اگر اس نے "خودکشی نہیں قتل' قتل" کی رٹ نہ چھوڑی تو کرنا پڑے گا۔"

جواہرات تعجب سے اس کی طرف گھومی۔ "تو یہ سب کیا ہے؟ یہ تلاشی وغیرہ؟"

"صرف ایک وارننگ۔" ہاشم ہلکا سا مسکرایا پھیکی مسکراہٹ۔

جواہرات قدرے مضطرب سی واپس ادھر دیکھنے لگی جہاں فارس برآمدے میں کھڑا تھا۔ یہاں تک آواز نہیں آتی تھی۔ وہ صرف اس کی حرکات و سکنات سے اندازہ کر رہی تھی۔

"جھوٹ بول رہی ہے وہ سائیکاٹرسٹ۔" فارس بمشکل ضبط کر کے غرایا تھا۔ پولیس آفیسر خاموشی سے

سنتا گیا۔ "وارث نہ کبھی اس کے پاس گیا تھا نہ وہ کبھی اینٹی ڈپریشن دوائیں لیتا تھا یہ سب بکواس ہے یہ ایک قتل ہے اور آپ کو اس کی تفتیش کرنا ہوگی۔"

"پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق۔"

"میں نہیں مانتا اس رپورٹ کو۔ وہ میرا بھائی تھا' میں نے اسے غسل دیا ہے۔ اس کے جسم پہ تشدد کے نشان تھے۔"

"اور اس کی وضاحت کیسے کریں گے آپ؟" اس نے شفاف پلاسٹک بیگ میں رکھا موبائل اور رسی دکھائی۔ "ہم نے موبائل کے جی پی ایس کو آپ کی گاڑی تک ٹریس کیا اور یہ رسی۔ یہ سب چیزیں آپ کی گاڑی سے ملی ہیں۔" اس نے زور دے کر دہرایا۔ فارس کے لب بھینچ گئے۔

"تو؟ وہ اس رات ادھر ہی تھا' ہو سکتا ہے وہ اپنا موبائل میری گاڑی میں بھول گیا ہو یا کسی نے اس کو مجھ پہ پلانٹ کیا ہو۔"

"تو پھر کیا ہی اچھا ہو غازی صاحب! کہ یہ ایک خودکشی ہی ہو کیونکہ اگر یہ قتل نکلا تو یہ۔" پیکٹ لہرایا "آپ کے پاس سے برآمد ہوا ہے۔" فارس نے سمجھتے ہوئے اسے گھورتے اثبات میں سر ہلایا۔

"بالکل یعنی کہ میں اس کیس کو فالو نہ کروں ورنہ یہ میرے اوپر ڈال دیا جائے گا تو پھر جائیں' وہ کریں جو کرنا ہے کیونکہ میں تو اس کیس کو نہیں چھوڑوں گا۔"

باہر جانے کا راستہ بازو سے دکھایا۔ وہ خاموشی سے چلے گئے۔ فارس سوچتا کھڑا رہا۔ اس کا غم اب "غصے" کے مرحلے میں داخل ہو چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

سعدی سارہ کے کمرے سے باہر آیا تو کچن میں گھنگھریالے بالوں کی جھلک دکھائی دی۔ زمر وہاں کھڑی تھی۔ اس وقت ندرت کو دوا دے رہی تھی۔ وہ روز آجاتی پھر ان کے ساتھ رہتی۔ سعدی کو دیکھ کر نرمی سے تسلی دینے کے انداز میں مسکرائی اور پھر باہر آگئی۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ برآمدے میں آئے' وہاں اب حنین نہیں تھی۔ زمر اس کی جگہ پہ بیٹھ گئی' سعدی ساتھ کھڑا ہو گیا۔

مایوس' شکستہ' پریشان۔

"ہم یعنی فارس ماموں اور میں پراسیکیوٹر آفس گئے تھے مگر وہاں کوئی بھی اس کیس کو شروع کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں پوسٹ مارٹم رپورٹ اور سائیکاٹرسٹ کی رپورٹ کے بعد تو بالکل بھی نہیں۔"

زمر نے ہمدردی سے اسے دیکھا۔

"سعدی! کیا یہ واقعی خودکشی تھی؟"

"زمر! یہ کیسی خودکشی تھی جس میں ماموں کے ہاتھ پہ رسی باندھنے کے نشان تھے' یہ قتل تھا۔ ان کی فائلز غائب ہیں۔ لیپ ٹاپ' فون غائب ہے۔"

"اوکے' میں پراسیکیوٹر بصیرت سے بات کرتی ہوں' وہ یقیناً یہ کیس۔۔۔؟"

"وہ کیوں زمر؟" وہ چڑ گیا' خفگی سے اسے دیکھا۔

"آپ کیوں نہیں؟"

زمر ایک دم رک گئی' اچنبھے سے سر نفی میں ہلایا۔

"میں' میں تو چھٹی پر ہوں۔"

"چھٹی والے دن ہی میرے ماموں قتل ہوئے تھے۔"

"مگر۔ سعدی۔ دیکھو بیٹا۔" وہ ذرا رسان سے کہتی آگے ہوئی۔ "مجھے بہت افسوس ہے' وارث بھائی بہت اچھے انسان تھے۔ بہت وضع دار اور رکھ رکھاؤ والے۔ جس دن سے یہ ہوا ہے ہم سب اپ سیٹ ہیں مگر میں نے اتنے سال بعد اب بریک لی ہے۔ سعدی! میرے پاس روز اتنے قتل کیسز آتے ہیں' میں بہت سوں کو بھگتا چکی ہوں' یہ کوئی بھی دوسرا پراسیکیوٹر لے سکتا ہے۔ میرا ہونا ضروری نہیں ہے۔"

"ہمیں آپ پہ اعتبار ہے' باقیوں پہ نہیں۔" وہ ضد کر رہا تھا۔

"مگر میں ایک ہفتے میں کیا کر لوں گی؟ پھر شادی کے وقت تو مجھے لازمی چھٹی پہ جانا ہوگا اور۔۔۔" وہ سمجھاتے ہوئے کہہ رہی تھی اور سعدی کا دماغ بھک سے اڑ گیا' اس نے بے یقینی سے زمر کو دیکھا۔

"آپ۔ آپ شادی کیسے کر سکتی ہیں؟"

زمر ایک دم سے رک کر اسے دیکھنے لگی۔ "کیا مطلب؟"

"ہمارا ماموں قتل ہو گیا اور آپ کو اپنی شادی کی پڑی ہے؟"

زمر اٹھ کھڑی ہوئی' سعدی کے بالکل مقابل' وہ اب بھی ناسمجھی سے اسے دیکھ کر سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"سعدی۔ میری شادی کل نہیں ہے۔ ابھی آٹھ تو دن ہیں اور یہ تو پہلے سے طے تھا۔ کارڈ بٹ چکے ہیں اب اس ٹریجڈی کے بعد کوئی دھوم دھام نہیں ہوگی۔ شادی سادگی سے ہی ہوگی مگر حماد کی فیملی میں کتنے لوگ باہر سے چھٹی لے کر آئے ہیں۔ سب تیار ہے اب کینسل تو نہیں ہوگا نا بیٹا! جو ہونا ہے وہ ہونا ہے۔"

"اور ہماری فیملی' زمر؟ ہم کتنے ٹوٹ گئے ہیں ہمارے اس غم میں آپ ہمیں یوں چھوڑ کر شادی کرنے جا رہی ہیں۔" وہ بے یقین تھا اور زمر ابھی تک سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ کیوں نہیں سمجھ رہا۔

"سعدی امی نہیں رہیں' ابا میری شادی کے بارے میں بہت وہمی ہو گئے ہیں۔ میں 29 سال کی ہوں میری ایک تیار شادی کینسل ہو گئی تھی امی کی ڈیتھ کی وجہ سے پہلے ہم نے یہ شادی چھ ماہ آگے کی۔ اب دوبارہ تو آگے نہیں ہوگی نا۔"

"آپ اتنی خود غرض کیسے ہو سکتی ہیں؟" وہ صدمے میں تھا۔

زمر متحیر رہ گئی' بنا پلک جھپکے اس نے سعدی کو دیکھا "خود غرض؟" اسے اپنی آواز کسی کھائی سے آتی سنائی دی۔

"میں خود غرض ہوں سعدی؟"

"کیا آپ ہمارے لیے اس شادی کو آگے نہیں کر سکتیں؟"

مگر وہ ابھی تک یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔ خود غرض۔ خود غرض۔ خود غرض پھر لب بھینچ لیے۔

"ہمیں کسی سے صرف اتنی قربانی مانگنی چاہیے جتنی وہ دے سکے۔"

"مجھے نہیں پتا۔" اسے غصہ آنے لگا۔ "ہمارے خاندان میں ایک قتل ہوا ہے اور آپ پراسیکیوٹر ہیں۔ کیا آپ ہمارے لیے اتنا سا بھی نہیں کر سکتیں؟ ہمارے غموں کا کیا' زمر؟"

"اور میری خوشیوں کا کیا؟" وہ بس اسے دیکھتی رہ گئی کہہ نہ سکی۔ وہ غصے میں آگے بڑھ گیا۔ زمر نے گردن موڑ کر اسے جاتے دیکھا اور پھر پرس لے کر باہر نکل آئی۔

گھر آئی تو بڑے ابا قمیص کے کف بند کرتے آئینے کے سامنے کھڑے تھے۔ وہ کہیں جا رہے تھے ساری دوپہر وہ بھی سارہ کی طرف تھے شاید آرام کر کے ادھر ہی جا رہے تھے۔ امی کے جانے کے بعد ذرا کمزور ہو گئے تھے مگر مضبوط رہنے کی اداکاری اچھی کر لیتے اسے دیکھ کر مسکرائے مڑے وہ نہیں مسکرائی نہ مڑی۔ ان کو دیکھتی رہی۔ ان کی مسکراہٹ غائب ہوئی غور سے اس کو دیکھا۔

"تو پھر تم کتنی دیر کی تمہید باندھو گی؟" معلوم تھا وہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔

"آپ فضیلہ آنٹی سے کہہ دیں کہ شادی دو ایک ماہ آگے کر دیں۔"

بڑے ابا کے ابرو سکڑے' مزید غور سے اسے دیکھا۔

"کیوں؟"

"سعدی کے ماموں فوت ہوئے ہیں جوان موت ہے۔ کتنی خود غرضی کی بات لگے گی اگر میں۔" الفاظ بھرا گئے۔ مگر اسے رونا نہیں تھا۔

"خود غرضی؟" وہ اسے دیکھتے آگے آئے۔ بالکل سامنے "اور کدھر سے آ رہی ہیں یہ باتیں؟" دروازے کو دیکھا جہاں سے وہ آئی تھی۔ "تم فوتگی کے گھر سے آ رہی ہو' مطلب سعدی نے کہا ہے یہ سب؟"

"اُفوہ! اس نے کچھ نہیں کہا۔ میں خود کہہ رہی ہوں۔ شادی آگے جا سکتی ہے موت کی وجہ سے شادی آگے کرنی چاہیے۔ نہیں کی تو خود غرض ہوگی۔"

"اتنا عجیب رد عمل' زمر یعنی واقعی اسی نے کہا ہے تو پھر بالکل خاموش ہو کر میری بات سنو۔" ذرا سختی سے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔ "اگلی دفعہ جب سعدی کہے کہ شادی آگے کی جاسکتی ہے تو کہنا جب تمہاری دادی فوت ہوئی تھیں تب میری تیار شادی چھ ماہ آگے کر دی تھی' اگر وہ کہے کسی رشتہ دار کی موت پہ کی جاسکتی ہے تو کہنا۔ تمہاری دادی کی وفات کے صرف ایک ماہ بعد فارس نے شادی کی اور ہم نے کچھ نہیں کہا اور اگر وہ کہے کہ تم خود غرض ہو تو اسے بتانا کہ اس کی فیس کون دے رہا ہے۔"

"ابا!" اس نے تڑپ کر غصے سے ان کو دیکھا۔

"وہ صرف اتنا چاہتا ہے کہ میں یہ کیس لے لوں۔"

"یہ تمہاری مرضی ہے مگر میں شادی آگے نہیں کروں گا۔ ندرت سے بھی بات کر چکا ہوں' اس کو کوئی اعتراض نہیں۔ تمہاری شادی پہلے بھی سعدی کی وجہ سے نہیں ہو سکی تھی اور اب۔"

"وہ بچہ تھا' اس سے غلطی ہوئی تھی۔"

"وہ اب بھی بچہ ہے۔ اب بھی غلطی کر رہا ہے۔"

پھر ذرا دھیمے ہوئے "وہ اپنی طرف سے خلوص نیت سے ہی کہہ رہا ہے مگر وہ بچہ ہے۔ اس کو ان باریکیوں کی سمجھ نہیں۔ یہ موضوع ختم ہوا۔" وہ کالر ٹھیک کرتے باہر نکل گئے۔

زمر ان کو دیکھتی رہ گئی۔ ٹی وی پہ کوئی عورت کسی ڈرامے میں کہہ رہی تھی۔

"سچ کہتے تھے لوگ' بھانجوں' بھتیجوں کو پیار دو یا قربانی' وہ اپنی اولاد نہیں ہوتے۔" اس نے کوفت سے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی بند کیا۔ موبائل پہ کال ملائی پھر بولی تو لہجہ سرد تھا۔

"سعدی! صبح مجھے آفس میں ملو۔ ہاں اپنے فارس ماموں یا جس کے ساتھ بھی آو مستغیث جو بھی ہے تب تک میں کیس کی پیش رفت پڑھ لوں گی۔" اور فون بند کر دیا چہرے پہ البتہ ناخوشی تھی۔

زمر خوش نہیں تھی۔ بالکل بھی نہیں۔

مدعی نہ شہادت حساب پاک ہوا

یہ خون خاک نشیناں تھا رزق خاک ہوا

آفس میں وہ میز کے اس طرف کنٹرول چیئر پہ تھی سامنے تین کرسیوں پہ وہ تینوں تھے۔ بے چین سا آگے کو ہو کر بیٹھا اکیس سالہ کم عمر سعدی' اس کے بائیں طرف ٹانگ پہ ٹانگ رکھے سوٹ میں ملبوس' موبائل پہ ٹائپ کرتا ہاشم۔ تیسری کرسی پہ جینز اور گول گلے کی شرٹ میں ملبوس پیچھے ہو کر بیٹھا فارس۔ ہاشم چونکہ ان سے مسلسل تعاون کر رہا تھا اور وہ ایک پریکٹس کرنے والا وکیل تھا' اس لیے اور خود اس کی پیش کش پہ اس کو ساتھ لائے تھے گو کہ وہ اور فارس آپس میں بات نہیں کر رہے تھے۔

"یہ وہ تصاویر ہیں کندھوں پہ نشان' کمر پہ جوتا یا کسی وزنی چیز سے مارنے کے' سر پہ چوٹ' ہاتھ پاؤں پہ رسی باندھنے کے نشان۔"

فارس ایک ایک چیز پہ انگلی لگا کر تصاویر اسے دکھا رہا تھا۔ زمر خاموشی سے ٹیک لگائے بیٹھی اسے سن رہی تھی۔ گھنگریالے بال جوڑے میں بندھے تھے' ونگ چمک رہی تھی۔

"اس کا باس اس پہ استعفیٰ کے لیے دباؤ ڈال رہا تھا۔ فاطمی۔" ہاشم نے بنا چونکے سپاٹ چہرے کے ساتھ اسے دیکھا۔

"میں نے اسے استعفیٰ دینے سے منع کیا تھا مگر وہ پریشان تھا۔ آپ کو اس کے باس سے تفتیش کرنی ہو گی۔ اس کا لیپ ٹاپ' فائلز سب غائب ہیں۔ وہ یقیناً" جس کیس پہ تفتیش کر رہا تھا' اس میں ملوث لوگوں نے اسے مروایا ہے۔" فارس کہہ رہا تھا پورے وثوق سے۔

زمر آگے ہوئی۔ سر اثبات میں ہلایا۔ ایک فائل نکال کر اس کے سامنے رکھی' کھولی۔ انگلی سے صفحہ پہ ایک جگہ دستک دی۔

"دو رسیاں' ایک موبائل فون' ایک کپڑا جو داخل تفتیش ہیں' ثبوت نمبر بارہ' تیرہ' چودہ اور پندرہ۔ جو کیس کا ریکارڈ ہے' یہ آپ کی گاڑی سے برآمد ہوا ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔" وہ سنجیدہ تھا۔

"فارس! اس کیس کو شروع کرنے سے پہلے میں اس بات کا تعین کرنا چاہتی ہوں کہ میں استغاثہ ہوں یا دفاع۔ اس لیے فی الحال ایک اٹارنی کی حیثیت سے میں ایک سوال پوچھنا چاہتی ہوں۔ آپ کا جواب اٹارنی کلائنٹ پریویلج کے تحت محفوظ رہے گا۔"

(اٹارنی کلائنٹ پریویلج یعنی موکل بتائی گئی کوئی بات چاہے وہ اعتراف جرم ہی ہو' وکیل کسی کو حتیٰ کہ پولیس کو بھی نہیں بتا سکتا' پریویلج توڑنے کی صورت میں وکیل کا لائسنس منسوخ ہو جائے گا اور وہ ساری زندگی وکالت پریکٹس نہیں کر سکے گا)

"اوکے!" فارس نے اچنبھے سے اسے دیکھ کر سر ہلایا۔ ہاشم ہلکا سا مسکرایا۔ وہ جانتا تھا گفتگو کدھر جا رہی ہے۔ اس نے سعدی کا کندھا تھپکا۔ "ہم باہر چلے جاتے ہیں۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔" فارس نے زمر کو دیکھتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر روکا۔ سعدی نے ناسمجھی سے سب کو دیکھا۔ زمر آگے ہوئی۔ سنجیدگی سے فارس کو دیکھا۔

"کیا آپ نے اپنے بھائی وارث غازی کا قتل کیا ہے؟ یا کیا کسی بھی طرح آپ اس قتل میں ملوث ہیں؟"

سعدی کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ اس نے بے یقینی سے زمر کو دیکھا۔ فارس کے جبڑے بھنچ گئے ہاشم نے بمشکل مسکراہٹ روکی۔ (انٹرسٹنگ۔)

"نہیں۔ ہرگز نہیں۔" وہ رکا۔ اسے واقعی صدمہ ہوا تھا۔ "آپ کیسے سوچ سکتی ہیں کہ میں اپنے بھائی کو مار سکتا ہوں؟"

"فارس! آپ قانون بھی جانتے ہیں اور تفتیش کا طریقہ کار بھی۔ آپ نے بھی بہت سی تفتیش اس طرح شروع کی ہوں گی اور آپ خاموش ہیں۔" اس نے جذباتی ہو کر کچھ کہتے سعدی کو سختی سے ہاتھ اٹھا کر خاموش کرایا مگر وہ چپ ہونے پہ آمادہ نہیں تھا۔

"پھپھو! آپ یہ کیا۔"

"میں اس وقت آپ کی پھپھو نہیں ہوں سعدی' میں پراسیکیوٹر ہوں' میں بالکل بھی مداخلت برداشت نہیں کروں گی اگر آپ نے دوبارہ ٹوکا تو میں آپ کو باہر جانے کا کہہ سکتی ہوں۔" وہ خاموش ہو کر پیچھے ہو گیا البتہ بار بار فارس کو دیکھتا تھا۔ وہ فارس کی طرف متوجہ ہوئی۔ سنجیدہ' سپاٹ۔

"تو پھر یہ آپ کی کار سے کیوں برآمد ہوئے؟"

"کسی نے مجھے سیٹ اپ کرنے کی کوشش کی ہے۔"

"اوکے۔" زمر نے اثبات میں سر ہلایا۔

"سو میں اس بات کو سچ سمجھوں کہ آپ اس قتل میں ملوث نہیں ہیں۔"

"وہ میرا بھائی تھا میڈم پراسیکیوٹر! میں اپنے بھائی کو قتل کیوں کروں گا؟"

"کیا بس یہی ڈیفنس (دفاع) ہے آپ کا؟" وہ سپاٹ لہجے میں بولی جیسے مایوس ہوئی ہو۔

فارس خاموش رہا۔ اسے اب احساس ہوا تھا کہ زمر اس کی طرف ہے۔ خلاف نہیں۔ وہ دھیما پڑا۔

"نہیں' میرے پاس alibi (ایلی بائی) ہے۔ میں اس وقت حنین اپنی بھانجی کو اس کی دوست کی طرف لے کر گیا تھا ایک ہوٹل میں۔ یقیناً" ہوٹل کے سی سی ٹی وی کیمرہ میں میرے آنے اور جانے وغیرہ کا وقت ریکارڈ ہو گا۔ اور میں اس لڑکی کو گواہ کے طور پر بھی پیش کر سکتا ہوں۔"

"اب یہ ہے بہتر ڈیفنس!" زمر نے سر ہلاتے ہوئے نوٹس لیے پھر اسے دیکھا۔ "آپ کو مجھے اپنی ایلی بائی سے ملوانا ہو گا۔ میں یقین دہانی کے بعد ہی کیس plead کروں گی۔"

"اوکے۔ کل تک اسے ادھر لے آؤں گا یا آپ کو ادھر لے جاؤں گا۔ ڈن؟"

"شیور!" زمر نے چند اور نوٹس لیے پھر سر اٹھا کر سوچتی نظروں سے اسے دیکھا۔ "پولیس نے آپ کو گرفتار نہیں کیا' گاڑی سے یہ سب ملنے کے باوجود بھی۔" ان چیزوں کی تصاویر کی طرف اشارہ کیا۔

"کیونکہ میرا خیال ہے' یہ وارننگ تھی کہ میں اسے خودکشی سمجھ کر بند کردوں ورنہ وہ اسے میرے اوپر ڈال دیں گے۔"

"ہوں' اب ہم کس سمت بڑھ رہے ہیں۔" تب ہی ہاشم کھنکھارا۔

"آئی ایم شیور فارس بے گناہ ہے۔" ساتھ ہی فارس کے تاثرات دیکھے۔ وہ ذرا نرم ہوئے۔ سر کے اثبات سے ہاشم کی بات کی تائید کی اور اٹھ گیا۔

"ہر چیز کے لیے شکریہ میڈم پراسیکیوٹر!" اور فارس باہر نکل گیا۔ سعدی قدرے بے چین' قدرے الجھا ہوا تھا' زمر سے بات کرنے کے لیے لب کھولے مگر پھر رعب تھا یا کیا' وہ بغیر کچھ کہے باہر چلا گیا۔

ہاشم سب سے آخر میں اٹھا۔ مسکرا کر زمر کو دیکھا۔

"آپ کا کیا خیال ہے' کیا فارس بے گناہ ہے؟"

وہ سامنے پھیلے صفحے سمیٹتے ہوئے ذرا شانے اچکا کر بولی۔ "میری رائے میٹر نہیں کرتی۔"

"کم آن' اب تو ہم دوست ہیں۔"

"نہیں۔ ہم بالکل بھی دوست نہیں ہیں۔" زمر نے سنجیدگی سے چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ "بہرحال میرا خیال ہے کہ وہ بے گناہ ہے۔"

ہاشم کے گلے میں پھندا سا لگا۔ بہرحال وہ مسکراتا رہا۔ "اور کس بات سے آپ کو یہ لگا؟"

"قتل کیس میں تین چیزیں ہوتی ہیں۔ قاتل' مقتول اور وجہ قتل۔ اس تکون میں قاتل کی جگہ فارس فٹ نہیں آتا۔ کیونکہ اس کے پاس اپنے بھائی کو مارنے کے لیے کوئی وجہ' کوئی مقصد نہیں ہے۔ وہ کیوں مارے گا وارث غازی کو؟"

"ہوں۔" سر اثبات میں ہلاتے' ہاشم مڑ گیا۔ مڑتے ساتھ ہی چہرے سے مسکراہٹ غائب ہوئی' اور اس کی جگہ سختی نے لے لی۔ خود پہ سو دفعہ لعنت بھیج کر وہ باہر نکلا۔

"آخر اتنی اہم بات وہ کیسے مس کر گیا؟"

فارس اور سعدی باہر کھڑے تھے۔ وہ کوٹ کا بٹن بند کرتا ان تک آیا۔ ہلکا سا مسکرایا۔

"ڈی اے کو تمہاری بات پہ یقین ہے فارس۔ اب تمہیں اس کو اپنے الیبائی سے ملوانا ہے بس۔" ذرا رک کر سوال کیا۔ "تمہاری بھانجی کی دوست کون ہے اور کہاں رہتی ہے؟" وہ ذہن میں ایک نیا لائحہ عمل ترتیب دیتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"وہ امریکن ہے۔ گوری۔ ہوٹل میں رہ رہی ہے۔ کل ملوا دوں گا میڈم سے اس کو۔" وہ ناخوش لگ رہا تھا۔

"کیا نام ہے اس کا؟"

"علیشا۔" سعدی نے جواب دیا۔ وہ اب اداس اور مضمحل سا فارس کے پیچھے جا رہا تھا۔ اس ساری کارروائی سے قطعاً" ناخوش نہیں لگ رہا تھا۔

ہاشم لب بھینچے' بے تاثر نگاہوں سے اسے جاتے دیکھے گیا۔ گردن میں گلٹی سی ابھر کر غائب ہوئی۔ اس نے ہلکا سا سر جھٹکا گویا کہ نظرانداز کرنے کی کوشش کی' مگر۔ ذہن میں کچھ کھٹک گیا تھا۔ "علیشا۔ امریکن۔"

"ہے' سعدی!" اس نے اسے پکارا۔ دور جاتا سعدی پلٹا۔ دھوپ کے باعث آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا۔

"فارس سے کہو' مجھے اپنی الیبائی کا نام' ہوٹل کا پتا وغیرہ ٹیکسٹ کرے' میں اس کریڈیبلٹی چیک کرلیتا ہوں' کورٹ میں ہر زاویے سے اسے جج کیا جائے گا۔"

"او کے!" سعدی مڑ گیا فارس دور جا رہا تھا۔ وہ اس کے پیچھے چلا گیا۔

ہاشم وہیں کھڑا ان کو دیکھتا رہا۔ پھر موبائل نکالا' کال ملائی۔

"خاور۔ کچھ دیر میں ایک عورت کا نام اور ہوٹل کا پتا ٹیکسٹ کرتا ہوں۔" "مجھے اس کے بارے میں اتنی معلومات چاہئیں جتنی اس کی سگی ماں کو بھی نہ ہوں۔" کرختگی سے کہہ کر فون بند کردیا۔

☼ ☼ ☼

چار سال بعد۔

حماد اور سعدی کے مشترکہ رشتہ دار کی شادی کے فنکشن میں کھڑا ہاشم بنا کسی کرختگی کے' مسکرا کر کسی سے بات کر رہا تھا۔ اس کے مخاطب نے قہقہہ لگایا تو ماضی میں کھوئی حنین چونکی' اردگرد دیکھا۔ وہ رنگوں اور روشنیوں سے سجے فنکشن میں کھڑی تھی۔ ہاتھ میں پکڑے پیالے کا ٹھنڈا میٹھا گرم ہو گیا تھا۔

وہ دھیرے دھیرے چلتی واپس اپنی میز تک آئی۔ سست روی سے بیٹھی۔ زمر اب وہاں نہیں تھی۔ حنین نے ذرا کی ذرا گردن موڑی۔ وہ قدرے فاصلے پہ جواہرات کے ساتھ کھڑی تھی۔ حنین کی "رشتے کو انکار کرنے والی بات۔" پہ ابھی تک اسی کے وہی تاثرات تھے۔ شاکڈ' سوچ میں ڈوبی ہوئی۔ حنین نے ہونہہ کر کے رخ موڑ لیا اور سوفلے کھانے لگی۔

"کیا تم یہ سوچ رہی ہو کہ یہاں آکر تم نے غلطی کی؟" جواہرات نے مسکرا کر' نزاکت سے اپنے بال انگلی سے ہٹائے اور ساتھ کھڑی زمر کو دیکھ کر پوچھا۔ وہ خود بین گلے والے لمبے آف وائٹ گاؤن میں ملبوس تھی اور ہمیشہ کی طرح جوان اور تروتازہ لگ رہی تھی' زمر نے دور دولہا دلہن کو دیکھتے شانے اچکائے۔

"مجھے فرق نہیں پڑتا۔"

"آئی ایم سوری' اس دن سونیا کی سالگرہ پہ بھی میں نے ایسی ہی بات کر کے تمہیں دکھی کر دیا تھا۔" جواہرات نے نرمی سے اس کا ہاتھ دبایا۔ زمر پھیکا سا مسکرائی' بولی کچھ نہیں۔

"میں دانستہ طور پر تمہیں احساس دلانے کو ایسی باتیں کر جاتی ہوں۔ تم خود دیکھو اپنے آپ کو۔ اس شخص کے پیچھے تم خود کو ضائع کر رہی ہو۔ ڈپریشن ایک مرض ہے اور تم اس سے صحت یاب نہیں ہو سکیں۔" وہ نرمی سے کہہ رہی تھی۔ زمر پھر سے سامنے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سے تاثرات رقم تھے۔

"تم کبھی آگے نہیں بڑھ سکو گی اگر تم فارس سے انتقام نہ لو۔ وہ اس سب کا ذمہ دار ہے اور وہ آزاد گھوم رہا ہے۔"

"میں نے چار سال انتظار کیا کہ شاید کورٹ اس کو سزا دے' مگر۔ مگر وہ کل بھی سب کی نظر میں بے گناہ تھا' آج بھی وہ بے گناہ ہے۔" وہ سامنے دیکھتے ہوئے تلخی سے بولی۔

"تو پھر اب کیا کرو گی؟ خاموش ہو کر بیٹھ جاؤ گی؟" وہ احتیاط سے زمر کے تاثرات دیکھتی ضربیں لگا رہی تھی۔

"اونہوں۔ اب میں اپنا انتقام خود لوں گی۔" وہ سرد اور سپاٹ سی ہنوز دولہا دلہن کو دیکھ رہی تھی۔ جواہرات کی آنکھیں چمکیں' ہونٹ مسکراہٹ میں ڈھلتے گئے۔

"تم کچھ پلان کر چکی ہو۔ میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں اگر تم چاہو تو۔ آخر فارس نے بے وجہ تم پہ اتنا ظلم۔۔۔"

"وجہ تھی اس کے پاس۔" زمر نے رخ پھیر کر جواہرات کو دیکھا۔ "اس کا رشتہ میرے پیرنٹس نے ٹھکرایا تھا' وہ یہی سمجھا کہ میں نے ٹھکرایا ہے سو اس نے مجھے ایسا بنا دیا کہ میں ہمیشہ کے لیے ٹھکرا دی جاؤں۔"

جواہرات نے نرمی سے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ "آئی ایم سوری۔"

"میں نے اس کی تمام کیس فائلز پراسیکیوٹر بصیرت سے مانگ لی ہیں۔"

جواہرات کے حلق میں کچھ اٹکا۔ بظاہر مسکرا کر اس نے حیرت سے کہا۔ "مگر۔ تم قانون سے مایوس ہو' پھر اس کیس کو ری اوپن کرنے کا فائدہ؟"

"ری اوپن نہیں کرنا' صرف پڑھنا ہے اور دیکھنا ہے کہ اس میں کوئی چنگاری باقی ہے یا نہیں۔ اور مجھے امید ہے کہ میرے دل کی طرح یہ کیس بھی مردہ ہو چکا ہے۔ یوں میری حجت تمام ہو جائے گی۔"

"اوہ۔ تم خود کو مطمئن کرنا چاہتی ہو کہ انصاف کا راستہ چھوڑ کر انتقام کا رستہ تم نے قانون سے مکمل مایوسی کے بعد اپنایا؟" جواہرات کی اٹکی سانس بحال ہوئی۔ دلچسپی بڑھ گئی۔

زمر نے اثبات میں سر ہلایا۔ اردگرد کے لوگوں سے

بے نیازوہ دونوں مدہم آواز میں بات کر رہی تھیں۔
"تو۔اس کے بعد تم کیا کروگی؟"

"مسز کاروار' جب یہ سب ہوا تھا' اور میں نے فارس کو اپنا ملزم نامزد کیا تھا' تب کسی نے میری بات کا یقین نہیں کیا۔ اگر کورٹ اس کو سزا دے دیتا' تب بھی سعدی' ابا' حسین' سب کو یہ ظلم لگتا۔ کوئی کبھی نہیں مانے گا کہ فارس نے یہ سب میرے ساتھ کیا۔ اس نے مجھے اس جرم کی سزا دی جو میں نے کیا ہی نہیں تھا۔"

"اور اب تم کیا کروگی؟"

زمر نے گال پہ آئی گھنگھریالی لٹ انگلی پہ لپیٹی' ذرا مسکرا کر جواہرات کو دیکھا اور آہستہ سے بولی۔ "میں اس کو ایک ایسے جرم کی سزا دوں گی جو اس نے نہیں کیا ہوگا۔ اور میں اس کو اس سب میں اس طرح پھنساؤں گی کہ سعدی' بڑے ابا' سب اسے مجرم مانیں گے۔"

"مگر۔ زمر' کسی کو سیٹ اپ کرنا ایک مشکل کام ہے۔ تمہیں اس کے لیے فارس کے پل پل کی رپورٹ چاہیے ہوگی۔ اس کے بینک اکاؤنٹس' کریڈٹ کارڈز' گاڑیوں' کمپیوٹرز' ہر شے تک رسائی چاہیے ہوگی اور سب سے بڑھ کر آخر میں تمہیں خود اس سے نکلنے کا محفوظ راستہ چاہیے ہوگا تاکہ کوئی تم پہ شک نہ کرسکے۔ یہ سب تم کیسے کروگی؟"
جواہرات ذرا الجھی تھی۔ زمر کی مسکراہٹ میں مزید تلخی آگئی۔

"ہے ایک طریقہ مگر اس پہ خود کو راضی کرنے کے لیے مجھے کچھ وقت چاہیے۔"

جواہرات نے قدرے چونک کر اسے دیکھا۔ "کیسا طریقہ؟"

وہ جواب میں اتنا آہستہ بولی کہ جواہرات کو بمشکل سنائی دیا۔

"In Sickness and in health
Till Death do us apart"

(بیماری میں اور صحت میں ہم ساتھ رہیں گے حتیٰ کہ موت ہمیں جدا کردے)

جواہرات بالکل سن رہ گئی۔ اس نے بے یقینی سے زمر کو دیکھا۔

"تم ایسا نہیں کرسکتیں۔"

"میں سب کچھ کرسکتی ہوں۔ اسے مجھ سے شادی کرنا تھی' جو نہیں ہوئی اور اس نے میرے ساتھ جو کیا وہ پوری دنیا نے دیکھا۔ بس کچھ دن لگیں گے' پھر میں خود کو راضی کرلوں گی اس شادی پہ' اور اس کے بعد جو میں اس کے ساتھ کروں گی' وہ بھی پوری دنیا دیکھے گی۔"

"تم اپنی زندگی کے ساتھ اتنا بڑا جوا کیسے کھیل سکتی ہو؟"

"میری زندگی تھوڑی سی رہ گئی ہے مسز کاردار۔ چار سال تک تو یہ گردے چل گئے' مگر اب شاید ہی مزید چار سال چلیں۔ اس تھوڑی بہت زندگی میں مجھے بس ایک کام کرنا ہے۔ سعدی اور ابا کو دکھانا ہے کہ میں سچ بول رہی تھی' اور فارس کو اس کے کیے کی سزا دلوانی ہے۔ بس۔"

جواہرات نے چونک کر اسے دیکھا۔ "اوہ اور تم یہ سب اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کو مجھے نہیں بتا رہیں۔ تمہیں میری مدد چاہیے' ہے نا۔"
زمر ہلکا سا مسکرائی۔

"میں آپ کے ساتھ اپنے دل کا بوجھ کیوں ہلکا کروں گی' آف کورس مجھے آپ کی مدد چاہیے۔"
(باقی آئندہ ماہ انشاء اللہ)

ناولٹ

اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کے پاس وحی بھیجی کہ۔
"اے موسیٰ علیہ السلام!
اپنے ماں' باپ کی عزت کر' کیونکہ جو کوئی ماں' باپ کی عزت کرتا ہے۔
میں اس کی عمر بڑھا دیتا ہوں۔
اور۔
اسے ایسا بچہ عطا کرتا ہوں جو اس کے ساتھ نیکی کرے۔
اور جو کوئی ماں' باپ کو ستاتا ہے۔
میں اس کی عمر کم کر دیتا ہوں۔
اور۔
اس کو ایسا بچہ عطا کرتا ہوں جو اس کو ستائے۔"

"باجی۔! میرا پتر پڑھیا تے ہے' پر کڑھیا کوئی نہیں۔"

کیا بات کر دی تھی ماسی برکتے نے اور صحیح فرمایا گیا تھا کہ۔

"جب اولاد ماں' باپ کو ذلیل کرے گی تو۔ قیامت آجائے گی۔"

وہ وہیں کھرے پر بیٹھ کر چڑیوں کو دانہ چگتے دیکھنے لگی۔

نانی ماں کہتی تھیں کہ چڑیوں کو باجرہ ڈالنے سے ان کی دعائیں لگتی ہیں۔ سادہ لوگ۔۔۔ کتنے سال گزر گئے ایک دعا بھی نہ لگ کر دی۔

"نانی ماں! ایک بات تو بتائیں۔۔۔" وہ بھری دوپہر

میمونہ صدف



وہ ایک ایک مٹھی باجرہ لیے کچے صحن کے ایک حصے میں بکھیرتی جاتی اور آگے بڑھتی جاتی' جب تک باجرہ پورے صحن میں پھیل نہ جاتا۔ یہ اس کے روز کا معمول تھا۔ وہ چھٹیاں گزارنے ہمیشہ نانی ماں کے پاس گاؤں چلی آتی تھی۔ نانی ماں سے اس کی بہت بنتی تھی۔ وہ اس کی ہمراز بھی تھیں اور غمگسار بھی۔ مگر اس بار وہ نانی ماں کے پاس چھٹیوں میں نہیں آئی۔

"بس باجی! میرا پتر مینوں کہندا "اوئے بکواس نہ کر۔۔۔ اوئے بکواس نہ کر۔۔۔" ماسی برکتے منہ پر دوپٹا رکھ کر روتی جاتی' آنسو پونچھتی جاتی۔ وہ کن انکھیوں سے نانی ماں اور خالہ برکتے کو دیکھتی۔ دل دکھ سے بھر بھر آتا' ایسی اولاد بھی ہوتی ہے۔

ان کے تکیے پر سر رکھے' آنکھیں موندے لیٹی ماسی برکتے کو سوچے جا رہی تھی۔ نانی ماں سلائیوں اور اون سے کھیلتی سویٹر بننے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔ نظر کم ہو گئی اور یادداشت کمزور۔

"کیا صرف اولاد ہی نافرمان ہوتی ہے۔ والدین ہمیشہ ٹھیک ہوتے ہیں۔۔۔ ٹھیک کرتے ہیں؟"

نانی اماں کے چلتے ہاتھ تھم گئے۔ انہوں نے گردن گھما کر اس کی جانب دیکھا۔ تیکھے نقوش اور سانولی رنگت والی نواسی کا رنگ چند دن میں ہی وہاں رہ کر کملا گیا تھا۔

"ایسا بھی تو ہوتا ہو گا کہ والدین غلط کر دیں۔ اولاد کا حق مار لیں۔۔۔ کوئی ناانصافی کر دیں پھر۔ ان کے لیے

کیا سزا ہے؟" نانی ماں کا دل دہل کر رہ گیا۔ وہ کبھی ایسی باتیں نہیں کرتی تھی جیسی ابھی کر رہی تھی۔

وہ اس کے سارے سوالات کا پس منظر خوب جانتی اور سمجھتی تھیں۔ کتنی کوشش کی کہ ان کا اکلوتا نواسا ہی ان کی لاڈلی نواسی سے شادی کے لیے مان جائے مگر نہیں۔۔۔ اس کی جدھر مرضی تھی' وہیں کرلی شادی۔

انہیں اپنے داماد فرید مراد کے خاندان سے بڑے شکوے شکایات تھیں۔۔۔ ایسی بھی کیا پرکھوں کی روایات کا پاس کہ بچیوں کے ساتھ اس قدر زیادتی کردی جائے۔

لو بھلا مردوں کی روایات کا پورا خیال ہے اور زندوں کو جھونکو بھاڑ میں۔۔۔ پھر بیٹیاں ہی کیوں بھینٹ چڑھیں ان رسم و رواج کے؟ بیٹے کیوں نہیں۔۔۔؟ لڑکے چاہیے تو خاندان سے باہر شادی کرلیتے مگر مجال ہے جو لڑکیوں کے لیے کبھی کسی نے سوچا بھی ہو۔۔۔ بھلے سے تیس' چالیس کی دہائی تک جالگیں۔ بھلے سے لڑکا رنڈوا ہو' اپاہج ہو' ان پڑھ جاہل ہو مگر ہو خاندان کا۔۔۔

زینب بی بی سے بھی انہیں یہ ہی شکوہ رہا کہ ماں ہو کر بیٹیوں کی طرف داری کرنے کے بجائے شوہر کے رنگ میں ڈھل گئیں۔

بڑی بیٹی صالحہ کو تو چلو پڑھایا لکھایا ہی کم تھا۔۔۔ سو میٹرک پاس سے بیاہ دیا۔ وہ بھی سعودیہ چلا گیا تو صالحہ کی قسمت چمک اٹھی تھی۔ مگر اب بریہ کو جو شوق سے اتنا پڑھایا لکھایا' نوکری کروائی' ہر طرح سے آزادی دی اور اب۔۔۔ شادی کے انتظار میں بیٹھے بیٹھے بتیس کا کردیا۔ وہ۔۔۔؟ فرید مرادیوں تو بڑے آزادانہ ماحول کے قائل تھے مگر ایک اس نقطے پر پہنچ کر وہی ڈھاک کے تین پات۔۔۔

بریہ نے کالج کے بعد آگے پڑھنا چاہا تو زینب بی بی کی ہزار مخالفت کے باوجود بولے۔۔۔

"کیوں نہیں۔۔۔ جتنا پڑھنا چاہتی ہے پڑھے۔"

زینب بی بی وہی خاموش۔ سو بیٹی نے اکنامکس میں ماسٹرز کرڈالا۔

نوکری کی خواہش ظاہر کی تو بولے۔۔۔ "ہاں ہاں۔۔۔ ضرور کرے نوکری۔ میرا ہاتھ بٹائے گی' بیٹا بنے گی میرا۔"

ہاں مگر وہ بنی تھی۔۔۔ سو بیٹی ہی رہی۔ بیٹا ہوتی تو چھوٹے بھائی بصیر کی طرح کسی اچھے خاندان میں اپنی مرضی سے شادی نہ کرلیتی۔ چلو مرضی سے نہ سہی مگر کسی ڈھنگ کی جگہ تو رشتہ پکا ہو جاتا۔۔۔

اور اب تو بریہ کے بعد مروہ بھی چوبیس کی ہونے والی تھی۔۔۔ یونیورسٹی جاتی تھی خیر سے' کمپیوٹر انجینئرنگ کررہی تھی۔

ایسا نہیں تھا کہ اتنے سالوں میں کوئی رشتہ ہی نہ آیا تھا۔۔۔ رشتے تو بہت آتے مگر کوئی ڈھنگ کا بھی تو ہو۔ کوئی کلرک بھرتی تھا تو کوئی پرچون کی دکان پر بیٹھتا۔ اس پر مستزاد کسی کی بھی تعلیم میٹرک' ایف۔ اے سے زیادہ نہ تھی۔ ایسے بے جوڑ رشتے جب بھی آتے امی تو انکار کردیتیں مگر ابو سوچنے کے لیے وقت مانگ لیتے' پھر وہ اندر ہی اندر کڑھتی رہتی کہ کیوں اتنا پڑھ لکھ گئی۔۔۔ اس سے بہتر تھا وہ ان پڑھ رہتی۔ مگر وہ یہ باتیں محض سوچتی تھی' امی ابو سے کہہ نہیں سکتی تھی۔ خاندان میں تو بس اسی قسم کے رشتے تھے۔۔۔ لڑکوں کو پڑھنے کا شوق نہ تھا اور لڑکیاں پڑھ پڑھ کر لائن لگا رہی تھیں۔

"والدین کبھی برا نہیں سوچتے پتر!" نانی ماں سمجھانے لگیں۔

"ہاں مگر والدین بھی انسان ہوتے ہیں نانی ماں۔ ان کے فیصلے بھی غلط ہوسکتے ہیں۔ ان سے بھی زیادتی ہوسکتی ہے۔ یہ کہاں لکھا ہے کہ وہ گناہوں سے' غلطیوں سے مبرا ہیں۔۔۔؟"

نانی ماں اس کی شکل دیکھتی رہ جاتیں۔ کیا کہتیں۔ سولہ آنے درست بات کی تھی نواسی نے۔

"ایک بات بتاؤں نانی ماں۔۔۔" انہوں نے ہولے سے سرہلایا۔

"میں امی ابو کی عزت کرتی ہوں مگر ان سے محبت نہیں کرتی۔۔۔" نانی ماں حق دق رہ گئیں۔

"میں اللہ کا حکم سمجھ کر محض حسن سلوک کرتی ہوں۔۔۔ میرے دل میں پیار نہیں امڈتا۔ میں کیا کروں؟"

نانی ماں خاموش رہیں۔۔۔ بتیس برس کے سانچے کو توڑا جاسکتا تھا' پھر سے نہیں بنایا جاسکتا تھا۔ تربیت کا ایک وقت ہوتا ہے۔۔۔ ہر وقت نہیں ہوتا۔ وہ وقت گزر گیا تو سب گزر گیا۔

وہ اٹھ کر نماز پڑھنے چلی گئیں۔۔۔ اور وہ وہیں لیٹے لیٹے گزشتہ ہفتے ہونے والے واقعے کو سوچنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"بھئی زینب! ارے کہاں ہو۔ ناشتا ملے گا آج یا ایسے ہی جانا پڑے گا۔۔۔ اچھا میری بات سن لو۔" امی سرعت سے نکل کر سامنے آکھڑی ہوئیں۔

"وہ لطیف صاحب نہیں ہیں ملتان والے۔۔۔ ارے بھئی راشدہ کے بہنوئی۔" انہوں نے اپنی دور پار کی بھابھی کا حوالہ دیا تو امی کو جیسے یاد آگیا۔

"انہوں نے اپنے بیٹے کے لیے بریہ کا رشتہ مانگا ہے۔ اس ویک اینڈ پر آنے کا کہا ہے۔۔۔ مناسب سی تیاری کرلینا کھانے پر۔۔۔ لڑکا سپاہی ہے فوج میں۔۔۔ گھر بار مل جائے گا۔۔۔ خاندان بھی اچھا ہے۔۔۔ عمر میں شاید بریہ سے پانچ برس چھوٹا ہوگا مگر چلو اتنا فرق تو چلتا ہے۔ تم آج کل میں ہی بصیر کو فون کرلو۔۔۔ اس کی مرضی جاننا بھی تو ضروری ہے۔ اکلوتا بیٹا ہے ہمارا۔"

وہ چائے سڑک سڑک کر پینے لگے اور وہ جہاں کی تہاں رہ گئی۔ بصیر کی مرضی اہم تھی۔۔۔ اور اس کی مرضی؟

"ہاں آج ہی فون کرتی ہوں۔۔۔ بہت اچھا رشتہ ہے۔ جتنی جلدی ہوجائے یہ کام اتنا ہی اچھا ہے۔"

زینب بی بی نے کچھ جتاتی نظروں سے بریہ کو دیکھا تو اس کے وجود میں حرکت پیدا ہوئی۔۔۔ ناشتے کے جھوٹے برتن اٹھا کر باورچی خانے میں لے جانے لگی۔ نل کھول کر منہ پر پانی کے چھپاکے مارے۔ وہ ہرگز رونا نہیں چاہتی تھی مگر وہ رو رہی تھی۔

"دل کیوں اتنی جلدی بھر آتا ہے اور آنکھوں کو بھی بھردیتا ہے۔"

"ایک بار ہمت کرکے منع کردو ابو کو' ورنہ ساری عمر پھر منہ چھپا کر یونہی روتی رہو گی۔۔۔" مروہ چائے کا کپ رکھنے کے بہانے اندر آئی تھی۔

وہ کیوں یوں ہر بار مروہ کے ہاتھوں روتے ہوئے پکڑی جاتی تھی۔

"میں نہیں رو رہی۔" رہی سہی کسر اس کی تردید نے پوری کردی۔ اس کا بھیگا لہجہ فوراً" چغلی کھا گیا۔

"تم یہ دھوکا کسی اور کو دینا۔۔۔ بلکہ کسی اور کو کیوں' خود کو ہی دیتی رہو۔۔۔ شاباش۔"

"کیا کرسکتی ہوں میں بتاؤ۔۔۔ کیا کروں؟" وہ بے بسی کی انتہا پر تھی۔ لب کچلتے ہوئے نظریں چرا گئی۔

"انکار کا حق استعمال کرو۔" اس کا کندھا ہلاتے ہوئے وہ زور دے کر بولی۔ بریہ نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے اس کا دماغ چل گیا ہو یا جیسے اس نے انکار کرنے کے بجائے قتل کرنے کا مشورہ دیا ہو۔

"تم تیار ہوجاؤ۔ یونیورسٹی سے دیر ہورہی ہے۔" مروہ جانتی تھی وہ کچھ نہیں کرنے والی' سو پیر پٹختی چلی گئی۔

"میں تو بے بس ہوں' مجبور ہوں اپنے والدین کے آگے۔۔۔ تو تو کسی کے آگے مجبور نہیں ہے۔ وہ سب جو میں نہیں کرسکتی' تو تو کرسکتا ہے۔۔۔ کچھ تو کردے اللہ۔" اس نے صافی سے برتن پونچھتے ہوئے دل ہی دل میں اپنے رب کو پکارا۔

"رب" ۔۔۔ جو انسان اور ہر شے کو ذرے سے کمال تک پہنچا کر پھر روبہ زوال کرتا ہے۔۔۔ ہاں وہی رب جو انسان کی پہلی امید بھی ہے۔۔۔ آخری امید بھی۔۔۔ اور ہر ہر امید بھی۔

اور پھر اس کے اکلوتے بھائی نے ہی اس رشتے سے

صاف منع کردیا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو بیٹا... اتنا اچھا رشتہ اس عمر میں غنیمت ہے۔ ارے لڑکیوں کی عمر تو جوں ہی پچیس سے اوپر چڑھتی ہے' رشتوں کا بندھا تانتا یکدم ٹوٹنے لگتا ہے... کنوارے تو کنوارے' دوجے بیاہ والے بھی نہیں پوچھتے۔ ان کی بھی یہی مرضی ہوتی ہے کہ کوئی اٹھارہ انیس برس کی لڑکی ہو... یہ تو نجانے کس نیکی کا بدلہ ہے جو خاندان سے اتنا بھلا رشتہ آگیا۔" وہ اسے معاملے کی سنگینی کا احساس دلاتے ہوئے آئے ہوئے رشتے کی افادیت اجاگر کرنے لگیں۔

"اوہو امی! سمجھنے کی کوشش کریں۔ میری بھی سو مجبوریاں ہیں۔ میں آرمی میں کیپٹن ہوں اور آپ نے ایک سپاہی ڈھونڈا ہے بجو کے لیے۔ میں کس سے کیا کہہ کر متعارف کرواؤں گا اسے... کہ یہ میرا بہنوئی ہے۔ ایک معمولی سا سپاہی جو سپاہی بھرتی ہوا اور سپاہی ہی ریٹائر ہو جائے گا۔ میری یہاں دس لوگوں میں عزت ہے۔ براہ مہربانی اسے قائم رہنے دیں... اور سب سے بڑھ کر سحرش کو میں کیا منہ دکھاؤں گا... میری بیوی ایک ریٹائرڈ کرنل کی بیٹی ہے اور میرا بہنوئی... خدا کے لیے امی! کوئی اور رشتہ ڈھونڈیں ڈھنگ کا۔ اور ویسے بھی ضرورت کیا ہے... بتیس کی تو بجو ہو گئی ہیں۔ جہاں اتنی زندگی گزر گئی۔ آگے بھی گزر جائے گی... میری مانیں تو آپ اب مروہ کے لیے سوچنا شروع کریں۔ اس کی صحیح عمر ہے شادی کے لیے۔ بجو کے پیچھے اسے بھی بوڑھا مت کریں۔"

کشور بن کی انتہا کر دی تھی ان کے اکلوتے بیٹے نے... دکھی دل سے انہوں نے خدا حافظ کہہ کر فون رکھ دیا۔

اور پھر امی نے من و عن سب ابو کے گوش گزار کر دیا' جسے وہ بھی سن رہی تھی... وہ اس کا بھائی تھا' سرپرست۔ اور وہ ہی... دل تو اب کھنڈر بن گیا تھا اور کھنڈروں کو آکر کون آباد کرتا ہے۔ کھنڈر آباد ہوں یا ویران پڑے رہیں... کھنڈر ہی رہتے ہیں۔" وہ خاموشی سے کام نبٹانے لگی مگر دھیان بار بار اسی جانب بھٹک جاتا۔

پھر مروہ کہتی تھی کہ اپنے حق کے لیے بولو... کیسا حق؟ کہاں کا حق؟ وہ حق جو اللہ کی طرف سے تفویض کیا گیا مگر دنیاوی خداؤں نے اس سے چھین لیا تھا... وہ جو سرپرست بنائے گئے تھے' خدا بن بیٹھے تھے۔ جنہیں کسی قسم کی پوچھ گچھ' سزا و جزا کا خیال تک نہ آیا تھا۔

وہ خود ہی اس "حق" سے دست برداری کا اعلان کرتی گاؤں نانی ماں کے پاس چلی آئی تھی... زندگی میں اور بھی ہزار کام ہیں۔ شادی اتنی بھی ضروری نہیں... وہ اکثر سوچتی... پھر الجھ جاتی۔

"نکاح نصف ایمان ہے۔"

نصف ایمان... ہاں ایمان کا ہی تو دھڑکا لگا رہتا ہے۔ اس قیمتی شے کا خطرہ نہ ہوتا تو لعنت بھیجتی ایسے "حق" پر۔

کبھی کبھی وہ تھکنے لگتی تھی خود سے لڑ لڑ کر... کیسا جہاد تھا یہ... اتنا سخت' اتنا کڑا۔ باقی جہاد تو کبھی نہ کبھی ختم ہو جاتے ہیں مگر یہ کیسا جہاد ہے جو اللہ نے "جہاد بالنفس" کے نام سے انسان کے اندر چھیڑ رکھا ہے... جس کا خاتمہ انسان کی موت کے ساتھ ہے... انسان کے اندر ہی شیطان بیٹھا ہے' جس سے لڑتے لڑتے عمر گزر جاتی ہے۔ جس کی کبھی جیت ہوتی تو کبھی ہار... یہ جنگ نفس امارہ' نفس لوامہ اور نفس مطمئنہ کے مابین ازل سے جاری ہے اور جاری رہے گی۔ ایسے میں نانی ماں اسے سمجھاتیں...

"فطرت کا ایک اصول ہے۔ ہر کام اپنے وقت پر ہی ہوتے ہیں۔ اس سے پہلے نہیں ہو سکتے۔ جیسے درخت اپنے وقت پر ہی پھل دے گا... نومولود وقت سے ہی بڑا ہوگا... بیج سے پودا پھوٹتا ہے اور درخت بنتا ہے مگر مناسب وقت گزرنے کے بعد... سو صبر سے رب کے فیصلے کا انتظار کرنا چاہیے۔"

اس کے دل کو بڑی ڈھارس ملتی' تسلی ہوتی۔

☆ ☆ ☆

آج اس نے فہمیدہ کو ناشتا کرانے کے بعد وہیل چیئر پر بٹھا کر باہر صحن میں نکالا تھا۔ سردیوں کا آغاز تھا۔ اور باہر کھلی کھلی سی دھوپ بھلی معلوم ہوتی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ آج انہیں باہر دھوپ میں بٹھا کر کام والی ماسی سے اچھی طرح ان کا کمرا دھلوا کر صاف کروائے گا۔ فہمیدہ کو دھوپ میں بٹھا کر وہ ماسی کے ساتھ کمرا دھلوانے لگا۔ کمرے میں سامان برائے نام ہی تھا۔ ایک سنگل بیڈ اور اس کے قریب ایک بید کی کرسی دھری ہوتی تھی۔ بیڈ کے ساتھ ہی ایک چھوٹی تپائی تھی جس پر ان کی ضرورت کی اشیا رکھی ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ کمرا دھل گیا تو اس نے کھڑکیاں کھول کر تیز پنکھا چلا دیا اور ایئر فریشنر چھڑکا تاکہ کمرے میں بسی بو ختم ہو سکے مگر وہ بدبو تو اب اس کمرے میں رچ بس گئی تھی بالکل اسی طرح جس طرح وہ بدبو فہمیدہ اور اس کے اپنے وجود کا حصہ بن گئی تھی۔ ملی جلی بدبو تھی... دواؤں' آیوڈیکس' پایوڈین' اسپرٹ کے ساتھ ساتھ انسانی فضلے کی... وہی مخصوص بدبو جو ہر گھر کے ہر اس کمرے سے اٹھتی ہے جہاں کوئی بیمار بوڑھا لاچار ہو کر' چلنے پھرنے سے معذور بستر پر پڑا اپنی آخری سانسوں کے رکنے کا منتظر ہوتا ہے مگر سانسیں ہوتی ہیں کہ رکتی ہی نہیں۔

"مجتبیٰ بیٹا! اب تو بھی شادی کر لے۔ دلہن آجائے گی تو تیری ماں کو سنبھال لے گی۔"

ماں کی دواؤں کو سلیقے سے رکھتے ہوئے مجتبیٰ کے ہاتھ وہیں جامد ہو گئے تھے۔ جواباً" وہ کچھ بول نہ سکا تھا۔ کیا بولتا... انسان کے لیے اپنے والدین کو اس حالت میں سنبھالنا مشکل ہوتا ہے' کجا کہ کسی دوسرے کے والدین کو سنبھالے۔ وہ خود جس مشکل سے اپنی ماں کو سنبھالتا تھا' وہی جانتا تھا۔ کوئی پرائی لڑکی کیسے یہ سب کر سکتی تھی۔ کام والی ماسی کمرا صاف کر کے اب ڈرائنگ روم کی صفائی کر رہی تھی۔ وہ وہیں اماں کے بستر پر چادر بچھاتے ہوئے بہت پیچھے چلا گیا تھا... تین سال پیچھے۔

☆ ☆ ☆

"تو کیا کہہ رہا ہے تجھے پتا بھی ہے۔" وہ خاموش تھا۔ "اتنی اچھی جاب چھوڑ دے گا؟"

"اور میں کیا کر سکتا ہوں۔" اس کی آواز مدھم اور لہجہ شکستہ تھا۔

"یہ کوئی مسئلے کا حل نہیں ہے میرے بھائی! تو آنٹی کے لیے کل وقتی ملازمہ رکھ سکتا ہے۔ اس کے ذمہ صرف آنٹی کو سنبھالنا ہوگا اور جب معاوضہ اچھا ملے گا تو کوئی بھی بڑی آسانی سے یہ کام کر سکتا ہے۔"

اسے حمزہ کی بات میں وزن محسوس ہوا تھا۔ پانچ ماہ قبل اس کی ماں کا روڈ ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ روڈ پار کرنے کے لیے کھڑی تھیں کہ نشے میں دھت ایک گاڑی والا ان پر چڑھ دوڑا اور ٹکر مار کر یہ جا وہ جا۔ جب تک لوگ جمع ہوئے۔ وہ گاڑی بھگا کر لے جا چکا تھا۔ ارد گرد جمع لوگوں نے انہیں قریبی اسپتال پہنچایا۔ ان کے کولہے کی ہڈی ٹوٹی تھی لہٰذا آپریشن کر کے پلیٹیں ڈال دی گئیں مگر اتنے عرصے بستر پر پڑے رہنے سے وہ چڑچڑی ہوتی گئیں اور ان کی یادداشت بھی کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ وہ بہت سی باتیں بھولنے لگ گئی تھیں۔ شروع میں تو اسے مشکل نہ ہوئی جب تک وہ چھڑی کی مدد سے چلتی پھرتی تھیں مگر آہستہ آہستہ جب وہ چلنے پھرنے' اٹھنے بیٹھنے سے جاتی رہیں۔ وہ کہیں بیٹھتیں تو اٹھنا ہی بھول جاتیں۔ لیٹتیں تو ایک ہی کروٹ پر گھنٹوں لیٹی رہتیں۔ اکثر وہ کھانا ہی بھول جاتیں۔ پھر انہیں آہستہ آہستہ رفع حاجت کے لیے جانا بھی یاد نہ رہتا۔ ایسے میں ان کے ساتھ ہر وقت کسی کا ہونا ضروری تھا... تب ہی مجتبیٰ نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ جاب چھوڑ کر ان کے پاس ہی رہا کرے گا۔

حمزہ کے کہنے پر اس نے اچھے معاوضے پر کل وقتی ملازمہ رکھ لی تھی۔ ایک ماہ بھی مکمل نہ ہو پایا کہ اس نے نوکری چھوڑنے کا عندیہ دے دیا۔

"صاحب! میرے گھر والے باتیں بناتے ہیں کہ تو

ایک مرد کے ساتھ ایک چھت تلے اکیلی رہ رہی ہے۔" مجتبیٰ کا خون کھول اٹھا تھا۔

"کیا بکواس ہے۔ میری ماں ابھی زندہ ہے۔ تم کوئی اکیلی عورت نہیں ہو اس گھر میں۔" وہ دھاڑا تھا۔

"ارے صاحب! وہ بیچاری تو نیم زندہ ہیں۔ ان کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔" اس کے لہجے اور الفاظ پر اس کا دماغ ہی گھوم گیا تھا۔

"میری ماں زندہ ہیں۔ وہ ٹھیک ہو جائیں گی۔ تمہیں یہ نوکری نہیں کرنی تو مت کرو۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے مگر میری ماں کے بارے میں یہ بکواس مت کرو... میں برداشت نہیں کر سکتا۔" بمشکل وہ خود پر قابو پا سکا تھا۔

"بڑھاپا بڑی بیماری ہے، جو لاعلاج ہے' بندہ اس سے کیسے بچ سکتا ہے۔ یہ تو سب پر آنا ہے۔ اوپر سے بڑی عمر کا بندہ ایک بار گر جائے تو سمجھو..." اپنی ایک طرف رکھی کپڑوں کی گٹھڑی اٹھا کر وہ چلی گئی اور مجتبیٰ وہیں کھڑا رہ گیا۔

"تو کیا اماں کبھی ٹھیک نہ ہوں گی۔" اس نے دروازے کی چوکھٹ میں کھڑے ہو کر اماں کو دیکھا جو بے حد لاغر اور کمزور ہو چکی تھیں... محض ان چند مہینوں میں ہی۔ دکھ سے دل اور آنسوؤں سے آنکھیں بھر آئیں۔

اس کے ــــ بعد ــــ بڑی عمر کی کئی عورتیں اس نے ٹھیک ٹھاک معاوضے پر رکھی تھیں مگر ساری ہی کچھ عرصے بعد چلی گئیں۔ کوئی دس دن رکی۔ کوئی پندرہ' کوئی مہینہ تو کوئی ڈیڑھ مہینہ... نجانے کام مشکل تھا یا لوگوں کے ہی اتنے نخرے ہو گئے تھے... ہر ایک کے پاس مختلف وجوہات تھیں کام چھوڑنے کی۔

"بیٹا! میں ان کے گندگی والے کپڑے نہیں دھو سکتی۔"

"پوری رات جگاتی ہیں' نہ خود سوتی ہیں نہ مجھے سونے دیتی ہیں اور پھر دن کو بھی تو نہیں سوتیں نا۔"

"بڑا تنگ کرتی ہیں اماں جی! مجھ سے نہیں ہوتا۔"

وہ معاوضہ بڑھا بھی دیتا مگر وہ خود بھی مطمئن نہ تھا ان سب کی خدمت سے۔ اسے لگتا تھا کہ اس کی ماں بے آرام ہی رہتی ہیں۔ وہ وقفے وقفے سے چلاتی تھیں۔

"کوئی ہے' کوئی ہے۔" حالانکہ ان کی خدمت گار وہیں پاس ہی موجود ہوتی' انہیں جواب بھی دیتی مگر وہ پھر بھی چلاتی رہتیں۔ "کوئی ہے' کوئی ہے۔"

اکثر خدمت گار انہیں ڈانٹ دیتی' جو اسے برا لگتا تھا۔ اس نے پوری زندگی لوگوں کو اپنی ماں کی عزت کرتے' ان سے ادب اور آہستہ آواز میں بات کرتے دیکھا تھا مگر اب وہی ماں تھی اس کی... بے بس' لاچار اور لوگوں کے رحم و کرم پر پڑی ہوئی... اس سے برداشت نہ ہوتا کہ کوئی اس کی ماں کو ڈپٹے' ٹوکے۔ جب وہ ان کے چلانے پر ان کے کمرے میں جاتا تو وہ فوراً" خاموش ہو جاتیں۔ جیسے وہ اسے بلانے کے لیے ہی شور کرتی تھیں۔ وہ جب تک ان کے پاس رہتا' تب تک وہ پرسکون ہوتیں اور جوں ہی نظروں سے اوجھل ہوتا' پھر سے چلانے لگتیں۔ کبھی کبھار تو خدمت گار انہیں چھوڑ کر ٹی وی دیکھنے میں منہمک ہوتی جیسے اسے اسی کام کے لیے لایا گیا تھا۔ وہ اپنی ہی گندگی میں لتھڑی پڑی ہوتیں اور اٹھنے والے تعفن سے بے چین ہو کر چلانے لگتیں۔

کئی ایک کو تو مجتبیٰ نے اس وجہ سے نکال باہر کیا تھا۔ کہ وہ وقت پر ٹھیک طرح سے اس کی ماں کو نہلاتی نہیں تھیں' گندگی صاف نہیں کرتی تھیں۔ وہ اپنی ہی جسمانی آلائشوں میں پڑی چلاتی رہتیں مگر خدمت گار پر اثر ہی نہ ہوتا... چھ ماہ میں وہ سات ماسیاں رکھ چکا تھا۔ پھر تو اسے کوئی عورت ملی ہی نہیں۔ تب ہی پھر اس نے فیصلہ کر لیا... وہی فیصلہ جو اسے شروع میں کر لینا چاہیے تھا... خود اپنی ماں کو سنبھالنے کا۔ یہی اس مسئلے کا واحد حل تھا اسے اور کوئی حل نظر بھی نہیں آتا تھا اور اس کے لیے پہلے اسے نوکری چھوڑ کر کسی اور ذریعہ معاش کا بندوبست کرنا تھا کیونکہ بہرحال گھر کا

خرچ اور زندگی کی گاڑی تو اسے چلانا ہی تھی نا۔ حمزہ نے اس کا فیصلہ سنتے ہی سر تھام لیا۔

"یار! مل جائے گی کوئی نہ کوئی عورت۔ میں امی سے بات کرتا ہوں... وہ ڈھونڈ دیں گی۔"

"وہ بھی بھاگ جائے گی۔ پچھلے چھ ماہ سے یہی ہو رہا ہے۔"

وہ اب مایوس ہو گیا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی دوسرا اس طرح سے اس کی ماں کو سنبھال بھی نہیں سکتا تھا جیسے وہ خود سنبھال سکتا تھا۔

"تو کیسے یہ سب کچھ کرے گا؟ جتنا آسان لگ رہا ہے نا۔ اتنا آسان ہے نہیں یہ۔ دنیا کے مشکل ترین کاموں میں سے ایک کام ہے یہ۔" حمزہ نے اسے اس بات سے خبردار کیا جسے وہ پہلے سے ہی جانتا تھا۔

"جانتا ہوں میں۔ اچھی طرح اندازہ ہے مجھے اس بات کا۔"

قدرے توقف کے بعد وہ بولا تو حمزہ کو اس کا لہجہ بھیگا بھیگا سا لگا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اپنی ماں سے کتنی محبت کرتا ہے۔ جب وہ ساتویں جماعت میں تھا تب اس کے باپ کا انتقال ہو گیا تھا۔ بہن بھائی کوئی تھا نہیں لے دے کر ایک ماں ہی بچی تھی جو سب کچھ تھی اس کے لیے۔ اس کے والد ترکے میں بس ایک مکان اور اپنی دکان چھوڑ گئے تھے... وہ مکان' جس نے اس بیوہ اور یتیم کو چھت مہیا کیا اور وہ دکان' جس کے کرائے سے ان کی زندگی کی گاڑی کھسکتی تھی۔

"مگر تم یہ نہیں جانتے کہ وہ والدین جو کبھی ہمارے لیے آہنی دیوار ہوتے ہیں' انہیں اس حال میں دیکھ کر جینا اس سے بھی مشکل کام ہے۔ جب اپنی ہی جسمانی آلائش میں میری ماں لتھڑی پڑی ہوتی ہے اور اس کے جسم پر مکھیاں بھنک رہی ہوتی ہیں۔ اپنی ماں کو گندگی کا ڈھیر بنتے دیکھ کر کیسا لگتا ہے... اس ماں نے جس نے جوانی میں اپنی خواہشوں کو میرے لیے قربان کر دیا۔ آج جب وہ چل نہیں سکتیں اور میری طرف مدد طلب نظروں سے دیکھتی ہیں تو مجھے لگتا ہے وہ مجھے میرے پہلے قدم کا واسطہ دے رہی ہیں۔ جب وہ کچھ بھول کر مجھ سے سوال کرتی ہیں تو میرے جواب سے پہلے ہی ان کی آنکھوں میں تحریر ابھرتی ہے کہ کچھ کہنے سے پہلے اپنا بچپن یاد کر لینا... وہ مجھے ان نظروں سے دیکھتی ہیں جیسے کہہ رہی ہوں کہ صبر کر لو بیٹا اور مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔ آج میرا خود پر اختیار نہیں ہے... جیسے کل تمہارا تم پر اختیار نہ تھا... حمزہ! میں کیسے اپنی ماں کی اتنی التجائیں' اتنی تکلیف کو نظرانداز کر کے ایک نافرمان اور مطلبی بیٹا بن کر زندگی میں محو ہو جاؤں۔"

حمزہ کو... احساس تھا۔ وہ کتنی ہی دیر خاموش بیٹھا رہا۔ کیا کہہ کر اسے تسلی دیتا۔ بعض اوقات لفاظی کسی کے دکھ کا مداوا نہیں ہوا کرتی۔

"کیسے کرے گا سب؟ میں سوچ سوچ کر تھک رہا ہوں۔" گہری سانس بھرتے ہوئے اس نے کہا۔

"مگر میں کر کر کے نہیں تھکوں گا۔" وہ جانتا تھا کہ وہ اتنی ہی محبت کرتا تھا اپنی ماں سے۔

"پھر سوچ لے... وہ عورت ذات ہیں اور تو... آئی مین! انہیں نہلانا دھلانا... سمجھ رہا ہے نا میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں۔" وہ ڈھکے چھپے لفظوں میں اسے احساس دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اس وقت وہ صرف میری ماں اور میں ان کا بیٹا ہوں۔ کوئی عورت یا مرد نہیں ہے ہم میں۔ یہ وہی عورت ہے جس کے پیٹ سے وہ مرد جنا گیا ہے' جو تیرے سامنے بیٹھا ہے۔"

وہ لاجواب ہو گیا تھا۔

"آمدنی کا کیا کرے گا؟"

"دکان سے ٹھیک ٹھاک رینٹ آ رہا ہے' سیونگ سے اوپر ایک پورشن بنا کر رینٹ پر دے دوں گا اور دو ٹیوشنز بھی مل گئی ہیں گھنٹے کی۔" اس نے سارا پلان اسے سنا دیا۔

"اس گھنٹے دو گھنٹے میں آنٹی اکیلی کیسے رہیں گی گھر پہ...؟"

”محلے کی جتنی خواتین ہیں ان سب سے میری بات ہو گئی ہے۔ وہ باری باری اماں کے پاس رک جایا کریں گی۔“ گویا وہ سارا انتظام ہی کیے ہوئے تھا۔

”سلام ہے تجھے دل سے میرے دوست!“ اس نے بے ساختگی میں اٹھ کر اسے گلے سے لگالیا۔

☼ ☼ ☼

”تیری نوکری کا کیا بنا۔۔۔ چھوڑ کیوں دی؟“ رات میں وہ نانی ماں کے بالوں میں تیل لگا کر مالش کر رہی تھی۔

”چھوڑ دی بس۔۔۔ اماں کو پسند نہیں تھا میرا نوکری کرنا۔“ پوری بات بتانے سے کہیں بہتر اسے یہی جملہ لگا۔

”زینب کی مت ماری گئی ہے۔“ نانی ماں آہستہ آواز میں بول رہی تھیں۔

”بس نانی ماں۔۔۔ وقت گزارنا مشکل ہوا تو نوکری کرنی چاہی مگر اس نے وقت کو ہی مشکل بنادیا تو چھوڑ دی۔“

وہ پوری بات کیا بتاتی اب انہیں کہ کیوں نوکری چھوڑنی پڑی۔ اسے تو اب تک ڈھیٹ بن جانا چاہیے تھا مگر سارا مسئلہ ہی یہ تھا کہ ڈھیٹ بننے کے بجائے وہ دن بہ دن حساس ہوتی جارہی تھی۔ ہر بار نئے سرے سے اسے دکھ ہونے لگتا۔ نئے سرے سے شرمندگی گھیر لیتی۔ ہر بار خاندان کے باہر سے رشتہ آنے پر امی اسے ایسی نظروں سے دیکھتیں جیسے جاننا چاہتی ہوں کہ اس رشتے کے آنے میں اس کی کس حد تک مرضی شامل ہے۔ اور ان کی ایسی نظروں سے وہ زمین میں گڑ جاتی۔۔۔ وہ نہیں جانتی کہ یہ کون ہے، کس نے بھیجا، کہاں سے آیا یہ رشتہ مگر سب بے سود تھا۔ ان دیکھے آنسو، ان دیکھے ماتم بھلا کب کسی کو دکھائی دیتے ہیں۔

مگر اس بار آنے والا رشتہ اور اس پر امی کے تاثرات۔۔۔ یہ سب تب شروع ہوا، جب نوکری کے دوران ہی اس کے ایک کولیگ ابرار صاحب کی والدہ اس کے لیے رشتہ لے آئیں۔۔۔ وہ قطعاً“ انجان تھی۔ خبر ہوتی بھی تو کیسے۔۔۔ کبھی اسکول میں بھی ابرار صاحب نے اس سے کسی قسم کی غیر ضروری بات یا کوئی نامعقول حرکت نہیں کی کہ وہ چوکنا ہوتی۔۔۔ گھر رشتہ لے کر وہ اپنی والدہ، بڑی بہن اور بہنوئی کے ساتھ آئے تھے۔ ان کے سامنے تو ابو نے بڑے طریقے سے عمروں کے تفاوت کو بنیاد بنا کر رشتے سے انکار کر دیا مگر امی نے بعد میں اس قدر ہنگامہ کھڑا کیا جیسے ساری غلطی ہی اس کی ہو۔۔۔ بہتیری اس نے امی کو صفائیاں پیش کیں مگر امی کے چند جملوں نے ہی اس کی زبان تالو سے لگادی۔

”یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے میں نے۔۔۔ عورت کی طرف سے کوئی نہ کوئی اشارہ ملتا ہے تب ہی مرد پیش قدمی کرتا ہے۔ تم اتنی ننھی کاکی ہو کہ تمہیں اس کی کسی بات سے اندازہ نہ ہو پایا کہ وہ کیا ارادہ کیے ہوئے ہے۔۔۔ عورت مرد کے بدلتے تیور فوراً“ بھانپ لیتی ہے۔“

اتنی ہتک اور تضحیک کے بعد وہ اب ماں کو کیا سمجھاتی کہ عورت مرد کے بدلتے روپ کو تب بھانپ سکے گی ناجب مرد روپ بدلے گا۔۔۔ ابرار صاحب تو شروع دن سے جیسے سارے اسٹاف اور اس کے ساتھ تھے، اب بھی ویسے ہی تھے۔۔۔ وہ چپ ہو رہی۔

اس واقعے کو ابھی دو ماہ بھی نہ گزرے تھے کہ اس کے ایک اور کولیگ وسیم کی بہن، جو اس کی کالج کے زمانے کی دوست بھی تھی، اپنے بھائی کا رشتہ لے آئی۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔۔۔ رشتے سے انکار تو ہونا ہی تھا مگر امی کی مشکوک نظریں اور ان کے طعنے۔۔۔

”تمہارا رجحان تھا تو پہلے سے بتا دیتیں۔۔۔ اگر کرنا چاہتی ہو شادی تو ضرور کرو مگر پھر دوبارہ مشکل مت دکھانا ہمیں۔۔۔ ہم بھی سمجھیں گے کہ ہماری دو ہی بیٹیاں تھیں جنہوں نے ہماری عزت کا پاس رکھا۔“

اس کا پورا وجود ہی کانپ اٹھا۔ وہ گنگ ہی رہ گئی۔

اس قدر بے اعتباری پر آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ اگر وہ وضاحت دے بھی دیتی تو کیا ہو جاتا۔ وہ اپنی ماں کی اس سوچ کو بدل نہیں سکتی تھی نا۔

☼ ☼ ☼

اس دن وہ بے حد خاموش تھی۔

”کیا ہوا؟ امی سے جھگڑا ہوا ہے کیا؟ خیر جھگڑنے والی تو تم ہو نہیں بجو!“ اس کے ستے چہرے کو یونیورسٹی سے آئی مروہ نے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ثمن آئی تھی آج۔۔۔ وسیم کا رشتہ لے کر۔“ وہ نظریں چرا گئی۔

”پھر۔“ وہ جانتی تھی کہ کیا جواب ملا ہوگا۔ پھر بھی پوچھ بیٹھی۔

”کیا تمہیں بتانے کی ضرورت ہے کہ کیا ہوا ہوگا۔“ وہ صوفے پر ڈھے سی گئی۔

”امی نے یقیناً“ بڑے پیار سے ثمن باجی کو کہا ہوگا کہ ہم خاندان سے باہر شادی نہیں کرتے۔ یوں جیسے ان کے نام نہاد خاندان میں تو ان کی بیٹیوں کے لیے اعلا تعلیم یافتہ اور مہذب لڑکوں کے رشتے بھرے پڑے ہیں۔“ اس نے تنفر سے سر جھٹکا۔

”آج امی نے اور بھی بہت کچھ کہا۔“ اور اس نے ساری بات تفصیلاً“ بتاڈالی۔

”واٹ۔۔۔ امی نے یہ سب ثمن باجی کے سامنے کہہ ڈالا۔“ وہ جانتی تھی کہ ماں سے کچھ بعید بھی نہ تھا۔

”دوسروں کے منہ پر امی کہاں کچھ کہتی ہیں۔ اس کو تو عزت سے رخصت کرکے امی نے بعد میں یہ سب مجھے سنایا۔“

”اور یقیناً“ تم یہ سب سنتی رہی ہوگی فرماں بردار بیٹی بن کر۔۔۔ آگے سے کچھ بھی نہیں کہا ہوگا۔ کوئی وضاحت نہیں دی ہوگی۔“ اسے اب امی سے زیادہ بہن پر غصہ آنے لگا۔

”ماں، باپ کو جواب نہیں دیا جاتا۔“ وہ تھکے سے انداز میں بولی۔

”وہ کوئی اور والدین ہوتے ہوں گے جن کو جواب نہیں دیا جاتا۔ جن کے آگے اف کرنے کا بھی حکم نہیں ہے۔ میری عظیم بہن کبھی کبھی خود کو ایکس پلین کر دینے سے کچھ غلط نہیں ہوتا۔“

”جہاں وضاحت کوئی معنی نہ رکھتی ہو، وہاں وضاحت دینے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔“ وہ گہری سانس بھر کر بولی۔

”تمہیں پتا ہے، بجو! تم مجھے ایک روبوٹ لگتی ہو۔۔۔ جذبات سے عاری، جس کی اپنی کوئی خواہش، کوئی حیثیت نہیں ہے۔ جس سے کوئی بھی غیر فطری، غیر انسانی سلوک کیا جائے تو بھی اسے محسوس نہیں ہوتا۔ پتا نہیں تم کس مٹی سے بنی ہو۔ تمہیں کبھی بھی کچھ محسوس کیوں نہیں ہوتا۔“ اس کی بات پر بریہ تڑپ اٹھی۔

”مجھے محسوس ہوتا ہے۔“ اس کی آواز رندھ گئی۔

”اچھا۔“ وہ استہزائیہ مسکرائی۔ ”مثلاً“ کیا محسوس ہوتا ہے تمہیں۔ بتیس برس کی ہونے کو ہو تم اور صرف والدین کے خاندانی رسم و رواج کی وجہ سے گھر بیٹھی ہو۔ کبھی محسوس ہوا تمہیں؟“

وہ کوئی بھی جواب دیے بغیر وہاں سے اٹھ گئی۔ مروہ نے غصے سے سامنے پڑا کشن دیوار پر دے مارا۔ اسے بہن کی حد درجے فرماں برداری سے سخت چڑ تھی۔

اگلے روز ہی اس نے اسکول جا کر استعفیٰ دے دیا تھا۔ بہتر تھا کہ وہ گھر بیٹھے۔ کم از کم ماں کو تسلی تو ہو جائے گی۔ مگر وہ بھول گئی کہ وہ کچھ بھی کر لے، ماں کی کبھی تسلی نہ ہونا تھی۔ جب بھی خاندان کے باہر سے رشتہ آتا تھا، اسی طرح کٹہرے میں اسے کھڑا کر دیا جاتا تھا۔

اس رات وہ صحن میں بیٹھی منہ چھپا کر روتی رہی تھی۔ بے آواز آنسوؤں کے ساتھ عشاء کی نماز وہیں صحن میں پڑھ کر وہ جائے نماز پر بیٹھی آنسو بہاتی رہی۔ اسے اللہ کو بتانا تھا کہ وہ بہت تکلیف میں ہے۔ اللہ

کے سامنے تو سب بند ٹوٹ جاتے ہیں' نقاب اتر جاتے ہیں۔ اس کے آگے کیا پردہ' کیسی انا؟ وہ روتی رہی' آنسوؤں کو بھی پتا تھا کہ وہ کس کے حضور بہہ رہے ہیں' سو کیسے رک پاتے؟

"اے اللہ! تو کیا میں بے حس ہوں؟ جذبات سے عاری ہوں؟ میں اچھی بیٹی بننا چاہتی ہوں۔ فرماں بردار اولاد بننا چاہتی ہوں۔ والدین جیسے بھی ہوں ان کا حق ہوتا ہے' مگر وہ مجھ سے میری برداشت سے بڑھ کر کیوں مانگ رہے ہیں؟ میری تکلیف کم کردے اے اللہ۔۔۔ مجھے بیٹی ہونے کی اس طرح سزا نہ دے۔۔۔ میں ان نظروں' ان لفظوں' ان رویوں سے تھک گئی ہوں۔۔۔ اور کتنا سہنا ہے؟ مجھے تیرے فیصلے کا' تیری حکمت کا انتظار ہے۔"

جائے نماز تہ کرکے وہ اندر کمرے میں چلی آئی' جہاں مروہ اپنے موبائل پر محو تھی۔ بہن کے ستے چہرے اور مٹے مٹے سے آنسوؤں کے نشانات کو اس نے دیکھا تک نہیں۔ وہ تو کل کے واقعے کو بھول بھی چکی تھی۔

"عجیب دنیا ہے یارب! انسان کا دکھ بس اسی کا ہوتا ہے۔۔۔ اس کے اندر پنپتا ہے اور اس کے اندر دم توڑتا ہے۔ اردگرد بسنے والوں کو کبھی کبھی خبر تک نہیں ہوتی کہ کسی دل کے لیے آج قیامت ہوکر گزر گئی۔"

رضائی میں گھسی وہ مروہ پر ایک نظر ڈال کر سوچنے لگی۔

"شاید اسی کا نام دنیا ہے۔۔۔ جہاں ہر ایک کو اپنے حصے کا دکھ اور غم کسی کی شراکت کے بغیر جھیلنا ہوتا ہے۔"

لحاف منہ تک اوڑھتے ہوئے نیند میں جانے سے پہلے یہ اس کی آخری سوچ تھی۔۔۔ نیند اپنے ساتھ سکون اور آسودگی لائی تھی اور آنے والا دن پچھلے غم اور دکھ نگل گیا تھا۔۔۔ نئے دکھوں کی جگہ بناتے ہوئے۔

☆ ☆ ☆

"اور والدین کے ساتھ احسان کرو۔۔۔ اگر تمہارے پاس ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچیں تو ان کو اف تک نہ کہو' ان کو جھڑکو نہیں اور ان سے عزت والی بات کرو۔"

اس نے نوکری سے استعفیٰ دے دیا تھا اور ساتھ ہی اوپر والے حصے میں کام شروع کروا دیا تھا۔ شام میں دو گھنٹے۔ بحریہ ٹاؤن میں وہ دو۔ بہن' بھائی کو معقول رقم کے عوض ٹیوشن پڑھانے لگا۔ دکان سے بھی ٹھیک ٹھاک آمدنی آرہی تھی۔ پہلی بار جب اس نے ماں کی جسمانی آلائش صاف کرنے کا سوچا تو دل کانپ اٹھا تھا۔ اتنا آسان نہیں تھا یہ سب۔ اس نے گرم پانی کا ٹب بستر کے قریب رکھا اور انہیں سہارا دے کر تکیے سے بٹھایا۔ ان کے کپڑے تبدیل کرنے اور گندگی صاف کرنے سے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ قمیص کی طرف جوں ہی ہاتھ گیا' اس نے ماں کو روتے ہوئے پایا۔۔۔ وہ زور' زور سے رو رہی تھیں۔

"نہ۔۔۔ نہ۔۔۔" وہ روتے ہوئے اسے روک رہی تھیں۔

"نہ۔۔۔ نہ۔۔۔ ال۔۔۔ ال۔۔۔ اللہ نہ۔" ٹوٹے الفاظ ادا کرتے وہ رو رہی تھیں۔ اس کے حلق میں نمکین آنسوؤں کا پھندا لگ گیا تھا۔ وہ کتنی دیر ماں کو روتے دیکھتا رہا۔

"اماں۔۔۔" ان کے ماتھے پر بوسہ دیتے ہوئے وہ بچوں کی طرح ان کے گال سہلا رہا تھا۔

"اماں! مت روئیں۔ آپ روئیں گی تو میری ہمت کون بندھائے گا۔ اماں پلیز۔ ایسا مت کریں۔" اور کتنی ہی دیر وہ انہیں چپ کراتا رہا۔

"میں آپ کا بیٹا ہوں اماں! اگر اللہ نے میرے نصیب میں اپنی ماں کی خدمت لکھی ہے تو یہ میرے لیے سعادت ہے۔ میں جانتا ہوں آج آپ خود کو بے بس محسوس کرتی ہیں کہ آپ کا' آپ کے بیٹے کے سامنے پردہ نہیں رہے گا۔ پردے کا حکم تو رب کی طرف سے ہے نا اور اسی رب نے آپ کو اس طرح بوڑھے سے بچہ بنا دیا ہے' تو اب مجھے آپ کی نگہداشت کرنا ہے۔ اماں! جیسے بچپن میں آپ نے

مجھے پالا۔ بس میرے لیے دعا کریں کہ اللہ میری ہر کوشش کامیاب کرے۔"

وہ خاموش ہوگئیں۔ جس طرح انہیں اپنے بیٹے کے سامنے عیاں ہوتے تکلیف ہو رہی تھی' سو ویسے اس کو بھی اپنی ماں کو یوں بے بس دیکھتے ہوئے بڑی اذیت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ مگر یہ زندگی ہے۔ جہاں ہر عروج کو زوال ہے۔ کل ان کا وقت تھا' آج اس کا وقت ہے اور کل کسی اور کا وقت ہوگا۔ یہی اللہ کا نظام ہے' جو وہ زمانوں سے اسی طرز پر چلاتا آرہا ہے اور اسی طرح چلاتا جائے گا۔ جب تک وہ چاہے گا۔

اس نے ماں کا لباس اتار کر گرم پانی سے روئی بھگو بھگو کر غلاظت صاف کی۔ پہلے پہل اسے ابکائی آگئی۔ چاہا چھوڑ دے۔ مگر سامنے پڑا آنسو بہاتا بے بس وجود اس کی ماں کا تھا۔ اللہ نے اس کے دل کو باندھ دیا۔ وہ جلدی جلدی ماں کو صاف کرکے انہیں دوسرا لباس پہنانے لگا۔ گندے کپڑے اس نے غسل خانے میں رکھ دیے۔

پینتیس برس کا وہ مرد روتا جاتا تھا اور ماں کے گندے کپڑے دھوتا جاتا تھا۔ یوں ہی تو ماں کے قدموں تلے رکھی جنت نہیں مل جاتی۔ بڑی جان مارنا پڑتی ہے۔ بڑا دل مارنا پڑتا ہے' تب جاکر جنت دی جاتی ہے۔ کپڑے دھوکر وہ باہر تار پر پھیلا کر اب صابن سے رگڑ رگڑ کر ہاتھ دھوتا رہا۔ آنسو مسلسل بہہ رہے تھے۔ وہ بار بار ہاتھوں کو نتھنوں کے قریب لاکر سونگھتا تو اسے لگتا کہ ابھی تک بدبو اس کے ہاتھوں سے الگ نہیں ہوئی اور پھر سے صابن سے رگڑ رگڑ کر ہاتھ دھونے لگتا۔ پھر آہستہ آہستہ وہی بدبو اس کے وجود کا حصہ بن گئی۔ مگر تب تک وہ اس سب کا عادی ہوچکا تھا۔

اب اسے کچھ بھی گندا نہیں لگتا تھا۔ وہ کبھی بھی ماں کو اکیلے نہیں چھوڑتا تھا۔ چاہے وہ جاگ رہی ہوتیں یا سو رہی ہوتیں۔ کچن کے بیشتر کام وہ خود ہی کرتا تھا۔ البتہ گھر کی صفائی ستھرائی کے لیے ماسی آتی تھی۔ نفیسہ یوں بھی پورا دن دلیہ اور سوپ ہی پی سکتی تھیں۔

باقی کچھ بھی انہیں ہضم نہ ہوتا۔ اپنا کھانا بھی خود بنا لیتا تو کبھی باہر سے کھا آتا۔ پوری رات اگر وہ جاگتی تھیں تو وہ بھی ان کے ساتھ جاگتا تھا۔ ان کی ٹانگیں دبا تا رہتا۔ نیم گرم تیل سے ان کا مساج کرتا' کبھی انہیں قرآن کی تلاوت کرکے سناتا' تو کبھی کسی قاری کی آواز میں ریکارڈ چلا دیتا۔ صبح صبح وہ ناشتے کے بعد انہیں سہارا دے کر بٹھاتا اور بالوں میں کنگھی کرتا۔ وہیں بستر پر ان کا منہ دھلواتا اور دانت صاف کرواتا۔ ہر جمعہ کو نماز پر جانے سے قبل وہ انہیں خود ہی نہلا کر وہیل چیئر پر بٹھا کر باہر صحن میں لے آتا۔ کام والی ماسی کو ان کے پاس بٹھا کر وہ جلدی سے غسل لے کر نماز کے لیے چلا جاتا۔ ان کے ناخن کاٹتا' کانوں کا میل صاف کرتا اور لباس تبدیل کرتے ہوئے روزانہ ان کی کمر پر بننے والے زخموں کو بھی صاف کرتا۔ جو لیٹ لیٹ کر کمر پر ابھرنے لگے تھے۔ یہ تمام معمولات اس کی زندگی کا حصہ بن گئے تھے۔ جب بھی وہ نماز کے لیے کھڑا ہوتا تو فہمیدہ بیگم کھانسنے لگتیں۔ اسے کسی نہ کسی ضرورت کے لیے آواز دے دیتیں۔

"کو... کوئی... ہے؟ اے... کوئی... ہے..." وہ فرض نماز توڑ کر بھاگا جاتا۔ آگے سے فہمیدہ بیگم کبھی کوئی ضرورت پیش کرتیں۔ کبھی کوئی۔

"چا... چا... در خا... خا... رش... پا... پا... نی..."

وہ ان کی ضرورت پوری کر دیتا۔ کبھی کبھی انہیں کسی چیز کی ضرورت نہ ہوتی' بس یوں ہی اسے بلانے کو شور ڈالتیں۔ جب وہ بھاگا آتا تو خاموش لیٹی اسے دیکھتی رہتیں۔ پھر جب ان کی تسلی ہو جاتی تو وہ پھر سے نماز کی نیت باندھتا اور ابھی دوسری' تیسری رکعت تک ہی جاتا کہ وہ پھر سے پکارتیں۔

"کو... کوئی... ہے؟" وہ پھر سے نماز توڑ ڈالتا۔ کبھی کبھی تو اسی طرح کرتے کرتے نماز کا وقت ہی نکل جاتا۔ ہر بار نماز توڑنے پر وہ دل ہی دل میں کہتا رہتا۔

"یا اللہ مجھے معاف کر دینا۔ میری ماں مجھے بلا رہی ہیں۔ مجھے معاف کر دینا۔ تیرے حق میں کمی کر رہا ہوں' تاکہ تیرے بندے کے حق میں کمی سے بچ سکوں۔ اپنے حق میں کی جانے والی کمی کو تو' تو معاف کر سکتا ہے۔ مجھے بھی معاف کر دینا۔ میرے اللہ! میری ماں مجھے بلا رہی ہے۔"

اپنی ماں کی چھوٹی چھوٹی تکلیف دور کرتے ہوئے وہ دل ہی دل میں اللہ سے مخاطب ہوتا۔

حمزہ جب بھی اس سے ملنے آتا ہمیشہ اسے دعا دیتا کہ اللہ اس کی آزمائش میں کمی کرے۔ وہ غمگین سا ادا سی سے مسکرا دیتا۔ مگر کچھ نہیں کہتا۔ صرف ایک بار جب حمزہ نے اسے کہا تھا کہ ان کے حق میں دعا کیا کرو اور اپنے لیے بھی کہ اللہ یہ آزمائش ختم کر دے تو وہ تڑپ کر بولا۔

"عمر کے جس حصے اور جیسی حالت میں وہ ہیں میں جانتا ہوں' اب وہ ٹھیک نہیں ہو سکتیں۔ اللہ سے ان کی مشکل ختم کرنے اور اپنی آزمائش کے خاتمے کی دعا کا مطلب ان کی موت مانگنا ہے حمزہ! اور میں اپنی ماں کے لیے موت کی دعا نہیں کر سکتا۔ ہاں یہ دعا کر سکتا ہوں کہ ان کی تکلیف میں کمی آئے اور میری آزمائش میں بھی کچھ کمی واقع ہو' مگر آزمائش اور تکلیف مکمل ختم ہونے کا مطلب میری ماں کا ختم ہونا ہے۔"

پھر حمزہ نے کبھی اسے وہ دعا نہ دی۔ نہ ہی پھر اسے یہ دعا کرنے کے لیے کہا۔

کبھی کبھی انسان کو آزمائشوں کے طویل ترین سلسلے سے گزرنا پڑتا ہے۔ محض ایک آدھ آزمائش ہی جانچ کے لیے ناکافی سمجھی جاتی ہے۔ اس کی زندگی میں بھی یہ سلسلہ اتنی جلد ختم ہونے والا نہیں تھا۔ اس آزمائش کے ساتھ ساتھ قدرت کو اس کی اور آزمائش بھی مطلوب تھی۔



تنزیلہ اس کی زندگی میں آنے والی وہ پہلی لڑکی تھی' جس سے اس نے بے انتہا محبت کی تھی۔ یہ تب کی

بات تھی' جب اس نے نئی نئی نوکری کا آغاز کیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ کام کرتی تھی۔ سادہ مگر باوقار اور خوب صورت لڑکی' جس کا تعلق اس کی طرح ایک عام سے گھرانے سے تھا۔ آہستہ آہستہ ان دونوں میں التفات بڑھتے بڑھتے محبت کا روپ دھار گیا اور جب مجتبیٰ کو تنزیلہ کی طرف سے بھی یقین ہو گیا کہ وہ اس کے لیے ویسے ہی جذبات رکھتی ہے تو اس نے فہمیدہ سے بات کی۔

وہ ان کی اکلوتی اولاد اور بڑھاپے کا سہارا تھا اور ان کے نزدیک بیٹے کی خوشی اور جذبات بڑے قیمتی تھے۔ تب ہی چپ چاپ اس کی خوشی کی خاطر تنزیلہ کے گھر جا کر اس کا رشتہ مانگا۔ مناسب سی چھان بین کے بعد دوسری طرف سے بھی ہاں کر دی گئی۔ تنزیلہ نوکری کے ساتھ ساتھ آگے پڑھ بھی رہی تھی اور ابھی اس سے بڑی بہن غیر شادی شدہ تھی۔ لہٰذا اس کے والدین نے ساتھ ہی یہ شرط عائد کر دی کہ جب تک تنزیلہ سے بڑی راحیلہ کی کہیں بات پکی نہیں ہو جاتی اور تنزیلہ پڑھائی مکمل کرکے فارغ نہیں ہو جاتی' تب تک وہ شادی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ فہمیدہ کو بیٹے کی خوشی کے آگے ہتھیار ڈالنا پڑے۔ مجتبیٰ اور تنزیلہ اپنی جگہ مطمئن تھے کہ دیر سے ہی سہی مگر جب بھی شادی ہوئی' وہ آپس میں ہی رشتہ ازدواج میں منسلک ہوں گے۔ مگر قدرت کے فیصلے بھی انسان کے فیصلوں سے میل کھائیں' یہ ضروری نہیں ہوتا۔

فہمیدہ کے ایکسیڈنٹ کے بعد گھر کے جو حالات تھے۔ وہ تنزیلہ کے سامنے تھے۔ شروع میں وہ آفس کے علاوہ فون اور میسجز پر بھی مجتبیٰ کا حوصلہ بڑھاتی رہتی کہ سب ٹھیک ہو جائے گا اور وہ اس کے ساتھ ہے۔ مگر جب مجتبیٰ نے بگڑتے حالات دیکھ کر اس کے سامنے شادی کی درخواست رکھی تو وہ ٹال مٹول کرنے لگی۔ مجتبیٰ کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ تنہا ماں کو سنبھالتا' اسی لیے اسے تنزیلہ کے ساتھ کی ضرورت تھی۔ پھر جب مجتبیٰ نے نوکری چھوڑنے کا فیصلہ کیا تو حمزہ سے کہیں زیادہ تنزیلہ نے مخالفت کی تھی۔ وہ اسے یہ کہہ کر تسلی کرانے لگا کہ مکان کے اوپر دوسری منزل بنوا کر وہ کرائے پر دے دے گا تو اچھا خاصا کرایہ ہر ماہ آ جائے گا اور پھر دکان کی آمدنی بھی تو تھی۔ خود بھی وہ ٹیوشن پڑھا رہا تھا اور جب تنزیلہ بھی کمائے گی تو تین افراد کی ضرورت سے کہیں زیادہ جمع ہو جائے گا۔ تنزیلہ وقتی طور پر خاموش ہو گئی تھی۔ مگر کب تک خاموش رہتی؟ آہستہ آہستہ اس نے مجتبیٰ پر کوئی اور اچھی نوکری پھر سے ڈھونڈنے کا زور ڈالنا شروع کیا۔ دونوں میں جھگڑے بڑھنے لگے تو اکثر وہ ہفتوں ہفتوں آپس میں بات نہ کرتے تھے۔ وہ ناراضی کو طول دینے سے بچانے کے لیے کچھ بھی کرکے اسے منا لیا کرتا تھا۔

جب راحیلہ کی شادی کی تیاریاں شروع ہوئیں تو اس نے پھر تنزیلہ سے اپنی اور اس کی شادی کے لیے بات کی۔ کچھ دیر تو وہ خاموش رہی' پھر بولی۔

"تمہاری جاب سیکیور نہیں ہے۔ تم پہلے کوئی ڈھنگ کی جاب تو کر لو' پھر شادی کا سوچنا۔"

"یار! میں چالیس ہزار سے زائد کما رہا ہوں اور جب اوپر والا پورشن بن جائے گا تو اس کا بھی ٹھیک ٹھاک کرایہ آنے لگے گا۔ تمہیں مسئلہ کیا ہے؟" وہ زچ ہو رہا تھا۔

"اوپر والے پورشن میں ہم خود رہیں گے۔" وہ اس کے نئے مطالبے پر چونکا تھا۔

"ہم کیوں اوپر رہیں گے؟ نیچے اتنا بڑا گھر بہت ہے تین لوگوں کے لیے۔"

"میں نیچے نہیں رہوں گی' بے شک نیچے والا پورشن کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو۔" اس کے کٹیلے لہجے نے مجتبیٰ کی تیوری پر بل ڈال دیے۔

"کیا میں وجہ جان سکتا ہوں؟"

"میں آنٹی کے ساتھ اس تعفن زدہ حصے میں نہیں رہ سکتی۔ تمہیں شاید احساس نہیں ہے کہ تمہارے گھر سے تمہارے وجود سے کیسی بو آنے لگی ہے۔ ایسی بدبو جو ہسپتالوں کے وارڈز سے آتی ہے۔ جس سے انسان کا سانس لینے کا عمل مشکل ہو جاتا ہے۔" وہ

سکنے میں رہ گیا تھا۔

"تم مجھ سے اگر یہ امید رکھے ہوئے ہو کہ میں تمہاری امی کو سنبھالوں گی تو اتنا جگرا نہیں ہے میرا۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں' تمہاری ماں سے نہیں کہ یہ آیا گیری کا کام کروں۔ تم آنٹی کے لیے کوئی نرس رکھ لو' اور کم سے کم ان کے ساتھ وقت گزارو۔ کیونکہ تمہیں خود بھی احساس نہیں ہے کہ تم کیسے ہوتے جارہے ہو۔ میں تمہیں ان کی خدمت سے نہیں روک رہی۔ شوق سے کرو' مگر تمہاری اپنی بھی کوئی شخصیت ہے۔ پوری زندگی پڑی ہے تمہارے آگے۔ تم۔"

"اسٹاپ اٹ تنزیلہ۔" اس کی آواز دکھ سے بھرا رہی تھی۔ "میں اماں کو نہیں چھوڑ سکتا۔" وہ محض اتنا ہی کہہ پایا تھا۔ اس کی ماں کی اس حالت نے اسے بے حد کمزور کردیا تھا۔ اندر سے دیمک لگ گئی تھی اس کے وجود کو۔

"تو بہتر ہے کہ تم مجھے چھوڑ دو پھر۔" اس کے الفاظ تھے یا قیامت کا شور۔۔۔ وہ ہل ہی نہ سکا تھا۔

"مجتبیٰ! دراصل تمہیں تب تک شادی نہیں کرنا چاہیے' جب تک تمہاری ماں زندہ ہیں۔ کیونکہ کوئی بھی لڑکی یہ سب نہیں کرسکتی جو تم چاہتے ہو۔ ویسے بھی والدین اولاد کی ذمہ داری ہوتے ہیں' داماد اور بہو کی نہیں۔ میرا فرض نہیں ہے انہیں سنبھالنا۔ ہاں اپنی خوشی سے کروں تو اور بات ہے' احسان ہوگا وہ میرا۔۔۔ مگر میں کیا کروں کہ اس میں میری خوشی شامل نہیں ہے۔ یہ سب اتنا آسان نہیں ہے مجتبیٰ۔۔۔! تم کیوں نہیں سمجھ رہے؟" وہ بے بسی سے مٹھیاں اور لب بھینچے بیٹھا سب سنتا رہا۔

"سمجھتا ہوں۔۔۔ سب سمجھتا ہوں۔ مگر تم کیوں نہیں سمجھ رہیں کہ اس وقت میں کس مشکل سے گزر رہا ہوں۔ مجھے تمہاری سپورٹ چاہیے۔"

"اگر میں شادی کے بعد الگ گھر کا مطالبہ کروں تو وہ میرا رائٹ (حق) ہے۔" وہ اتنی سفاک تھی کہ اسے نہ اس پر ترس آیا نہ اس کی ماں پر۔

"میں اپنی ماں کو پھینک دوں کیا؟ بتاؤ کیا کروں؟ ماں' باپ پھینکنے کے لیے ہوتے ہیں کیا؟" اس کی آواز پھٹ رہی تھی اور۔۔۔ دل بھی۔

"ہزار طریقے ہیں اس مسئلے کو سلجھانے کے۔۔۔ تم انہیں الگ کردو۔ کوئی بھی اٹینڈنٹ رکھ لیتا۔۔۔ اور اگر نہیں تو شہر میں بے شمار اولڈ ہومز ہیں۔" وہ تڑپ اٹھا۔

"تنزیلہ۔۔۔" اس کے ماتھے کی رگ غصے سے پھڑکنے لگی تھی۔ "انسانوں اور چیزوں میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے۔ چیزیں استعمال ہوتی ہیں اور بوسیدہ ہونے پر پھینک دی جاتی ہیں۔ انسانوں کو استعمال ضرور کیا جانا چاہیے' مگر بوسیدہ ہونے پر انہیں پھینکنا نہیں چاہیے' سنبھال لینا چاہیے' کسی بھی قیمتی متاع کی طرح۔۔۔ ماں' باپ اولڈ ہومز میں رکھنے کے لیے نہیں ہوتے۔ ان کی صحیح جگہ' صحیح مقام تو اولاد کا گھر ہوتا ہے۔ ہم اپنے گھروں کو آرائشی چیزوں سے اوپر تلے بھر لیتے ہیں' مگر اتنے بڑے گھر میں ماں' باپ نہیں رکھے جاتے' جن کا وجود باعث تکریم ہوتا ہے' ہمارے لیے' ہمارے گھروں کے لیے۔" اسے سمجھانا بے سود تھا' سو وہ خاموشی سے لب بھینچے ضبط کرتا رہا۔

"بہرحال میں اس معاملے میں تمہیں مزید سپورٹ نہیں کرسکتی۔۔۔ آئی ایم رئیلی سوری۔" اور اسے لگا وہ مر گیا تھا۔ وہ جارہی تھی اور وہ بس خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

اس کی بوڑھی ماں یک دم بچہ بن گئی تھی۔ جسے وہ سارا دن بہلاتا رہتا۔ شاید اس طرح اس نے بچپن میں اسے بہلایا ہوگا۔ جب اللہ نے بوڑھے کو بچے سے مشابہ قرار دیا تو ہم کیوں تفریق کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ ہم بچوں سے تو محبت کرلیتے ہیں۔ مگر بوڑھوں سے کیوں تنگ پڑجاتے ہیں' دھتکارنے کیوں لگتے ہیں۔

اس رات وہ فہمیدہ کو دلیہ کھلاتے ہوئے روتا رہا تھا۔ فہمیدہ کف اڑاتی' کھانستی' اسے دیکھتی رہیں۔۔۔ پوچھتی نہ تھیں کہ کیا ہوا اور مجتبیٰ چاہتا تھا کہ وہ اس سے پوچھیں کہ وہ کیوں رو رہا ہے۔ مگر وہ اس کے ساتھ نم آنکھوں سے غم منا رہی تھیں۔ بغیر وجہ جانے۔ دلیے کا ایک چمچہ ان کے منہ میں ڈال کر وہ

ہونٹوں سے بہہ جانے والے دلیے کو رومال سے پونچھتا اور اگلا چمچہ ان کے منہ میں ڈال دیتا۔ روتے روتے وہ تھک گیا اور دلیے کا پیالہ بھی ختم ہوگیا تو وہ ان کے برابر آکر لیٹ گیا۔

"میرے لیے دعا کیوں نہیں کرتیں اماں؟ میں مر رہا ہوں۔ وہ مجھے چھوڑ دے گی تو میں کیسے جیوں گا' ٹوٹ جاؤں گا۔ آپ دعا کریں اور اللہ سے کہیں کہ تنزیلہ کو میرا رہنے دے۔ مجھ سے اس کا ساتھ مت چھینے۔ میں اکیلا نہیں جی سکتا۔ آپ نے دعا کرنا چھوڑ دیا ہے نا' تب ہی اللہ مجھے اکیلا کرنے جارہا ہے۔ آپ کی دعا ڈھال تھی میرے لیے۔ ویسی ڈھال اب کہاں سے لاؤں؟" وہ رو رہا تھا اور فہمیدہ کھوں کھوں کی آواز نکالتی' اس کے شامل حال تھیں۔

جسم مفلوج ہوا تھا' ممتا تو نہیں۔۔۔ دل تو زندہ تھا جو اولاد کی محبت سے بھرپور پہلو میں دھڑکتا تھا۔ بھلے سے بستر پر پڑی ایک بچے کی مانند ہوگئی تھیں۔ مگر اولاد کی تکلیف محسوس بھی کررہی تھیں اور تڑپ بھی رہی تھیں۔ اس پینتیس سالہ بیٹے کو کیسے سمجھاتیں کہ ماں کسی بھی حال میں ہو اولاد کے لیے دعا کرنا نہیں بھولتی۔ باقی دنیا بھول سکتی ہے' بس ایک اولاد کو نہیں بھولتی۔

ہفتے بعد تنزیلہ کے والدین گھر آکر منگنی کی انگوٹھی کے ساتھ سامان واپس کرگئے تھے۔ اس نے ان سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ نہ وہ کوئی معذرت کا' پشیمانی کا ایک لفظ بھی کہہ کرگئے تھے۔ وہ ان سے کیا کہتا؟ کیا پوچھتا؟ جواب میں وہ اسے وہی کچھ کہتے جو ان کی بیٹی اس سے کہہ چکی تھی۔ وہ اب اپنے اندر اتنی ہمت نہ رکھتا تھا کہ دوسروں کے منہ سے بار بار اپنی موت کی منادی سنتا۔ وہ مر گیا تھا یہ تنزیلہ پہلے ہی اسے بتاچکی تھی۔۔۔۔ ہر بار جب وہ فون کرتا اور بیل بج بج کر بند ہو جاتی اور وہ فون نہ اٹھاتی تو ہر بار اسے اپنی موت کے قریب آنے کا احساس ہوتا۔

تنزیلہ کو پاکر ماں کو کھو دینے سے بہتر تھا' وہ تنزیلہ کو ہی کھو دیتا۔ اس نے کم نقصان کو اپنے مقدر میں چن لیا تھا' زیادہ نقصان کا وہ متحمل نہیں تھا۔

"برا ہوا یار! بہت ہی برا ہوا ہے۔ یہ سب نہیں ہونا چاہیے تھا۔" حمزہ تاسف سے ہاتھ مل رہا تھا۔ وہ حمزہ سے کہہ نہیں سکا کہ یہ نسبتاً "کم برا ہوا ہے اگر وہ اسے بیاہ کرلے آتا پھر جو ہوتا تھا' وہ اس سے کہیں زیادہ برا ہوتا۔ "تم مجھے بتاتے میں تنزیلہ کو سمجھاتا۔" وہ خاموش رہا تھا۔ محبت کو بھیک کی صورت قبول کرنا اسے گوارا نہ تھا۔ اس لیے اس نے کسی کو شامل حال نہ کیا۔

"ہم آنٹی کو ہسپتال میں بھی داخل کراسکتے تھے۔ وہاں ان کی زیادہ بہتر دیکھ بھال ہوتی۔" اس نے زخمی نگاہوں سے حمزہ کو دیکھا۔ جس عمر میں اس کی ماں تھیں' انہیں ڈاکٹروں' نرسوں اور دوائیوں سے کہیں زیادہ اپنی اولاد اور اس کی توجہ ٹھیک کرسکتی تھی۔ وہ اب بھی خاموشی سے چائے کے کپ کی سطح پر انگلیوں سے اس کی گرمائش محسوس کرتا رہا۔

"تجھے بہرحال اس طرح خاموشی سے اس کی زندگی سے نہیں نکلنا چاہیے تھا۔ اب بھی کچھ نہیں گیا' ہم جاکر تنزیلہ سے بات کرسکتے ہیں۔" اس نے جھکے سر کو اٹھا کر حمزہ کی جانب دیکھا۔

"میں اماں کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اس حال میں تو کبھی بھی نہیں جب ان کی بے بسی دیکھ کر مجھے یاد آتا ہے اپنا وہ بچپن جب میں بے بس اور وہ مجھ پر قادر تھیں۔" اس نے دیوار گیر تصویر کی جانب دیکھا جو اس کے بچپن کی تصویر تھی جہاں اماں ابا کے پہلو میں وہ گول گوتھنا سا بچہ مجتبیٰ تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"میں اپنی ماں کی پینتیس سال کی محبت پر تنزیلہ کی چھ سال کی محبت کو ترجیح نہیں دے سکتا۔ تنزیلہ کی محبت پانی کا بلبلہ تھی جو حالات کی آنچ سے پھٹ گیا۔ ایسی محبت جو سکھ میں ساتھ دے اور دکھ میں الگ ہو جائے۔"

"تم جذباتی ہو رہے ہو۔" حمزہ نے اسے ٹوکا تو وہ استہزائیہ ہنسا۔

"جذباتی۔۔۔ ہاں میں اپنی ماں کو لے کر جذباتی ہی

ہوں۔ اس میں غلط ہی کیا ہے؟ تنزیلہ کون سی بہت باوفا نکلی کہ اس جیسی مجھے دوبارہ نہ مل سکے گی۔ اس جیسی بلکہ اس سے بہتر مل جائیں گی۔"

"تجھے شادی تو کرنا ہی ہے نا کبھی نہ کبھی۔" حمزہ اس کے کندھے پر ہاتھ دھرتے ہوئے بولا۔

"کروں گا' ضرور کروں گا مگر اس لڑکی سے جو میری ماں کو برداشت کر سکے اور بالفرض ایسی لڑکی نہ ملی تو میں شادی نہیں کروں گا کم از کم تب تک جب تک ماں زندہ ہیں اور اس گھر میں سایہ شفقت لیے موجود ہیں۔" حمزہ گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"اللہ نے اولاد کے دل میں ویسی محبت نہیں رکھی جیسی والدین کے دل میں ہوتی ہے۔ والدین بخوشی اولاد کو پالتے ہیں مگر اولاد کے لیے یہ کام مشکل ہے۔ تو جلد تھک جائے گا اور پھر حوصلہ تسلی کے لیے تجھے کسی ساتھی کی ضرورت محسوس ہوگی۔"

"جانتا ہوں کہ ویسی محبت کرنا تو میرے بس میں ہے ہی نہیں جیسی اماں مجھ سے کرتی ہیں۔" حمزہ اس کی ہر بات سے متفق تھا تب ہی خاموش ہو گیا پر اسے دکھ تھا' اپنے دوست کے لیے اور وہ اس کے لیے دعا گو بھی تھا۔

"ایک بات کہوں حمزہ! اولاد سے کہیں زیادہ کبھی کبھی ماں باپ اولاد کے لیے آزمائش بن جاتے ہیں۔"

حمزہ چپ چاپ سنتا گیا۔ ایک وہی تو تھا جس سے وہ دل کی باتیں کر لیا کرتا۔ مخلص دوست رحمت ہوتے ہیں۔۔۔

"تنزیلہ کا ٹاپک ختم ہوا۔۔ چیپٹر کلوز۔ میری ماں کا مجھ پر صرف دودھ کا قرض نہیں تھا' بہت قرض ہوتے ہیں ماں کے۔۔۔ اتارے نہیں جا سکتے مگر کوشش تو کی جا سکتی ہے۔ جس کی نظر میں میری ماں کی عزت نہ تھی۔ وہ میرے لیے بے معنی ہے۔ رشتہ ٹوٹا' اچھا ہوا۔۔ ٹوٹ ہی جانا تھا اسے۔۔ آج یا کل۔۔" حمزہ کو لگا' وہ سنبھل چکا ہے اور اگر ابھی پوری طرح نہیں سنبھلا تو جلد ہی سنبھل جائے گا۔

☼ ☼ ☼

امی نے اسے فوری طور پر واپس آنے کا کہا تھا۔ سو وہ بغیر کسی قسم کے سوال و جواب کے سامان باندھنے لگی۔ اس بار نانی ماں بھی اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئیں۔ ماموں نے ٹکٹ کٹوایا اور لاری اڈے چھوڑ آئے۔

اس کے لیے خاندان میں سے ہی ایک رشتہ آیا تھا۔ اور رشتے والے دو روز تک اسے دیکھنے آ رہے تھے۔ لڑکے کا اپنا کپڑے کا کاروبار تھا اور گھر بھی اپنا تھا۔ بس ایک چھوٹی بہن تھی جو شادی شدہ تھی۔ ماں' باپ عرصہ ہوا چل بسے تھے۔ یہ ساری معلومات گھر پہنچتے ہی امی کے توسط اسے ملی تھیں۔

اور جب لڑکا سامنے آیا تو۔۔ آنسوؤں کا اک ریلا تھا۔ جسے وہ آنکھوں میں آنے سے روکتے ہوئے پیچھے دھکیلنے لگی۔ پچاس سے اوپر کا گنجا' چھوٹے قد کا مرد جس کی رنگت بھی ازحد سیاہ تھی۔ اوپر سے موصوف کی پہلی بیوی سے طلاق ہو گئی تھی اور اب دوسری شادی کرنے چلے تھے۔

"یہ لڑکا ہے۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ انکل لڑکا ہے؟" مروہ کا تو مارے صدمے کے اس سے بھی برا حال تھا۔

وہ کپکپاتے ہاتھوں سے چائے کی ٹرالی لیے اندر داخل ہوئی۔ سلام کیا اور سر جھکائے بیٹھ گئی۔ سامنے بیٹھے لڑکے کے منہ سے خوامخواہ ہی ہنسی کے فوارے پھوٹنے لگے۔

"منحوس۔۔ بڈھا۔" مروہ باہر کھڑی' دروازے سے کان لگائے کلستی رہی۔

ساتھ آئی بہن بریہ سے مختلف سوالات کرتی رہی' جن کے وہ بمشکل جواب دیتی رہی۔

"ذرا چھوٹی کو بھی بلائیں نا۔" شاید بڑی سے تسلی نہ ہوئی تھی تب ہی چھوٹی کے لیے فرمائش جھاڑ دی۔

امی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں بریہ کو اشارہ کیا کہ مروہ کو اندر مت بھیجے' مگر مروہ خود ہی منہ اٹھائے چلی آئی اور بریہ کے برابر بیٹھ گئی۔ بہن کے منہ میں زبان نہیں تو کیا تو وہ بولنا جانتی تھی اور خوب بولنا جانتی تھی۔

"اچھا تو یہ آپ کے ابو ہیں؟" شہد ٹپکاتی مسکراہٹ زبردستی سجائے اس نے سوال کیا۔ اگلے ہکا بکا ہی رہ

گئے۔

"یہ میرے بھائی ہیں۔۔ ان ہی کا رشتہ تو لائی ہوں میں۔" اپنے بھائی کی سبکی اس سے برداشت نہ ہو سکی۔ سو چہرے پر ناگوار تاثرات نے جگہ لے لی۔

"اوہ۔۔ سو سوری۔ میں سمجھی کہ یہ انکل ہیں۔ وہ انکل ہی لگتے ہیں نا۔" وہ بڑی معصومیت سے آنکھیں پٹ پٹا کر بولی' جیسے قطعاً "انجان ہو۔ انکلوں کے تو سر سے ٹکی تلووں میں بجھی۔

"لڑکے کی بھلا عمر' شکل و صورت کون دیکھتا ہے۔ میرے بھائی جان ماشاء اللہ اتنا کماتے ہیں کہ انہیں تو کوئی بھی رشتے سے انکار کر ہی نہیں سکتا۔ لوگ تو شکر کریں۔ جہاں ہم رشتہ لے کر جائیں۔ بھلا ایسے اچھے رشتے کہاں ملتے ہیں؟"

وہ کیک کھاتے ہوئے نخوت سے سر جھٹکتی بتا رہی تھی۔ جتا رہی تھی اور امی جی جی کرتے' تائید میں سر ہلاتیں' مروہ کو کھا جانے والی نظروں سے گھورے جا رہی تھیں۔ مگر وہ بھی مروہ تھی۔۔ ڈھیٹ بنی ماں کے اشاروں کنایوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ٹانگ پر ٹانگ دھرے جھلاتی رہی۔

"اچھا لوگوں نے اتنا اسٹینڈرڈ گرا دیا ہے یا ان کی نظر کمزور ہو گئی ہے؟" اس کی زبان پھسل ہی گئی۔

"مروہ! بریہ! تم دونوں اندر جاؤ بیٹا۔" امی لفظ چبا چبا کر بولیں تو دونوں سر جھکائے خاموشی سے اٹھ گئیں۔

"کیا ضرورت تھی یہ سب کہنے کی؟" بریہ نے اس کا بازو دبایا۔

"بہت اشد ضرورت تھی۔۔۔ وہ فٹ بال جو اندر بیٹھا ہے نا' جو صوفے پر ادھر سے ادھر بتیسی نکالے لڑھک رہا ہے۔ اس شخص سے شادی کرنے سے بہتر ہے بجو کہ تم کنواری ہی مر جاؤ۔" اس نے شکست خوردگی سے بہن کو دیکھا۔ کاش اتنی ہمت وہ کر سکتی۔

"تم اپنے لیے آئے رشتوں کا بھی یہی حشر کرو گی۔" وہ اداسی سے مسکرائی۔

"میں اپنے لیے آئے ایسے رشتوں کا سر پھاڑ کر' ٹانگیں توڑ کر بھیجوں گی' تاکہ پھر کبھی وہ کسی معقول جگہ رشتہ لے کر نہ جائیں۔"

مہمانوں کے جانے کے بعد امی نے مروہ کی ٹھیک ٹھاک کلاس لی تھی۔ وہ تو نانی اماں کے ساتھ جڑ کر بیٹھی بس تماشا دیکھتی رہی۔

مرد کیسا بھی ہو۔۔۔ کالا' بھدا' جاہل' اجڈ' نکھٹو' کہیں نہ کہیں دال گل ہی جاتی ہے اس کی۔۔ مگر لڑکیوں کو تو ہزار خوبیوں کے باوجود گھر بیٹھ کر ماں' باپ کی عزت کا مان رکھتے ہوئے خاموشی سے انتظار کرنا ہوتا ہے۔ ان کی قسمت میں انتظار کرنا ازل سے لکھ دیا گیا ہے۔ غضب تو تب ہوا جب کچھ روز بعد فون پر اس لڑکی نے بریہ کے بجائے مروہ کے لیے اپنے بھائی کی پسند کا اظہار کیا۔

"ہے تو وہ کافی منہ پھٹ۔۔ مگر بھائی جان کو وہ بڑی شوخ اور نٹ کھٹ لگی۔ اب کیا ہے نا کہ جو بھائی جان کی پسند وہی میری پسند۔۔ آپ تسلی سے سوچ کر جواب دیجیے گا۔"

اور مروہ نے تو آسمان سر پر اٹھا لیا۔

"شکل دیکھی ہے کبھی اس بڈھے نے آئینے میں۔۔ گنجا فٹ بال کہیں کا۔ قبر میں ٹانگیں لٹکی ہیں' اور موصوف بیٹی کی عمر کی لڑکی سے شادی کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ بہن صاحبہ کو دیکھو' میرے بھائی کی پسند کی چاچی۔۔۔ سہرا باندھنے کے بجائے اللہ اللہ کروائے اس سے۔۔۔ منحوس بڈھا۔ ان ہی حرکتوں کی وجہ سے بیوی چھوڑ گئی ہوگی اس کی۔" وہ بول بول کر تھکنے میں ہی نہیں آ رہی تھی اور اس کے کان پک گئے تھے۔

"میں بتا دوں امی۔" وہ کمرے میں کھڑے کھڑے ہی اونچی آواز میں بولی' تاکہ باورچی خانے میں کام کرتی۔ زینب بی بی سن سکیں۔ "سن لیں۔۔ میں بجو کی طرح نہیں ہوں۔ میرے لیے ایسے گھٹیا رشتے کے بارے میں سوچیے گا بھی مت۔ ورنہ۔۔ ورنہ میں بھاگ کر کورٹ میرج کر لوں گی۔"

اس کا دل دہل کر رہ گیا اور امی چھری لیے باہر آ گئیں۔

"میں تیرا ابھی خون نہ کردوں۔ ٹھہر جا تیری زبان کا تو میں علاج کرتی ہوں۔" وہ اس کی جانب لپکیں تو وہ جھٹ سے نانی اماں کے پیچھے چھپ گئی۔

"زینب! ہوش کرو کچھ۔ جوان و می ہے۔ چل جا تو میں آپ دیکھ لوں گی۔" نانی اماں نے جان خلاصی کروائی 'ورنہ وہ بیچ بچاؤ تو قتل ہو جاتی یا کوئی گی۔

پھر نانی اماں اسے کیا سمجھانے لگیں۔ وہ سنے بغیر اٹھ کر نماز پڑھنے چلی گئی۔

"واہ بریہ فرید۔۔۔! واہ۔ اب آپ کی یہ حیثیت رہ گئی ہے کہ وہ عمر رسیدہ شخص بھی آپ کو مسترد کرکے چلتا بنا۔ سونے پہ سہاگہ کہ بڑی کو ٹھکرا کر چھوٹی کو پسند کرلیا گیا۔" وہ خود پر ہی استہزائیہ ہنسنے لگی۔

"ہاں ہر ایک کا وقت ہوتا ہے۔ میرے جتنے رشتے آنے تھے آ گئے۔ اب مروہ کا وقت ہے۔ اب میرے لیے آیا ہر رشتہ اسے ہی پسند کرکے جائے گا۔ مجھے خود کو اس سب کے لیے تیار کرنا ہوگا۔" وہ خود سے ہی ہم کلام 'خود کو ہی سمجھانے لگی۔

اب اسے ٹوٹنا تھا' بکھرنا تھا اور پھر سے جڑنا تھا۔ انسان اکثر توڑا جاتا ہے' تب جب اسے پھر سے تشکیل کی ضرورت ہوتی ہے۔ ٹوٹتا ہے اور پھر سے نیا انسان بن کر ابھرتا ہے۔ انسان ٹوٹنے سے ہی تو بنتا ہے۔

"تم کوئی ایکٹیویٹی کیوں نہیں ڈھونڈتیں۔ ایک تو بندے کے گھر کے حالات ایسے ہوں 'اوپر سے کچھ کرنے کو بھی نہ ہو تو ویسے ہی پاگل ہو جاتا ہے۔ جاب نہیں کرنا چاہتیں تو مت کرو۔ ٹیوشن پڑھا لو گھر میں۔۔۔ کوئی کورس کرلو۔ اپنے آپ کو مصروف رکھوگی تو بے کار کی سوچوں سے بچ جاؤ گی۔" اس کی دوست بینش اس روز اس سے ملنے آئی تو اس کے حالات دیکھ کر بولی۔

"دل نہیں چاہتا ہے۔" وہ دل مسوس کر بولی۔

"دل کو منانا پڑتا ہے یار۔۔۔ خود کو مصروف رکھا جاتا ہے۔ خالی ذہن تو بے کار کی سوچوں کی آماجگاہ ہی بنے گا نا۔"

اور پھر اس نے گھر پر ہی چھوٹے بچوں کو ٹیوشن پڑھانا شروع کردی۔ بیکنگ کا کورس شروع کردیا۔ کچھ مصروف ہوئی تو منفی سوچوں کی یلغار بھی کچھ کم ہوئی۔



فرید مراد اچانک دل کا دورہ پڑنے کی وجہ سے جانبر نہ ہوسکے۔ ان کی یوں اچانک موت زینب بی بی کے لیے جاں گسل ثابت ہوئی۔ پہلے کا سا طنطنہ اور دبدبہ کہیں غائب ہی ہوگیا۔ صدمے سے نڈھال خاموشی سے ایک کونے میں پڑی رہتیں سارا دن' گھر اب بریہ نے سنبھال رکھا تھا۔

عورت کا سارا مان اور غرور شوہر کے دم سے ہوتا ہے یا جوان بیٹوں کے دم سے۔۔۔ بیٹا تو یوں بھی نام کا رہ گیا تھا اور شوہر ویسے ہی ساتھ چھوڑ گئے۔ ایسے میں بیٹیوں نے بڑا سہارا دیا۔ آہستہ آہستہ وہ زندگی کی طرف پلٹنے لگیں۔ زینب اب بیٹیوں پر بے جا روک ٹوک نہیں کرتی تھیں۔ انھیں اب احساس ہوگیا تھا کہ مل بانٹ کر ہی وہ حالات کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔ دکان سے اتنا کرایہ آجاتا کہ گزارہ ہو ہی جاتا۔ جو کسر رہ جاتی وہ بریہ ٹیوشن سے پوری کرلیتی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زینب کو نئی فکریں کھانے لگیں۔۔۔ شوہر سر پر نہ رہے۔ بیٹے نے مڑ کر پوچھا بھی نہیں۔ آخری بار باپ کی میت کو کاندھا دینے آیا تھا۔ پھر مڑ کر خبر ہی نہ لی۔ اگر وہ بھی چل بسیں تو بیٹیوں کا کیا بنے گا؟ اس روز ان کی ایک واقف کار آئی بیٹھی تھیں جنھوں نے انھیں اس بات کا احساس دلایا تھا۔

"دیکھو تو میں ڈھونڈ دوں کہیں رشتہ' زینب! میری مانو تو خاندان سے باہر کر ڈالو۔ دیکھو خاندانی اصول رکھنے والے مٹی ہوگئے۔ اگر ان کی بات کا مان رکھوگی تو ساری عمر بچیاں گھر پر ہی بیٹھی رہیں گی۔ کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو۔۔۔ گناہ تو تمہارے سر آئے گا نا کہ وقت سے بیٹیوں کو اپنے گھر کا نہ کیا۔ مانا کہ بچیاں ساری عمر بھی عزت سے 'ماں' باپ کے گھر بیٹھ سکتی ہیں۔ مگر دنیا بڑی ہی گندی ہے۔ لوگوں کی زبانیں کھلتے دیر کہاں لگتی ہے پاک دامن بچیوں پر بھی ایسے ایسے الزام لگا دیتے ہیں کہ۔۔۔ الامان۔۔۔ خاندان کی کیا عزت رہے گی' اگر کل کو بچیاں ہاتھ سے نکل گئیں تو؟ ابھی بھی وقت ہے کچھ ہوش سے کام لو۔ سوچو اس بارے میں۔"

جاتے جاتے بہت سمجھا بجھا کر گئی تھیں۔ تب ہی زینب اب اس پہلو پر غور و خوض کرنے لگیں۔ انھوں نے بصیر کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے لطیف صاحب کو خود سے فون کر ڈالا۔ مگر آگے سے وہ اپنے بیٹے کے نکاح کی خوش خبری سنانے لگے تو زینب خود ہی خاموش ہوگئیں۔ ظاہر ہے اس بات کو گزرے سال ہونے کو تھا اور جب وہ صاف انکار کرچکے تھے تو کس امید پر لطیف صاحب اپنے بیٹے کی اور کہیں بات نہ چلاتے۔

اب کی بار سوچ لیا تھا کہ جیسے ہی کوئی مناسب رشتہ ملتا ہے' وہ بصیر کو خاطر میں لائے بغیر ہاں کردیں گی۔ مگر فرید صاحب کی وفات کو چھ ماہ گزر گئے' کہیں سے کوئی رشتہ ہی نہ آیا۔

"آخری بار جب تم آئی تھیں تو تم نے کہا تھا کہ بریہ کے لیے کوئی رشتہ ڈھونڈو گی۔" زینب نے مرے مرے لہجے میں اپنا مدعا شکیلہ کے سامنے پیش کیا جو کافی دنوں بعد دوبارہ ملنے آئی تھی۔

زینب کی بات پر پہلے تو وہ چونکیں' پھر مسکرا دیں۔ پُرخلوص' بے ریا' مسکراہٹ۔

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ کیوں نہیں؟ بریہ کے لیے تو کب سے میری نظر میں اپنی گلی کا ہی ایک بچہ ہے۔ بڑا صابر' نیک' سعادت مند اور فرماں بردار۔۔۔ ہے بھی کنوارا' بس ایک بار منگنی ٹوٹ چکی ہے' مگر سارا محلہ جانتا ہے کہ اس میں بھی اس بچے کا کوئی قصور نہ تھا۔ لڑکی والے ہی ایسے مطلب پرست نکلے کہ بس۔۔۔" زینب خاموشی سے چائے پیتے لڑکے کے قصیدے سنتی رہیں۔

"عمر کتنی ہوگی؟" کنوارپن کا سن کر انھیں خدشہ تھا کہ بریہ سے بہت چھوٹا نہ ہو۔

"یہی کوئی چھتیس' سینتیس کا ہوگا۔ میرے شہاب سے تھوڑا ہی بڑا ہے۔" شکیلہ کے الفاظ پر زینب نے شکرانے کے کلمات ادا کیے۔

"اتنی دیر سے کنوارا کیوں بیٹھا ہے۔" انھیں اگلا خدشہ لاحق ہوا۔

"بوڑھی ماں ہے اور وہ اکلوتا بیٹا ہے۔ بس مت پوچھو کہ کیسے اس نے اپنی ماں کی خدمت کی ہے۔ ایسے سنبھال رکھا ہے ماں کو کہ دل خوش ہو جاتا ہے دیکھ کر۔ بھلا آج کل کے دور میں ایسی نیک اولاد کہاں ہوتی ہے۔ ارے نوکری کیا' لڑکی کیا' سب چھوڑ دیا ماں کے لیے۔۔۔ پسند کی منگنی تھی' مگر لڑکی کہتی تھی کہ ماں کے ساتھ نہیں رہنے کی۔ آج کل کی لڑکیاں بھی ' ابھی گھر میں قدم دھرتی نہیں اور پہلے ہی علیحدگی کے مطالبے۔۔۔ بس اس نے انگوٹھی منہ پر ماری کہ لو بھئی ماں سے زیادہ کچھ عزیز نہیں مجھے۔ کہتا ہے کہ شادی بھی اس سے کروں گا جو میری ماں کا خیال کرے گی۔ میری نظر تو ہر بار بریہ پر جا ٹکتی ہے۔ ایسی کم گو' صابر' سوچ سمجھ کر بولنے والی بچی ہے فرماں بردار۔ کہو تو بات کروں مجتبیٰ سے۔"

شکیلہ جواب طلب نظروں سے انھیں دیکھنے لگیں' تو زینب سوچ میں پڑ گئیں۔

"اتنا بڑا فیصلہ اچانک نہیں کرسکتی میں۔۔۔ کچھ وقت دو مجھے اور نہیں تو کم از کم اماں سے ہی مشورہ کرلوں۔"

وہ اکیلے فیصلہ کرنے سے ڈرتی تھیں اور خاندان والوں کی باتوں کا الگ خوف تھا۔ بہرحال انھیں اب کوئی فیصلہ تو کرنا ہی تھا۔ کب تک خاندان کا ہی سوچتی رہتیں۔

"ہاں کیوں نہیں۔۔۔ سوچو' مشورہ کرو' بھلے سے چھان بین بھی کروالو۔ مگر جلدی فیصلہ کرلینا۔ اچھے رشتوں کا بڑا کال ہے۔ یہ نہ ہو کہیں اور بات بن جائے اس کی۔۔۔ میرا تو بڑا ہی دل ہے بریہ کے لیے۔۔۔ بڑی اچھی جوڑی بنے گی دونوں کی۔"

زینب پھیکی سی مسکراہٹ سے سر ہلاتی سوچنے لگیں۔

☼ ☼ ☼

پہلی بار وہ نجانے کیوں اپنے اوپر اختیار کھو گیا تھا۔ اس نے فہمیدہ کو بری طرح سے جھڑک ڈالا۔ وہ نماز کے لیے کھڑا ہوا تھا۔۔۔ جب پانچویں بار فہمیدہ نے اسے بلایا۔

"کوئی ہے؟"اس روز وہ نماز چار مرتبہ توڑ چکا تھا مگر اب پانچویں بار وہ سکون سے نماز پڑھتا رہا۔ فرض پڑھ کر ہی اس نے سلام پھیرا۔ اس دوران فہمیدہ کوئی بیس پچیس بار اسے پکار چکی تھیں۔ چار مرتبہ پہلے جانے پر بھی انہوں نے کوئی حاجت پیش نہ کی بس خاموش نظروں سے اسے دیکھتی رہی تھیں۔ اکیلے پن سے انہیں وحشت ہوتی تھی تب ہی اسے آوازیں دیتی تھیں۔ چوتھی بار جب وہ نماز توڑ کر گیا تھا اور وہ آگے سے خاموش اسے دیکھتی رہیں تو مجتبیٰ نے انہیں بڑے پیار سے سمجھایا تھا۔

"اماں! مجھے نماز پڑھنے دیں۔ کم از کم فرض تو پڑھنے دیں۔ دس منٹ خاموشی سے لیٹی رہیں۔ میں ابھی آتا ہوں۔ بس دس منٹ میں۔ ٹھیک ہے؟ اب شور نہیں کیجیے گا۔"

اور جوں ہی وہ جا کر کھڑا ہوا تھا انہوں نے فوراً"زور زور کی کھوں کھوں شروع کر دی تھی۔ مگر اس بار وہ بھی ڈھیٹ بنا نماز پڑھتا رہا۔۔۔ اور جوں ہی سلام پھیرا وہ لپکا ان کے کمرے کی جانب۔

"اماں! میں منع کر کے بھی گیا تھا پھر بھی اتنا شور مچایا آپ نے۔ دو منٹ سکون سے سجدہ بھی کرنے دیا کریں۔ قسم سے زندگی عذاب بن گئی ہے میری۔ نہ دن کو سکون نہ رات کو۔۔۔ جب دیکھو کوئی ہے کوئی ہے۔۔۔ کیا تکلیف ہے آپ کو۔ موت تو نہیں آ گئی تھی جو اس قدر شور ڈالا ہوا ہے۔"

وہ دھاڑا تھا۔ فہمیدہ نم آنکھوں اور کپکپاتے سر سے اسے دیکھتی زہر آلود الفاظ سن رہی تھیں۔ جب وہ چپ ہوا تو وہ بولیں۔

"پا۔۔۔نی۔" کچھ دیر وہ ہونٹ بھینچے انہیں دیکھتا رہا پھر آگے بڑھ کر پانی کا گلاس ان کے لبوں سے لگا دیا۔ وہ پورا گلاس خالی کر گئیں۔ حالانکہ عام طور پر وہ محض دو گھونٹ ہی پیتی تھیں۔ انہیں پانی پلا کر وہ باہر چلا آیا۔ کچھ دیر یونہی صحن میں بچھی چارپائی پر بیٹھا رہا۔ اب نماز کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔۔۔ غصے میں وہ جنت کا دروازہ بند کر چکا تھا۔ اب نمازوں کا بھی کیا فائدہ۔ اسے افسوس ہوا خود پر۔ وہ وہیں بیٹھے بیٹھے بچوں کی طرح رونے لگا۔

"کیا کر دیا میں نے؟ کیا ہو گیا مجھ سے یہ؟" وہ کتنی دیر پچھتاوے میں گھرا روتا رہا۔ فہمیدہ خاموش تھیں۔ ایک بار بھی اسے نہ بلایا حالانکہ وہ آدھا گھنٹہ باہر بیٹھا روتا رہا تھا۔ اتنے وقت کا غبار بھرا تھا کبھی تو نکلنا ہی تھا۔

جنت جیسی حسین جگہ، جس کا کوئی آنکھ تصور نہ کر سکے بھلا اتنی آسانی سے ملنے والی ہوتی تو رونا کس بات کا تھا۔ آج اسے احساس ہوا تھا کہ یہ ماں باپ کو اف بھی نہ کہنا کیا ہوتا ہے؟ وہ روتا ہوا اندر آیا تھا۔

"اماں۔۔۔"ان کے ہاتھوں کو تھام کر لبوں سے لگایا، پیشانی پر بوسہ دیا۔

"اماں! معاف کر دو مجھے۔ غلطی ہو گئی مجھ سے۔ غصے میں کیا کیا بک گیا؟ اماں! مجھے معاف کر دو۔ مجھے بد دعا نہ دینا۔" وہ ماں کا ہاتھ تھامے چھوٹے سے بچے کی طرح بلک رہا تھا۔ فہمیدہ خاموش تھیں۔

"مجھے ہزار بار بلائیں اماں۔۔۔ ہزار بار کیا لاکھ بار۔ میں اب کبھی نہ ٹوکوں گا، کبھی نہیں روکوں گا۔" وہ کتنی دیر بیٹھا ان سے معافی مانگتا رہا مگر اب وہ خاموش تھیں۔

اگلے روز ہی وہ انہیں ریگولر چیک اپ کے لیے ہسپتال لے گیا تھا۔ نہ بی پی نارمل تھا نہ شوگر۔۔۔ وہ نادم تھا کہ اس کے اس رویے کی وجہ سے ہی ان کی طبیعت خراب ہوئی ہے۔

اس دن کے بعد وہ اسے کبھی نہیں بلاتی تھیں وہ خود سے ہی انہیں پانی پلاتا رہتا، باتیں کرتا جاتا مگر وہ اسے اب آواز نہیں دیتی تھیں۔ اکثر وہ بیٹھے بیٹھے رونے

لگتا۔

"اماں! خدا کے لیے مجھے آواز دیا کریں' مجھے آواز دینا کیوں چھوڑ دیا؟ اماں! میں ترس گیا ہوں آپ کی آواز سننے کو۔ بولتی کیوں نہیں ہیں؟ اس گھر کا سناٹا مجھے کھا جائے گا۔ خدا کے لیے اماں! مجھ سے بات کیا کریں۔ آپ کی خاموشی مجھے کھا جائے گی۔ مجھے بددعا نہ دیجیے گا اماں! میں پہلے ہی قسمت کا مارا ہوں۔۔۔ اب کچھ نہیں ہے کھونے کو میرے پاس ۔۔ مجھے بددعا نہ دیجیے گا۔"

وہ گھنٹوں روتا رہتا مگر فہمیدہ کی چپ نہ ٹوٹی۔ وہ اکثر اٹھ اٹھ کر اماں کو گھورتا رہتا' ان کی سانسوں کو ٹٹولتا کہ وہ چل رہی ہیں یا نہیں۔ اس ایک پل میں اسے پل صراط عبور کرنا پڑتا تھا۔ کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے اس احساس کے ساتھ پل پل گزارنا کہ کب آپ کے اپنے کی نبض رک جائے۔ جب انسان اٹھ اٹھ کر سانسیں ٹٹولتا رہتا ہے کہ نجانے کس لمحے رک جائیں۔ وہ اسی طرح دن میں کتنی بار ان کی نبض' ان کی سانس دیکھتے گزار دیتا۔

اور پھر ایک صبح ان کی سانسیں ان کے جسم سے آزاد ہو ہی گئیں۔ وہ اسی طرح خاموش ہی چلی گئی تھیں۔ جس موت کا اس نے طعنہ دیا تھا ماں کو وہ آئی تو انہوں نے اس کے آگے چوں تک نہ کی تھی۔ اسے پتا بھی نہیں چلا۔ وہ سوتا رہ گیا اور اس کی ماں مرگئی۔ مر تو وہ اسی روز گئی تھیں جب اس نے انہیں جھڑکا تھا۔ مگر اسے خبر ہوتے ہوتے بہت وقت لگ گیا تھا۔

وہ اس روز قبر پر حمزہ کے ساتھ گیا تھا۔ فہمیدہ کی قبر کی مٹی کو مٹھی میں بند کرکے وہ خاموش اور نم نظروں سے قبر کو دیکھے گیا۔ ہفتہ گزر گیا تھا انہیں فوت ہوئے اور اسے ایک بات کا دکھ نہ جاتا تھا کہ وہ فوت ہوتے ہوئے اس سے ناراض تھیں۔ اب وہ زندگی بھر کبھی سکون نہیں پا سکے گا۔ مرتے وقت شاید اس کی ماں بددعا دے گئی تھی' وہ اس قدر بے چین تھا۔ گھر تھا کہ کاٹنے کو دوڑتا تھا۔ ہر کمرے میں سے اسے اپنی ماں کی خوشبو آتی۔ نماز پڑھتے کھڑا ہوتا تو کان بجنے لگتے۔

"کوئی ہے' او کوئی ہے"۔۔۔ وہ نماز توڑ کر بھاگتا تو گھر خالی ہوتا۔

"اب میں اسی طرح نماز توڑ توڑ کر بھاگتا رہوں گا؟ پوری زندگی نمازیں توڑ توڑ کر بھاگوں گا اس آواز کے پیچھے جس کا گلا میں نے ہاتھوں سے گھونٹ دیا۔ ان ہاتھوں سے حمزہ! ان ہاتھوں سے جن سے اب میں یہ مٹی تھامے ہوئے ہوں۔" وہ بلک بلک کر رونے لگا۔

"حمزہ! وہ مجھ سے ناراض ہی چلی گئیں۔ اب میں پوری زندگی بھی ناک رگڑتا رہوں گا تو وہ نہیں آئیں گی۔" حمزہ نے اسے گلے سے لگا لیا۔

"ایسا کچھ نہیں ہے مجتبیٰ! تونے آنٹی کا جتنا خیال کیا ہے کوئی نہیں کرسکتا۔ وہ تو تجھے ہر دم دعائیں دیتی ہوں گی۔" وہ اس کی کمر سہلاتے ہوئے تسلی دے رہا تھا۔

"میں نے انہیں کہا کہ وہ عذاب ہیں میرے لیے اور دیکھ اللہ نے مجھ سے وہ عذاب ٹال دیا اور اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ عذاب کسے کہتے ہیں۔" حمزہ خاموشی سے اسے تھپکتا رہا۔

"جانتا ہے' اماں کہتی تھیں کہ انسان کو دعا کرتے رہنا چاہیے اللہ سے کہ' مجھے اس وقت تک زندہ رکھنا جب تک میرے زندہ رہنے میں بھلائی ہے اور مجھے اس وقت وفات دینا جب وفات میں میرے لیے بھلائی ہو اور۔۔۔ اور حمزہ۔۔۔ اللہ کے نزدیک اب ان کی موت زندگی سے بہتر تھی تب ہی اس نے انہیں اپنے پاس بلا لیا۔ وہ چلی گئیں حمزہ! کیونکہ ان کا مرنا اب بھلائی تھی ان کی زندگی سے اور یہ سب صرف میری وجہ سے ہوا۔ صرف میری وجہ سے۔"

"نہیں مجتبیٰ! تو غلط سوچ رہا ہے' تیرے جیسے بیٹے کی تو ہر ماں تمنا کرے گی۔" حمزہ کے الفاظ پر وہ تڑپ اٹھا۔

"ایسا مت کہہ حمزہ! ایسا مت کہہ۔ کسی کو بددعا مت دے کہ اس کا بیٹا میرے جیسا ہو۔"

حمزہ اب دکھ سے اسے گھٹنے پر سر رکھے روتے دیکھ رہا تھا۔ وقت لگنا تھا اسے اس دکھ سے باہر آنے میں۔

☼ ☼ ☼

ابو کی وفات کے بعد وہ محسوس کرنے لگی تھی کہ امی خاموش رہنے لگی تھیں اور متفکر بھی۔ اسے امی کے اس حال پر ترس آتا تب ہی وہ خلاف معمول ان سے ادھر ادھر کی گفتگو کرتی رہتی۔ بھائی نے تو یوں بھی کبھی خاص رابطہ نہ رکھا تھا کہ اسے اس سے کوئی بڑی توقعات وابستہ ہوتیں۔ پھر بھی وہ اس کی بے حسی پر کڑھتی رہتی۔ خونی رشتے توڑنا ممکن بھی تو نہ تھا کہ وہ آزاد کردیتی خود کو اس بے نام سی قید سے۔۔۔ انسان کتنا مجبور ہے اللہ کے قوانین' فطرت کے آگے۔ اسے ہر پل بے بسی کا احساس ہوتا تھا۔

وہ اب پہلے سے کہیں زیادہ ذمہ دار ہوگئی تھی۔ امی اور مروہ اب اسے اپنی ذمہ داری لگتے تھے۔ ذمہ داری کے ساتھ ساتھ بہادری بھی اسے اللہ نے ودیعت کی تھی۔ حالات انسان کو بہت بدل دیتے ہیں وہ بھی بدل گئی تھی۔ وہ اکثر ماں سے ان کی پریشانی کا سبب پوچھتی مگر وہ ٹال دیتیں۔ نجانے کون سی فکریں انہیں بے چین رکھنے لگی تھیں۔

"بریرہ۔" وہ بیٹھی سبزی بنا رہی تھی جب امی نے اسے مخاطب کیا تو وہ اپنے خیالات سے چونکی۔ امی گہری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ "شکیلہ نے ایک رشتہ بتایا تھا مجھے بہت دن پہلے میں نے بہت سوچ بچار کیا۔ کہیں جاکر دل مطمئن ہوا ہے۔" وہ بیٹھی بے یقینی سے ماں کی سن رہی تھی۔

"ایک بار بلوا کر مل لیتی ہوں۔ بعد میں ضروری کارروائی کرکے بصیر اور سمیر کو آگاہ کردوں گی۔" وہ بت بنی ماں کا چہرہ تکے چلی گئی۔

"پہلے ہی بہت دیر ہوگئی۔۔۔ اپنے ابو کو معاف کردو بیٹا اور ہوسکے تو مجھے بھی۔۔۔" ماں کے جوڑے گئے ہاتھوں کو دیکھ کر وہ ہوش میں آئی اور آگے بڑھ کر ہاتھ تھام لیے۔

"ایسا مت کہیں امی۔۔۔! والدین بچوں سے معافی نہیں مانگا کرتے۔ جہاں میرا نصیب لکھا ہوگا مل جائے گا۔ وقت لگتا ہے' دیر سے ہی سہی سب کو اپنے حصے کا مل جاتا ہے۔ یقیناً" اتنے عرصے اللہ میرے حق میں حالات سازگار کررہا ہوگا۔"

اس کی اپنی آواز بھی بھرا گئی۔ زینب خاموش ہوگئیں۔۔۔ ان کا دل بدلا تھا تو اللہ نے شاید اس لیے ان کی بیٹی کا نصیب کھول دیا ورنہ اتنے سال وہ کیسی پتھر دل بنی رہیں۔۔۔ پھر شکیلہ نے بھی تو بتایا تھا کہ لڑکے کا کہیں اور رشتہ ہو کر ٹوٹا تھا۔۔۔ اللہ کے فیصلے انسان کب سمجھ سکتا ہے۔ اتنی عقل' اتنا علم انسان کے پاس کہاں؟

"امی۔۔۔ ایک بات کرنا تھی آپ سے۔۔۔" وہ رات میں امی کے کمرے میں انہیں گرم دودھ دینے گئی تو جھجکتے ہوئے ہمت کر ہی ڈالی۔ زینب استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگیں۔

"امی' جس رشتے کی آپ بات کررہی تھیں' وہ آپ مروہ کے لیے سوچیں۔"

"کیوں تمہیں کوئی اعتراض ہے اس رشتے پر۔۔۔؟" ابھی دن کو ہی تو انہوں نے اس سے بات کی تھی تب وہ انہیں مطمئن سی لگی تھی تو پھر اب۔۔۔

"ہرگز نہیں۔ اعتراض ہوتا امی تو مروہ کے لیے کیوں کہتی۔۔۔؟ بس میں چاہتی ہوں کہ مروہ کی شادی پہلے ہو جائے۔"

"اس کا وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔ ابھی تمہاری باری ہے۔ یوں بھی مروہ اور اس لڑکے کی عمروں میں بہت فرق ہے اور مجھے تمہاری پریشانی زیادہ ہے۔۔۔ سو پہلے تمہارے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں پھر مروہ کا بھی سوچیں گے۔ ابھی اس کی ماں کا انتقال ہوا ہے۔۔۔ تھوڑا وقت گزر جائے تو شکیلہ سے بات آگے چلانے کا کہتی ہوں۔" وہ ماں کو نہیں سمجھا سکتی تھی کہ وہ کیوں اس خواہش کا اظہار کررہی ہے۔

"امی۔۔۔ مروہ کی بھی شادی کی عمر ہے۔ میں تو جہاں اتنا وقت عزت سے بیٹھی رہی۔ آگے بھی بیٹھی رہوں گی۔ میں ڈرتی ہوں امی۔۔۔! اس کی فطرت سے۔ میں کیسے سمجھاؤں آپ کو۔۔۔؟" وہ اضطراری انداز میں

انگلیاں موڑنے لگی۔ امی کے ماتھے پر بل پڑتے اس نے واضح محسوس کیے تھے۔

"مجھے سچ سچ بتانا بریہ! کہ وہ کسی غلط کام میں پڑ گئی ہے۔ کسی لڑکے کا چکر تو نہیں ہے؟ تب ہی میں اتنی بے جا آزادی کے حق میں نہ تھی مگر فرید صاحب سنتے کہاں تھے میری۔" امی بالکل ہی غلط سمجھ رہی تھیں۔ اب وہ کیا کہتی۔

"امی..... بندش لگانے سے گناہ رکتے نہیں ہیں۔ اللہ ہی ہے جو ہر کسی کو ہدایت دینے والا ہے ورنہ گناہ کے لیے تو بعض اوقات کسی ہم جنس یا مخالف جنس کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔۔۔ بعض گناہ تو تنہائی میں خود کی ذات سے بھی سرزد ہو جاتے ہیں۔" زینب چونکیں اور جیسے اس کے الفاظ کی سنگینی کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگیں۔

"امی! آپ جلد از جلد مروہ کی شادی کا سوچیں..... میرے معاملے میں دیر ہوئی تو میں کثرت سے استغفار کرتی رہی اور اللہ نے مجھے بڑے گناہوں سے محفوظ رکھا۔۔۔ ہاں مگر وہ اولاد کی جلدی شادی کا حکم دیتا ہے تو اس کی کوئی حکمت پوشیدہ ہے نا۔۔۔ اللہ سے بہتر سائیکولوجسٹ کوئی نہیں جو انسان کے ذہن کو سمجھ سکے۔۔۔ اور جو جتنا آپ کو جانتا ہے' اتنا آپ کی فطرت کے مطابق فیصلے کرتا ہے' حکم دیتا ہے۔ اس کا حکم یہی ہے کہ اگر شرعی عذر نہ ہو تو جلد از جلد اولاد کی شادی کروی جائے۔۔۔ آپ کوشش تو کریں۔ آگے جو اللہ کو منظور ہوا' ہو جائے گا۔"

زینب حیرت سے بیٹی کی باتوں کو سنتی سوچے چلے جا رہی تھیں کہ ان کی "بریہ" اتنی سمجھ دار کب ہوئی۔۔۔؟

☼ ☼ ☼

شکیلہ نے پہلے حمزہ سے تفصیلا" بات کی تھی اور حمزہ کو ہر لحاظ سے مجتبیٰ کے لیے رشتہ پسند آیا تھا۔ خاص کر جتنا شکیلہ نے بریہ کی صابر اور سعادت مندانہ طبیعت کا ذکر کیا..... مجتبیٰ کو ایسی لڑکی ہی چاہیے تھی جو اسے سمیٹ سکے۔ حالات کے مطابق اس کے مزاج کے اتار چڑھاؤ کو سمجھ سکے۔۔۔ حمزہ نے اپنے طور پر مجتبیٰ سے بات کی تو وہ جوابا" خاموش رہا۔

"میں ابھی شادی کے لیے تیار نہیں ہوں۔" حمزہ واقف تھا کہ اب تک وہ ماں کی وفات کے صدمے سے خود کو نکال نہیں پایا اور نہ ہی اس کے اندر کی چبھن' بے چینی دور ہوئی ہے۔ مجتبیٰ کو وقت درکار تھا مگر اتنا تو ہو سکتا تھا کہ وہ بات طے کر لیتے۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا یار۔۔۔ شادی کرنا تو ہے نا۔ کب تک اکیلے اس گھر کے در و دیوار کو تکتا اور ان سے الجھتا رہے گا۔ جیسی لڑکی تیرے مزاج کو سمجھ سکتی ہے' وہ یہی لڑکی ہے۔" حمزہ کی بات پر وہ تلخی سے مسکرایا۔

"وہ سمجھ لے گی' خوش رکھ لے گی مگر میں اسے خوش کیسے رکھوں گا۔۔۔؟"

"فضول مت سوچا کر۔ میرا یار لاکھوں میں ایک ہے۔" حمزہ نے اس کا شانہ تھپکا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ سخت دل برداشتہ ہے اس لیے اپنی امی اور شکیلہ آنٹی کے ساتھ جا کر اس نے اپنے طور پر رشتہ پکا کر دیا۔

☼ ☼ ☼

وہ رات کے آخری پہر باہر صحن میں آکر بیٹھ گئی۔۔۔ اکیلے نیند نہ آرہی تھی۔ امی' ماموں' بھائی' بھابھی' نانی ماں سب اندر سوئے ہوئے تھے۔ آج مروہ کی رخصتی کے بعد وہ جیسے ہلکی پھلکی سی ہو گئیں۔۔۔ ایک اچھے اور پڑھے لکھے خاندان میں چھوٹی بہن آسودہ زندگی گزارے گی' وہ سوچ کر ہی خوش تھی۔ اپنے سے آٹھ سال چھوٹی بہن کے لیے اس نے بہن سے زیادہ ماں بن کر سوچا تھا۔

اللہ سب کا رازدار ہے۔۔۔ اور وہ۔۔۔ اپنی بہن کی رازدار بن گئی۔ وہ رازدار جس کا اس کی بہن کو بھی پتا نہ چل سکا۔

انسان خطا کا پتلا ہے۔۔۔ غلطی کرتا ہی رہتا ہے۔ بھلا کون ہو گا جو غلطیوں سے پاک ہو گا؟ ایک چھوٹی سی غلطی اس کی بہن سے سرزد ہوئے چلی جا رہی تھی۔

اس نے پرچار نہ کیا' بس وہ کیا جو اسے کرنا چاہیے تھا۔ وہ امی کی اچھی بیٹی بن گئی تھی۔۔۔ اس سب کے بعد بھی نہ بنتی کیا؟ اور کون جانے کہ ہم میں سے کون کہاں کہاں قربانی دیتا ہے۔۔۔ سہتا ہے اور چپ رہتا ہے۔ پرکھنے کا حق تو اللہ کو ہے۔۔۔ وہی جان سکتا ہے کہ اس کے بندے نے کہاں کہاں دل مارا۔۔۔؟ انسان کبھی نہیں جان سکتا۔۔۔

اس نے انگلی میں پہنی مجتبیٰ کے نام کی انگوٹھی کو دیکھا اور مسکرا دی..... وہ اس کا نصیب تھا۔

☼ ☼ ☼

اس نے اماں کو دیکھا۔۔۔ جو سفید کپڑوں میں ملبوس' کسی بھی سہارے کے بغیر خوش باش سب کے درمیان چل پھر رہی تھیں۔۔۔ انہوں نے مڑ کر اسے دیکھا اور پھر مسکرانے لگیں۔

"مجتبیٰ ۔۔۔ مجتبیٰ پتر۔" وہ آنسوؤں سے روتا ہوا گھٹنوں کے بل چلتا ماں کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"روتا کیوں ہے۔۔۔؟"

"تو جو ناراض ہو گئی اماں! مجھے تیری بددعا لگ گئی۔ اب کیسے خوش رہوں گا۔" وہ بچوں کی طرح دونوں ہاتھوں سے آنکھیں رگڑتا ہوا رو رہا تھا۔

اماں ہنس دیں۔

"جھلا نہ ہو تو۔۔۔ بھلا ماں بھی کبھی بددعا دیتی ہے وہ بھی تیرے جیسے پتر کو۔۔۔ تو تو اویس قرنی کے نقش قدم پر چل رہا تھا۔ ایسے بھی کوئی ماں کی خدمت کرتا ہے جیسے تو نے کی۔" وہ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر رہی تھیں۔ کتنے برسوں بعد اماں نے اسے یوں لاڈ کیا تھا۔

"میں نہ بن سکا اویس۔۔۔ میں اویس کی قدموں کی خاک کے برابر بھی نہیں ہوں اماں۔ اویس بننا اتنا آسان کہاں ہوتا ہے؟ میں اپنی ماں کا اویس نہ بن سکا۔" اسے دکھ تھا' ملال تھا۔

"میرا دل تیری طرف سے خوش ہے۔۔۔ میرا رب بھی تجھ سے خوش ہو گا۔" ہاں وہ ماں کا دل ہی تو ہوتا ہے جہاں اولاد کی' کی گئی سب غلطیاں اور گناہ مٹ جاتے ہیں' صاف ہو جاتے ہیں۔

"تیری خدمت کے عوض تجھے دنیا میں بریہ دی گئی۔۔۔ تیری ماں کی دعائیں اب بھی تیرے ساتھ ہیں۔ میں آخرت میں تیرے حق میں گواہی دوں گی۔۔۔ تیری خدمت گزاری کی' فرماں برداری کی۔"

اماں نے سر جوں ہی چوما اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ پسینے میں شرابور ہانپ رہا تھا۔۔۔ سر گھما کر دیکھا تو اس کی ماں کی دعا' اس کی وفا شعار بیوی' بریہ اس کے ساتھ سو رہی تھی۔

"کیا کوئی شخص یوں بھی نوازا جاتا ہے۔۔۔ میری ماں مجھ سے خوش خوش اس دنیا سے گئی اور اب مجھے اس دنیا میں اپنی بیوی کو خوش رکھنا ہے۔" وہ گھونٹ گھونٹ پانی پیتا' ہر گھونٹ پر شکر ادا کر رہا تھا۔

دو فرماں بردار اولادوں کا جوڑا۔۔۔ جن کے ساتھ تاحیات ان کے والدین کی دعائیں رہتی تھیں' زندگی میں کیا اس سے زیادہ سکون بھی کہیں ہوتا تھا۔۔۔ ہو سکتا تھا؟ کبھی نہیں۔

☼

عنیزہ سیّد

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم

"روشنی کے اندر اندھیرا چھپا ہوتا ہے"۔ سفید صفحے پر سیاہ روشنائی میں لکھے الفاظ پر اس کی نگاہ دوڑی۔

"خوشی کے اندر دکھ چھپا ہوتا ہے۔" الفاظ جیسے اسے کچھ سمجھا رہے تھے۔

"اور گلاب کے ساتھ کانٹے ضرور ہوتے ہیں۔" بڑی پتے کی بات تھی۔ اس نے ایک دفعہ پھر ان الفاظ پر نظر دوڑائی۔

"ہوں..." دوبارہ ان الفاظ کو پڑھنے کے بعد اس نے جسم کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور ہاتھ میں پکڑی قرمزی جلد والی کتاب کرسی کے قریب رکھی میز پر دھر دی تھی۔

لفظوں کے اندر چھپی پتے کی بات اس کی سمجھ میں آنے لگی تھی۔

زندگی کے ہر سکھ کے ساتھ دکھ سائے کی طرح چلتا ہے۔ جہاں اور جب بھی بس چلتا ہے وہ سکھ کے نرم پروں پر اپنے پنجے گاڑ لیتا ہے۔

یہ ہر ذی روح کے ساتھ جڑا ہوا ہے، لیکن سوچ کا درست زاویہ اس کی شدت کا احساس کم کر سکتا ہے اور اس سے نجات کی راہ بھی دکھا سکتا ہے۔ یہی نچوڑ تھا کتاب میں درج جملوں کا۔

"سوچ کا درست زاویہ..." اس کے چہرے پر تلخ مسکراہٹ ابھری، تب ہی دروازے کا تالا باہر سے کھول کر نادیہ کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

"تو تم تو ابھی تک یوں ہی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہو۔" نادیہ نے اپنی پشت دروازے کے ساتھ لگا کر اسے بند کرتے

۳۲

بتیسویں اور آخری قسط



ہوئے کہا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں گھریلو سودا سلف کے بیگ تھے۔

"تمہارا کیا خیال ہے۔ مجھے کیا کرتے نظر آنا چاہیے تھا؟" سعد نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

"تم بھول گئے۔" وہ سیدھی کچن کاؤنٹر کی طرف بڑھی۔ "تم نے مجھے چیلنج کیا تھا کہ تم آج رات کے کھانے کے لیے پاکستانی انداز میں مرچ مسالے والی مچھلی فرائی کرو گے۔"

"ہاں۔ میں نے کہا تھا۔ لیکن مجھے تمہارے ان چند ڈبوں میں وہ تمام مسالے نظر نہیں آئے جو اس کو بنانے کے لیے ضروری تھے۔ اس لیے میں نے ارادہ ملتوی کر دیا۔"

"یہ بات نہیں ہے۔" وہ اپنے ساتھ لائے سامان کو کھول کر مختلف جگہوں پر رکھتے ہوئے بولی۔ "اصل بات یہ ہے کہ تم بہت کاہل اور آرام پسند ہو اور یہ کہ تمہیں ویسی مچھلی فرائی کرنا آتی ہی نہیں۔"

"سوچ ہے تمہاری۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔ "میں ابراہیم کا بہترین دوست' بلکہ ہم زاد رہ چکا ہوں اور ابراہیم سے بہتر کھانا کوئی نہیں بنا سکتا۔ ہم نے کئی بار مختلف دریاؤں پر کچی مچھلی خرید کر صاف کی اور بنائی۔ ابراہیم اسے مسالے لگا کر تلا کرتا تھا۔ میں بھی ابراہیم سے یہ فن سیکھ چکا ہوں۔"

"ابراہیم۔۔۔" نادیہ نے کچن کاؤنٹر پر رکھے ہاتھ کی انگلیاں کاؤنٹر سلیب پر بجاتے ہوئے یاد کیا۔ "ارے وہ موٹو جس کے گھر سے اس کے لیے بڑا سا ناشتا دان آیا کرتا تھا۔ جب ہم پنڈی والے اسکول میں پڑھتے تھے۔"

"ہاں بالکل وہی۔" بہت دن بعد سعد کے چہرے پر خوش گوار مسکراہٹ پھیلی تھی اور وجہ ابراہیم کا ذکر تھا۔

"ہاں۔۔۔ پھر میں مان سکتی ہوں کہ تمہیں مچھلی فرائی کرنا آتی ہو گی' کیونکہ وہ موٹو تو بچپن میں بھی صرف کھانے کے لیے زندہ رہا کرتا تھا۔ بڑے ہونے تک تو یقیناً "کھانا ہی اس کا اوڑھنا بچھونا بن چکا ہو گا۔" نادیہ نے رات کا کھانا بنانے کے لیے مشروم کے ٹن کا ڈھکن کاٹتے ہوئے کہا۔

ویسے کیا اب بھی وہ اتنا ہی موٹا ہے اور کھانے کا ویسا ہی شوقین۔۔۔ مجھے یاد ہے ایک بار وہ میرا بھنا چھین کر کھا گیا تھا۔ کیونکہ اسے سخت بھوک لگ رہی تھی اور میں صرف اس ڈر سے اس سے لڑ نہیں سکی کہ وہ مجھ سے دگنا بلکہ تگنا تھا اور اسے خوف ناک شکلیں بنا کر دوسروں کو ڈرانے میں مہارت حاصل تھی۔"

اپنے کام میں مگن' وہ سعد کی طرف دیکھے بغیر بولے چلی جا رہی تھی۔ لیکن اپنی طویل بات کے جواب میں خاموشی پا کر اس نے سر اٹھا کر سعد کی طرف دیکھا تھا۔ وہ کسی سوچ میں گم تھا۔ اس کے چہرے پہ لحظہ بھر کو پھیلی مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی اور اب اس کی جگہ اداسی نے لے رکھی تھی۔

"تم پھر اداس ہو گئے ہمیشہ کی طرح۔" الفاظ بے اختیار نادیہ کے منہ سے پھسلے۔

"میں نہیں جانتا تھا کہ ایک طویل عرصے تک مانوس شکلوں کا نظر نہ آنا بھی انسان کے دل پر عجیب عجیب سی کیفیات طاری کر دیتا ہے۔" سعد نے سر جھٹک کر اپنی سوچ سے باہر آتے ہوئے کہا۔

"یقیناً" ایسا ہی ہوتا ہے۔" نادیہ نے سر ہلا کر اس کی بات کی تائید کی۔ "لیکن تم کیوں اس خود ساختہ جلا وطنی کی اذیت میں مبتلا ہو۔ جبکہ وقت اور حالات تمہاری اپنی مٹھی میں ہیں۔ تمہاری یہ کیفیت اور ضد کم از کم میری سمجھ میں تو اب تک نہیں آئی۔"

"اس لیے کہ تم سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتیں۔" وہ بے بسی سے بولا۔

"چلو۔۔۔ میں نے مان لیا۔ ڈیڈی بہت برے شخص اور تمہارے مجرم ہیں۔" نادیہ نے مچھلی کے قتلوں پر مختلف چٹنیاں ڈالتے ہوئے کہا۔ بلکہ "مان لینا غلط لفظ ہو گا' یوں سمجھو میں نے فرض کر لیا جو کچھ تم ڈیڈی کے بارے میں سمجھتے ہو وہ سچ ہے' لیکن دوسرے لوگوں کا اس میں کیا قصور ہے۔ ان کو کیوں پیچھے چھوڑ آئے ہو۔"

"میں اس کی وضاحت بھی کر چکا ہوں۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"وہ وضاحت' تو صرف ماہ نور کے سلسلے میں تھی۔" اس نے مچھلی کے قتلوں والی ٹرے اوون میں رکھنے کے بعد پلٹ کر سعد کی طرف دیکھا "اور میں اس سے متفق بھی ہوں۔ تمہیں ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ لیکن۔۔"

اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی سعد نے چونک کر اسے یوں دیکھا جیسے اسے نادیہ سے اس بات کی توقع نہ ہو' جیسے وہ کہہ رہا ہو' پاگل ہو گئی ہو جو میری اس منطق سے متفق ہو۔ کیسی بات کر رہی ہو۔

"لیکن باقی لوگوں کو کیوں چھوڑ آئے تم؟" نادیہ نے سعد کی نظروں اور ان میں چھپے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ابراہیم' سارا خان اور سارا خان جیسے وہ اتنے سارے لوگ' جنہیں صرف تم میں زندگی اور امید کی کرن نظر آتی تھی۔

سعد نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"کبھی سوچا بھی ہے کہ وہ لوگ تمہارے قدموں کی آہٹ سننے کے انتظار میں کان لگائے رکھتے ہوں گے۔ ان کی آنکھیں تمہاری ایک جھلک دیکھنے کو بے چین رہا کرتی ہوں گی۔ تمہاری کوئی خبر سننے کے منتظر وہ لوگ کس تکلیف دہ کیفیت میں مبتلا رہتے ہوں گے۔"

"میں اب ان کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔" وہ تلخی سے بولا۔ "کچھ بھی تو نہیں۔ میرے پاس ان کو دینے کے لیے اب بچا ہی کیا ہے۔ خالی جیب اور ویران دل۔۔۔ دونوں ہی ایسی چیزیں جن کی کسی کو ضرورت نہیں ہوتی۔"

"تو پھر ان کو اپنی توجہ۔۔۔ اپنے خیال اور اپنی محبت کا احساس دیا ہی کیوں تھا تم نے؟" نادیہ کچن کاؤنٹر سے باہر آ کر اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ "کیوں یہ ظلم کیا تھا' ان کے ساتھ تم نے۔"

"جب تک میں ان کے لیے کچھ کر سکتا تھا' میں نے کیا' جب اس قابل نہیں رہا تو راستہ بدل لینے کے سوا میرے پاس چارا ہی کیا تھا۔" وہ کچھ دیر نادیہ کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد اس سے نظریں چراتے ہوئے بولا۔

"تم سمجھتے ہو تم نے اپنا راستہ بدل لیا؟" نادیہ نے دونوں بازو سینے پر باندھتے ہوئے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"ہاں۔۔۔" وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بولا۔

"غلط سمجھتے ہو تم کہ تم نے راستہ بدل لیا؟" نادیہ کی آواز معمول سے قدرے بلند ہوئی۔ "تم راستہ بدلنے کے بجائے تھک کر راستے ہی میں رک کر بیٹھ گئے ہو سعد اور ایسے رک جانا ہی تمہاری زندگی کا سب سے بڑا المیہ بن چکا ہے۔ نہ تم آگے جا رہے ہو' نہ ہی پیچھے پلٹنے کی ہمت کرتے ہو۔ تم خود اپنے آپ کے لیے ایک ایسا کوہ گراں بن چکے ہو جسے ماضی کے ماتم اور مستقبل سے متعلق مایوس باتیں سوچنے کے سوا کوئی کام ہی نہیں رہ گیا اور تم اپنا ہی راستہ کھوٹا کر چکے ہو' آگے کا بھی اور پیچھے کا بھی۔۔۔" سعد نے چونک کر نادیہ کی طرف دیکھا۔

"میری باتیں تلخ محسوس ہو رہی ہوں گی۔" نادیہ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "یہ تلخ سہی' مگر حقیقت پر مبنی ہیں۔" وہ واپس کچن کاؤنٹر کی طرف چلی گئی اور اوون سے ٹرے نکال کر تیار مچھلی کی خستگی کا جائزہ لینے لگی۔

"کوہ گراں۔۔۔ کوہ گراں۔۔۔" کرسی پر بیٹھے سعد کی سماعت کے ارد گرد وہ ایک لفظ چھوڑ گئی تھی۔ جس کی بازگشت نے اسے اپنی زد میں لے لیا تھا۔



"میں نے رابعہ بہن اور مولوی صاحب کو ان کی بیٹی کے پاس بھجوا دیا تھا' تاکہ وہ بھی تھوڑا آرام کر سکیں اور آپ بھی آرام کر لیں۔ آپ نے کھانا اچھی طرح کھایا ہے نا۔" چوہدری سردار نے بلال سلطان کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

"چوہدری صاحب! کیا یہ وہ ہی کمرہ ہے۔ جس میں سعد آپ کے پاس قیام کے دوران ٹھہرا تھا؟" بلال سلطان نے ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"جی ہاں۔۔۔ یہ وہی کمرہ ہے۔" چوہدری صاحب کو ان پر ترس سا آنے لگا۔ بلال سلطان کے بال منتشر تھے۔ آنکھیں تھکی ہوئی اور سرخ تھیں اور آواز بوجھل ہو رہی تھی۔

"آپ کو کیسے لگا کہ یہ وہ ہی کمرہ ہے۔ جس میں سعد ٹھہرا تھا۔" وہ نرم مسکراہٹ کے ساتھ بلال سلطان کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

"اس کے زیر استعمال بہت سی چیزیں اب بھی یہاں موجود ہیں۔" بلال نے لمبا سانس کھینچتے ہوئے کہا۔ "اور ان سب

چیزوں میں ابھی تک اس کی مہک رچی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔"

"بے چارے بلال صاحب!" چوہدری صاحب کو بلال کی بات سن کر خیال آیا۔ "ایک بیٹا ہاتھ سے گنوا بیٹھے' دوسرا اس عمر میں ساتھ چھوڑ کر کہیں گم ہو گیا۔"

"آپ اگر فریش ہو چکے ہوں تو اٹھیے' میں آپ کو کھاری سے ملواؤں۔ آپ اس سے مل کر خوش ہو جائیں گے' کیسا فرشتہ صفت بیٹا ہے آپ کا۔" انہوں نے اپنے تئیں بلال سلطان کا دکھ بٹانے کی کوشش کی۔

"میں اس سے کیا کہہ کر ملوں گا چوہدری صاحب! اسے کیا بتاؤں گا میں کون ہوں۔ اس کی ایک ڈھب پر چلتی زندگی میں انتشار پھیلانے میں کہاں سے آ گیا ہوں۔" بلال سلطان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"انسان اپنی زندگی میں چاہے کتنی ہی انہونیوں کے لیے تیار کیوں نہ بیٹھا ہو' چوہدری صاحب کوئی نہ کوئی انہونی ایسی ضرور ہو جاتی ہے جو اس کے ہوش اڑا دینے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ میرا وہ بیٹا جسے میں برسوں پہلے جی بھر کر رو چکا ہوں۔ میرے سامنے کھاری کے روپ میں آ کر کھڑا ہو گا۔ ایسی انہونی کی توقع تو مجھ جیسا ہوشیار انسان بھی کبھی نہیں کر سکتا تھا۔"

"شاید اسی لیے کہتے ہیں کہ زندگی کی بساط کے سارے مہرے اللہ خود چلاتا ہے۔ انسان کا ان پر کوئی اختیار نہیں ہوتا۔" چوہدری صاحب نے کہا۔

"ٹھیک کہتے ہیں آپ۔" بلال سلطان نے سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ایک یہ ہی نکتہ تو ساری عمر گزارنے کے بعد سمجھ میں آیا ہے کہ اختیار اللہ اپنے پاس ہی رکھتا ہے۔"

"تو پھر چلیں کھاری سے ملنے کے لیے؟" چوہدری صاحب نے کہا۔

"میں اس وقت حد سے زیادہ خوف زدہ ہوں چوہدری صاحب! میرے اس بیٹے کا مجھ سے ملنے پر ری ایکشن کیا ہو گا؟ میں اس لمحے کا سامنا کرنے کی ہمت خود میں پیدا نہیں کر پا رہا۔" بلال سلطان کے انداز میں بے بسی تھی۔

چوہدری صاحب نے کچھ دیر بلال سلطان کو دیکھتے رہنے کے بعد سر ہلایا۔

"میں سمجھتا ہوں بلال صاحب! لیکن اس ایک لمحے کا سامنا تو آپ کو کرنا ہی پڑے گا۔ اس غریب کو تو ہم کچھ عرصہ پہلے یہ اشارہ دے چکے ہیں کہ وہ آپ کا بیٹا ہے اور جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے' وہ اس بات سے زیادہ کہ وہ آپ کا بیٹا ہے۔ اس بات پر ایکسائیٹڈ تھا کہ وہ سعد سلطان کا بھائی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ میرے اچانک بیرونی سفر اور فلزا صاحبہ کے یہاں سے چلے جانے کے بعد جب ہر طرف سے اس کا یہ دعوا مسترد ہو گیا کہ وہ سعد سلطان کا بھائی ہے تو اسی وجہ سے وہ مایوس ہو کر "خود کشی" جیسی حماقت کرنے چلا تھا۔"

"یہ ہی تو وہ بات ہے جس سے میں ڈرتا ہوں۔" بلال نے جواب دیا۔ اس کی لاعلم' مطمئن' مگن' مسرور زندگی میں کیا یہ انکشاف بگاڑ نہ پیدا کر دے گا کہ اس کے سامنے بیٹھا شخص اس کا باپ ہے۔ وہ باپ جو اتنا ظالم تھا کہ اسے بلیوں' کتوں کی خوراک بننے کے لیے بس کے اڈے پر چھوڑ گیا۔ ایک بیٹے کو عمر بھر کی اذیت سے بچانے کے لیے لاعلم رکھنے کی سعی کی سزا میں پہلے بھگت رہا ہوں۔ دوسرے کے رد عمل کو شاید یوں براہ راست فیس نہ کر پاؤں۔"

"نہ آپ کی نیت میں کھوٹ تھا۔ نہ ہی محبت میں کچھ کمی۔" چوہدری صاحب نے ان کی ہمت بندھاتے ہوئے کہا۔ "آپ کا کیا قصور جو ساری تدبیروں کے باوجود وہ نتائج نہ آ سکے جو آپ نے سوچ رکھے تھے۔ خود کو اس مجرموں والی کیفیت سے نکال لیجیے بلال صاحب! میری نظر میں تو آپ اس پوری کہانی کے ہیرو ہیں۔ میں تو آپ کی ہمت اور حوصلے کو سلام پیش کرتا ہوں۔"

"ہیرو!" بلال نے سر اٹھا کر پوچھا۔ "کون۔۔۔ میں یا سعد۔ جس سے وابستگی کا تصور ہر کسی پر خوشی کی کیفیت طاری کر دیتا ہے؟"

"آپ بلال صاحب آپ۔" چوہدری سردار نے انہیں یقین دلاتے ہوئے کہا۔ "آپ اس پوری داستان کے Unsung hero ہیں۔ سعد تو میرے خیال میں بزدل نکلا' جو ذرا سی حقیقت کو کل سمجھ کر اس کا سامنا کرنے کے بجائے بھاگ نکلا۔ آپ کی طرح مشکل ترین وقت میں حواس قائم رکھنا ہی ہیرو ازم کی تشریح ہے۔" انہوں نے بات مکمل کر کے بلال سلطان کی طرف دیکھا جن کے چہرے کے تنے ہوئے نقوش اب قدرے ڈھیلے پڑ گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

سارا نے اپنے فون کی اسکرین پر نظر آتے شخص کو دیکھا۔ وہ اسے کئی برس بعد دیکھ رہی تھی۔ وہ اسے بہت اچھی طرح جانتی بھی تھی۔ لیکن نجانے کیوں فون کی اسکرین پر نظر آتا شخص اسے نامانوس سا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی ہر دم چمکتی آنکھیں بجھی بجھی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس کا مسکراتا چہرہ اداس تھا۔ وہ تھکا ہوا اور مضمحل نظر آ رہا تھا۔ سب سے بڑھ کر اس کے چہرے پر مایوسی اور ناامیدی چھائی ہوئی تھی' معمولی اور گرد آلود لباس میں ملبوس وہ لڑکا نجانے کہاں کہاں کی خاک چھانتا بلال سلطان کے اس محل نما گھر تک آ پہنچا تھا۔

"رکو!" سارا نے کچھ دیر اسکرین کو دیکھتے رہنے کے بعد سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔

اگتے سورج کی سرزمین کا وہ باشندہ' نگر نگر گھومتا پریا رانی کو کھوجتا کہاں تک چلا آیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں اور گول چھوٹی سی ناک والے رکو نے اسکرین کی طرف دیکھا۔ پریا رانی' سارا خان بن چکی تھی۔ اس کا لاغر بیمار جسم توانائی اور شفا حاصل کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر چھائی مردنی زندگی کی رونق سے اپنا آپ بدل چکی تھی۔ وہ اس کے سامنے تھی مگر اس کی دسترس سے اتنی دور کہ وہ ہاتھ بڑھانے پر بھی اس کو چھو نہیں سکتا تھا۔

"تم اب آئے ہو رکو! اتنے عرصے کے بعد۔" سارا خان نے اسی سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔ "اتنا کچھ ہو جانے کے بعد۔ اتنا کچھ بدل جانے کے بعد' جبکہ میں تو تمہیں رات کی تنہائیوں میں' بے بسی کے عالم میں دل سے آوازیں دیتی رہی۔ تم نے میری ایک بھی آواز نہیں سنی۔"

"میری بساط بہت مختصر اور اوقات بہت چھوٹی تھی سارا خان!" رکو نے کہا۔ "اپنی بساط اور اوقات کے مطابق میں نے تمہیں کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا۔ میں بھی پکارتا رہا۔ میں بھی ہر نظر آنے والے چہرے میں تمہیں تلاشتا رہا۔ مجھ سے چوک صرف اتنی ہوئی کہ میں نے تمہیں ان جگہوں پر ڈھونڈنے کی کوشش کی' جہاں میرے خیال میں تم ہو سکتی تھیں۔ سرکاری' خیراتی' اسپتالوں میں' رفاہی اداروں میں اور دارالامانوں میں' بھول کر بھی مجھے یہ خیال نہیں آیا کہ تم ایسی کسی جگہ کے علاوہ بھی کہیں ہو سکتی ہو۔ ان سے بہتر اور ان سے زیادہ خیال رکھنے والے ہاتھوں نے تمہیں تھام رکھا ہو سکتا تھا۔ یہ ہی میری غلطی تھی سارا!" اس نے مسکرانے کی ایک بے بس سی کوشش کی۔ سرکس کا ایک مسخرہ آخر اس سے زیادہ سوچ بھی کیا سکتا تھا۔

"پھر؟" سارا نے بے تابی سے کہا۔ "پھر تم یہاں تک۔ مجھ تک کیسے آ پہنچے۔"

"ماہ نور بی بی کے بتانے پر۔" رکو کا جواب مختصر تھا۔

"اوہ!" سارا کے دھیان میں ماہ نور اتر آئی تھی۔

"لیکن جب مجھے معلوم ہوا کہ میں تمہیں غلط جگہوں پر ڈھونڈتا رہا تھا اور یہ کہ تم ان سے کہیں بہتر اس جگہ پر موجود ہو تو

میں نے تمہارا پیچھا کرنے کا خیال ترک کر دیا تھا اور شاید میں یہاں تک پہنچنے کی جرات بھی نہ کر پاتا۔ اگر جو خان چاچا مجھے حوصلہ نہ دیتا۔ میری ہمت نہ بندھاتا۔"

"خان چاچا!" سارا کے منہ میں جیسے کسی نے کڑواہٹ بھر دی۔ اس کا چہرہ تلخ ہو گیا۔ وہ بزدل اور ظالم شخص جو عمر بھر مجھے اپنی بیٹی کہتا رہا اور جب میں اس کے کام کی نہیں رہی تو مجھے یوں لاوارثوں کی طرح پھینک دیا جیسے اس کا میرا کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔"

"تمہارا حق ہے، تم جو چاہے کہتی رہو۔ لیکن خان چاچا کی بساط اور اوقات شاید... مجھ سے بھی چھوٹی تھی۔ اپنا دم خم گنوا تا وہ بوڑھا ہوتا شخص تمہارے زخمی وجود کو کہاں اٹھائے جاتا، جبکہ اس کی عمر بھر کی کمائی بھی شیرو کے پاس بطور گارنٹی رکھی تھی۔" رکو نے نرمی سے کہا۔

"ہونہہ..." سارا نے نخوت سے سر جھٹکا "اسی لیے وہ مجھے بے بس اور بے آسرا کر کے اس مکھیوں بھری جھولداری میں پھینک کر خود باہر بیٹھا میرے مرنے کی دعائیں کرتا رہا۔"

"وہ اس سے زیادہ شاید کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا سارا!" رکو نے خان چاچا کی طرف داری جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "کیا تم واقف نہیں ہو کہ سرکس سے منسلک ہر شخص کی زندگی سرکس کے مالکوں کے پاس رہن رکھی ہوتی ہے۔ زندگی کو زندگی سے زیادہ کون سی قیمتی شے دے کر چھڑایا جا سکتا ہے، بتاؤ۔" اس نے سوالیہ انداز میں سارا کی طرف دیکھا۔ "زندگی سے زیادہ قیمتی شے شاید موت ہی ہے جو اس رہن شدہ زندگی کو ان ظالموں کے شکنجے سے چھڑا سکتی ہے۔ اسی لیے تو خان چاچا تمہارے مرنے کی دعائیں کرتا تھا۔"

"لیکن میں زندہ ہوں۔ دیکھو اور غور سے دیکھ لو کہ میں ابھی تک زندہ ہوں۔" اس نے اپنا نیب میز پر سیدھا رکھ کر اپنے بازو پھیلائے۔ "یہ میرے بازو، یہ میرے ہاتھ، یہ میری ٹانگیں۔ دیکھو ان میں خون اپنی پوری رفتار سے دوڑتا ہے، میری ٹوٹی ہوئی رگوں اور پٹھوں کی گرافٹنگ ہو چکی ہے۔ جدید اور مہنگی ترین فزیو تھراپی نے میرے مردہ ہوئے جسم کو زندہ کر دیا ہے اور اب میں دوبارہ سے ان بارز جھولوں اور نوکیلے بستروں پر اپنے کرتب دکھا سکتی ہوں۔" اس نے فخر سے رکو کی طرف دیکھا۔

"لیکن میں وہ سب اب کیوں کروں گی۔" اس کے انداز میں نخوت ابھری۔ "جس شخص نے مجھے اپنی سرپرستی میں لے لیا ہے۔ وہ مجھے اب سرکس کی دنیا میں واپس تھوڑی جانے دے گا۔ وہ تو میرے لیے ایک سے بڑھ کر ایک زندگی کا انتخاب کرے گا۔" وہ گردن کو خم دیتے ہوئے مسکرائی۔ "تم نے اچھا کیا جو یہاں آ گئے اور خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ میں کس حال میں زندگی گزار رہی ہوں۔ جا کر بتا دو بلیو ہیون سرکس کے کرتا دھرتاؤں کو وہ بے شناخت، بے آسرا اور مظلوم لڑکی جس نے تمہارے لیے کروڑوں کمائے اور پھر جسے تم لوگوں نے شدید زخمی حالت میں مرنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا تھا۔ آج تک زندہ ہے۔ نہ صرف زندہ ہے بلکہ اب اس پوزیشن میں ہے کہ ایک چھوڑ دس بلیو ہیون سرکس کھڑے کھڑے نقد خرید سکتی ہے۔"

رکو نے سارا کے لہجے کی حقارت اور تلخی کو سکون سے مسکراتے ہوئے اپنے اندر اتارا اور سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "تم بے فکر رہو، میں تمہارا یہ پیغام بغیر کسی لفظ کو آگے پیچھے کیے ان تک پہنچا دوں گا۔"

"میں ممنون رہوں گی۔" سارا نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

وہ سارا خان جو کبھی پیاری رانی تھی رکو اس کی طرف دیکھ کر ایک بار پھر اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "اچھا... میں چلتا ہوں۔"

"ہاں... ٹھیک ہے، تم جاؤ۔" سارا نے کہا۔

رکو کے سامنے دیوار پر لگی ساٹھ انچ کی اسکرین جو ذرا دیر پہلے روشن تھی۔ تاریک ہو گئی۔ اس نے چونک کر اپنے اردگرد دیکھا۔ وہ ایک وسیع و عریض، شان دار کمرے کے وسط میں کھڑا تھا۔ چند لمحے پہلے اس کمرے میں تاریکی تھی اور سامنے والی اسکرین روشن تھی۔ اب اسکرین تاریک اور کمرہ روشن ہو چکا تھا۔ اس کا دل نیچے کہیں بہت ہی نیچے ڈوبنے لگا۔ بہت گہرائی

میں کہیں بہت دور، اس نے اپنے ڈوبتے دل کو سہارا دینے کی کوشش کی اور دائیں بائیں دیکھتے ہوئے کمرے سے باہر نکلنے کا دروازہ تلاش کرنے لگا۔ اسی دم ایک دروازے سے وہ شخص داخل ہوا جس نے بتایا تھا کہ وہ اس گھر کی دیکھ بھال کرنے پر مامور عملے کا ہیڈ ہے۔ اس کے پیچھے لوازمات خورد و نوش سے بھری بڑی سی ٹرے اٹھائے ایک باوردی شخص اندر چلا آیا تھا۔

"رضوان الحق صاحب!" رازی نے اس کے قریب آ کر کہا۔ "آپ تشریف رکھیے۔" اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے صوفے پر بٹھا دیا اور ملازم کو اشارے سے ٹرے میز پر رکھنے کو کہا۔

"آپ ہمارے مہمان ہیں اور کچھ دن ہمارے ساتھ ہی قیام کریں گے۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"نہیں جی... وہ میں..." رکو نے گھبرا کر کہا تھا۔

"نہیں، وغیرہ تو ہو ہی نہیں سکتا، یہ صوفی کا فرمان ہے جو میم سیمی کے کہنے پر جاری ہوا ہے اور ان دونوں خواتین کا فرمان نظر انداز کرنے کی ہمت میں تو ہرگز نہیں کر سکتا۔"

"لیکن..." اس نے کہنا چاہا۔

"کہا نا... لیکن ویکن کچھ نہیں... جب تک میم سیمی واپس نہیں آ جاتیں آپ یہیں رکیں گے اور ان کی واپسی میں اب وقت ہی کتنا باقی رہ گیا۔ یہی کوئی ہفتہ، دس دن۔" رازی لاپروائی سے بولا تھا۔

"ارے آپ یہ اسنیکس لیں نا۔" اس نے ایک پلیٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "چائے میں چینی کتنی لیتے ہیں آپ؟" وہ رکو کو بات بھی کرنے کا موقع نہیں دے رہا تھا۔



"آپ نے میری شادی ایک لاوارث، بے شناخت، غریب سے لڑکے سے کی تھی اماں! اور میں بھی اس شادی کے لیے اس لیے رضامند ہو گئی تھی کہ اس بے آسرا لڑکے پر میرا رعب رہے گا اور اس کی وجہ سے میں چوہدری سردار کے فارم ہاؤس میں رہنے کے مزے لوٹا کروں گی۔" سعدیہ نے شکستہ اور ہاری ہوئی آواز میں کہا۔ رابعہ کلثوم نے اس کی بات سنتے ہوئے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"لیکن وہ لاوارث، بے شناخت اور غریب لڑکا تو بڑا مقدروں والا نکلا اماں! پل کے پل میں فقیر سے شہزادہ بن گیا۔ لاوارث کے وارث مل گئے۔ اسے ایسی شناخت مل گئی جو عمر بھر سر اٹھا کر چلنے کے لیے کافی ہے۔ اس کے اردگرد روپے پیسے، زر و جواہر کے محل کھڑے ہو گئے ہیں۔ وہ بغیر جست لگائے زمین سے آسمان پر جا پہنچا ہے۔ آسمان جہاں سے نیچے نظر ڈالنے پر زمین پر رہنے والے ننھے ننھے بونے نظر آتے ہوں گے... بے حیثیت اور حقیر بونے۔"

"لیکن تم یہ سب کیوں کہہ رہی ہو سعدیہ... تم ایسی دکھی اور پریشان حال کیوں نظر آنے لگیں، میری بات سن کر؟" رابعہ کلثوم سمجھ نہیں پائی تھیں، سعدیہ کو ہوا کیا تھا۔

"آپ کی سمجھ میں نہیں آ رہا اماں کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے۔" سعدیہ ان کی ناسمجھی پر تلخ ہوتے ہوئے بولی۔

"تمہارے لیے تو یہ بہت بڑی خوش خبری ہے۔" رابعہ کلثوم ابھی بھی اس کی بات نہیں سمجھی تھیں۔ وہ سعدیہ کی پریشانی کا محرک سمجھنے سے قاصر تھیں۔

"حیرت ہے اماں! آپ اسے خوش خبری سمجھ رہی ہیں۔" سعدیہ نے ماں کی بے نیازی اور ناسمجھی پر حیرت سے کہا۔ "بلال سلطان صاحب، جن کی کہانی آپ نے مجھے سنا رکھی ہے، ان کی کہانی میں رابعہ کلثوم یعنی رابعہ میراثن کی کیا حیثیت ہے۔ آپ نہیں جانتیں کیا؟ وہ مولوی سراج سرفراز کو کیا سمجھتے ہوں گے۔ آپ کو معلوم نہیں کیا؟"

رابعہ کلثوم کو یکایک آگاہی کا پہلا جھٹکا لگا۔

"رابعہ میراثن جس کا باپ میراثی برادری کا سرپنچ تھا اور مولوی سراج سرفراز بے چارے جن کا آگا پیچھا بھی کسی کو معلوم نہیں اور جنہیں آپ خود مولوانوں کا لمڈا کہہ کر پکارا کرتی تھیں۔ ان کی بیٹی سے کیا بلال سلطان صاحب جیسے آدمی اپنے بیٹے کا چاہے وہ گمشدگی کے بعد اچانک مل جانے والا بیٹا ہی کیوں نہ ہو، کوئی رشتہ بندھا پسند کریں گے۔ کیا ان کو گوارا ہو گا کہ ان جیسے بڑے آدمی کی بہو اتنی معمولی حیثیت کے ماں، باپ کی بیٹی ہو۔ کیا وہ یہ رشتہ قائم رہنے دیں گے؟"

سعدیہ سوال کررہی تھی اور رابعہ کلثوم کا دل ہر سوال کا جواب نفی میں دے رہا تھا۔

"شاید کبھی بھی نہیں۔" سعدیہ نے ماں کی خاموشی پر خود ہی اپنے سوالوں کا ایک جواب دیا۔ "اس لیے اماں! یہ خبر کہ کھاری واقعی بلال سلطان صاحب کا بیٹا ہے۔ میرے لیے خوش خبری نہیں ہے۔ یہ خبر بد خبری ہے۔ یہ خبر کھاری کی زندگی سے میرے وجود کو نکال باہر پھینکنے کی سناؤنی ہے۔ یہ خبر ہمیں ہماری وہ حیثیت یاد کرانے کے لیے کافی ہے، جسے کبھی ہم کھاری سے بہت بہتر، بہت بلند سمجھتے تھے اور جس کے بل پر ہم اس پر اپنا رعب جمائے بیٹھے تھے۔"

"بلال سلطان، جس کو جیسا بھی سمجھیں، کھاری تو ان کے جیسا نہیں ہے نا، وہ تو محبت کرنے والا، محبت کو جاننے سمجھنے والا بچہ ہے۔ دھن دولت کی اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں، وہ تو درویش صفت انسان ہے۔" رابعہ نے کانپتی آواز میں کہا۔

"واہ اماں واہ!" سعدیہ تلخی سے بولی۔ "کس کے دل کو تسلی دے رہی ہیں۔ میرے یا خود اپنے؟ دھن دولت کی حیثیت اس کی نظروں میں اس وقت تک نہیں تھی جب تک یہ دونوں اس کی پہنچ میں نہیں تھیں۔ وہ تب تک ہی درویش صفت تھا، جب تک اسے پتا نہیں تھا کہ امیری میں کیا مزا ہوتا ہے۔ اب تو وہ ہوگا اماں اور اس کے باپ کے محل، گاڑیاں، آسائشات، ایسے میں غریب مولوی صاحب اور مسکین بھین جی کی بیٹی تو شاید اسے نظر آئے نہ یاد رہے۔" اپنی بے حیثیتی پر سعدیہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

رابعہ کلثوم کا سر سعدیہ کی گفتگو سن کر چکرانے لگا۔ زندگی تھی یا کوئی تماشا۔ کبھی ایک منظر اسٹیج ہوتا تھا۔ کبھی دوسرا اور ہر منظر پہلے سے جدا، درمیان میں کوئی ربط تھا، نہ کوئی تال میل۔

"بس اماں! عزت اسی میں ہے کہ چپکے سے اپنا سامان باندھ کر یہاں سے نکل لیں ہم۔" سعدیہ نے سسکی لیتے ہوئے اپنے آنسو پونچھے۔ "اس سے پہلے کہ کھاری، مجھے خود اپنی زندگی سے نکال دے اور اس سے پہلے کہ چوہدری سردار ہمیں فارم ہاؤس سے نکل جانے کا حکم صادر کردیں۔"

"کیوں ہم کوئی چور ہیں، ہم نے کسی کا قتل کیا ہے یا لوٹا ہے کسی کو؟" رابعہ کلثوم پر حالات و واقعات کا ردعمل سوار ہوگیا تھا۔ جب ہی وہ چلاتے ہوئے بولی تھیں۔ "ہم اگر غریب مولوی صاحب اور مسکین رابعہ کلثوم ہیں تو ہاں ہیں اور بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ ہم فلاں فلاں ہیں۔ اپنی محنت کرتے ہیں اور محنت کا کمایا کھاتے ہیں۔ خواہ سوکھی روٹی اور بغیر دودھ کی چائے ہی ہمارا کھاجا ہو تب بھی ہمیں اس بات کا ڈر نہیں کہ کوئی انگلی اٹھا کر کہے گا کہ فلاں فلاں کا دیا کھاتے ہو، سر اٹھا کر جیتے ہیں اور سر اٹھا کر ہی جیتے رہیں گے۔ کوئی کون ہوتا ہے ہمیں نکل جانے کا حکم صادر کرنے والا۔"

"بات آپ کی نہیں، بات بلال سلطان صاحب کی ہے اماں!" سعدیہ نے ان کے ردعمل کا کوئی خاص اثر نہ لیتے ہوئے کہا۔

"ارے چھوڑو بھی بلال سلطان کو۔" رابعہ کلثوم نے ہاتھ سے دفع دور کیا۔ "بادشاہ ہوگا تو اپنی نظر میں ہوگا۔ آج اس کے پاس دھن دولت آگئی تو یہ اس کی قسمت ہے۔ گزرے کل کو کیسے بھولے گا، اس میں وہ ہم ایسوں کے ساتھ ہی اٹھتا بیٹھتا تھا اور ہماری ہی گودوں میں اس کا بڑا بیٹا پلا تھا۔"

"آپ کے غصے میں آنے اور غصہ دکھانے سے کیا فرق پڑے گا اماں۔ ہونی پچھلی اور اگلی ہونی کو ہونے سے روک نہیں سکتا۔" سعدیہ نے کہا۔

"دیکھ لیں گے کیا ہوتا ہے۔ تو غم نہ کر میری بچی۔" رابعہ نے سعدیہ کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔ "ایسا ہی زر کا مرید نکلے گا نا کھاری تو ہم خود اس پر تین حرف بھیج کر اس کی زندگی سے نکل جائیں گے۔ وہ ہمیں کیا نکالے گا۔" وہ سعدیہ کے الجھے بال ہاتھ سے سلجھاتے ہوئے بولیں۔ "تم کیوں غم کرو، تمہارے ماں، باپ بھی زندہ ہیں۔ جیسی گزارتے آئے ہیں آگے بھی گزار لیں گے۔ نہ ہوا کھاری ہماری زندگی میں تو کیا قیامت آجائے گی۔" وہ خود کو تسلی دے رہی تھیں یا سعدیہ کو۔ انہیں خود بھی معلوم نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

سارا کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ "تم خود اپنے آپ کے لیے ایک ایسا کوہ گراں بن چکے ہو، جسے ماضی

کا ماتم اور مستقبل کے بارے میں مایوس کن باتیں سوچنے کے سوا کوئی کام ہی نہیں رہ گیا۔"

"کوہ گراں۔" اسے یاد آیا۔ سائیں اختر نے بھی تو ایسی ہی کوئی بات کی تھی۔ "سزا و جزا کا اختیار جب انسان اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کرتا ہے تو اس عمل کو پورا کر سکتا ہے نہ اپنی راہ کا مسافر رہ پاتا ہے۔ سفر بے مراد رہ جاتا ہے اور اپنی اذیتوں کی صلیب اس کے لیے کوہ گراں بن جاتی ہے۔ جسے وہ اٹھا پاتا ہے نہ گرا دینے پر قادر ہوتا ہے۔"

"کوہ گراں!" اس نے اس لفظ کو دہرایا۔ "سفر بے مراد، اذیتوں کی صلیب، راستہ کھوٹا۔" اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ اس کی نظروں کے سامنے زرد رنگت، کمزور جسم، خون نچڑی سفید ہتھیلیوں والی سارا خان کا سراپا گھوما۔ خانہ بدوش بچوں کے دوڑتے بھاگتے نیم برہنہ اور بعض اوقات تنگ دھڑنگ وجود گھومے جو مٹھی بھر سکوں کے لیے پنجے اٹھا اٹھا کر سڑک پر دھیمی رفتار میں چلتی اس کی گاڑی کو دیکھنے کا انتظار کیا کرتے تھے۔ وہ بوڑھے اور ناتواں چہرے گھومے جو ہفتے دو ہفتے بعد اس کی آمد کے انتظار میں گھروں کی دہلیزوں پر بیٹھے رہتے، کب وہ لڑکا آئے جو ان کے پاس بیٹھ کر ان کے دکھ سکھ سنتا ان کو لطیفے سنا کر ہنساتا۔

"وہ سب کس حال میں ہوں گے۔" اس نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں۔ "آنکھوں میں انتظار کے چراغ جلائے کیا اب بھی وہ اس کی راہ تکتے، اس کی طرف سے کوئی پیغام موصول ہونے کی امید کرتے ہوں گے یا وہ سب اس سے مایوس ہوکر اسے بھول بھال چکے ہوں گے۔" اسے خیال آیا۔ "کیا بھول جانا اتنا آسان ہے کہ کوئی کچھ عرصہ نظر نہ آئے تو اسے بھلا دیا جائے۔ کیا ایک انسان کی دوسرے انسانوں کی زندگی میں صرف اتنی اہمیت ہے کہ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔"

اس کا دل گھبرانے لگا۔

"اگر یہ سب اتنا آسان ہے تو میں کیا کررہا ہوں۔ میں کیوں ایک جگہ ٹھہرا ہوا ہوں، یوں جیسے زمین نے میرے قدم جکڑ رکھے ہوں۔ کیا واقعی میں تھک کر راستے میں ہی بیٹھ گیا ہوں اور اپنا راستہ کھوٹا کرچکا ہوں۔ کوئی رشتہ، کوئی تعلق، کوئی احساس، کوئی جذبہ۔" اس نے خالی ہتھیلی سے سوال کیا اور اس کی نظریں ہتھیلی پر پھیلی لکیروں میں پھنس کر رہ گئیں۔ "اتنا تہی داماں کہ اتنے مہینے ہوچکے مجھے خود کو ان سب سے دور کیے اور پیچھے سے ایک بھی پکار میرے کانوں کو سنائی نہیں دی۔" اس کا دل خون کے آنسو رونے لگا تھا۔

"پھر وہی خود اذیتی، پھر وہی بیمار سوچ۔" دماغ نے ڈانٹنا شروع کیا۔

"محبتوں کو ٹھوکر تو تم نے خود ماری۔ نہ اپنا نشان کسی کو بتا کر آئے، نہ ہی پتا اور گلہ کرتے ہو پیچھے سے کسی آواز کے نہ آنے کا۔

ذرا خود کا احتساب کرو تو پتا چلے کہ تمہاری انسان دوستی، نیک فطرتی، محبتیں تقسیم کرنے کا عمل اور دوسروں کے کام آنے کا جذبہ صرف تب تک تھا جب تک تم ذاتی درد سے ناواقف تھے۔ جیسے ہی خود پر آگہی کا در کھلا۔ تم اپنے تئیں خود سب سے بڑے مظلوم بن گئے اور سب چھوڑ چھاڑ دنیا تیاگ کر بیٹھ گئے۔ واہ کتنے خود غرض نکلے تم۔ کبھی سوچا تم نے سارا خان کا کیا حال ہوگا، تنگ گلیوں اور محلوں میں گھروں کی دہلیزوں پر بیٹھے ان ضعیف العمر مرد و خواتین کی نظریں تمہارا انتظار کرتے کرتے کیسے تھکتی ہوں، یتیم خانوں اور دارالامانوں میں رہنے والے ان مخصوص لوگوں کا کون پرسان حال ہوگا جن کی ذمہ داری تم نے اپنے سر لے رکھی تھی۔"

اس نے دماغ کی ڈانٹ سے گھبرا کر ایک بار پھر آنکھیں میچ لیں۔

"تم تو راہ فرار حاصل کرنے کے لیے سب سے چھوٹا راستہ یعنی خودکشی تک کرنے چلے تھے۔ بس اتنی ہی ہمت تھی تمہاری۔ دوسروں کو ہمت، بہادری اور حالات کا سامنا کرنے پر لمبے لمبے لیکچر دینے والے خود پر پڑی اتنی سی ضرب بھی نہ سہ سکے۔" دماغ پوری شدت کے ساتھ اس پر برس رہا تھا۔

"رکھو ابھی رکھو اس کم بخت دل پر ہاتھ اور بتاؤ بھلا کیا اس کی ایک ایک دھڑکن پکار پکار کر ان کا نام نہیں لیتی، جس کو تم صرف اس لیے پیچھے چھوڑ آئے کہ جانچ سکو اس کی محبت میں کتنا دم ہے۔ جو آج بھی تمہارے دل میں بستی ہے۔ اس بے چاری کا کیا قصور تھا؟"

"نہیں ہے وہ بے چاری سنا نہیں تھا فاطمہ خالد کیا کہہ رہی تھیں۔ وہ مزے میں ہے۔ کوئی کورس کرنے شہر سے باہر گئی

ہوئی ہے۔ اتنا ہی تمہارے لیے ہلکان ہو رہی ہوتی تو کیا یوں مگن ہوتی پڑھائی میں۔" اس نے سوچا تھا۔
لیکن دل سے تو ایک ہی آواز ابھر رہی تھی۔ ایک ہی نام سماعت میں گونجنے لگا تھا۔
"ماہ نور... ماہ نور..."



"دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا۔" سمی آنٹی نے عینک کے اوپر سے سارا کو گھورتے ہوئے کہا۔ "وہ لڑکا نجانے کہاں کہاں تمہیں تلاش کرتا تم تک پہنچا ہے اور تم نے اسے جھٹک دیا۔ شرم کرو اور یاد کرو ان راتوں کو جب تم ڈپریشن زدہ نیند سے اٹھ کر چلا چلا کر اس کا نام پکارا کرتی تھیں۔ جب بلیو ہیون سرکس والوں میں سے اس کے علاوہ تمہیں کوئی دوسرا یاد بھی نہیں آتا تھا۔"

سارا نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے ان کی بات سنی اور پھر ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔
"اچھا تو آپ چھپ کر اس سے ہونے والی میری گفتگو سن رہی تھیں۔" اس کا لہجہ کاٹ دار تھا۔
"میں کبھی نہ سن پاتی اگر رازی نہ بتاتا کہ کون لڑکا تم سے ملنے آیا تھا۔" سمی آنٹی پر سارا کے انداز کا ذرا برابر بھی اثر نہیں ہوا۔
"چلیں... اچھا ہے کہ آپ نے سن لیا۔" سارا نے اپنے دونوں بازو سامنے باندھتے ہوئے کہا۔ "اب شروع ہو جائیں نصیحتیں کرنا۔"
"میں نصیحت نہیں کر رہی، تمہیں کچھ یاد دلا رہی ہوں۔" سمی نے کہا۔
"آگیا یاد۔" سارا نے ان کی طرف دیکھا۔ "اب آگے بولیں۔"
"میں دیکھ رہی ہوں کہ جوں جوں تمہارا جسم صحت اور تازگی پکڑتا جا رہا ہے توں توں تمہارا لہجہ گستاخ ہونے لگا ہے۔"
"اوہ!" سارا مسکرائی۔ "یہ تو کوئی نئی بات نہیں کی آپ نے، آپ کو تو میں اس وقت بھی گستاخ لگا کرتی تھی جب زندگی کے بارے میں بے زار گفتگو کرتی تھی۔"
"ہاں..." سمی نے بلند آواز میں کہا۔ "تمہاری ہر انتہا آخری ہی ہوتی ہے۔ اس وقت تم اپنی بے بسی اور ناکارہ وجود کا رونا روتے نہیں تھکتی تھیں اور تمہیں زندگی میں کوئی مثبت بات نظر ہی نہیں آتی تھی۔"
"اور آپ کا سارا دن مجھے ان وقتوں سے ڈراتے گزر جاتا تھا جب سعد نے ہماری زندگیوں سے چلے جانا تھا۔ جب سعد کی دی ہوئی زکوٰۃ اور خیرات کا سلسلہ ختم ہو جانا تھا۔"
سارا کے لہجے میں پوری شدت سے طنز جھلکا۔
"آپ نے دیکھا۔" اس نے بھنویں چڑھاتے ہوئے سمی کو جتاتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ "سعد چلا گیا۔ ہماری زندگیوں سے نکل گیا، مگر پھر بھی کوئی قیامت نہیں آئی، ہمارے دن پہلے سے بھی بہتر اور بہتر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اب دیکھیں، آج کو دیکھیں، کیا ہے جو ہمارے پاس نہیں ہے۔" اس نے اپنے بازو کھول کر پھیلاتے ہوئے کہا۔ "دنیا بھر کے سارے سرخ قالین ہمارے قدموں تلے بچھے ہیں اور ہم ہر جگہ یوں جاتے ہیں جیسے کوئی بہت اہم شخصیت ہوں۔"
سمی نے بے یقینی سے سارا کے اس انداز کو دیکھا، ان کا دل دکنے لگا۔
"اور جانتی ہو اس کی وجہ کیا ہے؟" انہوں نے خالی نظروں سے سامنے دیکھتے ہوئے کسی زدمبی کی طرح سوال کیا۔
"ہاں جانتی ہوں۔" سارا نے پورے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔ "ہمارے ساتھ یہ سب اس لیے ہو رہا ہے کہ ہم اپنے برے دن گزار چکے ہیں۔ ہم نے اپنے حصے کی مشکلیں، دکھ اور آزمائشیں سہہ لیں۔ اب بدلاؤ کا زمانہ ہے۔ جو ہر انسان پر آتا ہے، دکھ، اذیتیں اور آزمائشیں جنہوں نے کبھی دیکھی بھی نہیں ہوتیں، بدلاؤ کا زمانہ ان پر ان سب کے دروازے وا کر دیتا ہے اور جنہوں نے سہے ہی صرف اذیتیں اور دکھ ہوتے ہیں، ان پر بدلاؤ کا زمانہ زندگی کی نعمتیں برسانے لگتا ہے۔"
"واہ کیا خود ساختہ تجزیہ ہے۔" سمی نے بے اختیار کہا۔ "اتنی سی عمر میں اتنا کچھ دیکھ لینے کے بعد بھی تمہیں اندازہ نہیں ہوا کہ بدلاؤ کا زمانہ کسی کے لیے کچھ نہیں کر سکتا جب تک اوپر بیٹھی سب طاقتوں سے بڑی طاقت نہ چاہے۔ جب

کہ وہ سب جو تمہیں مل رہا ہے، تمہاری قسمت میں نہ لکھا ہو۔ اگر ایسا نہ ہوتا اور بدلاؤ کے زمانے والا تمہارا فلسفہ درست ہوتا تو کچھ لوگ تمام عمر سونے کے چمچے سے نوالے منہ تک لیتے نہ دکھائی دیتے اور کچھ لوگوں کے مقدر میں تمام عمر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ایک ایک پل گزارنا نہ لکھا ہوتا۔"
"جو جیسی زندگی گزار رہا ہوتا ہے، ویسے ہی تجزیے زندگی کے بارے میں کیا کرتا ہے۔ میں ایک عام انسان ہوں۔ فرشتوں جیسی گفتگو کی توقع مجھ سے نہ کریں تو بہتر ہے۔" سارا نے بے نیازی سے کہا۔
"تمہارے پاس کیا گارنٹی ہے کہ یہ جو آج تم پر اتنے اچھے دن اترے ہیں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔" سمی نے چبھتا ہوا سوال کیا۔
"اس کا انحصار میری آج کی پلاننگ پر ہے۔"
"تمہاری وہ پلاننگ کیا ہوئی جو پریا رانی کی حیثیت سے تم نے کی تھی۔ منہ اور سر کے بل گرنا تو یقیناً" تمہاری پلاننگ میں شامل نہیں تھا۔" سمی کے لہجے میں پہلے سے زیادہ چبھن اتری۔
"اس وقت میں کم عمر تھی اور ناتجربہ کار۔" سارا کے انداز میں ہنوز بے نیازی تھی۔ "اب مجھے خوب معلوم ہو چکا ہے کہ وقت اگر میرے ہاتھ میں ایک ستارا پکڑائے تو اس کے ذریعے مجھے چاند تک کیسے پہنچنا ہے۔ بلیو ہیون والوں نے مجھے میرے بچپن سے لے کر اس وقت تک جب میں گری، خوب ایکسپلائٹ کیا۔ میرے ذریعے کروڑوں کمائے، مگر میری اہمیت ان کی نظر میں دو کوڑی کی بھی نہیں تھی۔ آپ نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ کیسے مجھے بے بس موت مرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا اور پھر جب میں وہاں سے اٹھا لی گئی اس کے بعد سے اب تک، جب تک ماہ نور کے ذریعے انہیں یہ خبر نہیں پہنچ گئی کہ میں نہ صرف زندہ ہوں، بلکہ کروڑوں میں کھیلنے والا ایک شخص میرا سرپرست بن چکا ہے۔ انہیں میری یاد نہیں آئی۔ جیسے ہی میری موجودہ حیثیت کا علم ہوا انہوں نے اپنا جاپانی گڈا بھیج دیا میرے پیچھے۔ اب میں دوبارہ سے پریا رانی بن گئی۔ خان بابا کی پریا رانی، رکو کی پریا رانی، بلیو ہیون سرکس کی شہزادی پریا رانی۔" اس نے ایک استہزائیہ قہقہہ لگایا۔ "اسی لیے میں نے واپس بھیج دیا اسے، تاکہ اس کے ذریعے بلیو ہیون والوں کو پیغام پہنچ جائے کہ زندگی اس وقت تک ختم نہیں ہوتی جب تک اس کا وقت پورا نہ ہو جائے اور وقت کا کیا ہے وہ تو کسی بھی وقت کوئی بھی کروٹ لے سکتا ہے۔"
سمی نے ایک تک سارا کو دیکھتے ہوئے اس کی بات سنی تھی۔ ان کے سامنے جو سارا کھڑی تھی، اس کی جسمانی اور ذہنی بحالی کے سفر کے ایک ایک پل میں وہ اس کے ساتھ رہی تھیں۔ وہ ٹوٹی پھوٹی، شکستہ حال لڑکی اب ایک نارمل انسان تھی۔ اس نے قیمتی لباس پہن رکھا تھا اور وہ اس اجنبی ملک کے دارالحکومت میں ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے لگژری کمرے میں ٹھہری ہوئی تھی۔ اس کی فزیو تھراپی اور جسمانی تربیت مکمل ہونے میں چند ہی دن باقی رہ گئے تھے۔ اس کے بعد اسے واپس وطن لوٹ جانا تھا۔ بلال سلطان اس پر اتنے مہربان کیوں تھے؟ وہ اس ایک اہم نقطے پر دھیان دینا بھول رہی تھی۔
وہ اس سعد سلطان کو بھول گئی تھی۔ جس کے صدقے وہ آج یوں خود اعتمادی کے ساتھ اپنے پیروں پر کھڑی دنیا کی نظروں میں نظریں ڈالنے کی ہمت تک آ پہنچی تھی۔ پچھلے کئی دنوں میں اس نے کبھی بھولے سے بھی سعد سلطان کو یاد نہیں کیا تھا۔ وہ سعد سلطان، جس کی ایک آمد سے لے کر اگلی آمد تک کے درمیانی عرصے کے ہفتے، دن، گھڑیاں، ساعتیں تک اس نے گن رکھی ہوتی تھیں۔ وہ سعد سلطان، جس کا کندھا اس کی ہر لڑکھڑاہٹ پر سہارے کے لیے اس کے سامنے حاضر رہتا تھا۔ وہ جو اس کے ایک دو سے لے کر تین تک کی گنتی پر کسی جن کی طرح اس کے سامنے موجود ہوتا تھا۔
وہی سعد سلطان اب کہاں تھا۔ کس حال میں تھا۔ اس سارا خان نے شاید کبھی بھولے سے بھی اسے یاد نہیں کیا تھا۔
"صد افسوس..." سمی نے مایوسی سے سر ہلایا۔ "شاید کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے، انسان کی عادتیں بدل سکتی ہیں، فطرت نہیں بدل سکتی، شیرو کے سرکس کی کسی گھوڑا گاڑی کے پہیے کے قریب نوزائیدہ بچی پھینک جانے والی ماں یا باپ کا دل بھی تو ایسا ہی پتھر اور بے حس ہو گا نا جیسی بے حسی آج کی سارا خان میں اتر آئی ہے۔ یہ بے حسی ہی تو تھی جو سفاک ماں سے جگر کے ٹکڑے کو یوں لاوارث وہاں رکھوا گئی، پھر سارا کی جبلت میں محبت اور لگاؤ کیسے اترتا۔ خود غرضی کی پٹی آنکھوں پر باندھے سارا اندھا دھند آگے بڑھنے لگی تھی اور سمی کو اس کے آنے والے دنوں سے نجانے کیوں ایک انجانا سا خوف محسوس ہونے لگا تھا۔

"سارا! جلدی کرو بھئی، مسٹر ژنگ تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے۔" صوفی نے کمرے کا دروازہ کھول کر جھانکا۔ سارا تیزی سے ہلکے گلابی رنگ کا لپ گلوس ہونٹوں پر پھیرتے ہوئے نکلی۔

"آپ جائیں گی سیمی آنٹی؟" اس نے جاتے جاتے رک کر پوچھا۔

"نہیں۔" سیمی کا دل ایک دم اس بے حسی پر پورے ماحول سے اکتا سا گیا تھا۔

"چلیں پھر بیٹھیں تنہا اور یاد کرتی رہیں اس جاپانی گڈے کو۔" اس نے کہا اور تیزی سے کمرے سے باہر چلی گئی۔

"خداوندا... میں نے تیرے بھروسے پر اس لڑکی کو اس کی وقتی نادانی کی سزا سے بچانے کی خاطر اس غریب لڑکے کو وہاں رکوا دیا ہے۔ تو ہی میرے ارادے کی لاج رکھ لے۔ میں نے تیرے ایک محبت بھرا دل رکھنے والے بندے کا دل ٹوٹنے سے بچانے کی خاطر اپنی حیثیت داؤ پر لگا کر اسے وہاں روک لیا ہے اور تجھ سے درخواست کر رہی ہوں تو اپنے بھروسے پر کوئی قدم اٹھانے والے کو ذلت سے دوچار نہیں کیا کرتا تو میرے ارادے کی لاج رکھ لے۔"

اس شام دیر تک سیمی آنٹی دعا میں مشغول رہی تھیں۔



"خود شناسی بہت بڑی نعمت ہے میرے عزیز اور کیا تم جانتے ہو کہ یہ نعمت بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔" ڈاکٹر رضا نے سعد کی لوٹائی ہوئی کتاب کی قرمزی جلد پر درج سنہرے حروف پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔

"شاید۔" سعد نے مختصر جواب دیا۔

"مگر اس نعمت سے کہیں بڑی ایک نعمت اور بھی ہے، جو اس سے بھی کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔" ڈاکٹر رضا ہلکا سا مسکرائے۔

"اور وہ نعمت کیا ہے؟" اس نے سر اٹھا کر سوال کیا۔

"بندے کا خود اپنے سامنے یہ اعتراف کہ ہاں اسے خود شناسی حاصل ہو چکی ہے۔"

"اوہ ہاں!" سعد نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "لیکن کیا صرف خود اپنے سامنے کہ کسی اور کے سامنے بھی۔"

"جب بندہ خود اپنے سامنے اعتراف کرنے کی ہمت پکڑ لیتا ہے تو دوسروں کے سامنے اعتراف کرنے میں بھی اسے حرج محسوس نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کا آئینہ دل شفاف ہو چکا ہوتا ہے۔ دوسروں سے ہم اپنے بغض، رنج، حسد اور رشک کی وجہ سے ہی تو کتراتے ہیں جب دل کا آئینہ شفاف ہو جائے اور اس میں کوئی بال باقی نہ رہے تو گریز و فرار کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔" ڈاکٹر رضا نے نرمی سے کہا۔ جواب میں وہ ان کی طرف غور سے دیکھتا ہی رہا، بولا کچھ نہیں۔

"پڑھ لی یہ کتاب کہ بغیر پڑھے ہی لوٹا رہے ہو۔" ڈاکٹر رضا نے اس کا یہ انہماک توڑتے ہوئے کتاب اٹھا کر اس کی نظروں کے سامنے کی۔

"پڑھ لی۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"پھر..." انہوں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"پھر یہ کہ مجھے خوشی ہوئی آپ نے مجھے کتاب کے ذریعے وعظ و نصیحت اور تبلیغ کرنے کی کوشش نہیں کی۔"

"کیا تمہارا خیال تھا کہ میں ایسا کروں گا۔"

"ہاں بالکل۔" اس نے سچائی سے اعتراف کیا۔ "لیکن میں ممنون ہوں کہ آپ جس نتیجے پر مجھے پہنچانا چاہتے تھے، اس میں آپ کامیاب ہو گئے۔"

"ارے کس نے کہہ دیا کہ میں تمہیں کسی نتیجے پر پہنچانا چاہتا تھا؟" ڈاکٹر رضا چونکے۔

"میرے دل نے کہا۔" وہ سکون سے بولا۔ "اور آپ نے ایسا کر کے ٹھیک ہی کیا، میرے التباس ختم ہو گئے اور مجھے دھند کے اس پار کی چیزیں بھی نظر آنے لگیں۔"

"مثلاً" کیا نظر آیا؟" وہ محظوظ ہوتے ہوئے بولے۔

"مثلاً" یہ کہ ذاتی دکھ کو اجتماع پر مسلط کر دینے کی خواہش کرنے والا انسان تنہا رہ جاتا ہے۔"

"اور یہ کہ خوشی، سکون اور آسائش کے لمحوں سے محظوظ ہوتے ہوئے ہم اندازہ نہیں کر پاتے کہ آنے والے لمحے ہمارے لیے کس احساس پر سے نقاب اٹھانے والے ہیں۔"

"خوب۔"

"اور یہ کہ بہادری، یہ نہیں کہ آپ خود پر ہر خوشی حرام کر لیں بہادری، یہ ہے کہ اپنے دکھ کی اذیت کے دنوں میں بھی دوسروں کی خوشی میں یوں شامل رہیں جیسے یہ آپ کی اپنی خوشی ہے۔"

"بہت خوب!"

"اور یہ کہ جب آپ پر اپنا آپ ظاہر ہو جائے تو اعتراف کر لو کہ ہاں مجھ میں یہ خامیاں ہیں اور بہت تھوڑی سی فلاں فلاں خوبیاں۔"

"خود شناسی۔" ڈاکٹر رضا نے برجستہ کہا۔

"جی ہاں... خود شناسی۔" اس نے سر جھکا کر اعتراف کیا۔ جی ہاں... خود شناسی ہر آئینے میں انسان کو اپنا چہرہ دکھاتی اور وہ بھی اتنا واضح کہ کچھ پوشیدہ نہیں رہتا۔"

"بس یا کچھ اور بھی؟" ڈاکٹر رضا کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ تھی جیسے وہ بہت مطمئن ہوں۔

"بس اتنا ہی۔"

"گویا تم اس سے آگے کا سفر طے کرنے کو تیار ہو۔"

"اس سے آگے کا سفر۔" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں... " وہ مسکرائے۔ "صرف نظر کرنے سے لے کر درگزر کرنے تک کا سفر..."

"وہ کٹھن سفر ہے۔ اس کے لیے جو زاد راہ درکار ہے، شاید وہ میری دسترس میں نہیں۔" سعد نے سادگی سے کہا۔

"حوصلہ، صبر، تحمل، نرمی۔" ڈاکٹر رضا مسکرا کر بولے۔ "زاد راہ کچھ اتنا ناقابل حصول تو نہیں۔"

"ہو سکتا ہے نہ ہو، مگر حوصلہ، صبر، تحمل اور نرمی حاصل کرنے کے لیے، رد عمل، غصے، نفرت اور انتقام کے پھن پھیلائے ناگوں کا سر کچلنا پڑتا ہے، جو شاید میرے جیسے کمزور انسان کے لیے یہ ممکن نہیں۔"

"بدگمانی کی پٹی آنکھ سے اتار کر تھوڑی سی اعلا ظرفی سے کام لو۔ یہ ناگ خود بخود مر جائیں گے۔"

سعد نے ان کی بات سننے کے بعد گہرا سانس لیتے ہوئے سر صوفے کی پشت سے ٹکا لیا۔

"اچھا یہ بتاؤ، محبت اور محبوب کے بارے میں کیا خیال ہے تمہارا؟" ڈاکٹر رضا نے موضوع بدلا۔

"وہی جو نادیہ نے آپ کو بتایا۔" اس نے یوں ہی سر صوفے کی پشت سے ٹکائے جواب دیا۔

"محبت تمہاری اور محبوب بھی تمہاری، نادیہ بے چاری کو کیا خبر کہ تمہارا کیا خیال ہے۔"

"اس نے آپ کو بتا تو دیا ہے کہ میں کمال بے حس انسان ہوں۔ محبت اور محبوب کے موضوع سے بے زاری کا اظہار کرتا ہوں۔"

"پتا نہیں۔" ڈاکٹر رضا نے سر ہلایا۔ "نادیہ نے تو مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ لیکن اگر ایسا ہے تو پھر تو تم پکڑے گئے۔"

"کیا مطلب؟" وہ یک لخت سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"مطلب کہ جس موضوع سے دانستہ بے زاری کا اظہار کیا جائے، اصل میں وہی تو بندے کی جان کا روگ ہوتا ہے۔"

ڈاکٹر رضا نے دیکھا، سعد کا چہرہ ایک دم سفید پڑنے لگا تھا۔

"دیکھا... میں نے کہا تھا تم پکڑے گئے۔" وہ مسکرائے۔ "خود شناسی کی اسٹیج پر پہنچ چکے ہو، اعتراف والی اسٹیج تک بھی چھلانگ مار ہی لو..."

"ضرور مار لوں، مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں، محبت اور محبوب دور، بہت پیچھے رہ گئے، شاید میں بہت آگے نکل آیا ہوں۔" وہ افسردگی سے بولا۔

"جن کو محبت نصیب ہو جائے، وہ یوں شکست خوردہ تو نظر نہیں آتے۔ محبت کا حصول تو انسان کو فاتح عالم بنا دیتا ہے، مر

اٹھا کر بات کرو سعد! سلطان۔"

"محبت کرنے اور اس کو پانے کے درمیان بہت لمبا فاصلہ ہے۔ ڈاکٹر! مشرق مغرب جتنا فاصلہ....."

"اس دور میں تو فاصلے اتنے سمٹ گئے ہیں' ایک بٹن دباؤ اور مشرق سے مغرب پہنچ جاؤ۔"

"بٹن دبانا ہی تو سب سے مشکل کام ہے۔"

"اچھا!" ڈاکٹر رضا سنجیدہ ہوتے ہوئے بولے۔ "اگر اتنے عذر حائل ہیں تو پھر ٹھیک ہے' قائم رکھو فاصلے اور مت دباؤ بٹن' بس اپنی خود شناسی کے بحرِ بے کنار میں تیرتے پھرو ہر دم۔"

"آپ ناراض ہو گئے شاید....." سعد نے رنجیدگی سے کہا۔

"نہیں' ناراض تو تم ہو' خود سے' میں تو تم سے ناراض نہیں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولے۔ "مغرب کی نماز کا وقت ہوا چاہتا ہے' میں چلوں گا اب۔" انہوں نے اپنی سفید ٹوپی سر پر رکھی اور کمرے سے باہر چلے گئے۔

"اور گلاب کے ساتھ کانٹے ضرور ہوتے ہیں۔"

کسی نے جھک کر اس کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

"ہاں..... مجھے اتنی ہی کڑوی باتیں سن لینے کی عادت ڈال لینی چاہیے شاید۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے خود سے کہا۔

☆ ☆ ☆

سردیوں کی راتوں میں سب کی باری باری ڈیوٹی لگا کرتی تھی۔ صبح منہ اندھیرے سبزیوں پھلوں اور پھولوں کے ٹرک لوڈ ہو کر اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہوتے تھے' ٹرکوں پر لوڈ ہونے والا سامان تیار کرنے کے لیے راتوں کی ڈیوٹی لگا کرتی تھی۔ اس کی بھی بھی فرض کر کے یہ ڈیوٹی نہیں لگتی تھی مگر اسے ڈیوٹی والوں کے ساتھ رات بھر جاگنا اور ان کی باتیں سننا بہت اچھا لگتا تھا۔

رات بھر سب چائے کے پیالے بھر بھر پیتے' اپنی گرم چادروں اور کھیسوں کو اپنے ارد گرد لپیٹتے فرصت کی چند گھڑیاں ملنے پر ایک دوسرے کو اپنے بڑوں سے سنی کہانیاں' خود اپنی آپ بیتیاں' ادھر ادھر سے کان میں پڑی خبریں سناتے اور اسے یہ سب سننا بہت لطف دیتا تھا۔ ان میں سے چند حقہ بھی پیتے تھے۔

حقے کے کش لگا کر اس کی نے اگلے کو پکڑانا یہ اشارہ ہوتا تھا کہ پچھلے والے کی کہانی ختم ہوئی' اب نے جس کے ہاتھ میں ہے وہ کوئی بات سنائے گا۔ ان کہانیوں آپ بیتی اور جگ بیتیوں میں لوگوں کے ماں باپ' بہن بھائیوں اور ان کے گھروں کا ذکر ہوتا' ان سب کی سننے کے بعد رات کے کسی پہر جب وہ اپنے گرم بستر میں لیٹ کر رضائی اپنے گرد لپیٹتا تو دیر تک وہ ان ہی کہانیوں اور داستانوں پر غور کرتا رہتا تھا۔ ماں' باپ' بہن بھائی اور ایک گھر مختلف شکلوں اور ہیولوں کی مانند اس کی نظروں کے سامنے آتا اور گزر جاتا۔ ایک رات ان کی شکل کچھ اور ہوتی اگلی رات کچھ اور' ان بنتی بگڑتی شکلوں کو دیکھتے ہوئے وہ بھی کسی ایسی حتمی شکل سے خود کو مانوس نہیں کر پایا تھا۔

"پتا نہیں میری ماں کے بال لمبے تھے یا چھوٹے۔"

"میرا اگر کوئی بھائی ہے تو مجھ سے بڑا ہو گا کہ چھوٹا۔"

"جو کوئی بہن ہے اور کبھی میں اس سے ملوں تو اسے میلے سے پلاسٹک کی گلابی رنگ والی گڑیا ضرور لے کر دیتا' پتا نہیں میری کوئی بہن ہے بھی کہ نہیں اگر ہے تو اس کی شکل میرے جیسی ہے کہ کسی اور کے جیسی۔"

"اللہ جانے اپنے ابے کی جو بھی شکل میری سمجھ میں آتی ہے' وہ ہر پھر کے چودھری صیب جیسی ہی کیوں ہوتی ہے اور اماں کی ساری شکلیں بنتے بگڑتے آخر میں چودھرانی صابرہ بی بی جیسی کیوں بن جاتی ہیں' وہ مفروضوں کے ساتھ تصوراتی شکلیں گھڑتا' بگاڑتا بڑا ہوا تھا۔ زندگی نے اپنا رخ بدلا تھا' اس کے رنگ ڈھنگ بھی بدل گئے تھے لیکن ابھی بھی فرصت اور تنہائی کے چند لمحے میسر آنے پر یہ اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔

چودھری سردار اور شہر سے آئی اس بچھل پیری جیسی بی بی نے جو انکشاف چند ہفتے پہلے اس پر کیا تھا' اس کو مذاق پر محمول کرتے کرتے حالات اسے گندم میں رکھنے والی گولیاں کھانے کی طرف لے گئے تھے۔

موت کے فطری خوف نے اسے ان زہریلی گولیوں سے بچا کر اس روز ایک نئی حقیقت کے سامنے لا بٹھایا تھا۔ اس کے سامنے بادشاہوں کی سی آن بان والا ایک خوش شکل' خوش لباس شخص بیٹھا تھا جو اپنی وضع قطع سے ہی بڑا امیر کبیر دکھائی دیتا تھا' پڑھا لکھا اور آن بان والا۔

اور چودھری صاحب اسے پہیلی بجھوا رہے تھے۔

"بوجھو ذرا لکھاری! یہ صاحب کون ہیں؟"

اور اس کے ہار مان لینے پر چودھری صاحب ہی اسے بتا رہے تھے کہ وہ شخص اس کا سگا باپ ہے' اس کا یعنی محمد افتخار احمد کا' جس نے اپنے باپ کے تصوراتی ہیولوں میں بھی کبھی ایسے باپ کو دیکھنے کی جرات نہیں کی تھی وہ باپ اس کے سامنے بیٹھا تھا اور توقع' امید اور خوف نظروں میں سمیٹے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اس نے چودھری صاحب کی بات سن کر سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا اور انکار میں یوں سر ہلایا تھا جیسے اسے ان کی بات سمجھ میں نہ آئی تھی۔

"لکھاری میرے پتر! اٹھ کر لالہ صاحب سے مل' یہ تیرے والد صاحب ہیں' تیرے اپنے سگے والد صاحب۔"

"چودھری صاحب! اب تو ہر طرف اتنا شور مچ چکا ہے کہ بابے دین محمد نے مجھے گولیاں بھی نہیں دینی۔" اس کے دل نے ایک دم دہائی مچا دی۔

"تجھے یقین نہیں آ رہا نا جھلیا!" چودھری صاحب نے اس کے قریب بیٹھ کر پیار سے اس کی گردن کے گرد اپنا بازو پھیلاتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور پھر سرگوشی کے سے انداز میں اسے ایک کہانی سنانے لگے' ایسی کہانی جو سردیوں کی راتوں میں جاگ کر ڈیوٹی دینے والوں کی کہانیوں سے بالکل مختلف تھی۔

☆ ☆ ☆

"میں نہیں مانتا کہ انسان کی "Transformation" اچانک ہو جاتی ہے۔ سب فضول باتیں ہیں۔ انسان کے لاشعور میں کچھ چیزیں تعصب کی طرح موجود ہوتی ہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ لاشعور ہی ہماری زندگی کے بہت سے فیصلوں میں کارفرما ہوتا ہے۔" چندر شیکھر نے کافی کا گھونٹ حلق سے اتارنے کے بعد کہا۔

"تمہارا مطلب ہے نادیہ کے لاشعور میں ہی مذہب کے خانے میں اسلام کی تقلید موجود تھی۔" سعد نے دلچسپی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"سو فی صد۔" چندر شیکھر نے پورے یقین کے ساتھ کہا۔ "اور تم نے دیکھا' لاشعور فیصلہ کرنے میں کیسے کارفرما ہوا؟"

"ہوں۔" سعد نے سر ہلایا اور پھر سوالیہ انداز میں چندر شیکھر کی طرف دیکھنے لگا۔

"اور اگر نادیہ کے ذہن میں کسی ایک راستے کا انتخاب کرنے کا خیال ہی نہ آتا تو اس کا لاشعور کیا کرتا۔"

"نادیہ ان لوگوں میں شامل ہے جن کی روح کسی ایک راستے کو اختیار کرنے سے پہلے بے چین رہتی ہے' اسے اس راستے کا انتخاب کرنا ہی کرنا تھا جلد یا بدیر۔" چندر شیکھر نے اس بار بھی پورے تیقن کے ساتھ جواب دیا۔ "میں تمہیں بتاؤں' جب لندن آنے سے پہلے اس نے مجھ سے ذکر کیا کہ وہ خواب میں ایک سراب دیکھتی ہے جس کی شکل واضح نہیں مگر وہ ایک ایسی عمارت کی مانند ہے جس کے گنبد صاف دکھائی دیتے ہیں۔ اسی وقت مجھے یقین ہو چکا تھا کہ نادیہ اس راستے پر چلنے والی تھی۔ مندر کی سیڑھیوں' اشلوک اور بھجن پڑھنے کی آوازوں' گرجاؤں کی گھنٹیوں اور مسجدوں سے آنے والی اذان کی آوازوں میں سے کسی ایک کا اسے انتخاب کرنا ہی کرنا تھا۔ وہ اپنے باپ' باپ کے وطن اور باپ کی زبان سے محبت نہیں عشق کرتی تھی۔ اسے باپ کے ..... اور تجن کی طرف بڑھنا ہی تھا جب ہی تو یہاں آنے کے بعد جب اس نے اپنی کیفیات مجھے میل کرنا شروع کیں تو مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ اس کی بے چین روح نے اپنا وژن حاصل کر لیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بہت خوش قسمت ہے۔"

سعد حیرت سے چندر شیکھر کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی بات سن رہا تھا کچھ دیر اس کی گفتگو کے سحر میں ڈوبے رہنے

کے بعد وہ مسکرایا۔ "تمہارا خیال ہے نادیہ کا یہ وژن اس کی خوش قسمتی ہے۔۔۔"

"ہاں!" چندر شیکھر نے سر ہلایا۔

"جبکہ تم اور تمہارے ہم وطن، تمہارے ہم مذہب اس وژن کی آفاقیت کے منکر ہیں؟"

"ہاں، یہ صحیح ہے۔" چندر شیکھر نے بلا حیل و حجت اعتراف کیا۔

"کیا تمہارا دل اس کی آفاقیت اور عالمگیری پر یقین کر لینے کو نہیں چاہتا؟"

"دل کے چاہنے پر میں نے کبھی غور نہیں کیا۔" چندر شیکھر نے سڑک پر چلنے والی گاڑیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں اس وقت ایک روڈ سائیڈ کیفے کے باہر رکھی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ "لیکن میری نظر تعصب سے بہرحال بچی ہوئی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں دین اسلام نے دنیا کی تاریخ کو تہذیب، اخلاق اور علم کے خزانے عطا کیے ہیں۔"

"نادیہ خوش قسمت ہے کہ اسے وژن مل گیا، تمہاری نظر تعصب سے بچی ہوئی ہے، تم دونوں ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتے ہو، تم نادیہ کی مخصوص خوبیوں کے معترف ہو، اس کا خیال ہے کہ تم سے بہتر اس کا کوئی دوسرا دوست نہیں۔"

سعد نے بات کرتے کرتے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا جس پر بادل جھکا ہوا تھا۔ گیلا اور سیلا لندن ایک مرتبہ پھر بھیگنے جا رہا تھا۔ "نادیہ ایسی لڑکی اور دنیا کی تاریخ کو تہذیب، اخلاق اور علم کے خزانے عطا کرنے والے دین کی طرف تمہارا دل نہیں کھنچا کیا؟"

چندر شیکھر جو اس کی بات غور سے سن رہا تھا۔ سعد کی بات کا مفہوم سمجھتے ہوئے گہرا سانس لے کر مسکرا دیا۔ "یہ خیال تمہیں کیوں آیا؟"

"اس لیے کہ میں نادیہ کا بھائی ہوں اور میرا دل چاہتا ہے کہ میری بہن کٹھنائیوں سے بھری رہ گزر پر چلتے چلتے آسانیوں سے بچی شاہراہ پر جا نکلے۔" سعد نے مبہم سی بات کی۔

"ہوں۔" چندر شیکھر نے سر ہلایا اور ایک بار پھر سڑک پر دوڑنے والی گاڑیوں کی طرف دیکھنے لگا۔

"میں نے ابھی تمہیں بتایا کہ انسان کے لاشعور میں کچھ چیزیں تعصب کی طرح موجود ہوتی ہیں۔ یوں جیسے گھٹی میں چڑھی گئی ہوں۔ میرا بھی عجیب ہی معاملہ ہے۔" وہ رک کر ہنسا "میں کسی بھی مذہب کی تقلید نہیں کرتا۔ مجھے لادین کہلانا اچھا لگتا ہے، لیکن پھر بھی جہاں کہیں مندر میں بجنے والی گھنٹیوں کی آواز میرے کان میں پڑتی ہے۔ جب بھی کہیں بھجن پڑھتی لڑکیاں اور اشلوک سناتے پنڈت نظر آجاتے ہیں۔ میرا دل بے ساختہ ان سے تعلق محسوس کرنے لگتا ہے حالانکہ یہ وہ آوازیں ہیں جن سے میں نے اپنے بچپن ہی سے بچنے کی کوشش کی۔ مندر جانے کے لیے تیار اپنی ماں سے انگلی چھڑا کر میں گھر کے دروازوں کے پیچھے، سیڑھیوں کے نیچے اور غسل خانوں کے اندر چھپ جایا کرتا تھا کیونکہ مجھے پنڈتوں اور بھگوانوں کی مختلف اشکال کو دیکھ کر کچھ ہونے لگتا تھا۔

میں مذہب سے ہمیشہ سے باغی رہا ہوں، مگر لاشعور میں بیٹھا تعصب جو گھٹی میں مجھے چٹا دیا گیا ہے مجھے خود کو اس سے وابستہ کرنے سے بچنے نہیں دیتا اور شاید زندگی بھر نہ بچنے دے، یہ ہی حقیقت میرے اور نادیہ کے درمیان ایک بہت بڑا خلا ہے، ایک بہت بڑا بعد جس کو پاٹنا مشکل ہے۔ ہندو، مسلم، ہندوستانی، پاکستانی۔" وہ استہزائیہ سی ہنسی ہنسنے لگا۔ "انسانوں کی ٹریجڈیز کی بھی کوئی حد ہے؟" اس نے سوالیہ نظروں سے سعد کی طرف دیکھا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔" سعد نے اس کی بات سن کر اپنے دل میں اٹھنے والے نئے خیال پر فاتحہ پڑھتے ہوئے کہا "اکثر اچھے دوست اچھے دوست ہی رہتے ہیں، کیونکہ دوستی میں ایسی حدود و قیود کا کوئی تصور مانع نہیں ہوتا۔ ویسے مجھے معلوم نہیں تھا تم لوگوں کے ہاں بھی گھٹی دینے کا رواج ہے۔" اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"میں نادیہ کے لیے ایک بہترین ساتھی مل جانے کی دعا کے ساتھ تم سے رخصت ہوتا ہوں۔" چندر شیکھر نے کھڑے ہو کر سعد سے مصافحہ کرنے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ایک بات کبھی نہ بھولنا، نادیہ جیسی لڑکی بہترین سے ذرا سے بھی کم کی حق دار نہیں ہے۔" اس نے سعد سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

سعد نے چندر شیکھر کو رخصت ہو کر جاتے اور پھر نظروں سے اوجھل ہوتے دیکھا۔

"ٹھیک کہتے ہو تم۔ انسانوں کی ٹریجڈیز کی کوئی حد نہیں ہے۔" اس نے سوچا اور سر پیچھے کرتے ہوئے نظریں اٹھا کر ایک بار پھر آسمان پر چھائے بادلوں کی طرف دیکھنے لگا۔



"بندہ بھی کتنا ڈرپوک ہوتا ہے، بزدل، چوہے جتنے دل والا" وہ کب سے اکیلی بیٹھی سوچ رہی تھی "کبھی اس بات سے ڈرتا ہے کہ وہ کم شکل ہے، کبھی اس بات سے کہ وہ کم حیثیت ہے، بندے کے اندر کے کوڑھ جن پر اس کا اختیار بھی نہیں ہوتا۔ اسے ہر وقت کسی نہ کسی خوف میں مبتلا کیے رکھتے ہیں، پیٹ بھر کے خوش بھی ہونے نہیں دیتے۔"

اس نے سرد آہ بھرتے ہوئے اس کمرے کے در و دیوار پر نظر ڈالی جس میں کچھ عرصہ پہلے وہ دلہن بن کر آئی تھی اور جہاں آکر وہ اپنے تئیں بیگم صاحبہ بن گئی تھی۔ میلی صدری والے کم رو مولوی صاحب اور پیوند لگے کپڑے پہننے والی بھین جی کی بیٹی، جس نے اس عمر تک پیٹ بھر کر کھانا کھانے کی خواہش ہی کی تھی۔ اچھا پہننے اوڑھنے، مٹی گرتے، کچے فرشوں والے ایک کمرے کے گھٹن زدہ مکان سے باہر نکلنے کے خواب ہی دیکھے تھے۔ اس کمرے میں دلہن بن کر اترنے کے بعد خود کو کوہ قاف کی ملکہ سمجھنے میں حق بجانب ہی تو تھی، مگر اس کا کیا کیا جائے کہ خوابوں جیسی زندگی پلک جھپکتے ہی گزر جاتی ہے۔ بے چاری سعدیہ کلثوم کو بھی محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے حسین خوابوں بھری رات بھر کی نیند بس اب ٹوٹنے کو تھی۔

چودھری سردار نے لاوارث، بے نشان کھاری کے لیے مولوی صاحب اور بھین جی کی بیٹی کا انتخاب بھی اسی لیے کیا تھا، کہ بے شناخت کھاری کو کیا فرق پڑتا تھا اس کی زندگی کی ساتھی کس کی بیٹی تھی اور مولوی سراج اور بھین جی کے لیے اس سے بڑا اعزاز کیا ہو سکتا تھا کہ چودھری سردار نے اپنے لاڈلے کھاری کے لیے ان کی بیٹی کا انتخاب کیا تھا۔

کس کو معلوم تھا رات ختم ہونے اور نیند ٹوٹ جانے پر اسے کیسے بھیانک دن کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ روشن دن کھاری کے لیے روشن زندگی کی نوید لے کر آیا تھا۔ وہ گدا سے شاہ بننے والا تھا مگر غریب سعدیہ کو ناکردہ جرم کی نسل در نسل بھگتنے والی سزا منتقل ہونے کو تھی۔ کوئی پل جاتا تھا کہ کھاری کی زبانی اسے حکم نامہ سنایا جانے کو تھا، اعلا نسب، صاحب حیثیت، بلال سلطان کے بیٹے کی زندگی میں سراج سرفراز اور رابعہ کلثوم کی بیٹی کے لیے کوئی جگہ نہیں بنتی، ذات پات، حسب نسب، ایک بہت بڑی خلیج کی مانند اس کے اور خواب ناک زندگی کے درمیان آکر ٹھہر چکے ہیں۔

اس نے آہ بھرتے ہوئے اپنے حلق سے نکلتی سسکیوں کو روکنے کی خاطر اپنے منہ میں دوپٹا ٹھونس لیا۔ اس کے انگوٹھے تلے رہنے والا کھاری، انگوٹھے کے نیچے سے نکل کر قابل ذکر قد کاٹھ نکالتا سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔ سعدیہ کو اس گلیور کے سامنے اپنا آپ ایک ایسے بونے کی طرح لگ رہا تھا جو ناتواں تھا اور جس کے کندھے جھکے ہوئے تھے۔ اس نے اس منظر سے نظریں چرانے کے بعد آنکھیں سختی سے بند کر لیں۔

"بڑی ہی سختی کے دن آن ٹھہرے ہیں سعدیہ!" اس کے کانوں میں کھاری کی بوجھل آواز سنائی دی۔ وہ سعدیہ کے قریب بیٹھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ سعدیہ لاشعوری طور پر سمٹ کر ذرا فاصلے پر کھسک گئی۔

"لو جا دو بھلا میں انسان نہ ہوا جانور ہو گیا، کبھی ایک جگہ باندھ دو، کبھی کسی اور جگہ۔ میں نہ تو خود کو اجنبی محسوس کروں نہ ہی شور مچاؤں۔ نا بابا نا۔"

سعدیہ نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھول کر دیکھا، وہ دونوں کانوں کی لوؤں کو دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے چھوتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"میں غریب بندہ چٹا ان پڑھ اور جاہل اس انگریز نما باپ کو باپ کیسے مان لوں۔ چاہے وہ کتنا ہی بے چارا کیوں نہ ہو۔"

"وہ بے چارا ہے کیا؟" خوف سے بھرے لفظ سعدیہ کے منہ سے پھسلے۔

"آہو!" کھاری نے سر ہلایا۔ "مجھے چودھری صاحب نے ساری بات بتا دی ہے۔ بھین جی کو غلط فہمی ہوئی تھی۔ میری ماں کو، میرا مطلب ہے سعد باؤ کی ماں کو انہوں نے نہیں مارا۔ یاد ہے نا بھین جی نے ساری گل سنائی تھی۔"

سعدیہ نے ہونقوں کی طرح سر ہلا دیا۔

"وہ سعد باؤ کی ماں ہی نہیں تھی، وہ میری بھی ماں تھی۔" اس کی آواز بھرانے لگی "کسی ظالم نے چھرا پھیر کر میری ماں کا

گلا کاٹ دیا تھا۔" وہ بلند آواز میں اپنی برسوں پہلے مری ماں کو رونے لگا تھا۔ روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی تھی۔

"سعدیہ باؤ! بڑے خواب دیکھتا تھا میں۔" پھر اس نے ہچکیوں کے درمیان کہا۔ "جو کبھی میری ماں مجھے مل گئی تو اس کے قدموں میں بیٹھ جاؤں گا' اس کے پیر پکڑے اس کی شکل تکتے تکتے باقی کی ساری زندگی گزار دوں گا۔

میں غریب کب جانتا تھا کہ ماں تو اسی دن ہی مر گئی تھی جس دن میں دنیا میں آیا تھا۔" وہ ایک مرتبہ پھر رونے لگا تھا۔

کھاری کو تسلی دیتی سعدیہ خود بھی اس کے ساتھ اس عورت کو رو رہی تھی جس کی زندگی اور موت' دونوں ہی کئی اور زندگیوں کے لیے المیہ بن چکی تھی۔

"پر بھین جی غلط نہ سمجھیں' ماں کو بلال صاحب نے نہیں مارا تھا.... " روتے روتے ایک بار پھر کھاری نے اس حقیقت کو دہرایا جو کہانی کا مرکزی نکتہ تھی "وہ تو خود بھی بڑے ہی بے چارے ہیں۔ ایک بیٹا سالوں پہلے ہاتھ سے گنوا بیٹھے' دوسرا اب آکر ہاتھ سے گیا۔ وچارے بلال صیب' نہ دھن نہ دولت' نہ گھر نہ بار.... کچ وی انہیں راس نہ آیا۔ وہ مشین جیسے لگتے ہیں جیسے مشین کا ٹائم لگا دیا جائے تو وہ ٹک ٹک کرتی اپنا کام کرتی رہتی ہے۔"

"چلو شکر کرو کھاری' ماں نہ سہی تمہیں اپنا باپ تو مل گیا' ابا جی بتا رہے تھے تمہارے اچانک مل جانے پر وہ جن کو کبھی کسی نے روتے نہیں دیکھا تھا زاروقطار رو رہے تھے۔" سعدیہ نے اپنے دل پر بھاری پتھر رکھتے ہوئے وہ بات کہی جسے کہتے اس کا کلیجہ پھٹنے کو آ رہا تھا۔

"آہو شکر اے۔" اس نے قمیص کی آستین سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "مگر اب کیا فائدہ' اب نہ میں ان کے کسی کام کا ہوں نہ ہی وہ میرے کسی کام کے ہیں۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔" سعدیہ نے چونکتے ہوئے کہا "وہ تمہارے باپ ہیں' ان کے پاس بے حد و حساب پیسہ ہے' تمہاری تو لاٹری نکل آئی کھاری! اب تم آئندہ کی زندگی بہت اچھی گزارو گے' فارم ہاؤس اور چودھری صاحب کی چاکری سے آزاد ہو جاؤ گے۔ پینٹ کوٹ' پالش شدہ مہنگے جوتے پہن کر قیمتی ترین گاڑیوں میں گھوما کرو گے۔ تمہارے والد دنیا کی ہر نعمت تمہارے قدموں میں ڈھیر کر سکتے ہیں۔ وہ کسی بہت امیر کبیر' اونچی حیثیت والے باپ کی بیٹی سے تمہاری شادی کروا دیں گے۔ پھر تم بالکل صاحب لگو گے صاحب' جب کبھی یہاں گاؤں آؤ گے' لوگ دور سے ہی تمہیں دیکھ کر سلام کیا کریں گے۔"

سعدیہ کو خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ یہ سب باتیں کرنے سے پہلے اس نے اپنے دل پر جو پتھر رکھا تھا' اس کا وزن کتنا تھا۔

"اوئے اللہ دا واسطہ اے سعدیہ باؤ!" کھاری کو جیسے ڈنک لگا تھا' وہ اچھل کر پیچھے ہوا۔ "کیسی باتیں کرنے لگی ہو۔ اللہ نہ کرے جو میں پینٹ کوٹ پہن کے گڈیاں چلاؤں۔ توبہ توبہ توبہ ہزار واری توبہ" اس نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ "سعدیہ میں کیا خرابی ہے جو میں کسی امیر باپ کی بیٹی سے شادی کر لوں گا۔ میں تو اللہ کا شکر ہے پہلے ہی شادی شدہ ہوں۔"

"نہیں کھاری۔" سعدیہ نے افسردگی سے کہا "تمہارے والد مجھے کبھی بھی تمہاری بیوی کی حیثیت میں قبول نہیں کریں گے۔ تم نہیں جانتے' وہ میرے ابا جی اور اماں کو کس نظر سے دیکھتے ہیں' ابا جی بے چاروں کا تو دنیا میں شاید ہے ہی کوئی نہیں۔ اماں میراثیوں کی اولاد ہیں۔ تمہارے والد کی حیثیت بہت اونچی ہے۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتے ہوں گے کہ قسمت ان کے ساتھ ایسا ظالمانہ مذاق کرے گی کہ ان کے کسی بیٹے کا رشتہ ابا جی اور اماں کی بیٹی سے جڑ گیا ہو گا۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہو سعدیہ باؤ۔" کھاری رونا دھونا بھول گیا۔ "بلال صاحب نے تو چودھری صاحب کا بڑا شکریہ ادا کیا ہے کہ انہوں نے میری شادی بھین جی اور مولی جی کی بیٹی سے کرادی۔ وہ کہتے ہیں ایسی تربیت کوئی اور نہیں کر سکتا ہے اپنی بیٹی کی۔"

سعدیہ کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"وہ تو تمہیں ملنے کے لیے ادھر آنے ہی لگے ہیں۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"اور اگر وہ راضی نہ بھی ہوتے تو سعدیہ کیا تم نے کھاری کو اتنا ہلکا سمجھ لیا تھا کہ امیر کبیر باپ کو دیکھ کر کھاری اپنا راستہ بدل لیتا۔ کھاری قول کا بندا ہے سعدیہ باؤ! اس نے تمہارے ساتھ قول کا رشتہ باندھ رکھا ہے' روپیہ پیسہ اس قول کے سامنے کیا حیثیت رکھتا ہے۔"

کھاری کہہ رہا تھا اور سعدیہ کو ایسا لگ رہا تھا اس کے سینے پر دھرا بھاری پتھر کسی نے اٹھا کر دور پھینک دیا تھا۔ روشن دن کی چمک میں بھی اس کے اردگرد ستارے اتر رہے تھے، وہ دن میں بھی آنکھیں موند کر اپنے خوابوں کی دنیا میں جا سکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"چندر شیکھر واپس چلا گیا کیا؟" سعد نے نادیہ سے پوچھا جو چھٹی کے دن ہفتہ واری صفائی میں مصروف تھی۔
"ہاں!" نادیہ نے مختصر جواب دیا۔
"پیلسنکی گیا ہے کیا؟"
"نہیں، وہ ہندوستان گیا ہے، کسی ہندوستانی لڑکی سے شادی کرنے کا ارادہ لے کر۔" نادیہ نے ڈسٹر کو کوڑے دان میں جھاڑتے ہوئے کہا۔
"اچھا!" سعد نے نادیہ کے چہرے کے تاثرات جانچنے کی کوشش کی لیکن نادیہ کا چہرا بے تاثر تھا۔
"تمہیں کیسا لگ رہا ہے اس کا ارادہ جاننے کے بعد؟"
"مجھے کیسا لگنا چاہیے۔" نادیہ نے کام میں مصروف ہاتھ روکتے ہوئے پوچھا۔
"کیا تمہیں نہیں لگتا، چندر شیکھر ایسے لوگوں میں سے ہے جن کے بارے میں دل چاہتا ہے ان کا ہماری زندگیوں میں قیام دائمی ہو جائے؟" سعد نے سوال کیا۔
نادیہ ڈسٹر ہاتھ میں پکڑے کچھ دیر اس کی طرف دیکھتی رہی اور پھر اس نے اپنا رخ دوسری طرف موڑ لیا۔
"میں ایسی کوئی بات اس لیے نہیں سوچتی کہ میری زندگی میں لوگوں کا آنا جانا لگا ہی رہتا ہے، کسی کا قیام بھی دائمی نہیں ہوگا۔"
"کیوں تمہیں کیسے معلوم کہ ایسا ہوگا، ضروری تو نہیں کہ۔۔۔"
"ضروری ہے بلکہ یقینی ہے۔" وہ دوبارہ کام میں مصروف ہو چکی تھی "ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا چلا آتا ہے اس لیے میں نے خوش فہمیوں میں مبتلا ہونے کی عادت ہی نہیں ڈالی خود کو۔"
"اور پھر بھی تم خوش ہو؟" سعد نے سوال کیا۔
"ہاں پھر بھی میں خوش ہوں، خوش رہنے کے لیے میرے پاس اور بہت سی وجوہات ہیں۔" اس نے ڈش واشر کھول کر اس میں برتن رکھتے ہوئے جواب دیا۔
"مثلاً۔۔۔؟"
"مثلاً" وہ ڈش واشر بند کر کے اس کی طرف پلٹی۔ "میری حالیہ زندگی جس میں میں مصروف اور مگن ہوں۔۔۔"
"تم قرآن پاک پر اور اسلام کی تاریخ پر تحقیق کر رہی ہو، تمہاری کوئی خاص سماجی زندگی نہیں ہے، تم مخصوص وقتوں میں مخصوص کاموں میں مصروف رہتی ہو یا پھر فارغ وقت میں مسلسل عبادت کرتی ہو۔ کیا مجھے تمہیں یاد دلانا پڑے گا کہ ہمارے مذہب میں راہباؤں والی زندگی کا کوئی تصور موجود نہیں۔۔" سعد نے کہا۔
"پتا نہیں۔" نادیہ نے سر جھٹکا۔ "مگر جو بھی ہے، میں اس زندگی میں خوش ہوں۔"
"مگر میں تمہاری اس زندگی سے خوش نہیں ہوں۔" سعد نے کہا "اگر تمہاری نظر میں کوئی لڑکا ہے جو تم سے اور تم اس سے شادی کر کے خوش رہو گی تو مجھے بتاؤ، ورنہ میں خود تمہارے لیے کوئی مناسب لڑکا دیکھتا ہوں۔"
"اوہو!" نادیہ ہنس دی "تم خود ڈھونڈو گے میرے لیے زندگی کا ساتھی۔"
"ہاں بالکل!" سعد اس کے انداز پر حیران ہوا۔
"یوں اس ایک کمرے کے فلیٹ میں بیٹھے بیٹھے پوری دنیا سے کٹے ہوئے تم میرے لیے زندگی کا مناسب ساتھی ڈھونڈو گے۔" وہ مذاق اڑانے لگی۔
"بہتر ہوگا تم مجھے چیلنج مت کرو، کہیں ایسا نہ ہو اسی ایک ہفتے میں، میں لڑکا لا کر تمہارے سامنے کھڑا کر دوں اور تمہیں اس سے نکاح پڑھوا لینے پر مجبور کرنے لگوں۔" سعد نے سنجیدہ نظر آنے کی کوشش کی۔

"چلو یونہی سہی۔" وہ ہنوز مذاق کے موڈ میں تھی۔ "ایک نہیں تم دو ہفتے لے لو، چیلنج ہے تو چیلنج ہے۔۔۔"
"ضرور" وہ مسکرا کر بولا "لیکن پھر تمہیں بلا چون و چراں میری بات ماننی پڑے گی۔۔۔"
"فکر مت کرو، مجھے تم پر پورا بھروسا ہے۔" وہ بہت دنوں بعد ہلکے پھلکے موڈ میں آئی تھی اور اسے اس مسلسل مذاق میں مزا آ رہا تھا۔
"لیکن اگر ہفتے دو ہفتے میں چیلنج پورا ہو گیا اور تم نے میرا نکاح پڑھوا دیا تو اس کے بعد تم کیا کرو گے، بالکل اکیلے نہیں رہ جاؤ گے۔" رات کا کھانا کھاتے ہوئے اسے اچانک دن میں ہونے والی بات یاد آگئی تھی اس نے اسے دوبارہ چھیڑ دیا۔
"اچھا ہے نا، اکیلا پڑا تمہیں یاد کرتا رہوں گا، تمہیں چھینکیں آ آ کر زکام لگ جائے گا۔" وہ مسکرایا۔
"مجھے یاد کرتے رہو گے، کسی اور کو نہیں۔" وہ شرارت سے مسکرائی۔
"کسی اور کو، کس کو؟" وہ چونکا۔
"تم جانتے ہو، میں ماہ نور کا ذکر کر رہی ہوں، وہی ماہ نور جس کی یاد تمہیں رات بھر سونے نہیں دیتی۔"
"تم سے کس نے کہا؟" وہ یک دم انجان نظر آنے لگا۔
"مجھے کسی کا کہا سننے کی ضرورت کہاں ہے، میں تمہیں خوب جانتی ہوں۔" وہ پورے یقین کے ساتھ بولی تھی۔
"ہاں وہ میرے وجود کا حصہ تھی، ہے اور ہمیشہ رہے گی۔" وہ اچانک بولا تھا، نادیہ کو اس سے ایسے کھلے اعتراف کی توقع نہیں تھی۔
"لیکن اس کی زندگی کا حصہ بننا میری قسمت میں نہیں تھا۔ میری ذاتی زندگی کے عظیم المیے نے اس کے چہرے کو اجنبی چہروں کے ہجوم میں کہیں گم کر دیا ہے۔ اب میں چاہوں بھی تو اسے تلاش نہ کر پاؤں گا۔" وہ کہے چلا جا رہا تھا۔
"جو اتنے عزیز ہوتے ہیں، وہ یوں اتنی آسانی سے گم نہیں ہو جاتے، ہجوم میں لاکھ اجنبی چہرے ہوں، ایک شناسا چہرے کی تو بس ایک جھلک نظر آ جانا ہی کافی ہوتی ہے، انسان اس شناسا چہرے تک خود بخود پہنچ جاتا ہے۔" نادیہ کہہ رہی تھی۔
وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا نہ ہی اس نے نادیہ کی بات کا جواب دیا تھا۔
"اپنی انا کو راستے کا پتھر مت بناؤ سعد، پلٹ کر دیکھنے میں، آدھے راستے سے واپس لوٹ جانے میں، خود سے پکار لینے میں، اپنی حماقت کا اعتراف کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔ محبت اتنی بے مول چیز نہیں کہ اسے اتنی چھوٹی باتوں کے ہاتھوں پر ہاتھ سے گنوا دیا جائے۔"
"شاید وہ ایک واہمہ تھا محبت نہیں۔" وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔ "ایک وقتی جذبہ۔ جب ہی تو اس میں تڑپ پیدا ہوئی نہ پکارنے کا حوصلہ اور نہ تو اور براہ راست اظہار کا موقع بھی نہیں ملا۔ شاید وہ محبت تھی ہی نہیں۔" اس نے نادیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہو ذرا کہ وہ محض واہمہ تھا۔" نادیہ نے کہا۔ "آج مجھے تو یہ بتا ہی دو کہ ڈیڈی والے انکشاف نے تمہیں زیادہ مغلوب کیا یا ماہ نور کو کھو دینے کے احساس نے؟"
"دونوں کے درمیان ایک عجیب سا ربط ہے۔ ڈیڈی والا انکشاف غیر متوقع تھا اور میرا اس پر ردعمل اس سے بھی زیادہ غیر متوقع۔ میں نے اپنی زندگی کی ہر قیمتی شے اس آزمائش میں ہار دی۔ مجھے اپنی اس تہی دامنی پر زندگی بھر افسوس رہے گا۔" اس رات شاید وہ اعتراف کے موڈ میں تھا۔
"یہ دنیا بہت چھوٹی ہے۔" نادیہ نے میز پر دھرے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں یقین دلاتی ہوں یہ دنیا انتہائی چھوٹی ہے۔" سعد نے دیکھا ایسا کہتے ہوئے نادیہ کی آنکھوں میں اس کے لیے محبت کی جوت چمک رہی تھی جیسے اس کا بس نہ چل رہا ہو کہ وہ سعد کے حصے کی ساری خوشیاں اس کے قدموں میں ڈھیر کر دے۔
"سب کچھ گنوا کر اس سچی اور بے مثال لڑکی کی محبت باقی رہ جانا بھی غنیمت ہے۔" اس نے سوچا اور مسکرایا۔

☼ ☼ ☼

"پتا نہیں کیوں مجھے پہلے ہی لگتا تھا کہ وہ تمہارے ساتھ جانے سے انکار کر دے گا۔" فلزا نے آنکھوں سے چشمہ ہٹا کر

اخبار میز پر رکھتے ہوئے بلال سلطان سے کہا۔

"تم نے زندگی میں شاید ہی کبھی کوئی اچھی بات سوچی ہو۔" بلال نے جھنجلا کر جواب دیا۔ "سچ سچ بتاؤ تمہاری زبان پر سیاہی کا کوئی داغ تو نہیں۔"

"ایسا اس لیے ہے کہ میں دل سے نہیں دماغ سے سوچتی ہوں۔" فلزا کا موڈ خراب ہونے لگا۔

"ہاں جب ہی تم اس نوزائیدہ بچے کو بس اسٹاپ پر مرنے کے لیے چھوڑ آئیں' اس لیے کہ تم دل سے نہیں دماغ سے سوچتی ہو۔"

"زندگی بھر کا واحد ایسا کام جس پر میں تم سے بہت شرمندہ ہوں' میری وجہ سے تمہارا بہت بڑا نقصان ہو گیا۔" فلزا کی آواز پست ہو گئی۔

"میں بظاہر کتنا بے حس' اور خود غرض لگتا ہوں... لگتا ہوں نا!" بلال سلطان نے سوال کیا۔ فلزا نے نظر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا' وہ اپنے ماضی کی طرح آج بھی ویسے ہی دلکش تھے۔ کنپٹیوں پر موجود سنہرے بالوں اور پیشانی پر ظاہر ہوتی بڑھتی عمر کی چند لکیروں کے سوا ان میں کچھ زیادہ فرق نہیں آیا تھا۔

"شاید دوسروں کو تم لگتے ہو لیکن مجھے نہیں لگتے' اس لیے کہ میں جانتی ہوں تم بے حس ہو نا ہی خود غرض۔" فلزا نے سچائی کے ساتھ جواب دیا۔

"اور وہ دن یاد کرو جب تم نے اپنا پورٹ فولیو میرے منہ پر مارتے ہوئے مجھ سے کہا تھا کہ مجھ ایسا خود غرض' بے حس' پتھر دل اور سفاک آدمی تم نے کوئی دوسرا نہیں دیکھا۔" بلال سلطان ہلکا سا مسکرائے۔ ان کی مسکراہٹ میں عجیب سی اداسی تھی۔

"ہاں!" فلزا کی نظروں کے سامنے وہ منظر گھوم گیا۔ "اس لیے کہ اس وقت شاید میرا ذہن خاصا امیچیور تھا۔"

"کیا اب تمہارا ذہن میچیور ہو چکا ہے۔" بلال سلطان نے سوال کیا۔

"کل جب کھاری نے پہلے تم سے ملنے' تمہارے گلے لگنے سے انکار کر دیا اور "نہیں ہے یہ میرا باپ" کی گردان کرنے لگا تو مجھے ایسا لگا جیسے برسوں پہلے جو چھرا شہناز کے گلے پر چلا تھا اس کی اذیت اس اذیت سے کہیں کم ہو گی جو کل کھاری کے رد عمل پر تمہارے اندر اٹھی ہو گی۔" فلزا نے کہا اور بلال سلطان کی طرف دیکھا۔ ان کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ اس نے غور کیا ایک رات کے اندر اندر ہی ان کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے سے بن گئے تھے۔

"تم اگر سعد کا وہ پیغام پڑھ لو جو اس نے جانے سے پہلے میرے نام لکھا تھا تو شاید تمہیں لگے اس کے رد عمل میں جو اذیت میرے اندر اتری تھی' وہ اس سے کہیں زیادہ تھی جو کھاری کے رد عمل سے ہوئی۔ کھاری تو مجھ سے ناواقف تھا' سعد کو تو میں نے اپنے ہاتھوں سے پالا تھا' وہ تو قدم قدم پر میرے ساتھ رہا تھا۔ چوہدری سردار کی ادھوری انفارمیشن' تمہاری ادھوری پینٹنگز اور ماہ نور کی خالاؤں کی ادھوری گفتگو' سب ادھورے میں سے ایک مکمل نتیجہ اخذ کرنے میں اس نے ذرا دیر نہیں لگائی اور اس مکمل نتیجے کے ذریعے اسے مجھ سے بدظن ہونے میں اس سے بھی کم وقت لگا' میں تو اس بدظنی کا سامنا کرنے کے بعد بھی زندہ رہا۔" وہ تلخی سے مسکرائے۔ "ثابت ہوا کہ میں واقعی خاصا بے حس اور بے نیاز ہوں۔"

"سعد تم سے جتنی شدید محبت کرتا ہے' یہ رد عمل اسی محبت کا مظہر ہے۔ ایک انتہا کا فطری رد عمل دوسری انتہا ہے۔ کیا تمہیں اس انتہا کو دیکھ کر تسلی نہیں ہوئی کہ اس کی تم سے محبت کی شدت کیا ہے؟" فلزا نے کہا۔ "میرے اسٹوڈیو کو دیکھنے کی خواہش میں تمہیں جاننے کی خواہش پنہاں تھی۔ میرے اسٹوڈیو میں موجود وہ لیسٹ جو میں نے کسی زمانے میں تمہارا بنایا تھا دیکھنے کی خواہش میں اس نے اپنا ہاتھ زخمی کر لیا' تمہیں جان لینے کے جنون نے اسے میری ڈونائٹ ان ہیون والی پینٹنگ مجھ سے مانگ لینے پر مجبور کیا۔ کیا اس سارے عمل میں تمہیں اس کی تم سے محبت کی شدت نہیں نظر آتی۔"

"مگر اس کا نتیجہ کیا نکلا' جان لینے کا جنون' نفرت کے خونی سمندر میں جا کر ڈوب مرا۔ ایک انتہا دوسری انتہا کی طرف اتنی تیزی سے مڑی کہ اس نے درمیان میں رک کر مجھے کسی کٹہرے میں کھڑا کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔"

بلال کے چہرے پر کرب تھا۔ فلزا کو سمجھ میں نہیں آیا وہ بلال کی اس بات کا جواب کیا دے۔

"ثابت ہوا کہ مجھ سے زیادہ ناکام کوئی دوسرا شخص دنیا میں نہ ملے شاید۔ میں نے سعد کو جس کرب سے بچانے کے لیے

اسے اس کی ماں کے تذکرے سے دور رکھا اس کرب نے اسے کسی اور ہی رنگ میں آلیا۔ میں نے اپنی اس بیٹی سے جس کی ماں اسے مجھ سے یہ کہہ کر چھین کر لے گئی کہ وہ میری بیٹی ہی نہیں' جدائی اس لیے گوارا کر لی کہ بیٹی ماں کے جھوٹ اور سچ کے درمیان پس کر خود اپنے آپ سے نفرت نہ کرنے لگ جائے۔ میری وہی بیٹی نہ ماں کی رہی نہ میری' اب نجانے کہاں کس حال میں جیتی ہو گی۔"

"اوہ۔" فلزا چونکی۔ "وہ کون تھی؟"

"تھی ایک۔" بلال نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ "انسان خطا کا پتلا ہے اس بچی کی ماں نے دعوا کیا کہ وہ میری بچی ہی نہیں تھی' میری مردانگی کے لیے اس سے بڑی چوٹ اور کیا ہو سکتی تھی۔ میں نے اسے بچی لے جانے دی' حالانکہ میں سچ یا جھوٹ جاننے کے لیے بہت سے طریقے اپنا سکتا تھا' مگر میں پہلے ہی ایک بن ماں کا بچہ پال رہا تھا' بن ماں کی ایک اور بچی پالنے کا حوصلہ اس احساس کے ساتھ نہ کر پایا کہ ہو سکتا ہے' اس کی ماں کا دعوا سچا ہو۔ اس دعوے نے دنیا کے ہر رشتے سے میرا اعتبار ختم کر دیا تھا۔ میں نے خود پر بے حسی کی چادر اوڑھ لی اور خود کو حیثیت کے ملمع کے حصار میں بند کر لیا۔ آج یاد کرنے بیٹھتا ہوں تو سوچتا ہوں اس بچی کے ساتھ میں نے ایسا کیوں ہونے دیا۔ بھولنے سے بھی کوئی واقعہ ایسا یاد نہیں آتا جو اس کی پیدائش سے پہلے اس کی ماں کی کسی بے وفائی کا شک ڈالتا ہو' لیکن میں نے خود کو اولاد کے معاملے میں اتنا بد قسمت تسلیم کر لیا تھا کہ ہر انہونی کو ہو جانے دیا اور وہ بچی خود سے جدا کر ڈالی۔"

"اوہ میرے خدا!" فلزا پریشان ہوتے ہوئے بولی۔ "اب کہاں ہے وہ؟"

"پتا نہیں۔" وہ ٹرانس کی کیفیت میں بولے۔ "سعد کا اس کے ساتھ رابطہ رہتا تھا اور وہ مجھے بتانے کی کوشش بھی کیا کرتا تھا' مگر میں یوں سنتا جیسے وہ کسی اجنبی کا ذکر کر رہا ہو....."

"کیوں؟"

"اس لیے کہ میرا دل اس کو تسلیم کرنے پر مائل ہی نہیں ہوتا تھا۔ میں اس کی ماں کے دعوے کو بھلا ہی نہ پاتا تھا۔ انسان کی خود ساختہ انا اس سے ایسی حماقتیں نہ کروائے تو کیا وہ انسان ہی خسارے میں رہے جیسے میں رہا۔"

"اور اب یہ کھاری!" فلزا کو بلال کا دکھ اپنے دل پر چھاتا محسوس ہوا۔ "یہ تمہارے ساتھ جانے سے انکاری ہے۔ کیونکہ تم اسے اجنبی لگتے ہو' وہ اس ماحول' اس فضا سے مانوس ہے' وہ یہاں سے کہیں اور جانا نہیں چاہتا۔"

"وہ ایسا نہ کرتا تو مجھے حیرت ہوتی۔" بلال نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "وہ جو کہہ رہا ہے' ٹھیک کہہ رہا ہے' مگر شکر ہے' اس نے وہ نہیں کیا جس کی مجھے توقع تھی۔ کل رات وہ میرے گلے لگا۔ میرے سینے پر سر رکھ کر بیٹھا رہا۔ اس نے میری پیشانی اور میرے ہاتھ چومے۔ میرے گھٹنے دبائے اور مجھے "ابا جی" کہہ کر پکارا' ایسے تو کبھی سعد نے بھی نہیں کیا۔ برسوں بعد مجھے لگا جیسے میرے اندر بھڑکتی آگ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے پڑے ہوں۔ میرے بے چین وجود میں سکون کی ٹھنڈک اتر رہی ہو۔"

"مگر تمہیں اسے دیکھ کر افسوس تو ہوتا ہو گا' تم بھول کر بھی کبھی اپنے بیٹے کو ایسا نہ دیکھنا چاہتے جیسا وہ بن چکا ہے۔"

"میں نے کہا نا' ہر چیز کا "اختیار" اللہ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو انسان تو بڑا ہی سرکش اور بے مہار مخلوق ہے۔" بلال نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"اور کھاری کی دلہن جو مولوی صاحب اور رابعہ کی بیٹی ہے' تم رابعہ کی فیملی کے متعلق کچھ مشکوک ہونا۔" فلزا ان سے ہر سوال اس روز ہی کر لینے پر تلی ہوئی تھی۔

"وہ بھی میرا واہمہ تھا۔ ذات اور حسب نسب نہ تو انسان نے خود بنائے نہ ہی خود بنانے کا اختیار اس کے پاس ہے۔ لیکن پھر بھی انسان نے انہیں اپنے لیے فخر اور شرم کا ذریعہ بنا لیا۔ میرا کیا کمال ہے کہ میرا تعلق ایک اعلا نسب خاندان سے ہے اور رابعہ کا کیا قصور ہے کہ وہ اس خاندان سے ہے جسے معاشرے نے استہزاء کا نشانہ بنا رکھا ہے۔ افسوس میں رابعہ کے لیے ایسا سوچتا رہا۔ سراج سے وفا کر کے اور شہناز سے وہ سب سیکھ کر جو میں اس سے نہ سیکھ پایا' رابعہ نے ثابت کر دیا کہ وہ مجھ سے کہیں بہتر انسان ہے۔ کھاری جیسے معصوم اور بھولے بھالے لڑکے کے لیے رابعہ کی بیٹی سے بہتر انتخاب کیا ہو گا اور اب اس انکشاف کے بعد کہ کھاری شہناز کا بیٹا ہے۔ تم دیکھنا ان تینوں کی کھاری سے محبت کا رنگ کیا ہوتا ہے۔"

"عجائب خانہ۔ یہ دنیا ایک بہت بڑا عجائب خانہ ہے۔" فلزا نے بلال کی ساری باتیں سن کر کہا۔ "سمجھ میں نہیں آتا' نظر آتے کس منظر پر یقین کیا جائے کس پر نہیں۔"

"تم تو ایسا مت کہو' تم تو دل سے نہیں دماغ سے سوچتی ہو تمہارا وژن تو اچھا بھلا میچیور ہو چکا ہے۔" بلال ہلکا سا مسکرائے اور پھر سنجیدہ ہو گئے۔

"میں معذرت خواہ ہوں فلزا! میں اپنے لیے تمہارے جذبات کا مثبت جواب کبھی نہ دے سکا۔"

"اس میں تمہارا کیا قصور' ضروری تو نہیں جیسے میں تمہارے لیے سوچتی تھی ویسا ہی تم بھی میرے لیے سوچتے۔" فلزا ہونٹ بھینچ کر مسکرائی۔ "اور معذرت خواہ تو مجھے ہونا چاہیے میں نے انجانے میں دوبار تمہارے بہت بڑے نقصان کردیے۔ دونوں بار میں ہی تمہارے بیٹے تم سے جدا کردینے کا باعث بن گئی۔"

"تم بدنیت نہیں تھیں اسی لیے دیکھ لو۔ ماہ و سال کیسے مجھے واپس اپنے بیٹے کے پاس لے آئے۔" بلال نے اس کی شرمندگی کم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اور سعد؟" فلزا نے سوال کیا۔

"سعد!" وہ مسکرائے۔ "اس کی تم فکر مت کرو' وہ مجھ سے زیادہ اب کسی اور کے دل کا معاملہ بن چکا ہے۔"



"ماہ نور! شاید تم کبھی بھی بڑی نہیں ہو گی۔"

"اور شاید میرے بوڑھے ہو جانے تک آپ کا میرے بارے میں یہ ہی خیال رہے گا۔ ممی۔"

"ہاں جیسے تمہارے بڑھاپے تک میں دنیا ہی میں بیٹھی ہوں گی۔"

"دیکھ لیجئے گا آپ کو عمر خضر عطا ہونے والی ہے۔"

"بکواس بند کرو اور یہ جو کر کے تم نے گولا بنا کر بیگ میں ٹھونسا ہے اسے نکال کر ٹھیک طریقے سے تہہ لگا کر رکھو۔"

"اُفوہ ممی! طریقے سے کپڑے رکھنے سے وہ بیگ میں کبھی بھی پورے نہیں آئیں گے۔"

"تم رکھ کر دیکھو جتنے رکھنا چاہتی ہو' اس سے دگنے آجائیں گے۔" فائزہ نے اس کے بیگ سے سارے کپڑے نکال کر بیڈ پر پھینکتے ہوئے کہا۔

"ہائے ممی! سارے کپڑے نکال دیے اتنی مشکل سے سیٹ کیا تھا بیگ۔" وہ چلائی۔

"سیٹ کیا تھا یا کاٹھ کباڑ کا ڈربا بنایا تھا' رکو میں نے تمہیں رکھ کر بتاتی ہوں بیگ کیسے تیار کیے جاتے ہیں۔" فائزہ نے کہا۔

"ارے بھئی' یہ کون کدھر جارہا ہے۔" فاطمہ جو ماہ نور کے ہاں تازہ اترے کینو دینے آئی تھیں' اس چیخ پکار کو سن کر اندر آتے ہوئے بولیں۔

"کون جاسکتا ہے ان محترمہ کے علاوہ۔" فائزہ نے منہ بنا کر کہا۔ "جارہی ہے اسلام آباد۔"

"اسلام آباد۔" فاطمہ مسکرائی۔ "لڑکی تمہیں اس شہر سے کچھ زیادہ ہی عشق نہیں ہو گیا۔"

"عشق سے اگلی بھی اگر کوئی منزل ہے تو شاید وہ ہو گئی ہے۔" وہ بغیر جھجکے بولی اور فاطمہ کی لائی ٹوکری سے کینو نکال کر چھیلنے لگی۔

"آپ کے ہاں کوئی مہمان ٹھہرے ہوئے ہیں کیا فاطمہ آپا۔" فائزہ نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں میری ایک کزن آئی ہوئی ہے پیرس سے 'رئیسہ' نام ہے اس کا۔ بہت سالوں بعد آئی ہے پاکستان۔ اسے اپنے اس بھانجے سے ملنا ہے جس کی ماں کے حصے کی جائیداد پر عرصہ پہلے اس نے ناجائز قبضہ کرلیا تھا۔ اب اچانک ضمیر جاگا ہے' مجھ سے بات کی' میں نے کہا تو آؤ اور حق دار کو اس کا حق دے دو' آخرت سنوار لو اپنی۔"

"تو اس کے بھانجے سے ملتی رہتی ہیں کیا آپ' کیا بہت بڑی جائیداد ہے کزن کے پاس جو حصہ دینے کا خیال آگیا۔"

"ایسی ویسی۔ بڑی پیرس میں شاندار مینشن کی مالک ہیں اور ادھر بھانجے صاحب بھی کم مال دار نہیں بس مایا کو مایا ملنے

والی بات ہے۔ کیوں ماہ نور۔" فاطمہ نے معنی خیز نظروں سے ماہ نور کی طرف دیکھا۔

"مایا۔" ماہ نور نے کچھ سمجھے بغیر کہا۔ "یہ تو ہندو لڑکیوں کا نام نہیں ہوتا فاطمہ خالہ۔"

"اُفوہ یہ لڑکی۔" فائزہ نے اپنا سر پکڑ لیا۔ "آپ نے دیکھا' یہ کبھی سمجھ دار ہو گی نہ بڑی ہو گی۔" انہوں نے فاطمہ کی طرف دیکھا۔ "اسے محاورے تک نہیں آتے۔"

"یہ بڑی سمجھ دار ہے' تم دیکھتی جاؤ' یہ کیا کرتی ہے۔" فاطمہ نے مسکرا کر کہا۔

"دیکھتے ہیں' کیا کرتی ہے' ایک تو اس کے بابا کو اس سے بڑی توقعات ہیں۔ دوسرے آپ کو دیکھیے پہلے کون لیٹ ڈاؤن ہوتا ہے۔" فائزہ نے کہا اور ماہ نور کا بیگ سیٹ کرنے لگیں۔



"ہاں بھئی سعد! یہ رئیسہ سے بات کرلو۔ بے چاری برے انجام سے ڈرتی تمہیں ڈھونڈتی پاکستان آپہنچی' اسے کیا معلوم تم وہیں کہیں بیٹھے ہو یورپ میں۔" فاطمہ خالہ نے اس کا وہ نمبر محفوظ کر رکھا تھا جس پر یہاں آنے کے بعد اس نے ایک مرتبہ کال کی تھی۔

"میں ان سے بات کر کے کیا کروں گا فاطمہ خالہ۔"

"ارے بھئی رئیسہ تمہاری خالہ ہے' تمہاری مرحومہ ماں کی سگی بہن' ماں کی بہن سے ماں جیسی خوشبو ہی تو آتی ہے نا۔"

"ماں کی وہ بہن جس نے انہیں اس وقت چھوڑ دیا جب وہ برے حالات میں تھیں۔"

"ہاں۔ بس اسی بات کا تو غم کھائے جاتا ہے اب اس کو' بے چاری شوگر اور آرتھرائٹس کی مریضہ ہے' میں تو اسے دیکھ کر حیران رہ گئی' بہترین لیونگ اور سپر کلاس علاج کے باوجود لگتا ہے جیسے اس کی ہڈیاں بھی گھل رہی ہوں۔"

"اچھا ٹھیک ہے میں کرلوں گا ان سے بات' آپ نے ہی بتایا ہو گا انہیں میرے بارے میں۔ ہے نا۔"

"ہاں بالکل۔"

"مگر سچ یہ ہے کہ اپنی ماں کے حوالے سے آپ اور خدیجہ خالہ مجھے زیادہ عزیز ہیں۔ شاید آپ دونوں کے علاوہ خاندان بھر میں وہ کسی کو یاد بھی نہ ہوں۔"

"بس بیٹا! چھوٹے چھوٹے گلے شکووں میں نہ پڑو۔ جس وقت انسان جوان اور طاقت ور ہوتا ہے' اسے غلط صحیح کا اندازہ نہیں ہو پاتا' معاف کردینا چاہیے' کیونکہ معاف نہ کرنے سے تمہیں کوئی فائدہ تو ہونے والا نہیں۔" فاطمہ گلوگیر ہوئیں۔

"تو بات کرلو۔"

"ہاں۔ لیکن فاطمہ خالہ! ایک منٹ۔۔۔ ایک بات بتادیں پہلے۔"

"ہاں پوچھو۔"

"وہ۔۔۔" وہ پوچھتے ہوئے تھوڑا جھجکا۔ "آپ کے ہمسائے میں کیا چل رہا ہے آج کل۔"

"ہمسائے میں۔" فاطمہ کا لہجہ اچانک کھنکھنانے لگا۔ "آج صبح ہی گئی تھی میں ان کی طرف' سامان باندھ رہی تھیں دونوں ماں' بیٹیاں۔ ماہ نور واپس اسلام آباد جارہی ہے اپنا کورس مکمل کرنے۔ بڑے لائٹ موڈ میں تھیں دونوں' نوک جھونک جاری تھی دونوں میں جب میں گئی۔"

فاطمہ خالہ کی آواز سن کر اسے لگا تھا اس کے اور پاکستان میں موجود لوگوں کے درمیان فاصلے یک دم سمٹ گئے ہوں' مگر فاطمہ خالہ کی اس بات نے اچانک وہ فاصلے درمیان میں دوبارہ لا کھڑے کیے تھے' اس کا دل بجھنے لگا اور اسی بجھے دل کے ساتھ اس نے ان خاتون سے بات کی جو اس کی ماں کی سگی بہن تھیں' وہ اسے کنٹری سائیڈ میں موجود اس گھر کی بابت بتا رہی تھیں' جس کی مالیت نجانے کتنے پاؤنڈز تھی اور وہ اس کی ملکیت اس کے نام منتقل کرنا چاہتی تھیں۔ نیویارک میں ایک ریسٹورنٹ اور پیرس میں ایک مینشن' اس کے علاوہ ایک بڑا بینک بیلنس۔ وہ ان کی باتیں سنتا رہا۔ اسے اس اچانک ہاتھ

تکنے والے جیک پاٹ میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس ساری دولت کی قانونی مالک ہوتے ہوئے بھی اس کی ماں نے اللہ جانے کیسی کسمپرسی کی زندگی گزاری تھی اور یہ ساری دولت دوسروں کے اکاؤنٹس میں پڑی رہی تھی' اپنی ماں کی بہن کے دکھ اور پچھتاوے اب اس کے کس کام کے تھے' جب زندگی کی بساط پر موجود سب سے مہرے اپنی اپنی جگہوں سے ہل چکے تھے۔

☼ ☼ ☼

"تم میرے بیٹے ہو' جو کچھ تمہارے اور میرے ساتھ ہوا۔ کیا ہم اس کو بھلا نہیں سکتے۔" بلال سلطان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ کھاری سے کس سلیس زبان میں بات کریں جو وہ ان کی بات سمجھ سکے۔ جواب میں وہ سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔

"آپ پریشان نہ ہوں' کھاری پر یہ سب انکشاف اچانک ہوئے ہیں' یہ آہستہ آہستہ سمجھ جائے گا اور سنبھل بھی جائے گا۔" کھاری کے بجائے اس چھوٹی سی لڑکی نے جواب دیا تھا جو سراج سرفراز اور رابعہ کی بیٹی اور کھاری کی بیوی تھی۔

"تم اس چھوٹی سی عمر میں بھی بہت سمجھ دار ہو۔" انہوں نے بے اختیار تعریف کی۔ "میں نے سنا ہے' تمہیں پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ میں تمہیں جہاں کہو گی' داخلہ کرواؤں گا۔ تم جتنا دل چاہے پڑھنا۔"

"اچھا!" وہ مسکرائی۔ "اور کھاری..... یہ کیا کرے گا جو میں پڑھتی رہوں گی....."

"یہ..." انہوں نے کھاری کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "مجھے صرف ایک سے ڈیڑھ سال کا عرصہ چاہیے۔ وہ تم دے دو' اس کے بعد دیکھنا کھاری کس روپ میں تمہارے سامنے آتا ہے۔"

"او نہیں جی نہیں۔" خاموش بیٹھے کھاری کو یک دم جیسے کرنٹ لگا۔ "مینوں معاف کردیو اباجی۔" اس نے بلال سلطان کے سامنے ہاتھ جوڑے۔ "میں نہیں کوئی روپ بدلنا' میں اینج دا اینج ای ٹھیک آں....."

سعدیہ نے بلال سلطان کی طرف دیکھا' وہ کھاری کے رد عمل پر ان کا دکھ سمجھ سکتی تھی۔

"میں بوڑھا ہو رہا ہوں کھاری' اب اس عمر میں اگر تم مجھے مل ہی گئے ہو تو میرے بڑھاپے کا خیال نہیں کرو گے کیا؟ مجھے تمہاری ضرورت ہے' اب میں زندگی کا ایک بھی لمحہ تمہارے بغیر نہیں گزارنا چاہتا۔ میرے ساتھ چلو' میرے کاموں میں میرا ہاتھ تمہیں ہی بٹانا ہے۔ تمہارا بڑا بھائی تو روٹھ کر بیٹھ گیا مجھ سے۔" بلال سلطان نے آسان ترین الفاظ میں بات کرنے کی کوشش کی۔

"گل اے نہیں۔" کھاری نے ایک مرتبہ پھر ان کے سامنے ہاتھ جوڑے۔ "کہ میں آپ کی خدمت نہیں کرنا چاہتا۔ بات یہ ہے کہ مجھے جو کام آتا ہے' میں وہی کرسکتا ہوں۔ مجھ سے پھل تڑوالو' گاڑیاں لوڈ کروالو۔ مجھے کچھ اور کرنا نہیں آتا۔ میں چٹا ان پڑھ ہوں مجھے 'الف' 'بے' بھی نہیں آتی۔" بلال نے بے بسی سے کھاری کی طرف دیکھا۔

"تم میرے ساتھ چلو' میں تمہیں اس سے بڑا' اس سے زیادہ خوب صورت اور جدید ترین فارم ہاؤس بنا کے دوں گا' تم وہی کام کرنا جو تمہیں آتا ہے۔"

بلال سلطان کی یہ بات سن کر کھاری نے فوراً سعدیہ کی طرف دیکھا' جس نے سر ہلا کر بلال کے فیصلے کی تائید کی تھی۔

"پر اے پنڈ' یہاں کے لوگ' چوہدری صیب' چوہدرانی صابرہ بی بی' ماسی شیداں' ماسٹر کمال' بابے منگو دا میلہ!" وہ زیر لب بڑبڑایا۔

"تمہارا جب دل چاہے' آکر سب سے مل جایا کرنا اور رہے میلے ٹھیلے تو ان کی فکر نہ کرو تمہارے بھائی نے گھر میں پورے پاکستان میں ہونے والے میلوں کے سالانہ کیلنڈر اور روڈ میپس جمع کر رکھے ہیں جب بھی جہاں بھی جانا چاہو' تمہیں مشکل نہیں آنے والی۔"

"اور مولی صاحب اور بھین جی!" کھاری نے سوالیہ نظروں سے سعدیہ کی طرف دیکھا۔

"تمہارا خیال ہے' میں انہیں باقی کی عمر بھی اسی طرح گزارنے دوں گا۔" بلال سلطان مسکرائے۔ "ان دونوں سے

میری بات ہو چکی ہے۔ ان دونوں کے تو بہت سے قرض مجھ پر واجب ہیں' ابھی فوری طور پر تو دونوں حج کا ارادہ رکھتے ہیں لہٰذا یہاں سے واپسی پر اس کے انتظامات شروع ہو جائیں گے۔"

"اور سعد باؤ اور مہ نور باجی۔"

"ان کا کیا مسئلہ ہے اب؟" بلال سلطان نے پوچھا۔

"ان کا مسئلہ آپ نہیں جانتے۔ ان کا مسئلہ صرف میں جانتا ہوں....." کھاری نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔ "میرے سامنے میلے کے سائیں نے مہ نور باجی کو کہا تھا۔ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔۔۔ مہ نور باجی تو شدین (سودائی) ہو گئی تھیں۔ آپ کو کیا پتا..."

اس نے بلال سلطان کی طرف دیکھا۔ بلال سلطان جس روز سے فارم ہاؤس میں آئے تھے' پہلی بار دل سے مسکرائے تھے۔ وہ کھاری کے سینے میں چھپے راز سے بہت اچھی طرح واقف تھے۔

☼ ☼ ☼

"کہو کب تک رکے رہنے کا ارادہ ہے' چلنے کا بھی کوئی منصوبہ ہے یا نہیں ذہن میں۔" وودن زادے شرارت بھرے انداز میں اس سے پوچھ رہا تھا۔

"میں نے کہیں پڑھا تھا کہ اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے' انسان پر ایک در بند ہوتا ہے اللہ اس کے لیے کئی اور در کھول دیتا ہے' سمجھو' بس دوبارہ چلنے کا وقت آیا ہی کھڑا ہے۔" سعد نے نرمی سے جواب دیا۔

"تم نے کہیں پڑھا تھا....." وودن زادے نے حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ "جبکہ میں تو بغیر کہیں پڑھے ہی جانتا ہوں کہ ایک غیر مرئی طاقت ایسی ہے جو قدم قدم پر انسان کی مددگار رہتی ہے۔"

"تم بغیر پڑھے جانتے ہو تو اپنے نظریات کا زاویہ کیوں درست نہیں کر لیتے۔"

"میرے نظریات درست ہو رہے ہیں۔ زاویوں کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ تم کہو کب آ رہے ہو امریکا؟"

"بہت جلد....."

"امریکا میں رفاہی ادارے پہلے ہی سے ہیں بہت' تم یہاں آ کر لوگوں کے لیے مزید کیا کرو گے؟" وودن ایک مرتبہ پھر شرارت سے مسکرایا۔

"میں وہاں تمہارے لوگوں کے لیے نہیں خود اپنے لیے آ رہا ہوں وودن زادے' ایک چلتا ہوا ریستوران مزید چلانے۔"

"اوہ۔ پھر تو اللہ امریکیوں کے معدوں پر رحم کرے' تمہاری ذہنی رو تو کسی بھی وقت بھٹک جانے کے امکان موجود رہتے ہیں۔ مجھے ویری ڈیل سکی انگ مرکز کبھی نہیں بھولتا۔"

"باقی امریکیوں کو چھوڑو' تم اپنے معدے کا بیمہ کروا لو بس۔"

"اللہ نے مجھے ویسے ہی بچا لیا۔ میں امریکا چھوڑ کر ایران جا رہا ہوں عنقریب۔ مجھے لگتا ہے وہاں کی آب و ہوا مجھے راس آئے گی۔"

"اچھا۔" سعد چونکا۔ "لگتا ہے واقعی دنیا بھر میں بدلاؤ کا موسم آ چکا ہے' سب لوگ اپنے اپنے اصل کی طرف لوٹنے کے چکر میں ہیں....."

"مگر تم تو ایسا نہیں کر رہے نا۔ شاید تم تو اصل کے بجائے اجنبی اور پھر مزید اجنبی سرزمینوں کی طرف بڑھنا چاہتے ہو۔"

"یہ ہی تو بدلاؤ ہے شاید میرے لیے۔" وہ دھیمی آواز میں بولا تھا۔ وودن کے ساتھ اسکائپ پر ہونے والی یہ گفتگو اس کے دل پر مزید بوجھ ڈال گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

سعدیہ کو لگا' اسے اپنا کھلے کا کھلا رہ جانے والا منہ بند کرنے کے لیے اس پر اپنا پورا ہاتھ رکھنا پڑے گا۔ ایک عمر تک گاؤں سے باہر کسی چھوٹے یا بڑے شہر کی شکل تک نہ دیکھ سکنے والی لڑکی ایک ہی دن کے چند گھنٹوں کی مسافت کے بعد ملک کے دارالخلافہ میں پہنچ چکی تھی۔ اس گھر تک پہنچنے سے پہلے ہی شہر کی سڑکیں اور ان کے اردگرد کھڑی عمارتیں دیکھ دیکھ کر

ہی اس کا منہ آدھے سے زیادہ کھل چکا تھا۔

باقی کی کسر بلال سلطان کے گھر کے نظارے نے پوری کر دی تھی۔ اس محل نما گھر میں وہ کھاری کی بیوی اور بلال سلطان کی بہو کی حیثیت سے داخل ہوئی تھی۔ اس نے یہاں آتے ہوئے سنا تھا کہ یہ وہ گھر نہیں تھا جس میں بلال سلطان خود رہتے تھے۔ یہ گھر کھاری اور سعدیہ کے لیے لیا گیا تھا۔ یہاں کھاری کی وہ تربیت ہونا تھی جس کے بعد بلال اسے اپنے حلقہ احباب میں اپنے بیٹے کی حیثیت سے متعارف کروانے والے تھے۔

"کتنا پاگل ہے کھاری!" سعد نے منہ پر واقعی ہاتھ رکھتے ہوئے گھر کے در و دیوار کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ "آنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا' کس مشکل سے منایا سب نے اسے' آتے ہوئے بھی رو رو کر اپنا برا حال کر لیا' ساتھ میں گاؤں کے گاؤں کو رلا دیا۔ چودھری صاحب' چودھرانی بی بی' فارم ہاؤس کے سارے ملازم' گاؤں کے لوگ' سب ہی تو اسے رخصت کرتے ہوئے رو رہے تھے۔ اللہ توبہ۔ کتنی محبتیں ڈال رکھی تھیں اس نے سب سے۔" اسے گاؤں سے رخصتی کے منظر یاد آنے لگے۔

"لوگ اوپر سے رو رہے تھے' اندر سے تو جل مر رہے ہوں گے' بے چارہ کھاری اصل میں شہزادہ نکلا' کبھی اس گھر میں آ کر دیکھ لیں کہ کھاری کیسی کیسی چیزوں کا مالک بن چکا ہے تو سچ میں ہی ان کو دل کے دورے پڑنے لگ جائیں۔ سچ ہے بھئی اللہ بڑا بے نیاز ہے' چاہے تو بیٹھے بٹھائے چھپر پھاڑ کر دے دے' کھاری کو تو سمجھو بھاگ ہی لگ گئے۔ یہ بڑی سی گاڑی میں بیٹھ کر تو ہم یہاں پہنچے ہیں جس میں بیٹھ کر نہ تو دھکا لگتا ہے نہ ہی تھکن ہوتی ہے اور وہ بلال صاحب۔" اسے یاد آیا۔ "ان کا بس چلے تو ایک پل کے لیے بھی کھاری کو اپنی نظروں سے جدا نہ کریں۔ اتنا پیار دیا ہے انہوں نے کھاری کو اتنے سے دنوں میں کہ اس جیسا اڑیل گھوڑا بھی ان کے سامنے ہار مان گیا۔"

وہ گھر کے لاؤنج میں صوفے پر بیٹھی کمرے کی سجاوٹ دیکھتے ہوئے اوٹ پٹانگ باتیں سوچتی چلی جا رہی تھی۔

"سعدیہ' آؤ میں تمہیں تمہارا کمرہ دکھاؤں۔" کسی نے اس کے قریب آ کر کہا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا' پیازی جمپر اور بڑے بڑے شوخ پھولوں والی قمیص پہنے اس کے سامنے قلزا ظہور کھڑی تھی۔

ہائے سنا ہے یہ ہمارے ساتھ رہے گی' کھاری کو یہ ہی سکھائے گی۔ کیسا کرخت چہرہ ہے اس کا میں نے شکر کیا تھا سسر ملا' ساس نہیں' مگر یہ عورت تو لگتا ہے دس ساسوں سے بڑھ کر ثابت ہو گی' کتنی ہی دفعہ تو گاڑی میں بیٹھنے اٹھنے کے طریقے بتا چکی راستے میں.... سعدیہ سہم سی گئی۔

"ویسے تو یہ سارا گھر ہی تمہارا ہو گا' لیکن ایک کمرہ تو خالصتاً" تمہارا اور کھاری کا ہے۔ چلو دیکھتے ہیں اس کا انٹیریر کیسا ہے۔" قلزا نرمی سے بول رہی تھی۔ "اور آؤ تمہیں فضل حسین اور میمونہ بی سے بھی ملواؤں' وہ دونوں بھی آج ہی شفٹ ہوئے ہیں اس گھر میں۔ افتخار کو اردو اور روایتی ادب آداب وہ دونوں ہی سکھائیں گے۔"

"افتخار!" سعدیہ نے چونک کر دیکھا۔

"ہاں افتخار۔" قلزا نے سر ہلایا۔ "اب کھاری کو کوئی نہیں کہا کرے گا' تم بھی نہیں۔" اس نے بتایا۔ "اسے اس کے اصل نام سے پکارا جائے گا۔"

"اتنی پابندیاں۔" سعدیہ قلزا کی طرف دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ "یہ ہو گا' وہ نہیں ہو گا۔" اس کا دم الجھنے لگا۔ "چھوڑو" اس کا دل چاہا کہے "ایسے محل سے تو فارم ہاؤس کا وہ ایک کمرہ ہی بہتر تھا۔"

"افتخار کے ساتھ ساتھ تم بھی سب سیکھ جاؤ گی۔" قلزا جیسے اس کی الجھن سمجھ گئی تھی۔ "انسان ترقی کا سفر کرنے کا شوقین ہوتا ہے نا۔ اسے ہونا بھی چاہیے۔ مگر اس سفر میں مشکلیں بھی پیش آتی ہیں اور خود پر جبر بھی کرنا پڑتا ہے۔ مجھے یقین ہے کھاری کے اس سفر میں تم ہماری بہترین معاون ثابت ہو گی۔" وہ مسکرا رہی تھی۔

"خیر' یہ اتنی بھی بری نہیں جتنی دیکھنے میں لگتی ہے۔" سعدیہ نے ذرا سا مطمئن ہوتے ہوئے سوچا تھا۔

☼ ☼ ☼

"مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے تمہیں واپس ایک نارمل لڑکی کے روپ میں دیکھ کر۔"

سارا خان کی چین سے واپسی کے اگلے دن بلال سلطان سے ناشتے کی میز پر ملاقات ہوئی تھی۔

"یہ سب آپ کی وجہ سے ممکن ہوا۔" سارا نے ان کی طرف دیکھا "آپ فرشتوں جیسی صفات کے مالک ہیں۔"

"مجھے گناہ گار مت کرو بھئی۔" وہ معمول سے کہیں زیادہ مطمئن نظر آرہے تھے۔ "فرشتوں جیسی صفات انسان کو مل جاتیں تو دنیا کو دنیا نہیں جنت کہا جانے لگتا۔"

"میں اپنے تجربے کی بات کر رہی ہوں۔" سارا نے توس پر مارملیڈ لگاتے ہوئے جواب دیا۔ "میرے لیے تو یہ دنیا آپ ہی کی وجہ سے جنت جیسی ہوگئی۔"

"میری وجہ سے یا سعد کی وجہ سے؟" انہوں نے دفعتاً" کہا۔

"سعد!" وہ چونکی۔

"بھئی اگر میں سعد کا باپ نہ ہوتا تو مجھے تو شاید کبھی تمہارے بارے میں پتا بھی نہیں چلتا اور اگر مجھے اپنے بیٹے سے اتنی شدید محبت نہ ہوتی کہ اس کے سارے معاملات کو میں اپنے معاملات بنا لیتا تو تم تو اس کے چلے جانے کے یوں ہی چیزوں کا سہارا لیتی قدم قدم چلتی' لڑکھڑاتی زندگی ہی گزارے چلی جاتیں۔ مجھے کیا کسی کو بھی خیال نہ آتا کہ تمہاری مدد کرنی چاہیے۔"

وہ دم بخود بیٹھی ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔" انہوں نے کہا۔ "تمہیں اگر ممنون ہی ہونا ہے تو میری نہیں سعد کی ہو۔ اسی نے تمہیں اسپاٹ کیا تھا۔ کیوں نہیں کیا تھا کیا؟"

سارا نے اسی کیفیت میں ان کی طرف دیکھتے ہوئے سرہلایا۔

"مجھے تمہاری فٹنس اور ٹریننگ پوزیشن کی رپورٹس میل کردی گئی تھیں' یہ سپر کلاس رپورٹس ہیں۔ اے ون۔" انہوں نے موضوع بدل دیا۔

سارا نے مسکراتے ہوئے سرہلایا۔

"اب ایک دو دن میں تم نے یہ فیصلہ کرنا ہے کہ واپس سرکس رنگ میں کب داخل ہوگی تم؟" وہ کہہ رہے تھے۔ سارا پر جیسے کڑک کر آسمانی بجلی گری تھی۔

"سرکس رنگ۔" اس نے یوں کہا جیسے اس لفظ سے نابلد ہو۔

"ہاں بھئی سرکس رنگ۔" انہوں نے سرہلایا "اتنی اچھی فٹنس اور ٹریننگ کے بعد یوں ہی ہاتھ پر ہاتھ دھرے رکھ کر بیٹھے رہنے کا ارادہ ہے کیا۔" وہ ان کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

"اللہ نے جو نعمت تمہیں واپس کی ہے' اسے کام میں نہیں لاؤ گی کیا؟"

"لیکن میں نے تو سرکس رنگ میں واپس داخل ہونے کا کبھی سوچا بھی نہیں۔" وہ بڑبڑائی۔

"تو پھر زندگی کیسے گزارو گی؟ اپنی لیونگ کیسے مینج کرو گی۔" انہوں نے بے تاثر لہجے میں پوچھا۔

"آپ۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"میں... میرا کام تمہاری زندگی میں یہیں تک تھا بھئی۔ میں ایک پریکٹیکل انسان ہوں۔ بے عملی اور دوسروں پر انحصار کرکے بیٹھے رہنا مجھے ذاتی طور پر سخت ناپسند ہے۔ تمہاری صحت بحال نہ ہو پاتی یا کسی وجہ سے تم اتنی نارمل نہ ہو سکتیں تو میں ضرور عمر بھر تمہیں سپورٹ کرتا۔ لیکن اب تم ماشاء اللہ فٹ ہو' نارمل ہو تم نے زندگی کیسے مینج کرنی ہے مجھے بتاؤ۔ میں اس کے لیے تمہاری مدد کو حاضر ہوں گا۔ لیکن کرنا تو بہرحال تمہیں خود ہی ہے اب!"

وہ نیپکن سے منہ صاف کرکے اٹھ گئے اور اگلے لمحے وہ کمرے سے باہر جا چکے تھے۔ مگر اپنے پیچھے ناشتے کی میز پر بیٹھی سارا خان کے اردگرد وہ بہت سے سوال چھوڑ گئے تھے۔ آسمان پر اڑتے اڑتے اسے انہوں نے یکایک واپس زمین پر آجانے کا اشارہ دے دیا تھا اسے۔ سارا خان کو دوسروں پر انحصار چھوڑ کر خود اپنی طاقت اور ہمت کے بل پر زندگی گزارنا تھی۔ ان کی گفتگو کا لب لباب یہ ہی تو تھا۔

"رکو!" اس نئی صورت حال پر سوچتے سوچتے اچانک ایک نام اس کے ہونٹوں پر آیا۔ اس نے تیزی سے دائیں بائیں

دیکھا۔"

"یسی آنٹی!" اس نے بلند آواز میں کہا تھا اور ناشتہ ادھورا چھوڑ کر یسی آنٹی کو پکارتی ڈائننگ ہال سے باہر نکل آئی تھی۔



"کتنی عجیب سی بات ہے جیب میں چند پاؤنڈز ڈال کر تم آکسفورڈ اسٹریٹ میں خریداری کرنے چلی آئی ہوں' جب کہ خریدنا تمہیں کچھ بھی نہیں۔" سعد نے اپنے ساتھ چلتی نادیہ سے کہا جو ہلکی بارش سے بچنے کے لیے چھاتا سر پر تانے دائیں بائیں دیکھتی ہر اسٹور میں سجی چیزیں دیکھ رہی تھی۔

"ضروری تو نہیں کہ انسان خریداری نہ کرسکے تو بکنے والی اشیاء بھی نہ دیکھے" نادیہ نے چلتے چلتے رک کر کہا۔ اس کی نظریں سلفریجز سٹور کے چمکتے شیشوں کے پیچھے سجے آؤٹ فٹس پر رک گئی تھیں۔ سعد نے بھی رک کر اس کی نظروں کا تعاقب کیا۔

عرصے کے بعد جب تم پہلی بار مجھے اسی شہر میں ملے تھے تو تم نے مجھے اسی اسٹور سے کوٹ خرید کر دیا تھا' تمہیں یاد ہے نا!" نادیہ نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔

"کیا تم سمجھتی ہو کہ اب میں تمہیں اس جگہ سے خریداری نہیں کروا سکتا۔" سعد نے اسی انداز میں جواب دیا جیسے نادیہ بولی تھی "اگر تم ایسا سمجھتی ہو تو یہ تمہاری بھول ہے۔" وہ عین اس کے پیچھے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

نادیہ نے مڑ کر سعد کی طرف دیکھا۔ سیاہ پتلون پر اس نے سرمئی رنگ کا قیمتی رین کوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر نرمی تھی اور اس کے بال اس کے مخصوص انداز میں پیشانی پر بکھرے تھے۔ وہ اسے دیکھتے ہوئے مسکرا دی۔

"تم نے اس جگہ چلتے' آتے جاتے لوگوں کی اکثریت کو نہیں دیکھا۔" اس نے سعد سے سوال کیا' یہ سب صرف نظارہ کرنے ہی تو آئے ہیں۔ خریداری تو بہت کم لوگ کرتے ہیں یہاں سے۔"

"لیکن پھر بھی..." سعد نے کہنا چاہا۔

"پھر بھی کچھ نہیں۔" وہ مسکرائی "ہم یہاں صرف لوگوں اور اسٹور میں رکھی چیزوں کو دیکھنے آئے ہیں' ایک چھوٹی سی تفریح۔ اس کے بعد مارل برو اسٹریٹ کے اچھے سے انڈین ریسٹورنٹ سے کھانا کھائیں گے۔ مجھے یقین ہے' تم یہ ایک کھانا تو مجھے کھلا ہی سکو گے۔"

سعد نے مسکراتے ہوئے اپنی اس گڑیا جیسی بہن کو دیکھا جس کی نظریں اتنی شفاف اور پاک تھیں کہ اسے ان پر رشک آتا تھا۔

"چلو اب آگے چلتے ہیں۔" نادیہ نے اپنا رخ سیدھا کرتے ہوئے آگے قدم بڑھائے۔

نادیہ کا یہ ہلکا پھلکا انداز دیکھ کر وہ بھی اس مشہور زمانہ فیشن اسٹریٹ کے اسٹورز اور یہاں گھومتے پھرتے لوگوں کا نظارہ کرنے پر ذہنی طور پر تیار ہو گیا تھا۔ یہاں نظر آنے والے لوگوں کی اکثریت سیاح تھی۔ وہ مختلف چہروں کو دیکھتے ہوئے ان کی قومیت کا اندازہ کرتے ہوئے رین کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے نادیہ کے پیچھے چل رہا تھا۔ چلتے چلتے وہ آکسفورڈ سرکس تک پہنچ گئے۔

اور پھر جیسے اس کی نظر دھوکا کھا گئی اور ایک چہرے پر رک گئی تھی اردگرد چلتے لوگ' گاڑیوں اور بسوں کی آوازیں' بچوں کا رونا اور شور سب کچھ جیسے ساکت ہو گیا تھا۔ کائنات کا ذرہ ذرہ اپنی جگہ پر ٹھہر گیا تھا۔ سب کچھ پس منظر میں تھا' صرف وہ ایک چہرہ پیش منظر پر تھا۔

"جب میں تمہارے چہرے کو دیکھتا ہوں۔
اس میں ایک چیز بھی ایسی نہیں جسے تبدیل کیا جاسکے۔"

اس کے اردگرد برونو مارس کی آواز بازگشت کرنے لگی تھی۔ اسی دم اس چہرے نے مسکراتے ہوئے دائیں طرف دیکھا تھا۔ کائنات ایک مرتبہ پھر ساکت ہو گئی تھی۔

"اور جب تم مسکراتی ہو تو جیسے تمام دنیا ٹھہر جاتی ہے۔"

بروٹو مارس گا رہا تھا اور سعد سلطان کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا کسی معمول کی طرح چلتا وہ آگے بڑھ آیا تھا۔ اس سے آگے چلتی نادیہ پیچھے رہ گئی تھی۔ اسی طرح عالم بے خودی میں آگے بڑھتے بڑھتے اسے اچانک ایک خیال آیا۔ اس نے رک کر گردن پیچھے موڑ کر دیکھا۔ نادیہ اس سے فاصلے پر رک گئی تھی۔ چھاتا سر پر تانے وہ جھلملاتی آنکھوں کے ساتھ مسکرا رہی تھی۔ اس کی نظریں اسے پیغام دے رہی تھیں۔

"لو اجنبی چہروں کے درمیان اپنے شناسا چہرے کو پہچانو اور یہ کام تو ذرا بھی مشکل نہیں ہے لاکھوں کے مجمع میں بھی یہ ایک چہرہ ڈھونڈ لینا ذرا برابر بھی مشکل نہیں ہے نا؟" وہ اشارہ کرنے لگی تھی "جاؤ" آگے بڑھو اور اس کے ساتھ ہم قدم ہو جاؤ' آج تمہارا دن ہے۔"

اس نے جھلملاتی نظروں اور کپکپاتے ہونٹوں کے ساتھ مسکراتی نادیہ کو دیکھا اور گردن سیدھی کرتے ہوئے اس نقطے کی طرف دیکھنے لگا جس نے کائنات کی ہر جنبش روک دی تھی۔ پھر اس کی نظر اس چہرے کے ساتھ نظر آنے والے ایک اور چہرے پر پڑی اور کائنات واپس چیخنے چنگھاڑنے لگی تھی۔ اس کے حلق تک میں کڑواہٹ اتر آئی تھی۔ اس کا دل فوراً" آنکھیں بند کر لینے کو چاہا اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے آنکھیں بند کیں اور اگلے لمحے واپس مڑ گیا۔

نادیہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ نادیہ کو وہیں کھڑا چھوڑ کر آگے بڑھ گیا تھا۔ نادیہ نے اشکبار نظروں سے ماہ نور کے ساتھ کھڑے بلال سلطان کی طرف بے بسی سے دیکھا اور مڑ کر بھاگتے قدموں سے چلتی سعد کے قریب پہنچ گئی۔ اس کا سانس پھول رہا تھا۔

"کیوں چلے آئے' اس کی طرف گئے کیوں نہیں؟" وہ پھولے سانس کے ساتھ اس کے ساتھ تیز قدموں سے چلتی پوچھ رہی تھی "ایک ہی گلہ تھا نا تمہیں محبت سے اگر وہ محبت تھی تو اس میں تڑپ کیوں نہیں تھی۔ اس میں ڈھونڈ نکالنے کا جنون کیوں نہیں تھا۔ دیکھو' وہ اس آزمائش پر پوری اتری۔ کہاں کہاں کیسے کیسے تمہیں تلاش کرتی' تمہاری کھوج لگاتی وہ تم تک پہنچ چکی ہے' اس نے قریہ قریہ پھر کر تمہیں ڈھونڈ نکالا ہے' کیا اب بھی تمہاری تسلی نہیں ہوئی' کیا اب بھی تم اسے واہمہ قرار دو گے۔"

اس سے زیادہ تیز قدموں سے چلتا وہ جواب نہیں دے رہا تھا۔

"بولو' بتاؤ' سعد! تم اتنے پتھر دل کیوں ہو گئے ہو؟" نادیہ نے اس کا بازو پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے کہا تھا۔

"تم!" وہ رک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے پھنکارا "تم جانتی تھیں نا۔ تم دانستہ مجھے یہاں لائی تھیں نا آج؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"ہاں!" نادیہ نے تھکن بھرے لہجے میں جواب دیا تھا۔ "اس کی گرفت سعد کے بازو پر کمزور پڑ گئی تھی جب ہی بازو اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔

"تم نے اچھا نہیں کیا۔ تم نے یہاں تک ان کی راہنمائی کی' جبکہ تم جانتی تھیں کہ۔۔۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"ہاں میں جانتی تھی۔" وہ بلند آواز میں چیختے ہوئے بولی تھی "میں سب جانتی تھی' مجھے سب معلوم ہے' وہ سب جو تم نہیں جانتے وہ سب جو تمہیں ابھی جاننا ہے۔"

وہ کہہ رہی تھی۔ آسمان سے گرتی ہلکی پھوار تیز بارش میں بدل گئی تھی اور وہ دونوں وہاں کھڑے بھیگ رہے تھے۔



"میں نے تم سے کہا تھا' مجھے اپنے ساتھ وہاں نہ لے جاؤ' وہ بھاگ لے گا۔" بلال سلطان نے برساتی اتار کر نور الدین کو پکڑاتے ہوئے کہا۔

"مجھے بھی پتا تھا' وہ بھاگ لے گا۔" ماہ نور مسکرائی "نور الدین انکل! کیا اچھی سی چائے پینے کو مل سکتی ہے؟" اس نے نور الدین سے سوال کیا۔

"ضرور۔ مگر کون سی دار جلنگ والی یا سیلون والی۔" نور الدین نے اپنے چوڑے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

"کوئی سی بھی' مگر خوشبودار اور گرم ہونی چاہیے۔"

"ابھی لیجیے۔" وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

"پھر بھی تم مجھے ساتھ لے کر چلی گئیں۔" بلال سلطان نے پوچھا" جبکہ اس کو دیکھنے کی تڑپ لے کر وہاں گئی تھیں۔ دیکھا' مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں کیا اترا تھا۔ وہ خون تھا یا نفرت' میں فرق نہیں جانچ پایا۔"

"آپ کو نہ لے کر جاتی۔" ماہ نور نے ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا "میرے دل میں موجود تڑپ آپ کی تڑپ سے زیادہ تھی کیا؟"

"شاید نہیں۔" وہ سادگی سے بولے "مگر میرے لیے اس کے دل میں کیا ہے' خوب جانتی ہو تم۔ نفرت' انتقام' بدگمانی۔"

"اسی پٹی کو تو اتارنا ہے۔" ماہ نور سنجیدگی سے بولی۔ "آپ کا بیٹا بھی خوب ہے۔ ٹاسک پر ٹاسک دیے چلا جا رہا ہے' مجھے لگتا ہے' میں ایک ایسے رئیلٹی شو میں شرکت کر رہی ہوں' جس میں جیت جانے کی صورت میں مجھے انعام میں سعد سلطان ملے گا۔"

"اتنا ہی تو قیمتی ہے میرا بیٹا۔" بلال سلطان نے کہا۔ "ٹاسک تو پورے کرنے پڑیں گے۔"

"آج کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔" ماہ نور نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "جب تک سردار چچا نے مجھے سب تفصیل نہیں سنائی تھی۔ میں بھی آپ کے بارے میں ایسے ہی جذبات رکھتی تھی دل میں اور اب میں آپ سے اتنی ہی شرمندہ ہوں۔ اتنا ہی شرمندہ اس کو بھی ہونا پڑے گا۔ ادھوری معلومات پر راستہ کھوٹا کر لینے والا احمق۔" اس نے سر جھٹکا "کیا انعام ہے بھئی' کیا رئیلٹی شو ہے" وہ مسکرائی۔ "لیکن انکل سعد کے رد عمل سے تو آپ واقف تھے۔ آپ نے نادیہ کا ری ایکشن دیکھا۔ میرا تو دل رک سا گیا اس کے آنسو دیکھ کر۔ سعد کو جانے دیتے۔ نادیہ کو تو گلے لگا لیتے آگے بڑھ کر۔"

"ایک کے بعد ایک۔" بلال سلطان اداسی سے مسکرائے "بچھڑی ہوئی اولاد سامنے آن کھڑی ہوتی ہے۔" "تم جانتی ہو نادیہ کو دیکھ کر کتنے ہی لمحے میرے ہاتھ پاؤں بلکہ پورا جسم سن سا ہو گیا مجھے لگا۔ میں ہلکی سی جنبش بھی کرنے کے قابل نہیں رہا تھا' شاید فالج کا شکار ہو جانے والے لوگوں کی کیفیت ایسی ہی ہوتی ہو گی۔" وہ کہہ رہے تھے "میں اپنی پوری ہمت جمع کر کے جیسے ہی اس کی طرف بڑھنے لگا' وہ مڑ کر سعد کے پیچھے چلی گئی اور اس کے پیچھے سعد تک پہنچنا کم از کم آج کے دن میرے لیے ممکن نہیں تھا۔" وہ ٹوٹے' ہارے ہوئے لہجے میں بول رہے تھے۔ ماہ نور انہیں غور سے دیکھ رہی تھی۔

"چٹان نظر آنے والا یہ شخص اندر سے کیسا کمزور اور بھربھرا ہو چکا ہے' کیا کسی کو معلوم ہو گا۔" وہ سوچ رہی تھی۔



"مجھے افسوس ہے کہ تم میری نیت پر شک کر رہے ہو' میں نے ایسا کبھی سوچا بھی نہ تھا۔" نادیہ نے بسورتے ہوئے کہا۔

"کب سے رابطے میں ہو تم ان سے؟" سعد نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اپنا سوال کیا۔

"ان سے' کن سے؟" وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔ "میں صرف ماہ نور سے رابطے میں تھی' وہ بھی وردن زادے کے ذریعے۔"

"وردن!" وہ چونکا "اوہ!" اس کے ہونٹ سکڑے "گویا یہ کوئی لمبا چکر ہے؟"

"ہاں!" نادیہ نے اپنے اٹھے شانے گراتے ہوئے اپنے ہاتھ اپنی گود میں رکھے۔ "یہ لمبا چکر ہے' مگر میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ یہ دنیا بہت چھوٹی ہے۔ ہم گھوم پھر کر دوبارہ ایک ہی نقطے پر پہنچ جاتے ہیں۔"

"اچھا!" وہ طنزیہ انداز میں ہنسا "جیسے تم اور تمہارے ڈیڈی گھوم پھر کر آج ایک ہی نقطے پر پہنچ گئے۔"

"تم میرا دل چھلنی کرنا چاہتے ہو۔" نادیہ نے سوال کیا "اور اگر تمہیں ایسا کرنے سے کوئی تسلی ہو سکتی ہے تو تم ایسا بھی ضرور کر لو۔ جبکہ تم بھی جانتے ہو کہ اجنبیوں کے اس ہجوم میں ڈیڈی کے لیے شناسا چہرہ صرف تمہارا ہو سکتا تھا۔"

نادیہ کی آواز میں ایسا درد تھا' ایسی شکست تھی کہ سعد کا دل لمحہ بھر کے لیے کانپ اٹھا۔

"اور میرے لیے اس ہجوم میں شناسا چہرہ صرف تمہارا تھا۔" اس نے نادیہ کے گھٹنے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "میں سچ کہہ رہا ہوں۔"

"ہوں!" نادیہ سر جھٹکتے ہوئے مسکرا دی "جیسے میں جانتی نہیں۔" اس نے سعد کی طرف دیکھا۔ "وہ تمہارے پیچھے خوار ہوتے یہاں تک پہنچی ہے سعد تمہاری خاطر وہ بے چاری کہاں کہاں نہیں پہنچی۔ فضل حسین اور مونا آنٹی' فلزا ظہور' نور فاطمہ' سائیں اختر کی جھونپڑی' میرا میل باکس اس کی سنائی داستان سے بھرا پڑا ہے' کہو تو دکھا دوں۔"

"فضل حسین اور میمونہ بی' فلزا ظہور' نور فاطمہ' سائیں اختر!" سعد نے چونک کر نادیہ کی طرف دیکھا۔

ان ناموں کی نادیہ کی زبان سے ادائیگی یہ بتانے کے لیے کافی تھی کہ وہ محبت کیا تھی' وہ جنون کیسا تھا' تڑپ کتنی تھی' بے قراری کا کیا عالم تھا۔ سعد نے بے یقینی کو یقین میں بدلنے کے لیے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ پیچھے سے آنے والی اس پکار کا اس نے جس قدر طویل انتظار کیا تھا' وہی جانتا تھا۔ آج وہ بے حیثیت نہیں رہا تھا۔ صاحب حیثیت ہوچکا تھا۔

☼ ☼ ☼

"جاؤ' میں تم سے نہیں بولوں گی۔" ماہ نور نے اپنی قمیص کو گھٹنوں پر پھیلاتے ہوئے کہا اور چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔

وہ بے اختیار مسکرا دیا۔ ہلکے زرد رنگ کی اس سادہ سی شلوار قمیص پر زرد اور بھورے رنگوں کے امتزاج والا اسٹول اوڑھے وہ ہمیشہ کی طرح معصوم' بے ریا اور سادہ لگ رہی تھی۔ وہ ایک ٹک اس کے سراپے کو دیکھ رہا تھا اور دیکھے ہی چلا جارہا تھا۔

"مجھ تک یہاں آپہنچی ہو اور مجھ سے ہی نہیں بولوگی۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بھلا بتاؤ تو' تم مجھ سے کیوں نہیں بولوگی۔"

"اس لیے کہ تم نے کبھی میرے سامنے تو مجھ سے اپنی محبت کا اقرار نہیں کیا اور خود کو میرے لیے جیک پاٹ بنا کر یہاں آ بیٹھے' ٹاسک پر ٹاسک پورے کرنے کے لیے۔ بس میں تم سے' ہرگز نہیں بولوں گی۔" اس نے دوبارہ چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"محبت کا اظہار نہیں کیا تو تمہیں کیا الہام ہوا تھا کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔" وہ مسکراتے ہوئے وہاں آبیٹھا جس طرف ماہ نور نے چہرہ پھیرا تھا۔

"مجھے نہیں پتا۔" وہ نروٹھے پن سے بولی۔

"اتنی بار اظہار کیا تھا کہ کوئی کیا کرے گا۔" اس نے اس کا چہرہ پکڑ کر اپنی طرف اٹھاتے ہوئے کہا۔ "یاد کرو' منگو کے میلے میں سائیں نے تم سے کیا کہا تھا۔" ماہ نور کی نظروں کے سامنے وہ پرانا منظر گھوم گیا۔

"یاد کرو۔ سید پور فیسٹول میں تمہاری غلطیوں سے بھرپور پینٹنگز مہنگے داموں کس نے خریدی تھیں۔"

"میں اس کی منہ مانگی قیمت ادا کرنے پر تیار ہوں۔" وہ لڑکا ماہ نور کے سامنے کھڑا کہہ رہا تھا۔

"یاد کرو' میوزیکل ایوننگ میں یار ڈاڈھی عشق آتش لائی ہے" کس نے گایا تھا اور یاد کرو' ایک چیختی چلاتی' سوال کرتی دیوانی لڑکی کو' ہائی لائٹ ہونے سے کس نے بچایا تھا؟" وہ یاد کراتا چلا جارہا تھا۔

"یاد کرو تمہیں Just the way you are والا گانا بطور خاص کس نے سنوایا تھا۔"

ایک اور منظر' ماہ نور کی نظروں کے سامنے گھوما۔

"تمہیں ہر اس جگہ جہاں میں کبھی کسی اور کو لے کر نہیں گیا تھا' کون لے کر گیا تھا اور کس لیے لے کر گیا تھا؟"

ماہ نور نے یاد کرتے کرتے خجالت سے تھوک نگلا۔

"اتنی بار اظہار کے باوجود اگر کوئی پاگل محبت کے پیغام کو نہ سمجھے تو میرا کیا قصور۔" وہ ہنسا۔

"محبت تھی کہ کوئی پہیلی۔" اس نے ناراضی سے سر جھٹکا۔

"میری محبت تھی نا۔" وہ مسکرایا۔ "اس کے اظہار کا انداز بھی مختلف ہونا چاہیے تھا۔"

"دو لفظ سیدھے سیدھے بولتے جیسے تمہاری زبان الٹ جاتی تھی۔ اتنا مجھے خوار کیا' اتنا مجھے رلایا' اتنے حسد اور رشک

میں مبتلا کیے رکھا۔" اس نے ایک بار پھر سر جھٹکا۔

"بابا!" وہ کھل کر ہنس دیا۔ "غلطی ہوگئی' میں بھول گیا تھا کہ میری محبوبہ کو پزل اور بھول بھلیوں جیسی چیزوں سے بہت چڑ ہے۔"

"جتنی چڑ تھی' اتنا ہی تم نے مجھے گھمایا۔" وہ منہ بسور کر بولی "میری پڑھائی بھی رہ گئی' میری ممی بھی مجھ سے ناراض ہیں۔"

"اوہ.... آئی ایم ایکسٹریملی سوری۔" وہ لجاجت سے بولا "مگر میں بھی کیا کرتا' میں ہوں ہی ایسا مشکل ٹاسک۔"

"تم بہت خراب ٹاسک ہو' آتے آتے وہ پیغام محفوظ کر آئے میرے لیے اپنے آئی فون میں۔ کہاں کہاں نہیں جانا پڑا مجھے اختر کی کٹیا' اف" اسے یاد کرکے جھرجھری سی آگئی "فضل حسین اور میمونہ بی۔ ڈھوک کھوکھرپائے اور وہ بے نور فاطمہ یا اللہ سعد! وہ بے چاری کتنی دکھی مگر کیسی حوصلے والی عورت ہے' ہے نا۔"

"محبت کی ماری ہے نا!" سعد نے کہا۔ "محبت ایسا ہی حوصلہ اور ایسا ہی صبر طلب کرتی ہے جیسا نور فاطمہ میں ہے' مگر کتنی عجیب بات ہے کہ میں نے اپنے دل کی وہ باتیں ایسی جگہ محفوظ کیں جہاں کا مجھے پتا تھا' کبھی تم پہنچ نہیں پاؤ گی' مگر تم وہاں تک پہنچ گئیں۔ یہ کیسی حیران کن بات ہے۔"

"یہ حیران کن اس لیے نہیں ہے کہ یہ محبت کا اعجاز ہے' واہ یہ کا نہیں تم جانتے ہو تمہارا وہ آئی فون مجھے کس نے دیا؟"

سعد نے جواب دیے بغیر پہلو بدلا۔

"تم جانتے ہو' بلال انکل نے وہ زہراسی روز پڑھ لیا تھا جو تم نے ان کے بارے میں اگلا تھا' جب تم وہاں سے یہاں چلے آئے تھے۔"

سعد دوسری طرف دیکھنے لگا۔

"تم جانتے ہو' وہ تم سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ تم جانتے ہو' تم نے انہیں دکھ کی کس انتہا تک پہنچا دیا' ادھر ادھر سے ان کے خلاف ادھوری شہادتیں اکٹھے کرتے رہے اور پھر ان پر فرد جرم عائد کیے بنا ان پر کوئی مقدمہ چلائے بغیر انہیں ڈیتھ سیل میں ڈال کر خود یہاں چلے آئے۔ تم جانتے ہو' تم نے کتنی بڑی زیادتی کر ڈالی انجانے میں۔" وہ کہہ رہی تھی۔

"میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتیں۔" وہ بھاری آواز میں بولا تھا۔

"غلط کہہ رہے ہو' دراصل تم کچھ بھی نہیں جانتے۔" ماہ نور نے سختی سے کہا۔ "اور تم نے مجھے بھی مس گائیڈ کیا۔"

"پلیز ماہ نور! مجھے ان کی سنائی کہانی مت سنانا' اگرچہ میں معاف کردینے اور نظرانداز کردینے کا سبق پڑھ چکا ہوں اور میں نے انہیں معاف بھی کردیا ہے۔" سعد نے کہا۔

"تم انہیں کیا معاف کروگے۔" ماہ نور کے لہجے میں غصے کی جھلک اتری "جو تم نے ان کے ساتھ کیا' الٹا تمہیں ان سے معافی مانگنی پڑجائے گی بچو' ۔ میری بات دھیان سے سنو۔ "خبردار جو درمیان میں بولے تو۔"

وہ کہہ رہی تھی اور اسے بغیر ایک لفظ بولے دھیان سے سننا پڑ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کیا تم اپنے اس کم ظرف' انا پرست اور خود پسند باپ کو معاف کرسکتی ہو؟" نادیہ کے کمرے کے چھوٹے سے فلیٹ میں بلال سلطان ایک معمولی سی کرسی پر بیٹھے نادیہ سے پوچھ رہے تھے۔

"مجھے پہلے اس بات کا یقین کرلینے دیں کہ آپ مجھ سے ملنے' میرے لیے یہاں تک آئے ہیں۔ آپ میرے سامنے موجود ہیں۔" نادیہ نے کانپتی آواز میں جواب دیا۔

"یہ ایسی کون سی ناقابل یقین بات ہے۔" وہ افسردگی سے بولے "مجھے تو بہت پہلے تم تک پہنچنا چاہیے تھا' مجھے تو تمہیں تمہاری ماں کے ساتھ جانے ہی نہیں دینا چاہیے تھا۔ مگر میں انا پرست' خود پسند شخص اپنی ان دونوں خامیوں کے ہاتھوں بہت بڑی غلطی کرگیا۔"

"اس میں آپ کا کیا قصور تھا۔ جو کچھ آپ کو بتایا گیا۔ اس کو سننے کے بعد آپ کو یہی کرنا چاہیے تھا۔" نادیہ نے سادگی سے کہا۔

"نہیں، میں اپنی ذات کے حصار میں محصور محض تھا، میں نے رشتوں کی قدر کرنا چھوڑ دی تھی اور دیکھو، رشتوں کے معاملے میں میرے ساتھ کیا، کیا نہیں ہوا۔ کبھی کسی اور کے ساتھ بھی ایسا ہوتے دیکھا ہے؟" انہوں نے نادیہ کی طرف دیکھا۔

"آپ نے جو بھی کیا، مجھے اس کا گلہ نہیں ہے۔" نادیہ نے کہا۔ "لیکن آپ جو بھی ٹیسٹ کرانا چاہیں جیسے بھی جانچنا چاہیں جانچ لیں۔ مجھے یقین ہے میں آپ ہی کی بیٹی ہوں۔"

"مجھے کسی جانچ کی ضرورت نہیں، تم آج جو ہو، جیسی ہو، یہ ہی اس یقین کے لیے کافی ہے کہ تم میری بیٹی ہو۔" بلال نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر چومتے ہوئے کہا۔

"پھر میں آپ کو آپ کے سامنے ڈیڈی کہہ کر پکار سکتی ہوں نا!" نادیہ نے آنسوؤں میں بھیگی آواز کے ساتھ پوچھا۔

"سو بار، ہزار بار، عمر بھر۔" بلال پاگلوں کی طرح اس کے ہاتھ، سر اور پیشانی چوم رہے تھے۔

قسمت سے لڑنے کے لیے پیسہ جمع کرتا یہ شخص، دولت کے انبار میں چھپ کر بھی اپنی قسمت پر قادر نہ ہو سکا تھا۔ اپنے وقت کا انتظار کرتے کرتے اس کی عمر گزر گئی، اس کا وقت اس وقت تک نہیں آیا جب تک اس کے آجانے کا حکم اس عظیم طاقت نے نہیں دیا جسے ہم اپنا رب مانتے ہیں۔



"یہ ہائیڈ پارک ہے اور میں اس کے اسپیکرز کارنر کی طرف جا رہا ہوں۔" اس کے ساتھ پیدل چلتے شخص نے کہا تھا۔

"شوق سے جائیے اور جی بھر کر گالیاں دیجئے۔"

ضرور... اگر تم کان لگا کر سنتے نظر آؤ تو...

"مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔ گالیوں کے زیر سایہ ہی پل کے جوان ہوئے ہیں ہم۔"

"جب ہی جوان ہوتے ہی خودکشی کرنے چل پڑے تھے۔ گالیاں سنتے سنتے بے مزہ ہونے لگے تھے شاید۔"

"افسوس میری وہ کوشش ناکام ہو گئی، میں بہت سے معاملات میں اناڑی ثابت ہوا ہوں۔"

"مجھ ایسے کہنہ مشق کھلاڑی کے بیٹے ہو کے بھی اناڑی نکلے، افسوس!"

"آپ نے سب سکھا دیا، ایک درخت پر چڑھنا جو نہیں سکھایا۔"

"میں تمہارا باپ ہوں، خالہ نہیں سمجھے۔"

"خالہ تو وہ ہے جو مجھے ریسٹورنٹ اور مینشن وغیرہ وغیرہ کا مالک قرار دے رہی تھی، آپ عمر بھر مجھے جھانسا دیتے رہے، میں خوامخواہ خود کو میراثیوں کا نواسا سمجھتا رہا۔"

میراثن خالہ کی گود میں پل رہے تھے، وہ تو میں بچا لے آیا۔ چند ماہ کی رفاقت نے ماشاءاللہ خوب اثر چھوڑا تھا۔ رہتے ہی اس گود میں تو اللہ جانے کیا حال ہوتا۔"

"یاد رہے، اسی خالہ کی بیٹی آپ کی بہو بن چکی، اللہ آپ کی اگلی نسلوں پر رحم کرے۔"

"فکر مت کرو، وہ سراج سرفراز کی بھی بیٹی ہے۔"

"شکر کریں شکل و صورت میں ماں پر اور مزاج میں باپ پر گئی ہے بھئی آپ کچھ معاملات میں بہت کچے ہیں۔"

"ایسا ویسا... جیسے کہ میں تم جیسے احمق بیٹے کا باپ ہوں، کیا خوش نصیبی ہے میری۔ ماں کے قتل کا کھرا اٹھاتے اٹھاتے باپ تک پہنچ گئے۔ دنیا پاگل تھی جو اب تک قاتل باپ کو کھلا چھوڑ رکھا تھا۔"

"میں سخت شرمندہ ہوں۔ مجھے فلزا ظہور کی پینٹنگز۔"

"بہت بڑے گدھے ہیں آپ، ثبوت دیکھو... فلزا ظہور کی پینٹنگز سبحان اللہ۔"

"مذاق برطرف، ذرا رکیے، مجھے آپ کے قدموں میں گر کر معافی مانگنی ہے سیریسلی۔" سعد نے چلتے چلتے رک کر کہا۔

"ڈرامے بازی نہیں چاہیے۔" وہ اپنا سانس بحال کرتے ہوئے بولے۔

"ڈرامے بازی نہیں ہے۔ میں حقیقت میں بہت شرمندہ ہوں۔ چار دن سے حوصلہ جمع کر رہا تھا آپ کا سامنا کرنے کا۔"

"تم نے مجھے بہت بڑے کرب سے دوچار کیا۔" وہ سنجیدہ ہو گئے۔

"میرا سر حاضر ہے، جتنے چاہے جوتے مار لیجئے۔" وہ اپنا سر ان کے سامنے جھکاتے ہوئے بولا۔

"ضرور مارتا۔ اگر اپنی ساری زیادتیوں کے باوجود تم مجھے اس قدر عزیز نہ ہوتے۔" ان کی آواز بھرا گئی۔

"اپنے گمشدہ بیٹے اور کھوئی ہوئی بیٹی کے ملنے کے صدقے اس حقیر پر تقصیر کو معاف کر دیجئے۔" وہ بدستور سر جھکائے ہوئے تھا۔

"وہ تمہارا سگا بھائی ہے۔"

"مجھے دکھ ہے۔ "آپ نے کبھی بھولے سے بھی اس کا ذکر نہیں کیا کہ کوئی ایسا بھی تھا۔"

"وجہ جانتے ہو یا جاننا چاہتے ہو؟"

"نہیں جانتا مگر آپ کو بتانے کی ضرورت نہیں، میں جان جاؤں گا۔"

"سعد! تمہیں معلوم تھا، تم میری زندگی کی واحد خوشی تھے۔ تم نے خود کو مجھ سے دور کیوں کیا؟" انہوں نے اسے شانوں سے پکڑتے ہوئے کہا۔ "تم نے مجھے تنہا کیوں کر دیا؟" جواب میں وہ خود پر طنز بھرے انداز میں ہنس دیا۔

"اپنے تئیں آپ کو سزا دینے کے لیے، کیونکہ میرا خیال تھا، اس سے بڑی سزا آپ کے لیے کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی۔"

"تمہارا خیال درست تھا۔" انہوں نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ "یار! میں تو پہلے ہی ناکردہ جرائم کی سزائیں بھگت رہا تھا.. تم نے ناحق مجھے مجرم قرار دے دیا۔"

"مجھے معاف کر دیجیے۔ میں کوتاہ نظر ثابت ہوا۔"

"تمہارا کیا خیال ہے، میرے لیے تمہیں ڈھونڈ نکالنا مشکل تھا کیا؟" کچھ دیر اسے دیکھتے رہنے کے بعد بلال سلطان نے سوال کیا۔

"میں تو حیران تھا۔ آپ کو واقعی میں نہیں ملا، یا آپ جان بوجھ کر انجان بن رہے تھے۔" اس نے جواب دیا۔

"میں نے دانستہ وہ ڈور ماہ نور کے ہاتھ میں پکڑا دی جس کا ایک سرا تمہاری انگلی میں بندھا تھا۔ مجھے بھی دیکھنا تھا۔ وہ تمہیں کتنا چاہتی ہے۔"

"آپ نے دیکھ لیا؟" اس کے لہجے میں تفاخر اترا۔

"ہاں!" انہوں نے سر ہلایا "وہ تمہیں اتنا ہی چاہتی ہے جتنا تمہاری ماں مجھے چاہتی تھی۔"

"شاید۔" سعد نے سر ہلایا۔

"اللہ تمہاری زندگی ۔ طیفے لاٹروں سے محفوظ رکھے۔ تم خوش قسمت ہو جو تمہیں اس قدر چاہنے والی لڑکی کا ساتھ مل گیا۔"

"ارے ابھی کہاں، ابھی تو اس کی ممی کے سامنے اپروو ہونا باقی ہے۔"

"میرے بیٹے ہو... تمہیں کوئی ریجیکٹ نہیں کر سکتا۔" وہ یقین سے بولے۔

"ایسا؟" اس نے بے یقینی سے ان کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔" انہوں نے سر ہلایا اور آگے چل دیے۔

"ڈیڈی!" سعد نے پیچھے سے پکارا۔

"ہاں بولو!" بلال سلطان نے مڑ کر دیکھا۔

"کیا آپ نے مجھے معاف کر دیا۔ میں نے آپ کی آزمائشوں میں اضافہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔"

"میں نے تمہیں معاف کیا۔ مجھے فخر ہے میں تمہارا باپ ہوں۔ تم۔" انہوں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا "جس نے مجھے مدت بعد یاد دلا دیا کہ جب ہم اس پوزیشن میں ہوتے ہیں کہ کسی کے کام آسکیں تو ہمیں کیا کرنا چاہیے۔"

"مجھے کہنے دیجیے ڈیڈی! آپ بہت گریٹ ہیں اور مجھے آپ کا بیٹا ہونے پر فخر ہے۔"
سعد نے ڈبڈبائی نظروں سے انہیں دیکھا اور آگے بڑھ کر ان کے سینے سے لگ گیا۔

☼ ☼ ☼

"اچھا تو میں اب سمجھی کہ یہ چکر تھا سارا۔" فائزہ نے اخبار پڑھتے زوار کی طرف دیکھا" اور سب کچھ آپ کی ملی بھگت سے ہو رہا تھا۔ شکل سے کتنے معصوم لگتے ہیں آپ۔"

"تو کیا میں معصوم نہیں ہوں؟" زوار نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"آپ جیسے دس معصوم اور پیدا ہو جائیں تو دنیا تو معصومیت کا گہوارہ ہی بن جائے۔" فائزہ نے کہا۔ "لیں بتائیں بھلا لڑکی ناک کے نیچے لڑکے کے لیے خوار ہوتی رہی اور مجھے پتا ہی نہیں۔ میں اس کے سمسٹرز ضائع ہونے کا رونا روتی رہی۔ اس کے کیریر کے بیڑا غرق ہو جانے پر واویلا مچاتی رہی اور دونوں باپ بیٹی 'خفیہ منصوبے بنا کر کبھی اسلام آباد چل پڑتے اور کبھی پاسپورٹ ویزا بنوانے کے چکروں میں مگن رہے۔"

"ایک انتہائی اچھا داماد ڈھونڈنے کے لیے انسان کو پاپڑ تو بیلنے ہی پڑتے ہیں۔ کہیے کیا ایک قابل فخر داماد نہیں ڈھونڈ نکالا میں نے آپ کے لیے۔" زوار نے شرارت بھرے انداز میں کہا۔

"داماد۔" فائزہ نے سر جھٹکا "توبہ توبہ کتنے ٹوئسٹس اینڈ ٹرنز ہیں داماد کی فیملی کی داستان میں۔ کبھی ماں کا مرڈر ہو تا ہے اور کہیں بھائی گم ہو جاتا ہے' اسے سردار بھائی اٹھالے جاتے ہیں اور پھر پتا چلتا ہے کہ داماد صاحب تو خدیجہ' فاطمہ آپا کے قریبی رشتہ دار بھی ہیں۔ پھر کہیں سے ایک بہن بھی منظر پہ آجاتی ہے۔ ہمیشہ سے صابرہ بھابھی کے ساتھ آنے والا گھامڑ سا کھاری 'اس کا بھائی نکل آتا ہے اور پھر وہ اپنے باپ سے ناراض ہو کر لندن چلا جاتا ہے' جہاں میری ہی بیٹی میری ہی لاعلمی میں اس کے پیچھے پہنچ جاتی ہے۔ توبہ توبہ۔ میرا تو سر گھوم جاتا ہے' اس داستان پر غور کرتے کرتے 'ابھی تو در میان کے اللہ جانے کتنے لنکس مسنگ ہیں۔"

"اسی لیے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ اس داستان کے نشیب و فراز پر غور کرنے کے بجائے بیٹی کی شادی کی تیاریوں پر توجہ دیں۔ آپ کہانی کے اینڈ پراڈکٹ کو دیکھیں۔ سعد سلطان جیسا داماد تو چراغ لے کر بھی نہیں ملنے والا تھا آپ کو۔" زوار نے کہا۔

"ارے چھوڑیں۔ بیٹی کا کیریر گنوا کر ملنے والا داماد کس کام کا بھئی۔ آپ نے بھی اس کے باپ کے سوال پر فورا" یوں آمنا و صدقنا کہا جیسے ذرا سی دیر ہو جانے پر اس نے ہاتھ سے نکل جانا تھا۔" فائزہ اٹھتے ہوئے بولیں۔

"آپ کی بیٹی آمنا صدقنا پہلے ہی کہہ چکی تھی۔ میں نے اور بلال صاحب نے تو رسم ہی پوری کی۔" زوار مسکرائے۔

"اسی لیے کہا تھا۔۔۔ یہ لڑکی کسی نہ کسی کو ضرور لیٹ ڈاؤن کرے گی۔"

"کسی اور کو نہیں' صرف آپ کو۔ پڑھائی میں نکمی نکلی ہے نا۔" زوار نے شرارتا" کہا۔

"جانے دیں کیریر کو۔۔۔ آگے دیکھیے 'کیا گل کھلاتی ہے۔۔۔ آپ دھیان سے مہمانوں کی لسٹ بنائیے۔ ماہ نور کی شادی شہر کی اہم ترین شادیوں میں سے ایک ہونی چاہیے اس سیزن میں بس مجھے اتنا ہی چاہیے۔" وہ کہتے ہوئے کمرے سے باہر چلی گئیں۔

"ابراہیم ہے نا شادی کی تقریبات دیکھنے کے لیے 'مجھے فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" زوار نے کہا اور دوبارہ اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔

☼ ☼ ☼

"تم دیکھ رہی ہو سعدیہ! یہ جاپانی خرگوش اس لڑکی کے پیچھے ادھر پہنچا ہے۔ اسی کے پیچھے یہ نمانا دکھی رہتا تھا' وچارہ یہی کہتا تھا' بھائی افتخار دکھ کی کئی شکلاں ہوتی ہیں۔" کھاری نے بلال سلطان کے گھر پر بنے ٹریننگ روم اور منی سرکس رنگ میں پریکٹس کرتے رضوان الحق کو دیکھ کر سعدیہ کے کان میں سرگوشی کی۔

"ہائے پھر بولا نمانا' وچارہ' شکلاں۔" سعدیہ نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ "انہوں نے سن لیا نا قلزا آنٹی نے تو لگ پتہ جائے گا

آ[illegible]گا۔"

"ہائے میں کیا کروں۔ میرا تو قسمے منہ بھی تھک گیا ہے اردو بول بول کے۔ کدھر چلا جاؤں میں۔" کھاری نے بے بسی سے کہا۔

"عادت ڈالیں اردو بولنے کی۔"

"ڈال تو رہا ہوں اور کیا کروں۔ توبہ جب تم مجھے آپ کہہ کر بلاتی ہو' مجھے خوامخواہ اپنے آپ پر پیار سا آجاتا ہے۔" وہ ہنسنے لگا۔

جواب میں سعدیہ کو بھی بے اختیار ہنسی آگئی۔

☼ ☼ ☼

"چی اٹنگ سرکس' جدید ترین سرکس کمپنی ہے۔ تم نے دیکھا ان لوگوں کا اسٹائل ہمارے دیسی سرکسوں سے مختلف ہے۔ میں چاہتا ہوں تم دونوں اسی طرز پر اپنی ایک سرکس کمپنی بنالو۔" بلال سلطان نے اپنے سامنے بیٹھے سارا اور رکو سے کہا تھا سارا نے بلال کے ساتھ بیٹھے سعد سلطان کی طرف دیکھا اور لاشعوری طور پر اپنا ہونٹ دانتوں تلے دبالیا۔

"سارا۔۔۔! ڈیڈی نے تمہارے لیے بہت اچھا مستقبل پلان کیا ہے' تم دونوں کو فنانس اور سپورٹ کرنا ہماری ذمہ داری ٹھہری ہم پرافٹ اینڈ لاس میں بھی حصہ دار نہیں ہوں گے۔ یہ خالصتا" تم دونوں کی اپنی کمپنی ہوگی۔" سعد اس کی کیفیت کو بھانپ چکا تھا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔" سارا نے اپنے دل کی تمام کیفیات چھپا کر سرہلاتے ہوئے کہا۔

"کیا میں نے تمہیں ہرٹ کیا سارا؟" بلال سلطان اور رکو اٹھ کر باہر چلے گئے تو سعد نے سارا سے سوال کیا۔

"نہیں۔" سارا نے سرہلایا "میں تو تمہاری بہت ممنون ہوں۔۔۔ اپنی اس زندگی کے لیے' زندگی کے ولولے اور جوش کے لیے اگر تم نہ ہوتے تو آج میں یہ نہ ہوتی۔"

"سارا! میں اب بھی تمہارے لیے وہی سعد ہوں اور ہمیشہ ایسے ہی رہوں گا تمہارے لیے۔ ہر وقت دنیا میں کہیں نہ کہیں موجود۔ بس ایک' دو' تین تک گنتی گننے کی دیر ہوگی۔" سعد نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"ہاں۔ میں جانتی ہوں۔" سارا نے بھاری آواز میں کہا "لیکن میں بہت خود غرض نکلی سعد! بلال صاحب کی ذرا سی توجہ نے مجھے اپنی اوقات بھلا دی۔ مجھے اپنا آپ بھلا دیا۔ مجھے تمہارا وجود بھی بھولنے لگا۔ جب ہی تو میں نے کسی سے سوال کیا نہ ہی پریشان ہوئی کہ آخر تم کہاں چلے گئے تھے۔ میں ظرف کی اتنی چھوٹی ثابت ہوئی کہ مجھے یہ سوچ کر ایک کمینی سی خوشی محسوس ہوتی رہی کہ تم کہیں جا چکے ہو' اب میرے نہیں تو ماہ نور کی دسترس میں بھی نہیں۔" اس نے استہزائیہ انداز میں ہنستے ہوئے سر جھٹکا۔

"چلو بھلا۔۔۔ کوئی میرے جیسا کم ظرف بھی ہو سکتا ہے۔ وہ تو مجھے سمی آنٹی کی دور اندیشی اور معاملہ فہمی بھا گئی ورنہ میں تو اپنے غرور میں رکو کو بھی گنوا بیٹھی تھی' وہ بھی واپس چلا جاتا تو میں اکیلی خود اپنے لیے کیا کرپاتی۔"

"یہ بھی مت سمجھنا سارا کہ۔۔۔ ڈیڈی نے تمہیں تمہاری اوقات یاد دلانے کے لیے سرکس رنگ میں واپسی کا مشورہ دیا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو میں یہاں واپسی پر اس آئیڈیا کا سب سے بڑا مخالف ہوتا۔ لیکن یقین کرو۔ یہ راستہ تمہاری ذہنی اور جسمانی صحت کو قائم رکھنے کے لیے بہت ضروری ہے۔ خود انحصاری کا احساس دنیا کے بہترین احساسات میں سے ایک ہوتا ہے میری یہ بات کبھی نہ بھولنا۔ رہی بات تمہاری خود غرضی اور کم ظرفی کی تو بھول جاؤ کہ تم نے کبھی ایسا کیا تھا ہم میں سے کوئی بھی مکمل نہیں ہوتا۔ ہم سب کوتاہیوں اور کجیوں کے مارے ہوئے لوگ ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے کو معاف کرتے اور ایک دوسرے کی خطاؤں کو بھول جاتے رہنا چاہیے۔ مجھے تم پر آج بھی فخر ہے اور تمہیں یوں دیکھ کر مجھے خود اپنے آپ پر بھی فخر محسوس ہو رہا ہے۔ میری ذات تمہاری زندگی کو بچانے اور اسے دوبارہ کار آمد بنانے کا باعث بنی۔ میرے لیے اللہ کا اس سے بڑا اور احسان کیا ہوگا۔۔۔"

سعد کہہ رہا تھا اور سارا مبہوت بیٹھی اس کی بات سن رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

اس رات سعد کی کھاری سے ملاقات ہونے والی تھی۔ بلال سلطان نے دانستہ اس ملاقات میں تاخیر کی تھی۔ وہ کھاری کو تھوڑا اور گروم کرنے کے بعد سعد کے سامنے لانا چاہتے تھے۔

"بڑی شرم آئے گی مجھے سعد باؤ کے سامنے جاتے ہوئے۔" کھاری نے کنفیوز ہوتے ہوئے سعدیہ سے کہا تھا۔

"سعد باؤ نہیں سعد بھائی۔" سعدیہ نے تصحیح کی۔

"اوئے اوہوائی۔" وہ جھنجلا کر بولا "تھوڑا وقت تو لگے گا باؤ کو بھائی بنتے ہوئے۔"

"بننا کیا ہے۔ وہ ہیں ہی تمہارے بھائی۔" سعدیہ نے کہا۔

"اچھانا۔ بن دیکھو وہ کیسے ملتے ہیں مجھ سے؟" کھاری نے کہا۔

اور جس لمحے کے آنے سے پہلے وہ اس سے گھبرا رہا تھا۔ جب وہ لمحہ آیا تو اسے محسوس بھی نہیں ہوا کہ وہ اس شخص سے مل رہا تھا، جس کے دل کے راز سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد اس نے امانت کی طرح اسے اپنے اندر چھپا رکھا تھا۔

"آپ میلے والے سائیں تھے نا؟" وہ اپنے اس بڑے بھائی سے گلے ملتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں پوچھ رہا تھا۔

"تم جانتے تھے نا... مجھے پہلے ہی شک تھا۔" سعد نے اسے اپنے ساتھ لگا کر اس کا ماتھا چومتے ہوئے کہا تھا۔

"سعد باؤ! میں کتنے اور آپ کدھر، میں کہیں سے بھی آپ کا بھائی نہیں لگتا نا۔ مجھے لگتا ہے میں خواب دیکھ رہا ہوں۔" کھاری نے یہ بات بھی اس کے کان میں کہی تھی۔

"میں بھی یہ ہی سوچ رہا تھا کہ میں کہیں سے بھی تمہارا بھائی نہیں لگتا۔" سعد نے اس کے کان میں کہا۔ "تم اتنے معصوم، بے ریا اور نیک دل، میں اتنا چالاک، کروک اور ہوشیار..."

"آپ تو سائیں ہو جی، میلے والے سائیں، یاد ہے نا آپ نے مہ نور باجی سے کیا کہا تھا۔"

"کیا کہا تھا..."

"آپ کے گلے میں سوز کی وجہ عشق ہے، کہا تھا کہ نہیں کہا تھا۔"

"کہا تھا..."

"تو پھر جو عشق کرتے ہیں وہ چالاک نہیں ہوتے، ہوشیار نہیں ہوتے اور وہ، وہ تیسرا لفظ بھی نہیں ہوتے جو آپ نے بولا، مجھے ابھی وہ نہیں آتا۔" وہ جھجکتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"واہ! تم تو بڑے تیز ہو بھئی، سائیں کی باتیں بھی یاد ہیں..."

"مجھے ہی نہیں یاد، مہ نور باجی کو بھی یاد ہیں، آپ نے بھولنا نہیں۔" کھاری کو اس وقت بھی ماہ نور کا خیال تھا۔

"افتخار! اپنے بھائی سے ہی ملتے رہو گے، بہن سے نہیں ملو گے کیا؟" قلزا نے نادیہ کو آگے کیا۔ کھاری سعد سے الگ ہو کر ایک قدم پیچھے ہٹا۔ نادیہ کو دیکھ کر چونکنے کے بعد اس نے سعدیہ کی طرف دیکھا۔

"بلے بھئی بلے، پوری انگریز اور میری بہن، یہ ہو کیا رہا ہے میرے ساتھ؟" اس کی نظریں سعدیہ سے کہہ رہی تھیں۔ اس کی بہن کو اچھی اردو نہیں آتی تھی اور اسے اچھی انگریزی نہیں آتی تھی، وہ دونوں دوسروں کی مدد سے ہی باتیں کرتے تھے۔

☆ ☆ ☆

سعد اور ماہ نور کی شادی شہر کا بہت بڑا ایونٹ ثابت ہوئی تھی۔ اس شادی میں بلال سلطان نے اپنے چھوٹے بیٹے اور بیٹی کو بھی اپنے احباب میں متعارف کروایا تھا۔ اچانک ایک اور بیٹے اور بیٹی کا یوں سامنے آنا اچنبھے کی بات تھی مگر اس طبقے میں اچنبھے کی باتوں پر فوری اچنبھے کا اظہار نہیں کیا جاتا تھا، ایسی خبروں پر بعد میں تبصرہ کیا جاتا تھا۔ خود بلال سلطان اب زندگی کی اس اسٹیج پر تھے جہاں انسان لوگ کیا کہیں گے جیسے خوف سے باہر نکل جاتے ہیں، اور بلال کو تو شاید زندگی کی کسی اسٹیج پر بھی یہ خوف لاحق نہیں رہا تھا۔ ان کی شخصیت میں کچھ ایسا ضرور تھا کہ سوال کرنے والے ہونٹ ان کے سامنے خاموش رہنے کو ترجیح دیتے تھے۔

شادی میں رابعہ کلثوم اور سراج سرفراز کو دولہا کی خالہ اور خالو کی حیثیت میں متعارف کروایا گیا تھا۔

شادی میں خدیجہ اور فاطمہ بھی دولہا کی خالاؤں کی حیثیت سے شامل تھیں اور قلزا ظہور سے "ادھوری کہانی سنا کر چھوڑ جانے کا شکوہ کرتی رہی تھیں۔

"کہانی کا انجام تمہارے سامنے ہے، دیکھ لو غور سے۔" قلزا نے اسٹیج پر بیٹھے دولہا دلہن کی طرف اشارہ کیا تھا۔

شادی میں شریک دلہن کے چچا سردار، دولہا کے بھائی افتخار اور بھابھی کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے رہے تھے۔

اور دلہن کی تائی صابرہ نے قیمتی تھری پیس سوٹ میں ملبوس افتخار احمد عرف کھاری کی طرف حیرت سے دیکھ کر سوچا تھا شکر ہے رضیہ! میں کہیں انجانے میں اس بے چارے کی شادی تجھ سے نہیں کروا بیٹھی۔ مولوائن تو سنا ہے اس کے ابے کی رشتہ دار نکلی جو تجھ سے ہو جاتی اس کی شادی تو بلال سلطان کی سوسائٹی کیا کرتی بھلا۔"

شادی میں شریک ایک نئی سرکس کمپنی کی مالکن سارا خان، اور اس کا شوہر رضوان الحق بھی شریک تھے۔ دونوں نے حال ہی میں اسلام آباد میں جدید خطوط پر ایک سرکس کمپنی کا آغاز کیا تھا۔

"صرف دو گانوں کے بولوں کا فرق، دو انسانوں کی حیثیت واضح کرنے کے لیے کافی ثابت ہوا، ماہ نور! تم واقعی سعد سلطان کے دل کا معاملہ تھیں اور میں۔" سارا خان اسٹیج پر دلہن بنی بیٹھی ماہ نور کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی "میں اس کی نیک دلی کا معاملہ۔" اس کے چہرے پر ایک اداس مسکراہٹ پھیلی تھی۔

شادی کی تقریبات ابھی جاری تھیں جب پنڈال میں داخل ہوتے ایک شخص کو دیکھ کر سعد سلطان اپنی دلہن سے معذرت کرتے ہوئے اسٹیج سے اتر کر اس سمت بھاگا تھا جدھر سے وہ شخص داخل ہوا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ مہمانوں سے خوش گپیوں میں مصروف نادیہ کو بلا کر ایک طرف لے گیا تھا۔ اس جگہ وہ مہمان بھی کھڑا تھا جس کی آمد نادیہ کے لیے بھی سرپرائز کا باعث تھی۔

"معذرت خواہ ہوں چیلنج پورا کرنے میں دو ہفتے سے زیادہ دن لگ گئے۔" سعد نے نادیہ سے کہا "بس ان موصوف کے ویزے کا کچھ مسئلہ ہو رہا تھا۔" اس نے مہمان کی طرف دیکھا تھا۔

"تمہیں مجھ پر مکمل بھروسہ ہے نا نادیہ۔" اس نے نادیہ سے پوچھا تھا۔ نادیہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سر ہلایا۔

"بس پھر یہ شخص وودن زادے، تمہاری زندگی کے ساتھی کی حیثیت سے میرا انتخاب ہے، بولو قبول ہے؟" اس نے پوچھا تھا "اور اب تو تمہیں قبول کرنا ہی پڑے گا، یہ تمہارا وعدہ تھا۔"
نادیہ نے حیرت سے سر اٹھا کر وودن زادے کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔
"میری ترجیحات بہت مختلف ہو چکی ہیں سعد، وودن ان کو قبول کر پائے گا کیا؟" اس نے سوال کیا تھا۔
"تمہاری ترجیحات اور وودن کے نظریات دونوں ایک ہی سمت میں رواں ہیں، تم فکر مت کرو بس تم اسی بھروسے پر قائم رہو جو تمہیں مجھ پر ہے۔" وہ مسکرا دیا تھا۔



خانہ کعبہ کے گرد طواف کرتی رابعہ کلثوم دیوانہ وار رو رہی تھیں۔ برسوں پہلے وہ اپنی منہ بولی بہن کی لگن کے صدقے اللہ کے گھر میں حاضری دینے آئی تھیں اور اس کے بعد دوبارہ آنے کی خواہش لیے واپس لوٹ گئیں۔ اپنے حالات اور دل میں جاگزین خوف کے مارے وہ خواب میں بھی یہ تصور نہیں کر سکتی تھیں کہ ان کی یہ خواہش کبھی پوری ہو سکے گی۔
"دلوں کا پھیر، اے میرے رب یہ سب دنوں کا پھیر ہے۔" وہ روتے ہوئے بڑبڑا رہی تھیں۔ "اور انسان تو بہت ہی کوتاہ نظر، بے صبرا ہے، خود ہی مفروضے باندھتا، آپ ہی مایوس ہو جاتا ہے۔ اے میرے مالک تو مجھے شکران نعمت کی توفیق عطا فرما اور زوال نعمت سے محفوظ رکھ" وہ یہاں آنے کے بعد ہر قیام، رکوع اور سجدے میں یہ ہی دعا مانگتی رہی تھیں۔
"مولا واہموں، بدگمانیوں اور حسرتوں سے بچائے۔"
مولوی سراج سرفراز نے کعبہ کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا تھا اور اپنے شانے پر رکھے صافے سے اپنی بھیگی آنکھیں خشک کرنے لگے تھے۔



"سائیں اختر نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ میں نے جو جذبہ دل میں پال لیا ہے، وہ مجھے بہت خوار کرے گا۔" ماہ نور نے چڑھائی چڑھتے چڑھتے رک کر سانس بحال کرنے کے دوران کہا۔
"ہاں اختر کو سچ بولنے اور وہ بھی منہ پر سچ بولنے کی عادت ہے۔" سعد مسکرایا۔
"تم اس سے بہت متاثر نظر آتے ہو، جب ہی شادی کے اگلے ہفتے ہی اس سے ملنے یہاں چلے آئے۔" ماہ نور نے چھیڑا۔
"ہاں میں اس کا بہت بڑا فین ہوں۔"
سعد نے محبت بھری نظروں سے ماہ نور کی طرف دیکھا اور آگے چلنے لگا۔
"یہ کیا؟" اختر کے ڈیرے کی جگہ کو اجڑا اور خالی دیکھ کر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔
"اختر کی کٹیا کہاں گئی، اختر کہاں گیا؟" اس نے مڑ کر ماہ نور کی طرف دیکھا، جو خود بھی یہ منظر حیرت سے دیکھ رہی تھی۔
ان دونوں کی آوازیں سن کر کسی درخت کے نیچے بیٹھے دو شخص اٹھ کر ان کی طرف آ گئے۔
"عبدالودود۔" سعد نے ان میں سے ایک کو دیکھ کر کہا۔ "سائیں اختر کی کٹیا اور خود اختر کہاں گئے؟"
"سائیں جی اپنی اگلی منزل پر روانہ ہو گئے صاحب۔" عبدالودود نے کہا۔
انہوں نے فرمایا۔ "سانپ، سیہہ اور فقیر کا کوئی ایک ٹھکانا نہیں ہوتا۔ وہ ایک سے دوسری جگہ کا سفر کرتے ہی رہتے ہیں۔ میں نے سوچا پاؤں پڑ جاؤں گا، منت کر لوں گا سائیں جی یہ ٹھکانا نہ چھوڑیے، مگر اگلی صبح میرے نیند سے جاگنے سے پہلے ہی وہ یہاں سے کوچ کر چکے تھے۔"
"اوہ!" سعد اور ماہ نور نے بیک وقت کہا۔ "کہاں گئے وہ؟"

"پتا نہیں جی، تا حال ان کی کوئی خبر نہیں؟" عبدالودود نے کہا اور واپس جا کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ سعد اور ماہ نور نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دونوں نے چہرے پر کچھ گم ہو جانے کا احساس تھا۔

میرے پوؤ نہ خیال آکھیا جوگی
کیا دیس فقیرا نے سیہہ، سپ

فضا میں اختر کی آواز کی بازگشت گونجی۔ دونوں آہستہ قدموں سے واپس نیچے اترنے لگے۔
"یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے، جوگی، فقیر اور سائیں لوگوں کا یہ ہی شیوہ ہوتا ہے۔" ماہ نور نے نیچی آواز میں کہا، وہ سعد کے احساسات کو سمجھ رہی تھی۔
"ہاں، وہ کبھی بھی کہیں بھی کسی بھی روپ میں نظر آ سکتے ہیں۔ ان کا کوئی مخصوص حلیہ یا حوالہ نہیں ہوتا۔" سعد نے سر ہلایا۔
"ہاں جیسے منگو کے میلے کا سائیں۔" ماہ نور مسکرا کر بولی۔
"جو بہت unpridictable (غیر متوقع) ہے، کبھی بھی، کسی بھی روپ میں کہیں بھی نظر آ سکتا ہے۔" سعد نے مسکراتے ہوئے اس کی بات سنی اور بلند آواز میں ہنس دیا۔
"یہ دیکھو یہ بورڈ کسی جانب اشارہ دینے کے لیے لگایا گیا ہے۔ مگر یہ کس طرف اشارہ کر رہا ہے یہ اس پر نہیں لکھا۔" نیچے اترتے ہوئے ایک جگہ رک کر ماہ نور نے لوہے کے اسٹینڈ پر رکھے ایک تیر کے نشان جیسے لکڑی کے تختے کی طرف اشارہ کیا جس پر کوئی تحریر درج نہیں تھی۔
"رکو، اس پر میں کچھ لکھتا ہوں۔" سعد نے کہا۔ "تمہارے بیگ میں لکھنے کی کوئی چیز ہے؟"
"نہیں۔" ماہ نور نے کہا "ہاں ایک سرخ رنگ لپ اسٹک موجود ہے بس۔"
"لاؤ وہی دو۔" سعد نے ہاتھ بڑھایا اور لپ اسٹک اس سے لے کر تختے کی طرف بڑھ گیا۔ لکھنے کے بعد اس نے مسکرا کر ماہ نور کی طرف دیکھا، جو تجسس کے مارے تیزی سے آگے بڑھی۔
"Happily ever after"
سعد کے ہینڈ رائٹنگ میں سرخ لپ اسٹک سے بڑے بڑے حروف میں لکھے یہ الفاظ پڑھ کر وہ بے اختیار ہنس دی تھی۔ اس شخص کی محبت کے اظہار کا طریقہ کبھی بھی نارمل نہیں رہا تھا۔



کسی بھی کہانی کے اختتام پر کوئی ایسی جادو کی چھڑی نہیں چلتی، جس کے ذریعے سب غلط ٹھیک ہو جائے۔ یہ کہانی کے واقعات کا تسلسل ہی ہوتا ہے، جنہیں کہانی کی آخری قسط میں ہی جا کر اپنے انجام تک پہنچنا ہوتا ہے۔ کہانی شروع ہوتی ہے، مختلف موڑ لیتی، خود کو قاری پر کھولتی اپنے کرداروں کے ساتھ پیش آنے والے واقعات آگے بڑھاتی آہستہ آہستہ اپنے اختتام تک پہنچ جاتی ہے سعد اور ماہ نور کی یہ کہانی بھی ایسی ہی کہانیوں میں سے ایک کہانی ہے۔ اسے پڑھنے کے بعد سوچ کر بتائیے گا کہ اس کہانی کو اسی طرح آگے بڑھتے بڑھتے یوں ہی ختم ہونا تھا یا نہیں؟ کہانی کی آخری قسط میں اچانک کوئی جادو کی چھڑی ملی یا واقعات کا تسلسل بالآخر اپنے منطقی اختتام کو پہنچا۔ ضرور سوچیے گا اور ضرور بتائیے گا۔
عنیزہ سید



رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

ایک اعرابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔

"اسلام میں نیک اعمال بہت زیادہ ہیں۔ مجھے ایک بات بتا دیجیے۔ جسے میں مضبوطی سے پکڑ لوں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تیری زبان ہمیشہ اللہ کے ذکر سے تر رہے۔"

فصاحت و بلاغت،

حضرت علیؓ کے دل میں اپنے صاحبزادے امام حسنؓ کی بڑی عزت و محبت تھی۔ ایک روز فرمایا۔

"کبھی تم تقریر کرتے تو میں بھی سنتا۔"

کہنے لگے۔ "مجھے شرم آتی ہے آپ کے سامنے زبان کھولوں۔"

ایک روز حضرت علیؓ ایسی جگہ جا کر بیٹھ گئے جہاں حضرت حسنؓ کو نظر نہ آ سکیں۔ حضرت حسنؓ نے لوگوں کے سامنے تقریر کی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سن رہے تھے۔ جب وہ اپنی تقریر ختم کر کے چلے گئے تو حضرت علیؓ نے فرمایا۔

"یہ ایک ہی نسل تو ہے جس میں ایک دوسرے کا فرزند ہے۔"

نخبہ اکرم۔ گاؤں گویلکی

سیاست،

- سیاست جیسا کوئی جوا نہیں۔

(ڈسرائیلی)

- سیاست دان محبت کرتے ہیں نہ نفرت' جذبات نہیں مفادات ان کی راہ متعین کرتے ہیں۔

(اسٹیپن)

- جو بات اخلاقی طور پر غلط ہے' وہ بات سیاسی طور پر بھی غلط ہے۔

(ڈینیئل)

- عورت اور سیاست دان میں بڑا فرق ہے۔ اگر کوئی عورت ہاں کہے تو عورت نہیں، سیاست دان نہیں کہے تو سیاست دان نہیں۔

آمنہ اجالا۔ ڈہرکی

ضرورت،

شہر کے بہت سے اسٹیٹ ایجنٹ ان دنوں ایک دور دراز اور بنجر علاقے کی زمینیں مہنگے داموں فروخت کرنے کے سلسلے میں مصروف تھے۔ اس علاقے میں کئی ترقیاتی منصوبے زیرِ تکمیل تھے اور مزید بہت سے منصوبوں کے بارے میں بڑی امید افزا باتیں سننے میں آ رہی تھیں۔

ایک اسٹیٹ ایجنٹ وہاں کی چند ایکڑ زمین خریدنے کے سلسلے میں ایک سیٹھ کو آمادہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ارے صاحب... دیکھیے گا' وہ علاقہ تو جنت بن جائے گا جنت... وہاں کی زمین آج کی مٹی تو کل کا سونا۔ اس علاقے کو جنت بنانے کے لیے بس دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک تو میٹھے پانی کی ــ دوسرے شریف اور اچھے لوگوں کی۔"

"جہنم کو بھی جنت بنانے کے لیے ان ہی دونوں چیزوں کی ضرورت ہے۔" سیٹھ صاحب نے جواب دیا اور جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

ثمرہ، اقراء۔ کراچی

عوام کا فیصلہ،

سیٹھ جگت نارائن اور مسٹر سہراب مودی میں ایک سودا ہو رہا تھا۔ جگت نارائن کا دلی میں سینما تھا جہاں فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ اور سہراب مودی بھارت کے مشہور فلم ساز تھے۔ جگت نارائن کسی فلم کے سوا لاکھ روپے دینا چاہتے تھے اور سہراب مودی دو لاکھ مانگ رہے تھے۔ سودا نہیں پٹتا تھا۔ آخر سہراب مودی نے فیصلہ کیا کہ پکچر میں خود دکھاؤں گا۔

پہلا شو شروع ہوا۔ جگت نارائن اور سہراب مودی بیٹھے تھے۔ یکایک سہراب مودی اٹھے اور منہ پر کپڑا لپیٹ کر چار آنے والے درجے میں جا بیٹھے۔ شو کے بعد جگت نارائن نے کہا۔

"مجھے دو لاکھ منظور ہیں۔"

سہراب بولے۔ "اب تین لاکھ لوں گا۔"

جگت نارائن نے پوچھا۔ "یہ کیوں؟"

جواب ملا۔ "چار آنے والوں نے اسے پاس کر دیا ہے۔"

حکومتوں کی کامیابی اور ناکامیابی بھی چار آنے والوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ کسی حکومت کے متعلق ادنیٰ طبقے کی رائے اچھی ہے تو اسے کوئی نہیں ہلا سکتا اور ادنیٰ طبقہ جس حکومت سے بیزار ہے اسے کوئی باقی نہیں رکھ سکتا۔

(ملا واحدی)

ماہ نور علی۔ کراچی

سچ تو یہ ہے،

- جس معاشرے میں سچ کو خطرے کی علامت بنا دیا جائے وہاں آسمان سروں سے کھینچ لیا جاتا ہے اور زمین قدموں کے نیچے سے سرک جاتی ہے۔
- جہاں خواب و خیال چھین لیے جائیں وہاں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ہم انسانوں میں رہ رہے ہیں یا جانوروں کے ساتھ۔
- پتھروں سے واسطہ پڑے یا پتھر دلوں سے زندگی کا سفر رکتا نہیں۔
- کسی کی تمنا اور آرزو کے نیچے اپنی ہتھیلیاں رکھنا آسان کام نہیں ہے مگر جب یہ ہونے لگے تو اس سے اچھا کام کوئی نہیں کیونکہ دعاؤں اور وفاؤں کا پورا ذخیرہ ہاتھ لگتا ہے۔
- منفرد لوگوں کو مار سہنی پڑتی ہے۔ طعنوں کی یا تنہائی کی۔
- نقصان کیا ہے، وقت پر عمل کرنے سے چوک جانا۔
- طاقت سے دشمن کے اوپر فتح پانا آدھی فتح ہے اور محبت سے دشمن کے اوپر فتح پانا پوری فتح ہے۔

انجل۔ ڈہرکی

ایک پیغام،

اسپین کے شہر میڈرڈ کے ایک باغ میں درخت پر یہ الفاظ کندہ ہیں۔

"مجھے گزند مت پہنچایئے کیونکہ

- میں جاڑے کی برفانی راتوں میں آپ کے چولہے کی حرارت ہوں۔
- میں گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں آپ کو بچانے والا سایہ ہوں۔
- اپنے پھلوں سے اور ان سے بنے مشروبات کے ذریعے دورانِ سفر آپ کی پیاس میں ہی بجھاتا ہوں۔
- میں وہ شہتیر ہوں جس کے سہارے آپ کے گھر کی چھت قائم ہے۔
- آپ کے گھر کا دروازہ بھی ہوں۔
- میرے جسم ہی کو تراش کر آپ کشتی بناتے ہیں۔
- آپ کی کشتی کا چپو بھی میں ہوں۔
- میں آپ کی کدال کا دستہ ہوں۔
- میں آپ کا پہلا دوست ہوں۔
- میں ہی آپ کا سب سے آخری ساتھی بھی ہوں کیونکہ میں ہی آپ کے تابوت کا خول ہوں۔

عائشہ خان۔ ٹنڈو محمد خان

جہدِ مسلسل،

بیمہ ایجنٹ کے بے حد اصرار پر ایک سرمایہ دار ـــ

بیمہ پالیسی لینے پر آمادہ ہوگیا۔ سرمایہ دار نے بیمہ ایجنٹ سے کہا۔

"تم خوش نصیب ہو کہ آخر تم نے مجھے بیمہ پالیسی لینے پر راضی کرلیا۔ میں صبح سے اب تک اٹھارہ ایجنٹوں کو ٹال چکا ہوں۔"

"میں جانتا ہوں جناب! میں نویں مرتبہ آپ کے پاس آیا ہوں۔" بیمہ ایجنٹ نے کہا۔

حاکم کا انصاف،

مالک بن دینار کہتے ہیں کہ جب حضرت عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے تو چرواہے نہایت تعجب سے کہنے لگے کہ لوگوں پر کون خلیفہ مقرر ہوا ہے جو ہماری بکریوں کو بھیڑیے کچھ نہیں کہتے۔

دشمن سے سلوک،

خلیفہ منصور کا قول ہے۔

جب دشمن تیری طرف ہاتھ بڑھائے تو اگر تجھ میں طاقت ہے تو اس کا ہاتھ کاٹ ڈال ورنہ اسے چوم لے۔

غور طلب،

یہ بات بھی بڑی غور طلب ہے کہ اگر آپ کتے سے پیار محبت کا اظہار کریں، اسے تھپکی دیں تو وہ آپ کو دوست سمجھنے لگے گا لیکن اگر آپ بلی سے تھوڑی دیر پیار کریں، اسے سہلائیں، تھپکیاں دیں تو وہ خود کو دیوتا سمجھنا شروع کردیتی ہے۔

(اشفاق احمد۔ زاویہ)

شکوہ،

معانی بن سلیمان اپنے دوست کے ساتھ چہل قدمی کررہے تھے۔ دوست نے ماتھے پر بل لاکر کہا۔

"اف! آج کتنی سردی ہے۔"

معانی نے کہا۔ "اب تمہیں گرماہٹ مل گئی ہے؟"

وہ بولا۔ "نہیں۔"

اس پر معانی نے کہا۔ "پھر مذمت کرنے کا کیا فائدہ اگر سبحان اللہ کہہ دیتے تو بات بھی تھی۔"

عائشہ۔ گوجرہ

نظر ثانی،

"بیگم! آج میرا دوست ڈنر پر آرہا ہے۔" شوہر نے بیوی سے کہا۔

بیوی نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ "آپ کو پتا ہے کہ آج ملازمہ چھٹی پر ہے۔ برتن دھونے کے لیے سنک میں پڑے ہیں۔ باتھ روم میں میلے کپڑوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ منا بھی بیمار ہے اور۔۔۔"

"میں جانتا ہوں، سب جانتا ہوں۔" شوہر نے بیوی کی بات کاٹ کر تحمل سے کہا۔

"پھر بھی آپ اپنے دوست کو ڈنر پر بلا رہے ہیں۔" بیوی نے شکوہ کیا۔

"دراصل وہ بے وقوف آدمی شادی کرنا چاہ رہا ہے۔ میں نے اسی لیے اسے ڈنر پر بلایا ہے تاکہ وہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرسکے۔"

صائمہ جبی۔ کراچی

جہاں پناہ،

افلاطون کی شہرت جب یونان سے باہر نکلی تو ایک پڑوسی ملک کے بادشاہ نے اسے اپنے دربار میں بلاکر کتاب "جمہوریت" کی بہت تعریف کی اور فرمائش کی کہ افلاطون اس ملک کے لیے بھی کوئی آئینی خاکہ تیار کرے اور ملک چلانے کے گر بتائے۔

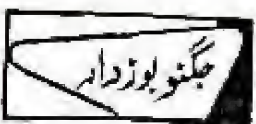
افلاطون نے شاہی فرمان کے مطابق مہمان بن کر کام شروع کردیا۔ پانچ ماہ بعد بادشاہ نے عظیم فلسفی کو دربار میں بلوایا اور پوچھا۔

"تم نے ہمارے ملک کے لیے جمہوری و دستوری خاکہ تیار کیا ہے یا نہیں؟"

افلاطون نے عرض کیا۔

"خاکہ تو میں نے تیار کرلیا ہے مگر اس میں جہاں پناہ کہیں نظر نہیں آتے۔"

ثنا عبدالقیوم۔ بنگہ چیمہ



کی ڈائری سے

کبھی زندگی میں ایسا بھی موڑ آتا ہے کہ آشنا چہرے بھی ناآشنا سے لگتے ہیں اور دنیا سے کٹ کر اپنا آپ تنہائی کی قید میں رہنا اچھا لگتا ہے۔ منیر نیازی کی یہ غزل آپ بھی پڑھیے۔

محفل آرا تھے مگر پھر بھی کم نما ہوتے گئے
دیکھتے ہی دیکھتے کیا سے کیا ہوتے گئے

ناشناسی دہر کی تنہا ہمیں کرتی گئی
ہوتے ہوتے ہم زمانے سے جدا ہوتے گئے

منتظر جیسے تھے در شہر فراق آثار کے
اک ذرا دستک ہوئی در و بام وا ہوتے گئے

حرف پردہ پوش تھے اظہار دل کے باب میں
حرف جتنے شہر میں تھے حرف لا ہوتے گئے

وقت کس تیزی سے گزرا روزمرہ میں منیر
آج کل ہوتا گیا اور دن ہوا ہوتے گئے



کی ڈائری سے

جب آشنا چہرے، شناسا آوازیں کھو جائیں تو زندگی بڑے بے ڈھب انداز میں گزرنے لگتی ہے۔ محسن نقوی میرے فیورٹ شعراء میں سے ہیں۔ ان کی یہ غزل جو مجھے بے حد و حساب پسند ہے۔ آپ سب کی نذر۔

دشت ہجراں میں نہ سایہ نہ صدا تیرے بعد
کتنے تنہا ہیں تیرے آبلہ پا تیرے بعد

لب پہ اک حرف طلب تھا نہ رہا تیرے بعد
دل میں تاثیر کی خواہش نہ دعا تیرے بعد

خواتین کی ڈائری

امت الصبور

درد سینے میں ہوا نوحہ سرا تیرے بعد
دل کی دھڑکن ہے کہ ماتم کی صدا تیرے بعد

تجھ سے بچھڑا ہوں تو مرجھا کے ہوا برد ہوا
کون دیتا مجھے کھلنے کی دعا تیرے بعد

ملنے والے کئی مفہوم پہن کر آئے
کوئی چہرہ بھی نہ آنکھوں نے پڑھا تیرے بعد

جان محسن مرا حاصل یہی مبہم سطریں
شعر کہنے کا ہنر بھول گیا تیرے بعد

زوال افضل گھمن

کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر اعتبار ساجد کی یہ غزل عزیز از جان ناہید مزمل بٹ ہزاروی اور عارفہ معین کے نام۔

پھول تھے رنگ تھے لمحوں کی صباحت ہم تھے
ایسے زندہ تھے کہ جینے کی علامت ہم تھے

سب خرد مند بنے پھرتے ہیں ہر محفل میں
اس ترے شہر میں اک صاحب وحشت ہم تھے

اب کسی اور کے ہاتھوں میں ترا ہاتھ سہی
یہ الگ بات کبھی اہل رفاقت ہم تھے

رتجگوں میں تیری یاد آئی تو احساس ہوا
تیری راتوں کا سکون نیند کی راحت ہم تھے

اب تو خود بھی اپنی ضرورت نہیں ہے ہم کو
وہ بھی دن تھے کہ کبھی تیری ضرورت ہم تھے





خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی.
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmall.com

نور عین..... لاہور

اس وقت دوپہر کے دو بجے کا وقت ہے اور میں کمرے میں اکیلی بیٹھی بڑی بے دلی سے یہ خط تحریر کر رہی ہوں اور جناب اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے بقر عید والے دن ایسا ہی خط تحریر کیا تھا لیکن کچھ ناگزیر وجوہات کی بنا پر وہ اس طرح پوسٹ ہوا کہ اب شاید ہی ادارہ خواتین تک پہنچے' کسی بھی ڈائجسٹ کے لیے لکھا جانے والا یہ میرا پہلا خط ہے جو میں کسی خاص وجہ سے لکھ رہی ہوں۔ "ہمارے نام" میں شرکت کرنے کی سب سے بڑی اور اہم وجہ محترمہ ماریہ صاحبہ فرام لاہور کا خط ہے۔ جی ہاں' قارئین میں بھی اپنی فیورٹ رائٹر سائرہ رضا ہی کی طرح خواتین' شعاع اور کرن کا لفظ لفظ پڑھ ڈالتی ہوں۔ ایک بار نہیں کئی بار۔ روزانہ صبح ناشتے کے لیے سب کے اٹھنے سے پہلے ایک دو گھنٹے میں صرف ان ہی کا مطالعہ کرتی ہوں جس پر میرے والد صاحب روزانہ مجھے تنبیہہ کرتے ہیں (مسکراتے ہوئے) "بس بھی کرو پہلے تمہاری نظر بڑی اچھی ہے" اب سمجھ بھی جائیں ناں لیٹ کر جو پڑھتی ہوں اور میرے سرہانے پڑا نظر کا چشمہ میرے والد صاحب کو بہت برا لگتا ہے۔

خواتین ڈائجسٹ نہ جانے پچھلے کتنے سالوں سے زیر مطالعہ ہے۔ سو اس کے اعلا معیار کی میں دل سے قائل ہوں خیر بات ہو رہی تھی ماریہ صاحبہ کے خط کی۔ ان کا خط پڑھ کر میں کافی دیر ڈسٹرب رہی اور اب بھی ہوں کیوں؟ یہ بعد میں بتاؤں گی۔

میں جانتی ہوں اور اس بات کو اچھی طرح سمجھتی بھی ہوں کہ ایک قاری تعریف کے ساتھ ساتھ تنقید کا بھی پورا پورا حق رکھتا ہے' لیکن اپنا حق استعمال کرتے ہوئے دوسروں کے حقوق کو کہیں پس پشت ڈال دینا کہاں کا انصاف ہے' ایک ڈائجسٹ معیاری ڈائجسٹ تب ہی کہلاتا ہے جب اس میں چھپنے والی کہانیوں میں کوئی نہ کوئی میسج ضرور ہو' سب میں نہ ہو کچھ میں ہی سہی تاکہ ہماری بہنوں کے کچے ذہن صرف سراب کے پیچھے بھاگنا نہ سیکھیں کہ ان رسالوں کو پڑھنے والی لڑکیاں ان سے بہت اثر لیتی ہیں' میں یہ بالکل نہیں کہتی کہ کہانیوں میں رومانس کا عنصر ختم کر دیا جائے کیونکہ بہرحال یہ رسالے تفریح کی غرض سے ہی پڑھے جاتے ہیں لیکن اگر ہلکی پھلکی خوب صورت پیرائے میں لکھی گئی کہانیاں اپنے قاری کو کوئی اچھا میسج دے بھی دیں تو اس میں غلط کیا ہے؟ میرا یہ سوال قارئین سے ہے پلیز جواب ضرور دیجیے گا۔

رہی بات نیکی کے درس کی تو نیکی گلاب کی خوشبو کی مانند ہوتی ہے' جس کی خوشبو کبھی حس شامہ کو لبھانا نہیں چھوڑتی۔ سمیرا حمید کا "مہر ثبت" میں نے دوبار پڑھا اور ہر بار کھو گئی۔ ایک کہانی آپ کو بار بار صفحے پلٹنے پر مجبور کردے' یہ ہی تو ایک اچھی کہانی کی پہچان ہے اور سمیرا حمید کو ایسی کہانیاں لکھنا بہت اچھی طرح آتا ہے۔ رومانٹک کہانیوں کے ساتھ اصلاحی کہانیاں بھی بے حد ضروری ہیں۔ اور اگر ایسا نہ ہوتا تو "پیر کامل" اور "جنت کے پتے" جیسی تحاریر دل پر نقش نہ ہو جاتیں۔

اب میں آپ کو اپنی ڈسٹربنس کی وجہ بھی بتاتی ہوں۔ ایک رائٹر تب ہی کوئی کہانی بنتا ہے جب وہ کسی خیال سے' کسی بات سے یا پھر کسی واقعے سے متاثر ہوتا ہے' جیسے جب میں نے "مداوا" لکھی تب مجھے میرے والد صاحب نے ایسے ہی باتوں باتوں میں بچھو بوٹی کے متعلق بتایا تھا اور میں نے اسی رات ایک کہانی بن لی۔ اب پچھلے پانچ چھ دنوں سے میرے ذہن میں مختلف موضوعات پر کہانیوں کی ایک فلم چل رہی ہے' لیکن میں ان کو لکھنے سے ہچکچا رہی ہوں۔ کیونکہ آپ سب کا (قارئین) اصرار ہے کہ کہانی میں کوئی میسج نہ ہو' میں اچھی طرح سمجھ سکتی ہوں کہ سب رائٹرز میری ہی طرح گومگو کی کیفیت کا شکار ہوں گی۔ آخر میں ان سب قارئین سے معذرت چاہوں گی جنہیں میری باتیں بری لگی ہیں' کیونکہ میں خود ہلکی پھلکی کہانیوں کی بڑی مداح ہوں' سو یہ بالکل نہ سمجھا جائے کہ میں ایسی کہانیوں کی اشاعت کے سخت خلاف ہوں' اگر قسمت نے ساتھ دیا تو آپ جلد ہی میری ہلکی پھلکی رومانٹک تحریریں بھی پڑھیں گے۔

ویسے قارئین آپس کی بات ہے اگر کہانی میں لڑکا لڑکی کا رومانس نہ بھی ہو' تب بھی روزمرہ کے ہلکے پھلکے واقعات بہن بھائیوں کی نوک جھونک' شاپنگ' میک اپ' جھلملاتی جیولری کہانی کو حسین بنا ہی دیتے ہیں خیر یہ میرا ذاتی خیال ہے۔ کسی کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

ج : پیاری نور عین! آپ کا خط قارئین تک پہنچا رہے ہیں۔ آپ کہانیاں ضرور لکھیں اور جو تھیم آپ کے ذہن میں ہے اسی کے مطابق لکھیں لیکن ڈائریکٹ تبلیغ نہیں بلکہ قارئین کو خود نتیجہ اخذ کرنے دیں۔ آپ صرف تصویر بنائیں اس تصویر کی تشریح نہ کریں۔ غیر ضروری تفصیل اور تقریر کہانی کو بے مزہ کردیتی ہے۔ بات نصیحت اور نیکی کے درس کی نہیں' بلکہ کہانی لکھنے کے انداز کی ہے۔

نمرہ کشور..... ملیسی

جتنی پیاری پیاری کہانیاں ستمبر کے خواتین میں تھیں اتنے ہی خوب صورت بھرے اکتوبر میں پڑھنے کو ملے' مزہ آگیا۔ لیکن "عہد الست" اور "مہر ثبت" پر ایسی بے تکی تنقید' بڑا افسوس ہوا' ہمارے خیال میں تو یہ تحریریں مدتوں ذہن سے محو نہ ہو سکیں گی۔ "کمل" ہماری موسٹ فیورٹ رائٹر کا ناول۔ یہ قسط پڑھ کے بھی بہت مزا آیا۔ "فارس ماموں کا لویٹر" "ایل شیپ والے جوتے جو لنڈے سے لیے تھے ہاہا کتنا فنی لکھتی ہیں' نمرہ آپی' اللہ پاک کا فرمان ہے "شہید زندہ ہیں انہیں مردہ نہ کہو" یعنی شہیدوں کے لیے ہمیشہ کی زندگی ہے.... لیکن یہ ہمیشہ کے لیے چیونٹیاں.... ہائے اللہ! کیسے سمجھ میں آئے یہ فقرہ! اور چیونٹی سے مجھے ہر دفعہ ایک حدیث پاک یاد آتی ہے کہ "شہید کو شہادت کے وقت اتنی سی تکلیف ہوتی ہے' جتنی ایک چیونٹی کے کاٹنے سے ہوتی ہے۔"

ج : نمرہ! "ہمیشہ کے لیے چیونٹیاں" یہ ایک فلسفہ ہے جس کے مطابق کمزور لوگ جو ہمیشہ چیونٹی کی طرح بظاہر چھوٹے اور کمزور نظر آتے ہیں لیکن وہ اپنی اسی کمزور حیثیت میں انتقام لیتے ہیں' جس طرح ایک کمزور چیونٹی ہاتھی کی سونڈ میں گھس جائے تو اسے بے بس کردیتی ہے' اشعار ایک ہی بار اکٹھے بھی بھیجے جاسکتے ہیں اور نظمیں غزلیں بھی آپ ایک ساتھ ہی بھیج سکتی ہیں۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

فرحانہ ریاض..... سرگودھا

خط لکھنے کی وجہ ملتان سے شیریں ظفر کا خط ہے۔ جس میں انہوں نے "کمل" ناول میں شائع ہونے والی کچھ غلطیوں کا تذکرہ کیا۔ شیریں صاحبہ کے بقول ستمبر کی قسط میں حنین جن فلموں کا ذکر اور نگ زیب سے کرتی ہے وہ اس وقت کے بعد کی ہیں جو نمرہ نے دکھایا۔

معذرت کے ساتھ مگر یہاں غلطی مصنفہ کی نہیں آپ

اعتذار

کچھ ناگزیر وجوہات کی بنا پر اس ماہ بہن عفت سحر طاہر کے ناول "من مانگی دعا" کی قسط شامل اشاعت نہ کرسکے۔
اس کے لیے قارئین سے معذرت خواہ ہیں۔
آئندہ ماہ آپ یہ قسط پڑھ سکیں گی' ان شاء اللہ۔

اپنے گھر میں بہت اہمیت ہوتی ہے اس کا خیال رکھنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ نفرت سے اپنا اور اس کا موازنہ کرتی ہے امی کزن کے کہنے پر اس کے دادا لڑکی کو میڈیکل کالج میں پڑھنے کی پرمیشن دے دیتے ہیں لیکن وہ غصے میں داخلہ نہیں۔

پلیز بجو اگر آپ کو یا کسی قاری کو اس کہانی کا نام اور رائٹر کا نام پتا ہو تو ضرور بتا دے۔

ج : پیاری حوریہ! ہم آپ کی امی کی کامل شفایابی کے لیے دعاگو ہیں۔ ان شاء اللہ وہ ٹھیک ہو جائیں گی۔ قارئین سے بھی دعا کی درخواست ہے۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ اگر قارئین میں سے کسی نے اس کہانی کو پہچان لیا تو ہم ضرور شائع کریں گے مرونڈے تو ہمیں بہت پسند ہیں اور آپ کے ہاتھ کے تو یقیناً "زیادہ مزے دار ہوں گے۔ امی صحت یاب ہو جائیں تو ضرور بھجوائیں۔

مدثرہ کوثر (بنت حوا) چک نمبر 632 چوک سرور شہید

پانچ سالوں میں دس سال کے "خواتین" پڑھے پھر بھی کیا میرا اتنا بھی حق نہیں بنتا کہ میرا خط شائع ہو؟ نمرہ احمد کو اگر خط بھیجنا ہو تو کیسے بھیجوں؟ عنیزہ سید تو پورے رسالے کی جان ہیں۔ بے شک کہانی پرانی (ہر کسی کی ذات گم شدہ) ہے مگر انداز اور پھر فلاسفیاں!!! نمرہ احمد جزئیات نگاری میں اول نمبر پر ہیں تو تنزیلہ ریاض اتنے حساس اور گہرے موضوع میں لکھنے پر۔ کہانی "عہد الست" کے کردار تو ایسے ہیں کہ ماضی 'حال کا ہی نہیں پتا چلتا۔

ج : مدثرہ! سب سے پہلے معذرت کہ آپ کا پچھلا خط شائع نہیں ہو سکا۔ خواتین ڈائجسٹ پر آپ کا پورا حق ہے۔ نمرہ احمد کو آپ ہماری معرفت خط لکھ سکتی ہیں' ہم ان تک پہنچا دیں گے۔ عہد الست کے کردار اب واضح ہو گئے ہیں اور کہانی بھی ۔۔۔ ہمارے خیال میں تو اب کوئی کنفیوژن نہیں ہونا چاہیے۔

مشعل فیاض ۔۔۔ گوجرانوالہ

ردا آفتاب سے گفتگو اچھی رہی۔ عنیزہ سید کی تحریریں میں نے کبھی پڑھی نہیں۔ "بن مانگی دعا" اگر عفت آپی چاہتیں تو دریا کو کوزے میں بند کر دیتیں اور اچھا سا ناول بھی ہم پڑھ لیتے۔ نمرہ احمد! آئی ریئلی لو یو پلیز فارس اور زمر کی شادی کرا دینا۔ (مزا آجائے گا) تنزیلہ ریاض آپ کا میں نے مرگ برگ پڑھا جب میں 10th میں تھی (پرانے رسالوں میں سے) اب سیکنڈ ایئر میں ہوں ویل ڈن امیزنگ۔ نور عین زبردست۔ شیریں ملک اور عتیقہ محمد بیگ کے افسانے پسند نہیں آئے۔ ام طیفور آپ میرے ہی شہر کی ہیں اور ہمارا شہر کسی سے کم نہیں۔ بازی لے گئیں۔ دستر خوان پڑھ کر مزہ آیا۔ صرف پڑھ کر۔ ٹرائی کرنے کو دل نہیں کیا۔

ج : پیاری مشعل! خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

نرگس نور' شکیلہ نور ۔۔۔ لالہ موسیٰ

آج مجھے کسی تحریر نے نہیں ایک خط نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا ہے جو کہ ماریہ نے لاہور سے لکھا تھا۔ دیکھیں ماریہ جی بے شک ہم رسالہ ٹینشن ریلیز کرنے کے لیے پڑھتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی انسان ایسی چویشن میں ہوتا ہے کہ اپنا دل تازہ کرنے کے بجائے ایمان تازہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے ہو سکتا ہے آپ کے پاس دینی کتابیں ہوں۔ لیکن مسئلہ دوسری قاری بہنوں کا بھی تو ہے۔ ہو سکتا ہے ان کے پاس یہی ایک ذریعہ ہو دین اسلام کے بارے میں جاننے کا۔ جیسے کہ ایک قاری بہن نے لکھا کہ جنت کے پتے کہانی پڑھنے کی وجہ سے انہوں نے پردہ کرنا شروع کیا۔ مجھے اس خط کو پڑھ کر بہت غصہ آیا میں نہیں جانتی کہ آپ میرا خط شائع کریں گی یا نہیں۔ لیکن پلیز ماریہ جی کو ایک بات ضرور بتا دیجیے گا کہ رومانس ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی اسلامی کہانیاں پڑھنی بھی ضروری ہوتی ہیں پلیز شاہد آفریدی کا انٹرویو شامل کریں۔

ج : نرگس اور شکیلہ! اس میں غصہ آنے کی تو کوئی بات ہی نہیں۔ ہر ایک کی پسند' ناپسند الگ ہوتی ہے اور ہر ایک کو اپنی رائے رکھنے' اس کا اظہار کرنے کا حق ہے اور سچ کہیں تو زیادتی ہر چیز کی بری ہوتی ہے۔ کبھی کبھی ہمیں خود بھی محسوس ہوتا ہے کہ ہماری مصنفین کہانی کے فنی تقاضوں کو نظر انداز کر رہی ہیں۔ فکشن میں کبھی بھی ڈائریکٹ نہیں ہونا چاہیے اور دلچسپی کا عنصر برقرار رہنا چاہیے۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

کومل ۔۔۔ گوجرانوالہ

ٹائٹل کے بارے میں اتنی بار کہا گیا ہے کہ کبھی کچھ مختلف دے دیا کریں۔ ماڈل گرل کے علاوہ۔ لیکن کبھی بھی اس میں چینج نہیں آیا۔

ج ، پیاری کومل! آپ کا مشورہ سر آنکھوں پر' لیکن کسی بھی چیز کی شناخت اور پہچان بدلنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔

پاکیزہ ہاشمی ۔۔۔ نامعلوم شہر

سب سے پہلے ہمارے نام پڑھا اور ماریہ جی کا انداز کافی سے زیادہ برا لگا۔ ہمیں تو شعاع اور خواتین بہت معیاری لگتے ہیں تو میں انہیں بتانا چاہوں گی کہ نمرہ احمد کو پڑھنے کے لیے دل چاہیے جو ان کے الفاظ کی خوب صورتی کو محسوس کر سکے۔ سمیرا حمید کو پڑھ کے لگتا ہے کہ ہم بھی ان کی اسٹوری کے ساتھ موجود ہیں۔ اگر تھوڑی سی نیکی کا درس اور اصلاح آپ کو پیسے کا ضیاع لگتا ہے تو بس کیا کہوں میں؟

ج ، پاکیزہ! شعاع اور خواتین آپ کو پسند ہیں' بہت شکریہ۔ پسند ناپسند مختلف ہو سکتی ہے اور اس کے اظہار میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ ماریہ بہن نے اپنی رائے کا اظہار کیا تو یہ ان کا حق تھا۔ ہم اپنی تمام قارئین کی رائے کا احترام کرتے ہیں۔

بشریٰ صدیقی ۔۔۔ چیچہ وطنی

معذرت کے ساتھ کہنا پڑھ رہا ہے کہ اس بار کا خواتین انتہائی بور تھا۔ عہد الست اور نمل اچھے رہیں۔ "کوہ گراں" میں جب سے طیفا آیا تھا تب سے اندازہ تھا کہ یہی قاتل ہو گا' یہ بات سعد کو بتانے میں کیا حرج تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا۔

ج ، پیاری بشریٰ! ہمیں افسوس ہے کہ اس بار خواتین ڈائجسٹ آپ کو پسند نہیں آیا۔ ہم اسے مزید بہتر بنانے کی کوشش کریں گے۔

عائشہ نور ۔۔۔ لاہور

آپی جی! میں ڈائجسٹ صرف پڑھتی ہی نہیں ہوں بہت پیار سے ان کا خیال بھی رکھتی ہوں۔ میں نے 2009ء میں باقاعدگی سے پڑھنا شروع کیا تھا۔ میں نے کسی ڈائجسٹ کا ٹائٹل بھی خراب نہیں ہونے دیا۔ میں نے زندگی میں اگر اپنی امی ابو کے بعد کسی سے پیار کیا ہے تو وہ خواتین ڈائجسٹ سے کیا۔

ج، شکریہ عائشہ! ہمیں خوشی ہے کہ ہماری قارئین ہمارے پرچوں سے اتنی محبت کرتی ہیں۔

☼

قارئین متوجہ ہوں!

1 خواتین ڈائجسٹ کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جا سکتے ہیں۔ تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔
2 افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کر سکتے ہیں۔
3 ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔
4 کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔
5 مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں۔ ناقابل اشاعت کی صورت میں تحریر واپسی ممکن نہیں ہو گی۔
6 تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔
7 خواتین ڈائجسٹ کے لیے افسانے' خط یا سلسلوں کے لیے انتخاب' اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

ادارہ خواتین۔ 37 اردو بازار کراچی۔



ہر ڈرامے کی ماں

شاہین خان سے ملاقات

شاہین رشید

کچھ خواتین ایسی ہوتی ہیں جو نوعمری میں تو خوب صورت ہوتی ہی ہیں۔ لیکن جب وہ اپنے اس دور سے نکلتی ہیں تو ان کی شخصیت میں زیادہ نکھار اور گریس آجاتا ہے اور ان کی شخصیت ایک رعب دار پرسنالٹی میں بدل جاتی ہے۔۔۔ "شاہین خان" بھی ان ہی میں سے ایک ہیں جنہیں آپ آج کل کافی ڈراموں میں دیکھ رہے ہیں۔ ڈرامہ سیریل "چپ رہو" اور "خطا" آج کل بہت پسند کیے جا رہے ہیں اور ان ڈراموں میں "شاہین خان" ایک دکھیاری اور شفیق ماں کا رول کر رہی ہیں۔ اپنی بہترین پرفارمنس کی وجہ سے ناظرین انہیں بہت پسند کر رہے ہیں۔

"کیسی ہیں شاہین صاحبہ؟"

"جی اللہ کا شکر ہے۔"

"ماشاء اللہ اتنا اچھا کام کر رہی ہیں۔ ہر دوسرے ڈرامے میں نظر آ رہی ہیں۔ کہاں تھیں اتنا عرصہ؟"

"بات یہ ہے کہ مجھے پاکستان میں قیام کیے ہوئے تقریباً" دس سال ہو گئے ہیں اس سے قبل میں جاب کرتی تھی "سعودی ایرلائن" میں بہ حیثیت "ایر ہوسٹس" کے تو زندگی کا زیادہ حصہ سعودی عرب اور لندن میں گزرا یعنی پہلے سعودی عرب، پھر لندن، پھر سعودی عرب اور اب پاکستان میں ہوں۔"

"بحیثیت ایر ہوسٹس کے جاب اور میزبانی کرنا کیسا لگتا تھا؟"

"بہت اچھا لگتا تھا۔ میں نے اپنی اس جاب کو بہت انجوائے کیا تھا۔ بہت ہی دلچسپ جاب، پوری دنیا آپ گھومتے ہیں۔ مختلف لوگوں سے ملتے ہیں مختلف ثقافت دیکھنے کو ملتی ہے۔ آپ کا ویژن وسیع ہو جاتا ہے۔ آپ کی سوچ میں بہت فرق آجاتا ہے دل و دماغ سوچ کے معاملے میں کھل جاتے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس سے اچھی جاب تو کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔"

"مسافروں نے کبھی تنگ کیا؟ کتنے سال جاب کی؟ اور پاکستان آنے کی وجہ۔"

"نہیں کبھی نہیں، ہماری ٹریننگ ہی اس طرح کی ہوتی ہے کہ اگر کوئی کچھ کہے بھی تو آپ کو برداشت کرنا ہے۔ مگر اللہ کا شکر ایسا کچھ نہیں ہوا، بہت اچھی

ایئرلائن کے ساتھ میں نے کام کیا ہے اور تقریباً" تیرہ چودہ سال میں نے جاب کی۔ پھر لندن چلی گئی۔ اب کراچی میں ہوں۔ میرا ایک بیٹا لندن میں زیر تعلیم ہے۔ دو بچے چھوٹے ہیں ایک بیٹی اور ایک بیٹا۔۔ اور پاکستان آنے کی وجہ یہ تھی کہ میرے شوہر باہر رہنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا دل تھا کہ ہم مستقل طور پر پاکستان میں رہیں۔"

"باہر سے آکر لوگ بہت پچھتاتے ہیں کہ کاش نہ آتے؟"

"نہیں ایسا کچھ نہیں ہے۔ ہمیں بالکل بھی پچھتاوا نہیں ہے ہم پاکستان آکر بہت خوش ہیں۔۔۔ ہم پاکستانی ہیں اور ہمیں فخر ہے اپنے پاکستانی ہونے پر اور آپ یہ بھی تو دیکھیں کہ آپ کسی بھی ملک میں جائیں آپ کہلاتے تو دوسرے درجے کے شہری ہی ہیں نا۔۔۔ پاکستان تو اپنا ہے اور پھر یہ بھی بات ہے کہ سب کچھ اچھا ہو رہا ہوتا ہے۔ آپ کے بچے بھی پڑھ لکھ جاتے ہیں مگر اینڈ کیا ہوتا ہے آپ تمام فرائض سے فارغ ہو کر اکیلے رہ جاتے ہیں یا تو مکمل فیملی ہو، سب رشتے دار ہوں۔ لیکن جب ایک سنگل فیملی کے طور پر رہ رہے ہوں تو بچوں کی اپنی لائف شروع ہو جاتی ہے تو پھر ذرا مشکل ہو جاتا ہے باہر رہنا۔۔۔ بے شک 99 فیصد وہاں سب کچھ اچھا ہے لیکن جو ایک فیصد دوری ہوتی ہے، وہ تکلیف دیتی ہے۔"

"فیلڈ میں کیسے آئیں آپ؟"

"ہمیشہ سے میری عادت تھی کہ میں لوگوں کی نقلیں بہت اچھی کر لیا کرتی تھی، میری ایک دوست تھی جو کہ رائٹر بھی تھی۔ اس نے جاب چھوڑ کر اپنی توجہ لکھنے پر مرکوز کر دی۔۔۔ اور مجھے کہا کہ میں پی ٹی وی کے لیے کچھ لکھ رہی ہوں اور تم نے اس میں ایکٹ کرنا ہے۔۔۔ اس وقت میرا بیٹا بہت چھوٹا تھا میں نے کہا کہ کس طرح کروں گی۔۔۔ خیر میں کاظم پاشا کے پاس گئی، انہوں نے میرا انٹرویو کیا اور کچھ ڈائیلاگ دیے بولنے کے لیے، میں نے ڈائیلاگ بولے تو کہنے لگے کہ ٹھیک ہے، کل سے آپ کی ریکارڈنگ ہے آپ آجائیے گا اور بس۔۔۔ ایک پلے کیا اسے لوگوں نے دیکھا خاص طور پر پی ٹی وی کے لوگوں نے دیکھا اور مزید کالز آئیں۔۔۔ پھر منظور قریشی اور حیدر امام رضوی کے ساتھ کام کیا۔ پرائیویٹ پروڈکشن کے ساتھ کام کیا، بس پھر چل سو چل کام ملتا گیا، میں کرتی گئی اور میرا پہلا ڈرامہ سیریل "تھوڑا سا آسمان" تھا جو کہ کاظم پاشا کی پروڈکشن اور ڈائریکشن تھی۔"

"پہچان اب بنی۔۔۔ وجہ؟ کتنے سال ہو گئے ہیں اس فیلڈ میں؟"

"وجہ یہ تھی کہ میں نے مسلسل کام نہیں کیا کہ جیسے لوگ کرتے ہیں، میں نے کبھی بھی اسے بطور پروفیشن نہیں لیا بلکہ یہ میرا شوق تھا اور جب ٹائم ملتا تھا کر لیتی تھی۔۔۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ میڈیا ایک ایسی چیز ہے کہ جس میں آپ نظر آتے رہیں تو لوگ آپ کو پہچانتے ہیں، لیکن اگر آپ نے ایک ڈرامہ کے بعد چھ ماہ کا گیپ دیا تو پھر لوگ نہیں پہچانتے۔۔۔ مجھے اس فیلڈ میں پانچ سال ہو گئے ہیں، اور لوگوں نے مجھے مسلسل نہیں دیکھا۔ درمیان میں، میں نے ایک فلم میں کام کیا اور تقریباً" ایک سال تک میں میڈیا سے کٹ سی گئی تھی، کیوں کہ فلم میں ٹائم بہت لگ گیا تھا۔ وہ فلم بھی بے حد کمال کی تھی "گڈ مارننگ ان کراچی" بس اس کی تکمیل کے بعد میں نے ڈراموں میں دوبارہ کام شروع کیا اور اب چونکہ ایک کے بعد ایک سیریل چل رہے ہیں تو لوگوں کو پہچان ہوئی کہ "شاہین خان" بھی کوئی آرٹسٹ ہے۔"

"آپ کو زیادہ تر شفیق اور محبت کرنے والی ماں کے رول میں دیکھا ہے آپ کو غریب گھرانے کی ماں کا رول دیں تو کریں گی؟ کیونکہ آپ غریب لگتی نہیں ہیں؟"

"شروع شروع میں تو کردار کی آفر اس طرح آتی تھی کہ وہ جو لندن سے آئی ہوئی ہیں ان کو بک کر لیں، کیونکہ وہ ماڈرن اور ہیپی فیملی کی مدر کے لیے موزوں ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار حیدر امام رضوی صاحب

کا فون آیا کہ ایک ایلیٹ فیملی ہے اور آپ باہر سے آئی ہیں۔ اس طرح کا رول ہے آپ کا تو میں نے کہا کہ حیدر بھائی کوئی اور کردار ہے؟ کہنے لگے کہ ہاں ہے مگر آپ نہیں کر سکیں گی میں نے پوچھا کہ کیا رول ہے تو کہنے لگے کہ ایک فقیرنی کی ماں کا رول ہے تو میں نے کہا کہ پلیز آپ مجھے چانس دیں میں آپ کو کر کے دکھاؤں گی ۔۔۔ کہنے لگے کہ یہ تو ایک سرائیکی فیملی کا کردار ہے، میں نے کہا میرا بیک گراؤنڈ بھی ملتان سے ہے ۔۔۔ تو کہنے لگے کہ کیا آپ سرائیکی لہجہ اپنا لیں گی۔ میں نے کہا کہ میں آپ کو بول کر بتا دیتی ہوں ۔۔۔ اور جب میں نے سرائیکی بولی تو وہ بہت حیران ہوئے، میری شکل دیکھنے لگے۔ تو میں نے کہا کہ میرے بچپن میں میرے اردگرد جو سرونٹ تھے وہ سب سرائیکی تھے تو نہ صرف بہت اچھی طرح سمجھتی ہوں بلکہ بول بھی لیتی ہوں ۔۔۔ تو "ٹیکسی ڈرائیور" کے نام سے وہ پلے ایک ایسے چینل سے چلا جو زیادہ مقبول نہیں تھا اس لیے میرا کام صحیح طرح رجسٹرڈ نہیں ہوا، مگر جنہوں نے دیکھا بہت تعریف کی۔"

"آج کل تو ایک سمپل ماں کے ہی رول آپ کر رہی ہیں مختلف رولز کے لیے آپ ڈائریکٹرز سے کہتی ہیں؟"

"بالکل کہتی ہوں ۔۔۔ اور مجھے یہ بھی یاد ہے 'زیادہ دور کی بات نہیں ہے۔ ہم ٹی وی کے ایک سیریل میں مجھے غریب عورت کے کردار کے لیے کاسٹ کیا گیا تو چینل والوں نے کہا کہ وہ غریب نہیں لگیں گی۔ آپ نے کیسے انہیں بک کر لیا؟ تو ڈائریکٹر نے کہا کہ مجھ پر بھروسہ کریں میں کروالوں گا ۔۔۔ اور جب میں نے وہ کردار کیا تو لوگوں نے کافی پسند کیا وہ سیریل تھا "کہانی رائمہ اور مناہل کی"

"آپ کے فن کے بارے میں مزید باتوں سے پہلے آپ اپنا فیملی بیک گراؤنڈ بتائیں؟"

"میرا تعلق پنجاب کے شہر ملتان سے ہے، ہم تین بہنیں اور پانچ بھائی ہیں۔ ایک بھائی کا انتقال ہو چکا ہے۔ اور میں اپنی فیملی میں سب سے چھوٹی ہوں۔ سب ماشاء اللہ سے شادی شدہ ہیں۔ ایک بہن پنجاب میں ہے جہاں امی ان کے پاس ہوتی ہیں ۔۔۔ تین بھائی کراچی میں رہتے ہیں ۔۔۔ الحمدوللہ سب خوش ہیں اپنی زندگی میں ۔۔۔ میری تعلیم گریجویشن تک ہے، تعلیم کے بعد جاب کرنے کو دل چاہا۔ سعودی ایئرلائن میں ایئر ہوسٹس کے لیے اشتہار آیا۔ میں نے اپلائی کیا اور منتخب ہو گئی اور سعودی عرب چلی گئی۔ میں لکی تھی کہ مجھے یہ جاب مل گئی ۔۔۔ میڈیا میں آنے کا بھی دل چاہتا تھا، مگر جیسا کہ ہوتا ہے فیملیز میں کہ اجازت نہیں ملتی لڑکی کو۔ اب جو آئی ہوں تو شوہر کی اجازت سے آئی ہوں اور ایئر ہوسٹس کی جاب کے لیے بھی فیملی نے مخالفت کی۔ مگر اللہ کا شکر ہے کہ مان گئے ۔۔۔ اور میں اپنی امی کی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میرا ساتھ دیا اور میں جہاں بھی گئی۔ میری امی میرے ساتھ ہوتی تھیں۔ اور ہاں میں 2 جولائی کو پیدا ہوئی۔"

"آپ اب بھی اتنی حسین ہیں۔ ینگ ایج میں تو مشکل ہوتی ہوگی؟"

"وہ عمر بہت احتیاط کے ساتھ گزاری، گارڈ کے ساتھ ہی آتی جاتی تھی یا بھائی کے ساتھ یا فیملی کے ساتھ، اکیلے آنے جانے کی اجازت نہیں تھی۔"

"شادی ۔۔۔؟"

"جی الحمدوللہ بہت خوشگوار زندگی گزار رہی ہوں۔ پسند سے کی۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے اور میرے میاں صاحب بھی آرٹسٹ ہیں، پینٹر ہیں ان کا نام فرخ شہاب ہے۔"

"اب بتائیے کہ آج کل کیا انڈر پروڈکشن ہے اور کیا مکمل ہے؟"

"دو پروجیکٹس پہ کام ہو رہا ہے جو کہ نومبر میں آن ایئر ہو جائیں گے اے آر وائی سے۔ ایک فلم کر رہی ہوں اور اس کو مزید ڈس کلوز نہیں کرنا چاہتی۔ دسمبر سے اس کی شوٹ شروع ہو جائے گی اور یاسر نواز ڈائریکٹر ہیں۔ ڈراموں میں A پلس کے لیے ایک پروجیکٹ کر رہی ہوں، باقی کے لیے بات چیت چل رہی ہے۔"

"آپ بتا رہی تھیں کہ آپ صبح 10 بجے شوٹ



پہنچ جاتی ہیں۔ تو اتنی وقت کی پابندی، پھر صبح کا وقت، فیملی لائف ڈسٹرب ہوتی ہے؟"

"مجھے جو لوگ جانتے ہیں اور جن کے ساتھ میں نے کام کیا ہے ۔۔۔ ان سب کو یہ معلوم ہے کہ شاہین صاحبہ کو اگر کال کی ہے تو انہیں اسی وقت بلایا جائے، جب سب آجائیں۔ میرے والد صاحب بہت پنکچوئل ہیں اور وہ جب کسی کو ٹائم دیا کرتے تھے تو یہ ضرور کہا کرتے تھے کہ اگر میں وقت پہ پہنچ گیا تو ٹھیک اگر نہ پہنچا تو سمجھ لینا کہ مجھے کچھ ہو گیا ہے یا مر گیا ہوں۔ تو بس ذہن میں یہ بات سما گئی کہ، جس کو ٹائم دیا ہے اس کی اور وقت دونوں کی عزت و قدر کرنی ہے اور فیملی لائف کے ڈسٹرب ہونے کی بات ہے تو میرے میاں صاحب کا اسٹوڈیو گھر میں ہی ہے۔ میری بیٹی بارہ سال کی ہے اور بیٹا دس سال کا۔ ایک بیٹا ملک سے باہر ہے۔ تو میں مینیج کر لیتی ہوں میاں صاحب گھر میں ہوتے ہیں، اور نوکر چاکر بھی لیکن بچوں کے لیے کھانا بھی خود بناتی ہوں اور انہیں اسکول بھی خود ہی تیار کر کے بھیجتی ہوں۔ اور الحمدوللہ جوائنٹ فیملی ہے۔"

"آج کل بڑے حساس موضوع پہ ڈرامہ سیریل "چپ رہو" آن ایئر ہے اگر یہ حادثہ آپ کی بیٹی کے ساتھ ہوتا تو آپ کیا کرتیں؟"

"میں بالکل بھی ایسی ماں نہیں ہوں اور جب مجھے اسکرپٹ ملا اور میں نے اسے پڑھا تو میں نے سوچا کہ یہ تو میری پرسنالٹی سے بالکل مختلف ہے اور یہ میں نہیں ہوں۔ میں تو بہت بولڈ وومن ہوں اور مجھے پتہ ہے کہ اپنے حقوق کو کس طرح حاصل کرنا ہے یا حقوق کے لیے کس طرح بولنا ہے۔ میرے تو گھر والے دیکھیں گے تو وہ کہیں گے کہ یہ آپ کیا کر رہی ہیں۔ لیکن میں نے یہ رول کیا اور یہ کردار ان خواتین یا ماؤں کے لیے ہے، جن کے ساتھ ایسا ہوا اور انہوں نے کہا کہ چپ رہو تو چپ نہیں رہنا چاہیے۔ آپ آگے کی اسٹوری دیکھیے گا تو آپ کو پتا چلے گا کہ چپ رہ کر بڑی بیٹی کے ساتھ کتنی زیادتی کی گئی۔"

"اب ہمارے ڈرامے کچھ بولڈ نہیں ہو گئے؟ آپ بتائیں کہ کیا آج کل کے ڈرامے اچھے ہیں، بولڈ ہیں یا ہم ڈراموں کی دنیا میں ابھی بھی پیچھے ہیں؟"

"سچ پوچھیں تو میڈیا نے لوگوں کو بہت آگہی و شعور دیا ہے، جو چیزیں ہمارے آس پاس ہیں وہ اب سے نہیں ہیں بہت پہلے سے ہیں۔ "شادی" بچے 'لو' طلاق' ریپ یہ ہمارے معاشرے میں ہمیشہ سے ہیں۔ ان کو ہائی لائیٹ ہم نے کبھی نہیں کیا۔ کچھ عرصہ قبل میں نے ڈرامہ سیریل "وارث" دیکھا اور میں حیران رہ گئی کہ اس زمانے میں بھی کتنے بولڈ سبجیکٹ پہ یہ ڈرامہ لکھا گیا تھا، اسی طرح 80ء کی دہائی میں چولانگ پلے ہوتے تھے۔ ان کے موضوعات بھی بہت بولڈ ہوتے تھے۔ لیکن ان کو "انڈر کور" کر کے دکھایا جاتا تھا۔ اب تھوڑا آزادی سے دکھا دیا جاتا ہے ۔۔۔ اور میرے خیال میں تو اچھا کر رہے ہیں۔ مگر کچھ چیزیں کچھ اوور ہو رہی ہیں، اس کے لیے تھوڑی احتیاط کر لیں تو زیادہ بہتر ہے، مثلاً" کچھ ڈائیلاگ ایسے ہوتے ہیں جن کو بولنے کے لیے میں ایزی فیل نہیں کرتی تو میں اپنے ڈائریکٹر سے کہہ دیتی ہوں کہ آپ اسے تبدیل کریں، میں ۔ ایسی لینگویج نہیں بول سکتی۔ جیسے ایک ڈرامے میں سین تھا کہ بیٹی کی شادی کی پہلی صبح آپ بیٹی کے کمرے میں آجاتی ہیں تو میں نے کہا کہ نہ میری

ایسی تربیت ہے اور نہ ہی میں نے اپنی فیملی میں ایسا کچھ دیکھا ہے اور آپ کتنے ہی ماڈرن ہو جائیں کوئی ماں داماد کے ہوتے ہوئے اپنی بیٹی کے کمرے میں صبح صبح نہیں جا سکتی۔ تب میرے ڈائریکٹر نے میرا سین بدلا۔۔۔ اور مجھے کوئی رول پسند نہیں آتا تو میں انکار کر دیتی ہوں۔"

"کہا جاتا ہے کہ جو بر گر فیملی یا کھاتے پیتے گھرانوں کی لڑکیاں فیلڈ میں آتی ہیں' انہیں جلدی کام مل جاتا ہے بہ نسبت غریب گھرانے کی لڑکیوں کے؟"

"آپ کی گرومنگ اور آپ کا فیملی بیک گراؤنڈ آپ کی شخصیت کو ابھارنے میں بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ خواہ آپ امیر گھرانے سے ہوں یا غریب گھرانے سے۔ مجھ سے جب لڑکیاں کچھ پوچھتی ہیں تو میں ان کو کہتی ہوں کہ آپ جب کسی کے سامنے پہلی بار جائیں تو اپنی ڈریسنگ اس انداز میں کر کے جائیں کہ جب لوگوں کی پہلی نظر آپ پر پڑے تو ان پر اچھا تاثر قائم ہو۔"

"بالکل۔۔۔ اور پہلی نظر کے علاوہ ہمیشہ آپ پر ایسی نظریں اٹھیں کہ آپ کو اپنے آپ پر فخر ہو اور اس میں والدین کی اچھی تربیت کا بہت وارو مدار ہے؟"

"جی اگر آپ غریب گھرانے سے آئی ہیں یا کہیں سے بھی آئی ہیں اور آپ نے ٹائٹس جینز یا سلیولیس پہنی ہوئی ہے اور آپ کا انداز تکلم بھی بناوٹی ہے تو آپ کیا شو کرنا چاہ رہی ہیں کہ میں Available ہوں۔۔۔ تو پھر وہ آپ کو اسی طرح ٹریٹ کریں گے۔۔۔ اور برائی ماحول میں نہیں ہوتی' برائی آپ کے اندر ہوتی ہے۔"

"آپ اتنا عرصہ ملک سے باہر رہ کر آئیں۔ میرا بھی آنا جانا لگا رہتا ہے' میں دیکھتی ہوں کہ وہ بے شک کپڑوں میں نہیں ہوتے مگر باقی سب کچھ ہوتا ہے ہم کپڑوں میں ہوتے ہیں اور باقی کچھ نہیں ہوتا۔۔۔؟"

"بالکل۔۔۔ بالکل ایسا ہی ہے۔ ابھی ہمیں بہت ٹائم لگے گا اپنی سوچ کو بدلنے میں۔ وہاں کسی کو پتا ہی نہیں ہوتا کہ آپ نے کیا پہنا ہے کیا نہیں' آپ کون ہیں کیا ہیں۔۔۔ آپ ایمرجنسی میں اسپتال جائیں' پہلے آپ کا علاج کریں گے یہ نہیں کہیں گے کہ پہلی فیس جمع کرائیں جو باتیں ہم مسلمانوں میں ہونی چاہئیں ان کے اندر ہیں۔"

"چلیں جی۔ باتیں بہت ہو گئیں۔۔۔ اب کچھ ادھر ادھر کی باتیں ہو جائیں کہ فارغ اوقات میں کیا کرتی ہیں۔ کیا کھانا پینا ہے' کیا مشاغل ہیں؟"

"کھانے بنانے کا مجھے بہت شوق ہے اور بنا کر کھلانے کا بھی بہت شوق ہے' بہت اچھا کھانا پکاتی ہوں۔ گھر میں کک بھی ہے' مگر پھر بھی خود سے کچھ نہ کچھ ضرور بناتی ہوں۔۔۔ گھر کے کاموں میں' بچوں میں بہت زیادہ انوالو رہتی ہوں۔ میری بیٹی کو پڑھنے کا (مطالعہ) بہت شوق ہے تو ہمارے گھر میں ہم سے زیادہ آپ کو کتابیں ملیں گی۔ ایک دن کا بھی میرا آف ہوتا ہے تو گھر کی چیزیں آرگنائز کرتی ہوں اور آپ نے مشاغل کی بات کی تو جب گھر میں ہوتی ہوں تو بچوں کے کام ہی میرے مشاغل ہوتے ہیں کہ بچوں کی کتابوں کو آرگنائز کرنا ہے۔ ان کی چیزوں کو دیکھنا ہے۔ ان کی الماری کو دیکھنا ہے۔ ٹھیک کرنا ہے اور سارا وقت بچوں کے ساتھ ہی گزارتی ہوں۔"

"میڈیا کی تقریبات میں حصہ لیتی ہیں؟"

"نہیں' میڈیا کی تقریبات میں حصہ نہیں لیتی' کہیں آتی جاتی نہیں۔ سب کو پتا ہے کہ شاہین آپا کے کانوں میں "پیک اپ" کا لفظ سنائی دیتا ہے اور گاڑی کی چابی ہاتھ میں لے لیتی ہیں کہ بس میں نے اب گھر جانا ہے' لاسٹ سین سے پہلے سب کو معلوم ہوتا ہے کہ شاہین آپا کا سامان گاڑی میں رکھ دینا ہے۔ پیک اپ کے بعد میں کہتی ہوں کہ اگر میں نے پیچھے مڑ کے دیکھا تو پتھر کی ہو جاؤں گی' بس مجھے گھر جانا ہے مجھے اپنی فیملی بہت پیاری ہے۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے شاہین خان صاحبہ سے اجازت چاہی' اس شکریے کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں ٹائم دیا۔

☆

سحالہ جیلانی



کنول خورشید ——— لیہ
اگلی محبتوں نے وہ نامرادیاں دیں
تازہ رفاقتوں سے دل تھا ڈرا ڈرا سا

بنتِ انور ——— لاہور
ابھی تک اُس کو میرا انتظار ہے شاید
مری نظر پہ بہت اعتبار ہے شاید

امبرین جاوید ——— لاہور
نہ گلے رہے نہ گماں رہے' نہ گزارشیں ہیں نہ گفتگو
وہ نشاطِ وعدہ وصل کیا' ہمیں اعتبار بھی اب نہیں

سدرہ نور ——— حویلی لکھا
بندھا ہوا ہے بہاروں کا اب وہیں تانتا
جہاں رُکا تھا میں' کانٹے نکالنے کے لیے

رباب قمر ——— سیالکوٹ
ترے وصال کے لمحے عجب طرح گزرے
نظر خموش' دلوں میں قیامتیں برپا

عائشہ غیاث ——— لالہ موسیٰ
وہ جو گیت تم نے سنا نہیں' مری عمر بھر کا ریاض تھا
مرے درد کی تھی وہ داستاں' جسے تم ہنسی میں اڑا گئے

انشال رضوان ——— ڈی آئی خان
اپنے شہر میں کس سے ملیں' ہم سے تو چھوٹیں محفلیں
ہر شخص تیرا نام لے' ہر شخص دیوانہ ترا

ثنا ذیشان ——— حیدر آباد
اڑتے اڑتے آس کا پنچھی دور اُفق میں ڈوب گیا
روتے روتے بیٹھ گئی آواز کسی سودائی کی

سعدیہ اصغر ——— گوجرانوالہ
کوئی بھی شکل مکمل نظر نہیں آتی
یہ کس نے توڑ دیا ہے نظر کا آئینہ

فاخرہ علی ——— کراچی
آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو

تحریم ——— گوجرہ
مجھ کو نفرت سے نہیں پیار سے مصلوب کرو
میں تو شامل ہوں محبت کے گنہگاروں میں

زرغونہ ریحان ——— سکھر
زندگی دھوپ بڑھانے لگی آئینوں سے
میں چلا جب تری دیوار کے سائے سائے

ثنا اُجالا ——— بھلوال
آؤ کچھ دیر رو ہی لیں ناصر
پھر یہ دریا اتر نہ جائے کہیں

پروین اختر ——— کراچی
دل کا اُجڑنا سہل سہی' بسنا سہل نہیں ظالم
بستی بسنا کھیل نہیں' بستے بستے بستی ہے

لاریب ——— کھڈیاں
پتا نہیں وہ اب کس مقام پر ہو گا
سنا ہے لوگ صداؤں سے تیز چلتے ہیں

سونیا معین ——— رحیم یار خان
میری طلب تھا ایک شخص' وہ جو نہیں ملا تو پھر
ہاتھ دعا سے یوں گرا' بھول گیا سوال بھی

عابدہ غوری ——— بھیرہ والا
دل کے سب نقش تھے ہاتھوں کی لکیروں جیسے
نقشِ پا ہوتے تو ممکن تھا مٹاتے جاتے

حرا خان ——— ساہیوال
فیض' زندہ رہیں' وہ ہیں تو سہی
کیا ہوا گر وفا شعار نہیں

آسیہ بلال ——— چیچہ وطنی
وہ کہتے ہیں رنجش کی باتیں بھلا دیں
محبت کریں' خوش رہیں' مسکرا دیں

شبانہ طاہر ——— ڈی جی خان
کبھی نغمۂ آرزو' کبھی زندگی کی پکار ہم
کبھی خاکِ کوچۂ یار ہم' کبھی شہر یار بہار ہم

خبریں و ریس

واصفہ سہیل



انا

گلوکارہ واداکارہ شاہدہ منی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں بچپن سے انہیں دیکھنے والے ادھیڑ عمری کو پہنچ گئے لیکن شاہدہ منی ویسی ہی سدا بہار ہیں۔ شاہدہ منی موجودہ ملکی حالات کے بارے میں کہتی ہیں کہ انتہائی دکھ اور افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ ایک طرف تو ملک میں سیلاب کی تباہ کاریوں نے ہزاروں لوگوں کو بے گھر کردیا ہے لوگ پریشان حال ہیں۔ یہ کوئی غیر نہیں ہیں یہ ہمارے اپنے ہیں' ہم نے ہی آگے بڑھ کر ان کی مدد کرنی ہے' انہیں سہارا دینا ہے۔ کیوں کہ انسانیت کا تقاضا یہی ہے۔ دوسری طرف کچھ لوگ حکومت مخالفت کو انا کا مسئلہ بنا بیٹھے ہیں۔ (شاہدہ! صرف انا کا مسئلہ نہیں معاملہ شاید اسکرپٹ کا بھی ہے) پاکستان میں رہنے والے سب ایک خاندان کی مانند ہیں جس میں اگر کسی ایک کو تکلیف پہنچتی ہے تو دوسرا اس کو فوراً" محسوس کرتا ہے۔ اس وقت سب کو اپنے اختلافات بھلا کر ان کی مدد کرنی چاہیے۔ (واہ شاہدہ! ہم آپ سے اتنی سمجھ داری کی توقع نہیں رکھتے تھے!)

ڈائٹنگ

اکثر خواتین یہ سوچتی ہیں اگر وہ اپنا وزن کم کرلیں تو ان کی زندگی میں مثبت تبدیلی آجائے گی جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ ایک تحقیق کے ذریعے یہ بات سامنے آئی ہے کہ وزن میں کمی سے انسان میں ڈپریشن اور مایوسی بڑھ جاتی ہے۔ ڈائٹنگ کے نتیجے میں بلڈ پریشر لو ہونے لگتا ہے۔ جس سے مزاج پر منفی اثرات نمودار ہونے لگتے ہیں۔ اس لیے شروع سے اپنی خوراک میں ایسی چیزیں شامل رکھیں جن سے آپ کا وزن نہ بڑھے۔ اور وہ خواتین جو ہر وقت ڈائٹنگ پر رہتی ہیں اچھے کھانوں سے دوری کی وجہ سے چڑچڑی ہوجاتی ہیں۔ ہر چیز کی طرح ڈائٹنگ میں



بھی اعتدال ضروری ہے۔

کاش!

ملالہ یوسف زئی کو نوبل انعام بھی مل گیا اور ملالہ نے ایوارڈ کی تقریب میں نریندر مودی اور نواز شریف دونوں کو شرکت کی دعوت بھی دے دی۔ ملالہ کو ملا کر کل دس مسلمانوں کو یہ نوبل ایوارڈ دیا گیا ہے (کیونکہ ڈاکٹر عبدالسلام پاکستانی تو ہیں مگر ختم نبوت پر یقین نہیں رکھتے) ملالہ سمیت یہ ایوارڈ جن دس مسلمانوں کو ملا۔ وہ سب ان لوگوں میں شامل ہیں جو امریکا اور اسرائیل کے مفادات کے لیے کام کررہے تھے اور ملالہ نے بھی اپنی مشہور زمانہ ڈائری میں توہین رسالت کی حمایت ہے۔ اور بظاہر ملالہ تعلیم کی اتنی حامی نظر آتی ہیں۔ لیکن در حقیقت ملالہ اور ان کے والد پاکستان میں لڑکیوں کی تعلیم کے لیے کوئی کام کرہی نہیں رہے ان کے ذاتی اسکول بھی خالص تجارتی بنیادوں پر چل رہے ہیں۔ فنڈ کے نام پر ملنے والی رقم بھی ان کے ذاتی اکاؤنٹس میں جمع ہورہی ہے۔

مزے کی بات یہ ہے کہ برطانیہ میں ملالہ کے والد ایجوکیشن اتاشی کے طور پر بھاری تنخواہ اور دیگر مراعات حاصل کررہے ہیں' اس کے علاوہ ملالہ کی تعلیم کا بھاری بھرکم بوجھ بھی حکومت پاکستان اٹھا رہی ہے۔ (کاش یہ رقم پاکستان میں بچوں کی تعلیم پر خرچ کی جائے تو کتنوں کا بھلا ہو؟) ملالہ اور ان کے والد فنڈ کے نام پر اپنے اکاؤنٹ میں اضافہ کررہے ہیں۔

اِدھر اُدھر سے

☆ انقلابی دھرنے کے خاتمے سے چوہدری شجاعت حسین اس قدر دل برداشتہ ہوئے ہیں کہ کل اگر وہ حکومت کو ایک آدھ دن کی مہمان قرار دے رہے تھے تو آج سرعام یہ کہتے پائے جاتے ہیں کہ حکومت گرنے کا کوئی امکان نہیں اور یہ کہ مڈٹرم انتخابات کا کوئی امکان نہیں دکھائی دے رہا' وہ تو مایوسی کے عالم میں اس حد تک چلے گئے ہیں کہ تحریک انصاف کے دھرنے کو "ناچ گانا اور میوزک پروگرام" قرار دے کر عمران خان سے مطالبہ کردیا ہے کہ محرم میں تو اسے بند کردیں۔

(جسارت)

بنگلہ دیش میں انڈین لاء جنگل کے قانون سے بھی کچھ کمتر۔ پروفیسر غلام اعظم 90 سال کی عمر میں 90 سال سزا پانے پر بنگلہ دیش میں "ظلم کا راج" لکھ کر تاریخ رقم کرگئے۔

(حفیظ اللہ نیازی)

میڈیا کے بعض حلقوں کی نالائقی' بانجھ پن' چھچھورا پن' کم ظرفی' پست حوصلگی اور یک طرفہ سوچ ننگا عیاں ہوچکا' جبکہ قوم اعصاب شکنی سے مرحلہ وار بحالی کی طرف گامزن۔ کئی ہفتے "شیر آیا' شیر آیا" کا ڈھونگ اور واویلا' کرنٹ جاوید ہاشمی نے بلف کال کرلیا تو دھرنا دھرا رہ گیا' دھڑام سے نیچے آگرا۔

(حفیظ اللہ نیازی)

یہ قوم اور اس کے "آزاد" صحافی تو جنرل مشرف کے خلاف نہیں کھڑے ہوئے جس نے امریکی احکامات پر محسن قوم قدیر خان کو جھوٹے الزامات لگا کر ذلیل کیا اور جان سے مارنے کی دھمکیاں دے کر ان سے اقرار جرم کروایا۔

(تحسین زیدی۔ امریکا)



سرورق کی شخصیت

ماڈل ---------- عفرا
میک اپ ---------- روز بیوٹی پارلر
فوٹوگرافر ---------- موسیٰ رضا

جسِ درد کا کوئی انت نہیں

نایاب جیلانی

یقین کی حدوں کو چھوتا ایک احساس جو حقیقت ہے۔ اور حقیقت ہوتی ہی دردناک ہے۔ میں نے درد کو اتنے کاٹ دار انداز میں پہلی مرتبہ اپنے وجود کے اندر اترتے دیکھا ہے۔ جب' ہاں جب مجھے پتا چلا۔ کہ میری پیاری سہیلی اس دنیا میں نہیں رہی۔ فرحانہ نہیں رہی۔ فاطمہ نجیب کی واہ کینٹ سے کال آئی۔

"نایاب؟ خبر سچی ہے کیا۔" میرے ہاتھ سے موبائل گر گیا۔ لوگ تصدیق چاہ رہے تھے۔ کوئی یقین کرنے کو تیار نہ تھا۔ پھر کالز کا ایک طویل سلسلہ۔ سدرہ صدیقی' فاطمہ گوندل' نبیلہ عزیز۔ کالز پہ کالز آرہی تھیں۔ اور میرے کان سن تھے' میرا جسم کانپ رہا تھا۔

مجھے نہیں پتا' میں کب سنبھلی۔ امی نے مجھے دوائیاں کھلائیں۔ پانی پلایا۔ اور پھر میں نے بشیر بھیا کو کال کی۔

میری آواز کانپ رہی تھی۔ میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ میں نے بھیا سے پوچھا۔ "فری کہاں ہے؟" اور میں بار بار پوچھ رہی تھی۔ اور وہ تھکی آواز میں بتا رہے تھے۔ "اللہ کے پاس۔" ان کے پاس کوئی اور جواب نہیں تھا۔

میں نے پوچھا۔ "فرحت آنٹی' فرحانہ کی امی؟"

جواب آیا۔ "وہ بھی۔"

میں نے پوچھا۔ "کرن؟ فری کی بہن؟"

جواب آیا "وہ بھی۔" میرا دل پھٹنے لگا۔ میں اونچی آواز میں رونے لگی۔ مجھے پتا چلا فرحانہ کا بیٹا دانی نشتر اسپتال میں ہے اور فرحانہ کا چھوٹا بھائی خاور بھی نہیں رہا۔

بشیر بھیا نے میری بات حیفہ سے کروائی۔ حیفہ رو رہی تھی۔ وہ بہت خوف زدہ تھی۔ بہت ڈری ہوئی تھی۔ حیفہ کا پیپر تھا اور واثق کا بھی پیپر تھا۔ وہ دونوں اپنے بابا کے پاس تھے۔ فرحانہ شادی پہ جا رہی تھی۔ اپنی امی' بہن بھائی اور بیٹے کے ساتھ۔ حیفہ نے کہا۔ "نایاب خالہ۔ مما نہیں رہیں۔ مما چھوڑ کے چلی گئیں۔" وہ رو رہی تھی۔ بلک رہی تھی۔ اور میرا دل پھٹ رہا تھا۔

اس دکھ کے پل صراط پہ فرحانہ کے پیچھے رہ جانے والا خاندان کھڑا تھا۔ اس کا شوہر' باپ' بچے۔

ایک' دو تین دن ہوگئے پر یقین ابھی تک نہیں آرہا۔ آہی نہیں سکتا۔ یقین بھلا کیسے آئے؟ ایک ایک منٹ' ایک ایک لمحے کو شیئر کرنے والی۔ ایک ایک بات بتانے والی۔ صبح ناشتے سے لے کر رات سونے تک۔ اس کی ساری روٹین میری آنکھوں کے سامنے چل رہی ہے۔

اس کا پہلا میسج صبح پانچ بجے آتا تھا۔ جب وہ اپنے بچوں کو باری باری اٹھا اٹھا کر تیار کرواتی' ناشتہ بناتی' ان کے بیگز اٹھا کر گیٹ تک رخصت کرتی اور پھر بچوں کو اسکول بھیج کر اس کا دوسرا میسج آتا تھا۔ قریب سات بجے۔ جب وہ خود ناشتہ کرتی تھی۔ یہ ناشتے کا دوسرا راؤنڈ تھا۔ پہلا راؤنڈ وہ صبح چھ بجے بالائی اور پراٹھے کے ساتھ پورا کر چکی ہوتی تھی۔ بقول فری کے اسے صبح صبح بڑی سخت بھوک لگا کرتی تھی۔

ناشتے کے دوران وہ باقی فرینڈز (لکھاری بہنوں) جن سے اس کی بہت اچھی بات چیت تھی' انہیں "گڈ مارننگ" کا میسج کرتی تھی۔ اور برابر میرے ساتھ گفتگو جاری رہتی۔

ان دنوں پھر اس کی کام والی علیل تھی۔ اور فری کے پاس ایک سو دس دلائل تھے۔ "بے چاری بیمار ہے نا۔" میں کہتی' آئے دن چھٹی' اس کی پکی چھٹی کروا دو۔"

وہ دہل جاتی۔ "روپیٹ کے ملی ہے پورے سات ہزار ماہانہ پہ۔ میں تو کبھی نہ چھوڑں۔" اس کا اسمائلی فیس والا میسج آتا۔

جواباً" میں تپ کر کہتی۔ "وہ بھی تمہیں نہیں چھوڑے گی۔ ایسی احمق خاتون اسے بھی پوری ڈی جی کے میں ملنے والی نہیں۔ ہر چیز لے کے سخاوت کردیتی ہو۔"

وہ مسکرانے لگتی۔ وہ ایسی ہی تھی۔ بہت دیالو' بہت سخی۔ بہت خالص اور بہت خاص۔

اس کے خاندان میں مہینے میں دو تین شادیاں' یا کوئی نہ کوئی برتھ ڈے پارٹی' یا کسی کا عقیقہ یا کسی کی منگنی تو لازمی ہوتی تھی۔ اور فنکشن میں جانے سے پہلے اس کی لمبی چوڑی تیاری۔ شاندار ڈریسنگ' اچھا سا ہیئر اسٹائل۔ اور میچنگ شوز۔ میک اپ وہ کرتی نہیں تھی۔ ایسے ہی اتنی حسین نظر آتی۔ بشیر بھائی ایسے ہی تو اسے "فیری" نہیں کہا کرتے تھے۔ وہ حقیقتاً "فیری" تھی۔ میرے پاس اس کی بے شمار تصویریں ہیں۔ کالج کی' گھر کی فنکشنز کی حتیٰ کہ اس کی شادی کی بھی۔ بچوں کی۔ دانیال' حیفہ اور واثق کی۔ فرحانہ کے امی ابو کی' ساری بہنوں کی۔ شبانہ' ثمن اور ڈاکٹر مہر النساء (کرن) کی۔ فری کے بچپن کی۔

میں فرحانہ سے اکثر کہتی تھی۔ "ترکی کی ماڈلز جیسی لک ہے تمہاری۔" اس کا فٹافٹ میسج آتا۔

"نہ' نہ۔ میری نہیں' میری امی کی۔ فریحہ ڈرامہ ہے نا۔ اس کی والدہ زہرہ۔ میری امی ہو بہو زہرہ جیسی ہیں۔ ویسی ہی خوبصورت لمبی تیکھی ناک۔"

میں نے کہا۔ "ہیں؟ واقعی؟"

اس نے ثبوت کے طور پر پکس بھیج دیں۔ اور میں حیران۔ واقعی اس کی امی زہرہ جیسی تھیں۔ بہت خوب صورت' گوری چٹی' اونچی لمبی۔ اور بہت حسین و جمیل' خوب صورت سے نورانی چہرے والے ابو۔ ریٹائرڈ اسسٹنٹ کمشنر ملک خدا بخش۔ اور فرحانہ میں ذرا بھی اکڑ' غرور' نخرہ نہیں۔ نہ اونچے خاندان کا' نہ باپ کے عہدے کا۔ وہ اتنی خالص' سچی اور سادہ تھی۔ وہ اتنی ہمدرد اور پیار کرنے والی ٹوٹ کر چاہنے والی تھی۔

میں نے فرحانہ میں ایک چیز بہت شدت سے دیکھی تھی۔ اور وہ تھی اپنے بہن' بھائیوں سے محبت ان سے دیوانگی کی حد تک چاہت۔ ڈاکٹر مہر النساء (کرن) فری کی سب سے چھوٹی بہن تھی حال ہی میں ڈاکٹر بنی تھی۔ وہ فرحانہ کا فخر تھی' اس کی خوشی تھی' اس کا عشق تھی۔ کرن کی ہر تصویر نئی پرانی اس نے مجھے بھیج رکھی تھی۔ مکھن کی ٹکیہ جیسی کرن' بڑی بڑی ذہین اور روشن کرین آنکھیں۔ معصوم سا چہرہ اور فرحانہ جیسی سادگی۔ اللہ' ذرا بھی غرور نہیں' اتنی مٹھاس' اتنی محبت' اتنا خالص پن۔

کرن کا ہاؤس جاب شروع تھا۔ فری کے ان دنوں کئی میسج آئے۔ کئی دفعہ اس نے مشورے لیے۔ ایک مرتبہ اس نے بتایا۔ "لاہور سے کرن کے لیے AC کا رشتہ آیا ہے۔ ہم نے انکار کردیا۔ شوخے سے لوگ تھے۔ اچھا کیا نا؟" ایسے ہی بہت سے پروپوزلز آتے رہے کوئی پروفیسر' کوئی انجینئر' ان دنوں ڈاکٹر کا پرپوزل آیا تھا۔ اور شاید یہ فائنل بھی ہو جاتا اگر۔

مجھے فری نے بتایا۔ "دانی کے رزلٹ کا انتظار ہے۔ میں بہت جلد لاہور شفٹ ہو جاؤں گی۔" وہ ایک دو ماہ تک لاہور شفٹ ہو جاتی۔ اس نے لاہور میں بڑا خوب صورت گھر خرید اتھا۔ یہ گھر اس لیے خریدا تھا کہ وہ خود لاہور اپنے بچوں کے ساتھ آکر رہتی۔ وہ حیفہ اور دانی کو ہاسٹل بھیجنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ خاص طور پر حیفہ کو۔ فری نے کہا۔

"حیفہ مجھ سے بہت اٹیچ ہے۔ وہ سانس بھی نہیں لیتی میرے بغیر۔ تم نہیں جانتیں نایاب' کرن کے ڈاکٹر بننے کے دوران میرے ابو نے کتنا درد جھیلا ہے۔ ابو کی

جان ہے کرن میں' ہر چھٹیوں کے بعد کرن اور ابو ایک دوسرے کو رو رو کر الوداع کرتے ہیں اور کرن ملتان جانے تک اور لاہور پہنچنے تک روتی ہوئی جاتی ہے۔ میں اس دکھ سے حیفہ کو نہیں گزارنا چاہتی۔ میں اپنے بچوں کے ساتھ رہوں گی اور حیفہ بھی کرن کی طرح ڈاکٹر بنے گی۔"

اس کے خواب' اس کے آدرش۔ مجھے ایک ایک ستارہ ٹوٹتا دکھائی دے رہا ہے۔ پچھلے دنوں شبی (شبانہ) کی وجہ سے فری کچھ ٹینس تھی۔ مجھے ایک ایک بات بتائی۔ مشورہ لیا اور پھر مسئلہ حل کیا۔ وہ بہت سمجھدار تھی۔ اس کے ابو ہر مشورہ اسی سے کرتے تھے۔ وہ معاملہ فہم تھی۔ ذہین تھی۔ بہت طریقے سے بہنوں اور بھائیوں کے پرابلمز حل کر لیتی تھی۔

مجھے ایک ایک بات یاد ہے۔ اس کا ایک ایک میسج جیسے دل پہ نقش تھا۔ اکثر وہ کسی اور کو میسج لکھتی اور غلطی سے مجھے بھیج دیتی۔ کبھی دانی کو میسج لکھ رہی ہوتی۔ "دانی! دھیان سے بائیک چلانا۔ اور دیکھو بائیک چلانا' ہوا میں اڑانا نہیں۔ اور پلیز' واثق کو تنگ مت کرنا۔ تمہارا چھوٹا بھائی ہے۔" ایسے ہی کئی میسج کسی اور کو کرنے ہوتے اور مجھے بھیج دیتی۔ ایک مرتبہ واثق اور حیفہ کی ٹیوٹر کو میسج لکھا۔

"پلیز ناہید۔ واثق کو پیار سے سمجھایا کریں۔ وہ سختی سے نہیں مانتا۔ لاڈ سے سمجھ جاتا ہے۔ وہ اتنا انٹیلی جینٹ ہے کہ ایک مرتبہ سمجھانے سے پک کرتا ہے۔ دوبارہ ریپیٹ کبھی نہیں کروانا پڑتا۔" ایسے ہی لاتعداد ٹیکسٹ۔ باتیں' یادیں۔ اب کون ناہید کو میسج کر کے واثق کو سمجھانے کا کہے گا؟

اب کون دانی کو بتائے گا بائیک اڑاتے نہیں چلاتے ہیں دانی اور واثق کا بہت خیال رکھنا۔ وہ تمہارا چھوٹا بھائی ہے۔

وہ ہنستی مسکراتی۔ بچوں کے ساتھ بچہ بن جاتی۔ بچوں کے لیے نت نئے پکوان بناتی۔ اس کے بچے سی

فوڈ کے دیوانے تھے۔ آئے دن عجیب و غریب نام کی ڈشز بناتی اور کبھی نہ تھکتی۔

ہم دونوں گھر کے کام کرتے لاتعداد باتیں کرنے کے عادی تھے۔ میں فرش دھو رہی ہوتی۔ اور وہ کپڑے دھو رہی ہوتی۔ بیچ بیچ میں ہاتھ خشک کر کے ایک دوسرے کو ضرور رپلائی کرتے تھے۔

اس دوران اس نے کئی موبائل پانی میں گرائے' توڑے' ضائع کیے۔

وہ اپنے ابو کی بہت لاڈلی تھی۔ اور میاں کی بے انتہا لاڈلی۔ میں نہیں جانتی یہ دو لوگ فرحانہ کی دائمی جدائی کے "غم" کو کیسے سہار پائیں گے۔

اور ابھی تو اس غم کی ابتدا ہے۔ وہ غم جو ان پیچھے رہ جانے والوں کے لیے کسی پہاڑ سے کم نہیں۔ کسی چٹان سے کم نہیں۔

اکثر فرحانہ بات کرتے کرتے اچانک بتاتی۔ "او ناپاب۔ دیکھو کرن آگئی۔ اب مجھ سے کوئی مشکل سی ڈش بنوائے گی۔" اور کرن کا تو معمول تھا۔ وہ ہر روز فرحانہ کے پاس آتی تھی۔ کبھی صبح کو آتی اور رات کو جاتی فرحانہ اور کرن کی جان ایک دوسرے میں تھی۔

اور آج میں سوچتی ہوں۔ اگر کار ایکسیڈنٹ میں فرحانہ بچ جاتی اور اسے پتا چلتا اس کی اونچی لمبی گوری چٹی' بہت مہربان سی امی فرحت النساء جنہوں نے شادی کے دس سال تک فرحانہ کو گھر میں کھانا نہیں پکانے دیا بلکہ ہر روز بلاناغہ لنچ تیار کر کے بھیجا کرتی تھیں۔ وہ امی جنہوں نے ناز اٹھا اٹھا کر ابھی تک اسے "بچہ" بنائے رکھا تھا۔ وہ پیاری' میٹھی اور جانی امی۔ اس دنیا میں نہیں رہیں۔

اور اگر فرحانہ اس حادثے میں زندہ بچ جاتی اور اسے پتا چلتا۔ اس کی شہزادیوں جیسی آن بان والی لاڈلی بہن ڈاکٹر مہرالنساء اس دنیا میں نہیں رہی۔

اور اگر فرحانہ اس بھیانک ٹریفک حادثے میں زندہ بچ جاتی اور اسے پتا چلتا کہ اس کا بہت پڑھاکو لاڈلا چھوٹا بھائی جس کا ایل ایل بی ادھورا رہ گیا ہے۔ وہ اس دنیا میں نہیں رہا تو۔ تو بھلا فرحانہ ناز ملک زندہ رہ سکتی تھی؟ کبھی بھی نہیں۔ وہ اس خبر کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی۔ اس کی سانسیں بند ہو جاتیں۔ اس کا دل بند ہو جاتا۔ اسے اپنے بہن بھائیوں سے ایسا ہی جنونی عشق تھا۔ اور یہ محبت و درد کی عجیب و غریب داستان رقم ہوئی

اور یہ اذیت و درد اور "غم" کی انوکھی داستان ہے۔ جس درد کا کوئی انت نہیں۔ کوئی حد نہیں۔ کوئی سرحد نہیں' کوئی کنارہ نہیں۔ اور فروو۔ تم اپنی یادوں اور باتوں کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہو گی۔

ادھورے خواب ادھوری کہانیاں

سائرہ رضا

کردار لکھاری کے ہاتھوں میں کٹھ پتلیاں ہوتے ہیں۔ وہ جیسے بھی پیش کردے اچھا بنا کر یا برا بنا کر۔ کہانی کے اندر بہت بولنے والے بڑے بہادر حق و سچ کی آواز بننے والے کردار سب اچھا کردینے والے کردار۔ نہیں بول پاتے تو بس لکھاری کے سامنے۔ وہ توڑ دے مروڑ دے آباد کردے یا برباد وہ چپ رہتے ہیں۔

بااختیار نظر آنے والے بے بس کردار۔

لیکن اگر جو بول پاتے یا چلیے ہم تصور کرلیں کہ وہ آپس میں گفتگو کرتے ہیں ایک دوسرے سے دل کی کہتے سنتے ہیں تو آج نوحہ کناں ہیں۔ عقیدت کا کردار' مشکل نام والے بابا سبکتگین' تحریم اور اویس' سنعان اور حبہ۔

ایک دوسرے سے منہ موڑ کر رہتے جیون ساتھی جو نجانے کیسے ایک دوسرے کو برداشت کرتے ہیں۔ وہ بھی آج کسی ایک دکھ پر بیٹھے اکیلے رو رہے ہیں۔ ایک دوسرے کے آنسو پونچھ رہے ہیں۔ بھیگی آنکھوں سے سنعان اس ملن کو دیکھتا ہے اور یہ کیسا منظر ہے کہ تحریم اپنے آنسو پونچھنے کے ساتھ ساتھ عقیدت اور اماں کے آنسو بھی پونچھتی ہے شدت غم سے ماں سے لپٹ لپٹ جاتی ہے۔ سالم صاحب جو عمر کی نقدی ختم ہونے کے گمان پر وصیتیں لکھتے پھر رہے تھے۔ اب اپنی موت کو بھلائے ایک جوان لاشے پر ماتم کناں ہیں۔

اگر جو کہہ پاتے تو کہتے جانے کی عمر تو میری تھی۔

اے میری تخلیق کار فرحانہ ناز ملک تو خود کیوں چلی گئی۔ مجھے مار دیتی مگر۔

عقیدت تحریم کے خوب صورت بچوں کو لاڈ کرنے کو بے حال تھی۔ اس نے کہا فرحانہ ناز ملک کے بچے دیکھے تھے۔ دیکھے ہوتے ناں تو تحریم کے پیارے کیلیے بچے کو بھول جاتی عقیدت کو میچ جتوا کر فرحانہ خود موت سے ہار گئی۔ دور دیس بیٹھا شہریار اور فہد اور سحاب ایک دوسرے کا منہ تکتے ہیں فروغ ماہ نے تو ابھی محبت کے باب کا پہلا ورق ہی پلٹا تھا۔ اور یہ سب کردار اور ایسے بہت سے کردار جو فرحانہ کے ذہن میں زندہ تھے اک صبح مر گئے۔ کہ فرحانہ ناز ملک مر گئی۔ اب اس سے آگے کیسے لکھوں امتل۔ اتنے دن سے ایک آنسو نہیں ٹپکا۔ مگر ابھی جب میں نے لکھا۔ فرحانہ ناز ملک مر گئی۔ میں نے خود کو اس کی جگہ رکھ کے دیکھا ...... میرے پاس بھی کردار ہیں۔ میرے پاس بھی خواب ہیں۔ میرے پاس۔ یہ تعزیتی خط نہیں ہے۔ یہ ان ادھورے رہ جانے والے کردار کا نوحہ ہے۔ جو میری آنکھ سے ٹپک کر اس کاغذ کو گیلا کرتا ہے۔

ٹپ ٹپ ٹپ۔

پتا نہیں میں کیا لکھ رہی ہوں۔ مگر یہ ضرور جانتی ہوں کیوں لکھ رہی ہوں وہی فرحانہ کے کرداروں کا رونا جو ادھورے رہ گئے۔

اور فرحانہ کے خواب۔

اور وہ پیارے بچے۔

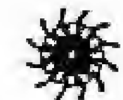
اور میں خود۔

میں تمہیں رو رہی ہوں فرحانہ۔

ہم جو کبھی ملے نہیں مگر ہم تھے تو ایک جیسے ناں وہ ہی تخلیق کار۔ تم اور میں کوئی الگ تھوڑی ہیں۔

تمہارے ادھورے کردار اور ادھورے خواب کہانیاں۔

میرے اندر ایک ایسا خلا بنا چکے ہیں جو کبھی نہیں بھر پائے گا۔





دسترخوان کی رونق

صبا سحر

نوڈلز اور میکرونی کا سلاد

اجزا :

نوڈلز	ایک پیکٹ
پیاز' شملہ	ایک ایک عدد
چینی	ایک چائے کا چمچ
میکرونی	ایک کپ
ہری پیاز' ٹماٹر	ایک' ایک عدد
ٹماٹو کیچپ	دو کھانے کے چمچے
میونیز	دو کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب :

نوڈلز اور میکرونی الگ الگ ایک ایک چمچے تیل کے ساتھ ابال کر نتھار لیں۔ سبزیوں کو آدھا انچ کیوبز میں کاٹ لیں۔ اب ایک پیالے میں تمام چیزیں ڈال کر اچھی طرح مکس کریں۔ لیموں کا رس چھڑک دیں۔ اس سلاد میں چکن اور ابلے ہوئے انڈے بھی شامل کیے جاسکتے ہیں۔

آلو بخارے اور دال کی چٹنی

اجزا :

مونگ یا مسور کی دال	ایک کپ
آلو بخارے	دس عدد
پیاز' ٹماٹر	ایک' ایک عدد
ہلدی' لال مرچ	ایک' ایک چائے کا چمچہ
ہری مرچ	آٹھ عدد
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب :

آلو بخاروں کو پانی میں بھگو دیں۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد دال کو ہلدی کے ساتھ اچھی طرح گلا کر اس میں آلو بخارے بیج نکال کر ڈال دیں اور تھوڑے سے پانی کے ساتھ گھوٹ لیں۔ فرائنگ پان میں پیاز اور ٹماٹر کو ہلکا سا فرائی کر کے اس میں لال مرچ' ہری مرچ اور نمک شامل کریں۔ اب اس آمیزے کو دال اور آلو بخارے میں ملا دیں۔ چند منٹ پکائیں' پھر اتار لیں۔

پیاز کی اچاری چٹنی

اجزا :

پیاز	چار عدد
سرکہ	ایک کپ
سونٹھ پسی ہوئی	آدھا چائے کا چمچہ
رائی 'لال مرچ	ایک ایک چائے کا چمچہ
ہری مرچ	دس عدد
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب :

ایک بڑے مٹی کے برتن میں سرکہ 'نمک' ہری مرچ' پیاز 'لال مرچ' رائی اور سونٹھ مکس کریں۔ پیاز کو چھیل کر چار چار ٹکڑے کرکے اس میں ڈالیں اور تین چار دن کے لیے رکھ دیں۔ مزے دار پیاز کا اچار تیار ہے۔

مرچیلی ادا

اجزا :

ہری مرچیں	دس عدد
ادرک لہسن پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
رائی 'سونف	ایک 'ایک چائے کا چمچہ
کلونجی 'کھٹائی	ایک 'ایک چائے کا چمچہ
ثابت لال مرچیں	آٹھ عدد
بیسن	آدھا کپ
لیموں کا رس	دو کھانے کے چمچے

ترکیب :

ہری مرچوں کو لمبائی میں کاٹ کر دانے نکال لیں اور لیموں کے رس میں ڈال کر رکھ دیں۔ ادرک لہسن پیسٹ' رائی 'کلونجی 'سونف 'نمک' ثابت لال مرچ اور کھٹائی کو ملا کر باریک پیس لیں اور بیسن میں تھوڑے پانی کے ساتھ ملا کر پیسٹ بنالیں ۔ اب ہری مرچوں کو بیسن میں اچھی طرح کوٹ کرکے تل لیں ۔ یہ ذائقے دار مرچیلی ادا دال چاول' کے ساتھ خوب مزا دیں گی۔

شکارپوری چٹنی

اجزا :

کیری	ایک کلو
چینی	آدھا کلو
لہسن کے جوے	چار عدد
کلونجی	آدھا چائے کا چمچہ
ثابت لال مرچ	آٹھ عدد
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب :

کیری کو دھو کر چھیل کر کدوکش کرلیں۔ لہسن کو بھی باریک چوپ کرلیں۔ ثابت لال مرچوں کو توڑلیں۔ ایک برتن میں کدوکش کی ہوئی کیریاں ڈالیں۔ اس کے ساتھ ہی چینی 'لہسن' ثابت لال مرچ اور کلونجی ڈال کر اچھی طرح مکس کرکے تھوڑے سے پانی میں پکائیں۔ چمچہ چلاتی رہیں۔ جب چینی اور کیری کا پانی خشک ہوجائے تو اچھی طرح مکس کریں۔ شکارپوری چٹنی تیار ہے۔

شکارپوری کھٹا میٹھا اچار

اجزا :

ہری مرچ	دس عدد
رائی 'اچور	ایک 'ایک چائے کا چمچہ
چینی 'زیرہ	ایک 'ایک کھانے کا چمچہ
لہسن ادرک پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
سرکہ	تین چائے کے چمچے
نمک 'تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

ہری مرچوں کو کٹ لگائیں اور بیج نکال دیں۔ پیالے میں پسا زیرہ 'اچور اور نمک مکس کرکے ہری مرچوں میں بھر دیں۔ ایک ساس پان میں تیل گرم کریں اور ذرا سی رائی ڈال کر کڑکڑائیں۔ لہسن پیسٹ ڈالیں اور ساتھ ہی 'چینی اور نمک ڈال کر پانچ منٹ پکائیں۔ اس میں ہری مرچیں ڈال کر دم پر رکھ دیں پانچ منٹ بعد اتارلیں' سرکہ مکس کریں۔ کھٹا میٹھا شکارپوری اچار تیار ہے۔

ٹماٹر اور انار دانے کی چٹنی

اجزا :

ٹماٹر	آدھا کلو
سرخ مرچ	دو چائے کے چمچے
انار دانہ	دو کھانے کے چمچے
لیموں	ایک عدد
ہری مرچ	پانچ عدد
ہرا دھنیا	آدھی گٹھی
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب :

ٹماٹروں کو توے پر بھون کر چھلکا اتار کر تمام اجزا کے ساتھ باریک پیس لیں۔ پھر لیموں کا رس ملالیں۔

بگھارے دہی بڑے

اجزا :

بیسن	ایک کپ
کھانے کا سوڈا	ایک چٹکی
پسی لال مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
دہی	آدھا کلو
کڑی پتا 'ثابت مرچ	پانچ 'پانچ عدد
زیرہ	آدھا چائے کا چمچہ
نمک 'تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

بیسن میں کھانے کا سوڈا' نمک اور لال مرچ ڈال کر پھینٹ لیں اور گرم تیل میں پکوڑے فرائی کریں۔ دہی میں نمک ملا کر خوب پھینٹ لیں۔ تھوڑا پانی ڈال کر پتلا کریں۔ پھر تیار پکوڑے ڈال دیں۔ ایک فرائنگ پان میں تیل گرم کرکے اس میں ثابت لال مرچ' زیرہ اور کڑی پتے ڈال کر کڑکڑائیں اور دہی میں بگھار لگادیں۔ دوپہر کے کھانے میں جھٹ پٹ تیار ہونے والی ڈش حاضر ہے۔

املی کی چٹ پٹی چٹنی

اجزا :

املی	آدھا پاؤ
میتھی دانہ' سونٹھ	آدھا' آدھا چائے کا چمچہ
چینی	آدھا پاؤ
سرخ مرچ' زیرہ	دو' دو چائے کے چمچے
سرکہ	آدھا کپ
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب :

زیرہ اور میتھی دانہ کو بھون کر کوٹ لیں۔ املی کو بھگو دیں۔ نرم ہوجانے پر چھان کر پکالیں۔ پھر سونٹھ' نمک' چینی' سرکہ اور حسب ضرورت پانی ملا کر پکائیں۔ گاڑھا ہو جائے تو بھنا مسالا اور سرخ مرچ ڈال کر اچھی طرح مکس کریں اور بوتل میں بند کرکے رکھ لیں۔ املی کی ذائقے دار چٹنی تیار ہے۔ ہر کھانے کے ساتھ پیش کریں۔

ٹماٹو کیچپ

اجزا :

ٹماٹر	ایک کلو
چینی	ایک کپ
لہسن پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
پسی سرخ مرچ	تین چائے کے چمچے
پسا زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
پسی ہری مرچ	ایک چائے کا چمچہ
سرکہ	چھ کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب :

لہسن پیسٹ' زیرہ' ہری مرچ اور سرخ مرچ ایک چمچے سرکے کے ساتھ ملا کر پیسٹ بنالیں۔ ٹماٹر کو تھوڑا پانی ملا کر پکالیں۔ جب یہ گل جائے تو ایک کانٹے سے دبا کر اس کا پتلا ملغوبہ بنالیں۔ چھلکا الگ کردیں۔ اس تیار شدہ پیسٹ میں نمک' چینی اور باقی کا سرکہ ملا کر تھوڑی دیر پکائیں کہ یکجان ہوجائے' پھر ٹھنڈا کرکے صاف اور خشک بوتل میں بھر لیں۔ مزے دار ٹماٹو کیچپ تیار ہے۔

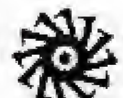
ویجی ٹیبل رائتہ

اجزا :

دہی	ایک پاؤ
کھیرا 'ٹماٹر	ایک 'ایک عدد
ابلا ہوا آلو	ایک عدد
سبز دھنیا	ایک کھانے کا چمچہ
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
ثابت لال مرچ	دو عدد
لہسن کے جوے	دو عدد
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب :

تمام سبزیوں کو چوکور کاٹ لیں۔ نمک 'لہسن 'لال مرچ زیرہ' ہرا دھنیا اور پودینے کو باریک پیس لیں۔ دہی پھینٹ کر سبزیاں اور چٹنی ملائیں۔ مزے دار ویجی ٹیبل رائتہ تیار ہے۔





دعا ایمان۔ قصور

سمجھ میں نہیں آرہا کس طرح اپنی پریشانی بیان کروں۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں جب بھی سوچتی ہوں کہ وہ مجھ سے دور چلا جائے گا تو کیسے جیوں گی سوچ اس موڑ پہ آکر مفلوج ہو جاتی ہے سانس رکنے لگتی ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو دل و جان سے چاہتے ہیں مگر کچھ لوگ ہمارے ملن میں رکاوٹ بن کر کھڑے ہوگئے ہیں۔ میرے گھر والے میرے ساتھ ہیں اور ان کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ وہ اپنی جگہ پر مجبور ہے نہ وہ اپنے والدین سے بغاوت کر سکتا ہے اور نہ وہ مجھے غلط راستے کا مشورہ دے گا۔ میں نے راتوں کو سجدوں میں رو رو کے اسے رب سے مانگا ہے اور ابھی تک مانگتی ہوں۔ تین سال اس کے لیے ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپتی رہی۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ اس نے مجھے وہ دے دیا جسے میں دعاؤں میں مانگتی تھی۔ مگر ایک سوال ابھی بھی اپنی جگہ پہ ہے کہ کیا وہ واقعی مجھے دے دیا گیا ہے یا یہ دل و نظر کا فریب ہے۔ کیا وہ میرا ہے اور میرا رہے گا۔ وہ مجھ سے دور تو نہیں جائے گا؟ اگر وہ دور چلا گیا تو کیا میں اس کے بغیر جی پاؤں گی؟ نہیں کبھی نہیں اتنا پیار پا کے میں اس کے بغیر جی نہیں سکتی۔ زندگی صرف اسی کے نام پر آکر ٹھہر گئی ہے۔ صرف وہ بس وہ 'وہ نہیں تو کوئی نہیں' یہ زندگی بھی نہیں۔

اچھی بہن! آپ نے وضاحت نہیں کی جو لوگ آپ کی راہ کی رکاوٹ بنے ہوئے کہ وہ کون لوگ ہیں۔ کیا اس لڑکے کے والدین نہیں چاہتے یا کوئی اور لوگ ہیں؟ اور وہ ایسا کیوں نہیں چاہتے ہیں؟ ان کو اس پر کیا اعتراض ہے؟ اگر وہ اپنے والدین سے بغاوت نہیں کر سکتا تو دوسرا کون سا راستہ ہے؟

سب سے اہم بات آپ نے یہ واضح نہیں کیا کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہے یا والدین پر انحصار کرتا ہے۔ اگر وہ اپنے پیروں پر نہیں کھڑا ہے تو پھر اس سے کوئی توقع رکھنا عبث ہوگا۔

آپ کا سوال یہ ہے کیا واقعی وہ آپ کا ہے' آپ کو دے دیا گیا ہے یا یہ دل و نظر کا فریب ہے؟ اس سوال کا جواب صرف ایک ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اسے آپ کی قسمت میں لکھ دیا گیا ہے تو وہ آپ کو ضرور ملے گا۔ ورنہ صبر کے سوا چارہ نہیں۔ انسان کو صبر کرنا ہی پڑتا ہے۔

"وہ نہیں تو کوئی نہیں۔ یہ زندگی بھی نہیں۔" یہ سوچ درست نہیں ہے۔ زندگی سے بڑھ کر کوئی نہیں ہوتا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی امانت ہے۔

س۔ علی گجر خان

بہن س کا یہ تیسرا خط ہے گھر والوں کے رویے' والدہ کی بیماری' بد مزاجی' برا بھلا کہنا' والد کا شکی مزاج اس پیاری سی بہن کو کس اذیت میں مبتلا کر رہا ہے اور وہ کہاں تک پہنچ گئی ہے۔

"میں ہر نماز کے بعد اللہ جی سے مانگتی ہوں۔ ہر خواہش' ہر مراد اس سے مانگتی ہوں۔ وہ میری ایک خواہش پوری کرتا۔ موت دیتا یا ان سب کے چنگل سے آزاد کرا لیتا۔ کچھ سمجھ نہیں آرہا۔ میں پاگل ہو رہی ہوں یا عنقریب ہو جاؤں گی۔ سب سے مایوس ہو چکی ہوں۔ اپنے گھر والوں سے' اپنی دوستوں سے۔ آپ سے' اللہ سے

جو سکھ نواز تا ہے۔ سب مجھ پر ترس کھاتے ہیں۔ میری رشتہ دار' میری کزنز' دوستیں اور جو مجھ پر ترس کھاتے ہیں! وہ سب مجھے زہر لگتے ہیں۔ ان سب سے مجھے نفرت ہے۔

اچھی بہن! میں وہی بات دہرانے پر مجبور ہوں جو پچھلے جواب میں لکھی جا چکی ہے کہ آپ بہت ذہین اور سمجھ دار لڑکی ہیں' حساس ہیں اور ضرورت سے زیادہ حساس ہیں۔ سچ بات یہ ہے کہ مشورے کی ضرورت آپ کو نہیں آپ کے والدین کو ہے جنہیں احساس ہے نہ شعور۔ جنہیں پیار کے دو لفظ بولنے نہیں آتے' کسی کا دل رکھنا نہیں آتا۔

آپ بے شک سب سے مایوس ہوں لیکن اللہ سے نہیں۔ اللہ پر کامل یقین رکھیے۔ آپ کے اس بھائی کو تو کامل یقین ہے کہ ان شاء اللہ آپ کو زندگی میں وہ سب کچھ ملے گا جس کی آپ خواہش رکھتی ہیں' جس کے لیے آپ دعائیں مانگتی ہیں۔

ایک مشورہ ضرور ہے کہ حساس ہونا اچھی بات ہے لیکن اچھی بات بھی حد سے بڑھ جائے تو اچھی بات نہیں رہتی۔

آپ ضرورت سے زیادہ حساس ہیں۔ جب آپ کو اندازہ ہو چکا ہے کہ آپ کے والد شک کے مریض ہیں اور آپ کی والدہ کو غصہ کرنے کی عادت ہے اور آپ بچپن سے ان کو اسی حالت میں دیکھ رہی ہیں تو پھر ان کی باتوں کا اثر کیوں لیتی ہیں۔ اب اس عمر میں آکر ان کی عادتیں نہیں بدل سکتیں۔

جہاں تک رشتہ دار' کزنز' دوستوں کے ترس کھانے کی بات ہے تو انہیں آپ سے ہمدردی ہے۔ وہ آپ کو اچھا سمجھتی ہیں۔ وہ جانتی ہیں کہ دوسرے لوگ آپ کے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔ آپ بری نہیں ہیں۔ آپ کے والد آپ پر غلط شک کرتے ہیں۔ ان کی یہ ہمدردی اور ترس آپ کو صحیح سمجھنے کی وجہ سے ہے۔ اگر وہ آپ کو غلط سمجھتیں تو آپ سے نفرت کرتیں' ہمدردی اور ترس کو غلط مفہوم نہ دیں۔ اگر کوئی آپ کے ساتھ مخلص ہے تو اس کے خلوص کو سمجھیں۔ اس کے ساتھ نفرت کرکے دوریاں نہ بڑھائیں بلکہ کسی سے بھی نفرت نہ کریں۔ ایک بات یاد رکھیے جو محبت کرتے ہیں' انہیں ہی محبت ملتی ہے۔ نفرت کرنے سے سب سے زیادہ نقصان خود کو ہی پہنچتا ہے۔

غزالہ خان

جادو وغیرہ پر مجھے یقین نہیں ہے۔ لوگوں کو بے وقوف بنانے اور ان سے پیسہ بٹورنے کے لیے عامل حضرات نے یہ چکر چلا رکھا ہے۔ جادو کے سلسلے میں ایک اہم بات یہ ہے کہ جادو کا اثر صرف ان لوگوں پر ہوتا ہے جو اس پر یقین رکھتے ہیں۔ آپ یقین رکھیں کہ جادو کوئی چیز نہیں ہے اگر آپ نے یقین کر لیا کہ کوئی جادو کر رہا ہے تو آپ کو نقصان ہوگا۔

بھائی سمجھنے اور بھائی ہونے میں بہت فرق ہے منگنی ہونے کے بعد کسی دوسرے لڑکے سے تعلق رکھنا مناسب نہیں۔ آپ کے منگیتر کو شک ہو سکتا ہے۔ بہتر ہے کہ محتاط رہیں۔



بیوٹی بکس

امت الصبور

ناہید آصف۔۔۔ لیہ

س : باجی! میری عمر تیس سال ہے میری جلد صاف اور چمک دار ہے لیکن میری آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے ہیں یہ حلقے پھولے پھولے سے ہیں جو بہت عجیب سے لگتے ہیں۔ میں نے ڈاکٹر کے مشورے سے وٹامن اور آئرن کی گولیاں استعمال کی ہیں لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

ج : سب سے پہلے تو آپ خود کو پرسکون رکھیں اور ایک بھرپور نیند لیں کم سے کم آٹھ گھنٹے سوئیں۔ سوجن کم کرنے کے لیے آپ چائے کی استعمال شدہ پتی ایک کپڑے کی تھیلی میں ڈال کر آنکھوں پر رکھیں۔

روزانہ آلو یا کھیرے کے باریک قتلے کاٹ کر دس منٹ تک آنکھوں پر رکھیں۔ اس سے کافی فائدہ ہوگا۔

افشین قمر۔۔۔ بدین

س : میرے ہونٹ اکثر خشک رہتے ہیں میں ہونٹوں پر چیپ اسٹک لگاتی ہوں کبھی کبھی کریم بھی لگا لیتی ہوں لیکن اس سے صرف وقتی فائدہ ہوتا ہے۔ ہونٹ پھٹے ہونے کی وجہ سے لپ اسٹک بھی اچھی نہیں لگتی۔ کوئی اچھا سا نسخہ بتائیں۔

ج : افشین! آپ نے لکھا ہے کہ آپ کے ہونٹ اکثر خشک رہتے ہیں اس کے لیے آپ کبھی کبھی کریم لگاتی ہیں لیکن یہ نہیں بتایا کہ آپ کون سی کریم لگاتی ہیں۔ آپ کو چاہیے کہ آپ ہونٹوں پر کیسٹر آئل لگائیں آج کل خشک موسم کی وجہ سے بھی ہونٹ پھٹتے ہیں رات کو ہونٹوں پر کیسٹر آئل لگائیں۔ دن میں کم از کم تین مرتبہ چیپ اسٹک لگائیں۔ لپ اسٹک بھی گلوسی استعمال کریں۔

عالیہ وحید۔۔۔ پشاور

س : باجی میرا مسئلہ ہے کہ میرے بال نہیں بڑھتے ہیں پلیز آپ مجھے کوئی ایسا نسخہ بتائیں کہ میرے بال لمبے ہو جائیں۔

ج : عالیہ! بال لمبے اور گھنے ہونے میں اچھی صحت کا بڑا حصہ ہے آپ اپنی صحت کا خیال رکھیں۔ آج کل سیبوں کا موسم ہے۔ سیب دھو کر چھلکے سمیت کھائیں، دوسرے پھل اور سبزیاں زیادہ استعمال کریں، باقاعدگی سے دودھ پئیں۔ آپ کے بالوں پر خوشگوار اثر پڑے گا۔

بالوں میں ناریل یا سرسوں کے تیل کی مالش کریں تیل لگانے سے پہلے اسے ہلکا سا گرم کریں۔ نہانے اور بال دھونے سے پہلے تھوڑا سا لیموں کا رس لے کر بالوں کی جڑوں میں مالش کریں اس کے بعد صابن یا شیمپو سے دھو کر صاف کرلیں۔ یہ خشکی کے لیے بھی مفید ہے۔

ریٹھے، آملے اور سیکا کائی کو پیس لیں۔ اس کا پیسٹ بنائیں اور اس سے سر دھوئیں بال لمبے اور گھنے ہو جائیں گے۔

روبینہ بٹ۔۔۔ لاہور

س : باجی! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے چہرے پر تازگی نہیں ہے چہرے کا رنگ بھی بہت خراب ہو گیا ہے عموماً سردیوں میں میرے ہاتھ، بازو اور پاؤں کی جلد کھردری اور بے رونق ہو جاتی ہے۔ کوئی ایسا حل بتائیں کہ میرے چہرے پر تازگی، چمک اور شفاف پن پیدا ہو جائے۔

ج : چہرے کی رونق کے لیے آٹے کی بھوسی میں چھاچھ ملا کر دس منٹ تک چہرے اور گردن پر اس کا لیپ کریں۔ پھر صاف پانی سے چہرہ دھولیں۔

انڈے کی زردی پھینٹ کر اس میں چند قطرے زیتون کا تیل ملالیں اور چہرے پر لگائیں۔ بیس منٹ تک لگا رہنے دیں۔ ان ترکیبوں پر عمل کرنے سے آپ کے چہرے پر چمک اور تازگی پیدا ہو جائے گی۔

گلیسرین میں چند قطرے لیموں کے ملا کر ایک بوتل میں رکھ لیں اور رات کو اچھی طرح ہاتھ پیروں پر لگالیں یا کوئی اچھی کولڈ کریم لے کر اس سے ہاتھ پیروں کا مساج کرلیں اس سے بھی ہاتھ پیر نرم ہو جاتے ہیں۔

☼